محفل و مجالس

علامہ

• اصول و فروع

• نقوشِ عصمت

(۸۶/۱۱۰ھ)

مولائے کائنات

ابو الائمہ حضرت امام **علی** ابنِ ابی طالب علیہ السّلام

کی مُناجاتوں میں سے ایک مُناجات

اِلٰهِی کَفٰی بِیْ عِزًّا اَنْ اَکُوْنَ لَکَ عَبْدًا وَکَفٰی
بِیْ فَخْرًا اَنْ تَکُوْنَ لِیْ رَبًّا اَنْتَ کَمَا اُحِبُّ
فَاجْعَلْنِیْ کَمَا تُحِبُّ

میرے اللہ میری عزت کے لئے یہی کافی ہے کہ میں تیرا بندہ ہوں اور میرے فخر کے لئے یہی کافی ہے کہ تُو میرا پروردگار ہے۔ تُو ویسا ہی ہے جیسا میں چاہتا ہوں، پس تُو مجھ کو ویسا بنا لے جیسا تُو چاہتا ہے۔

اشتراک:

IDAARA-E-TARVEEJ-E-SOAZKHWANI
ادارۂ ترویجِ سوز خوانی
Post Box No. 10979, Karachi-74700

چودہ ستارے

محفل و مجالس

علامہ السید ذیشان حیدر جوادی طاب ثراہ

عصمہ پبلیکیشنز
پی۔او باکس نمبر۔ 18168 کراچی 74700 پاکستان

○ جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں ○

نامِ کتاب	:	محفل ومجالس
مؤلف	:	علامہ سید ذیشان حیدر جوادی طاب ثراہ
ناشر	:	عصمہ پبلیکیشنز کراچی
تعداد اشاعت	:	۵۰۰ سو
تاریخ اشاعت	:	جولائی ۲۰۰۲ء
طباعت	:	پرنٹنگ محل ناظم آباد نمبر ۲ کراچی
سیریل پبلکیشن ایڈیشن	:	پہلا ایڈیشن
ھدیہ	:	۱۵۰/= روپیہ
مشیر قانون	:	پروفیسر سید سبطِ جعفر زیدی ایڈوکیٹ جناب شبیر رضوی ایڈوکیٹ (ہائی کورٹ)
سرِ ورق (ٹائیل ڈیزائننگ)	:	سید امتیاز عباس

اسٹاکسٹ

افتخار بک ڈپو۔ اسلام پورہ کرشن نگر۔ لاہور
مکتبۃ الرضا۔ ۸ بیسمنٹ میاں مارکیٹ۔ اُردو بازار۔ لاہور
رحمت اللہ بک ایجنسی کھارادر۔ کراچی
حسن علی بک ڈپو۔ کھارادر۔ کراچی
محفوظ بک ایجنسی۔ مارٹن روڈ۔ کراچی
عباس بک ایجنسی۔ رستم نگر۔ لکھنؤ
خراسان بک سینٹر برنس روڈ۔ کراچی
احمد بک ڈپو۔ رضویہ سوسائٹی۔ کراچی
زیدی بک اسٹال۔ خراسان کراچی
سید محمد ثقلین کاظمی جی 6/2۔ اسلام آباد
سودے بکس لائبریری اینڈ اسٹیشنرز۔ سکردو۔ بلتستان
ویلکم بک پورٹ (پرائیویٹ) لمیٹڈ۔ مین اُردو بازار۔ کراچی۔
الحسن بک ڈپو مسجد باب العلم۔ نارتھ ناظم آباد۔ کراچی۔

S. Jawad Haider Rizvi
Principal
JAMIA IMAMIA ANWARUL ULOOM
30, Mirza Ghalib Road, Allahabad - 211 003 • Ph.
Residence : D-19, Kareli Colony, Allahabad - 211 016 • Ph.

سید جواد حیدر رضوی
مدیر جامعہ امامیہ انوار العلوم
۳۰۔ مرزا غالب روڈ۔ الہ آباد۔

اجازت نامہ

جناب محترم سید ایوب نقوی صاحب
مدیر عصمہ پبلیکیشنز کراچی پاکستان

سلام علیکم
امید ہیکہ بفضلہ تعالیٰ بخیریت ہوں گے۔

والدعلام سرکار علامہ سید ذیشان حیدر جوادی طاب ثراہ سے انکی تصنیفات و تالیفات کو شائع کرنے کیلئے مولانا سید ظفر عباس صاحب قبلہ کی موجودگی میں انکی حیات میں گفتگو ہوئی تھی اس گفتگو کے پس منظر میں آپ کو اجازت دی جاتی ہے کہ والدعلام طاب ثراہ کی جملہ تصنیفات و تالیفات کو پاکستان میں شائع کر سکتے ہیں یہ اجازت آپ کے ادارہ عصمہ پبلیکیشنز کیلئے مخصوص و محدود ہے۔

جناب ایوب نقوی صاحب کے علاوہ کوئی دوسرا شخص انفرادی طور پر یا کوئی ادارہ آپ کی اجازت کے بغیر والدعلام سرکار علامہ سید ذیشان حیدر جوادی طاب ثراہ کی تصنیفات و تالیفات کو شائع نہیں کر سکتا۔ اگر کوئی صاحب یا ادارہ اسکی خلاف ورزی کرتا ہے تو عنداللہ مسئول ہوگا اور جناب ایوب نقوی صاحب کو قانونی چارہ جوئی کرنے کا مکمل حق حاصل ہوگا۔

والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ
سید جواد حیدر رضوی
ابن علامہ سید ذیشان حیدر جوادی طاب ثراہ
۲۴ دسمبر ۲۰۰۰ء

قصہ مشہور ہے کہ کسی زمانے میں انگریزوں کی ایک جماعت نے اس بات کا سروے کیا کہ دنیا کی کس قوم میں کس قدر ذوق مطالعہ پایا جاتا ہے اور آخر میں جب اپنی رپورٹ مرتب کی تو ہندوستان کے بارے میں یہ تبصرہ کیا کہ "یہاں کی قوم میں ذوق مطالعہ بہت ہے لیکن کتاب مانگ کر ـــ خرید کر نہیں۔"

یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا تجربہ برسہا برس سے کیا جا رہا ہے کہ کھانا کھانا ہو تو سب الگ الگ کھائیں گے۔ سامان خریدنا ہو تو سب کا سامان الگ الگ ہونا چاہیے۔ مکان بنانا ہو تو سارے خاندان کا مکان الگ الگ ہو ـــ لیکن کتاب خریدنا ہو تو محلہ بھر یا خاندان بھر میں ایک آدمی خرید لے یہی کافی ہے۔ باقی لوگ اس سے عاریتہً لے کر پڑھ لیں گے۔ ظاہر ہے کہ جس قوم میں مطالعہ کا ذوق اس منزل پر ہو اس میں نشر و اشاعت کا کام کس قدر مشکل ہوگا اور تبلیغ کی گاڑی کس طرح آگے بڑھ سکے گی۔ اس کا اندازہ کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے

ہندوستان نہ غریب ہے نہ فقیر ـــ یہاں کے مومنین نہ مفلس ہیں نہ فاقہ کش۔ دنیا کے ہر کام پر لاکھوں روپیہ صرف ہو رہا ہے۔ شادی بیاہ کی جہل رسموں سے مکانات کی آرائش تک ہزاروں روپیہ برباد ہو رہا ہے ـــ لیکن جب مذہبی کتب خریدنے کا وقت آتا ہے تو ہر شخص کو غربت، ناداری، افلاس اور ملکی پریشانیاں سب ہی یاد آنے لگتی ہیں اور ایک کتاب کا خریدنا جوئے شیر لانے کے مرادف ہو جاتا

ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کا نہیں خریدنا ہے کوہ ہمالیہ کو سر پر اٹھانا ہے جب کہ ایسی کوئی کیفیت دنیاوی لٹریچر کی خریداری میں نہیں پیدا ہوتی۔ درحقیقت اسی قومی ذہنیت کا نتیجہ ہے کہ ہر کام قیمت ادا کر کے انجام دیتا ہے اور دین و مذہب کو مفت حاصل کرتا ہے۔

ایسے حالات میں ذہنی افلاس اور مذہبی جہالت کا دور دورہ نہ ہوگا تو کیا ہوگا۔ یہ تو محض خوش فہمی ہے کہ ہر آدمی اپنی جگہ پر اپنے کو "اعلم دوراں" تصور کرتا ہے اور جو بات نہیں جانتا اس کے نہ جاننے ہی کو کمال دین و دیانت تصور کرتا ہے ـــ در مذہب کا صحیح احساس ہوتا اور مذہب کو تنظیم حیات کا ذریعہ سمجھا جاتا تو یہ صورت حال ہرگز نہ ہوتی۔

کس قدر حیرت انگیز بات ہے کہ عراق و ایران اور بالخصوص ایران میں کتاب بازار میں نہیں آتی اور پیش فروش (ایڈوانس بکنگ) کے طور پر ہزاروں نسخے بک جاتے ہیں۔ اور تقریباً یہی کیفیت پاکستان میں پیدا ہو رہی ہے۔ اور ہندوستان میں پانچ سو نسخے نکالنے کے لئے پانچ سو طریقے اختیار کرنا پڑتے ہیں اور برسوں انتظار کرنا پڑتا ہے اور ہر شخص کے پاس ایک ہی "عذر معقول" ہوتا ہے کہ دیگر ممالک میں پیسہ ہے اور ہندوستان میں غربت ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر اس ملک میں غربت ہے تو کیا آتشبازی کے پیسے باہر سے آتے ہیں۔ شادیوں کی رسومات پر ہزاروں کا سرمایہ عراق و ایران والے صرف کرتے ہیں۔ ولادت سے وفات تک درجنوں تقریبات ایجاد کر کے دعوت احباب کا سامان بیرونی ملک والے کرتے ہیں۔ ریڈیو ٹیپ ریکارڈر۔ فرنیچر۔ سامان آرائش عرب و عجم والے خرید کر رکھ جاتے ہیں یا ـــ اور اگر ایسا نہیں ہے ـــ تو پھر یہ سب سامان کہاں سے آجاتا ہے ـــ؟

بات صرف یہ ہے کہ انسان جس کام کو ضروری سمجھتا ہے اس کے لئے وقت

بھی نکلتا ہے اور سرمایہ بھی فراہم کرتا ہے اور جس کام کو "مد فاضل" تصور کرتا ہے اس کے لئے کسی ایثار کا تصور بھی نہیں کرتا۔

خدا جزائے خیر دے ان صاحبانِ خیر کو جنھیں آج بھی مذہبی لٹریچر کی اہمیت کا اندازہ ہے اور اس کار پر بھی رقم خرچ کرتے ہیں اور اس طرح کام بھی انجام پا جاتا ہے اور مرحومین کے ایصالِ ثواب کا بھی بہترین راستہ نکل آتا ہے۔

ربِ کریم جملہ حضرات کو اس قسم کی توفیق کرامت فرمائے اور ایسا ایصالِ ثواب کرنے والوں کے مرحومین کو جنت الفردوس میں جوارِ معصومین عنایت فرمائے۔

ناظرین کرام ایسے مرحومین کے لئے ایک سورہ فاتحہ پڑھ کر ایصالِ ثواب کر دیں تو دینی کتب کی اشاعت میں شرکت کا ثواب بھی حاصل کر سکتے ہیں۔

والسلام علیٰ من اتبع الہدیٰ

السید ذیشان حیدر جوادی

۱۵ جمادی الاول ۱۴۰۵ھ

فہرست محفل

چودہ ستارے

		صفحہ
پہلی محفل	داستانِ عظمت سرکارِ دو عالمؐ	۱۱
دوسری محفل	داستانِ عظمت صدیقہ طاہرہؑ	۳۲
تیسری محفل	داستانِ عظمت مولائے کائنات حضرت علیؑ	۵۶
چوتھی محفل	داستانِ عزیمت امام حسن مجتبیٰؑ	۷۴
پانچویں محفل	داستانِ عظمت سرکار سید الشہداءؑ امام حسینؑ	۹۵
چھٹی محفل	داستانِ عظمت امام زین العابدینؑ	۱۱۴
ساتویں محفل	داستانِ عظمت امام محمد باقر علیہ السّلام	۱۳۴
آٹھویں محفل	داستانِ عظمت امام جعفر صادق علیہ السّلام	۱۵۵
نویں محفل	داستانِ عظمت امام موسیٰ کاظم علیہ السّلام	۱۷۳
دسویں محفل	داستانِ عظمت امام رضا علیہ السّلام	۱۹۴
گیارھویں محفل	داستانِ عظمت امام محمد تقی علیہ السّلام	۲۱۶
بارھویں محفل	داستانِ عظمت امام علی نقی علیہ السّلام	۲۳۹
تیرھویں محفل	داستانِ عظمت امام حسن عسکری علیہ السّلام	۲۵۹
چودھویں محفل	داستانِ عظمت حضرت حجۃ بن الحسن عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف	۲۷۹

فہرستِ مجالس

چودہ ستارے

پہلی مجلس	داستانِ عزیمت سرکارِ دوعالم	۳۰۰
دوسری مجلس	داستانِ عزیمت صدیقہ طاہرہ	۳۲۱
تیسری مجلس	داستانِ عزیمت مولائے کائناتؑ حضرت علیؑ	۳۴۷
چوتھی مجلس	داستانِ عزیمت امام حسن مجتبیٰؑ	۳۶۸
پانچویں مجلس	داستانِ عزیمت سرکار سید الشہداءؑ امام حسینؑ	۳۸۹
چھٹی مجلس	داستانِ عزیمت امام زین العابدینؑ	۴۱۰
ساتویں مجلس	داستانِ عزیمت امام محمد باقر علیہ السلام	۴۳۱
آٹھویں مجلس	داستانِ عزیمت امام جعفر صادق علیہ السلام	۴۵۴
نویں مجلس	داستانِ عزیمت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام	۴۷۵
دسویں مجلس	داستانِ عزیمت امام رضا علیہ السلام	۴۹۷
گیارھویں مجلس	داستانِ عزیمت امام محمد تقی علیہ السلام	۵۲۰
بارھویں مجلس	داستانِ عزیمت امام علی نقی علیہ السلام	۵۴۳
تیرھویں مجلس	داستانِ عزیمت امام حسن عسکری علیہ السلام	۵۶۴
چودھویں مجلس	داستانِ عزیمت حضرت حجۃ بن الحسن عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف	۵۷۹

باسمہٖ سبحانہٗ

حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

اسم مبارک	:	احمدؐ، محمدؐ،
لقب	:	مصطفیٰؐ، بشیر، نذیر، وغیرہ،
کنیت	:	ابوالقاسم،
والد ماجد	:	جناب عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم،
والدہ ماجدہ	:	جناب آمنہ بنت وہب بن عبد مناف،
ولادت	:	۱۷ ربیع الاول سنہ ۱ عام الفیل جمعہ شعب ابی طالب،
بادشاہ وقت	:	نوشیرواں عادل،
ازواج	:	تیرہ (۱۳) جناب خدیجہ، جناب ام سلمہ وغیرہ،
اولاد	:	جناب سیدہ، قاسم، طیب، طاہر، ابراہیم،
شہادت	:	۲۸ صفر سنہ ۱۱ھ بروز دوشنبہ، مدینہ منورہ،
عمر شریف	:	۶۳ سال،

فہرستِ مجالس

چودہ ستارے

پہلی مجلس	داستانِ عزیمت سرکارِ دوعالم	۳۰۰
دُوسری مجلس	داستانِ عزیمت صدیقہ طاہرہؑ	۳۲۱
تیسری مجلس	داستانِ عزیمت مولائے کائناتؑ حضرت علیؑ	۳۴۷
چوتھی مجلس	داستانِ عزیمت اِمام حسن مجتبیٰؑ	۳۶۸
پانچویں مجلس	داستانِ عزیمت سرکار سید الشہداءؑ اِمام حسینؑ	۳۸۹
چھٹی مجلس	داستانِ عزیمت اِمام زین العابدینؑ	۴۱۰
ساتویں مجلس	داستانِ عزیمت اِمام محمد باقر علیہ السّلام	۴۳۱
آٹھویں مجلس	داستانِ عزیمت اِمام جعفر صادق علیہ السّلام	۴۵۴
نویں مجلس	داستانِ عزیمت اِمام موسیٰ کاظم علیہ السّلام	۴۷۵
دسویں مجلس	داستانِ عزیمت اِمام رضا علیہ السّلام	۴۹۷
گیارھویں مجلس	داستانِ عزیمت اِمام محمد تقی علیہ السّلام	۵۲۰
بارھویں مجلس	داستانِ عزیمت اِمام علی نقی علیہ السّلام	۵۴۳
تیرھویں مجلس	داستانِ عزیمت اِمام حسن عسکری علیہ السّلام	۵۶۴
چودھویں مجلس	داستانِ عزیمت حضرت حجۃ بن الحسن عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف	۲۷۹

باسمہٖ سبحانہٗ

حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

اسم مبارک	:	احمدؐ، محمدؐ،
لقب	:	مصطفیٰؐ، بشیر، نذیر، وغیرہ،
کنیت	:	ابوالقاسم،
والد ماجد	:	جناب عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم،
والدہ ماجدہ	:	جناب آمنہ بنت وہب بن عبد مناف،
ولادت	:	۱۷ ربیع الاول سنہ ۱ عام الفیل جمعہ شعب ابی طالب
بادشاہ وقت	:	نوشیرواں عادل،
ازواج	:	تیرہ ۱۳ (جناب خدیجہ، جناب ام سلمہ وغیرہ،
اولاد	:	جناب سیدہ، قاسم، طیب، طاہر، ابراہیم،
شہادت	:	۲۸ صفر ۱۱ھ بروز دوشنبہ، مدینہ منورہ،
عمر شریف	:	۶۳ سال،

اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم | بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی اَفْضَلِ الْاَنْبِیَاءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ خَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا اَبِی الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ وَّآلِہِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاہِرِیْنَ الْمَعْصُوْمِیْنَ وَلَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلٰی اَعْدَائِہِمْ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ اللّٰہُ الْحَکِیْمُ فِیْ کِتَابِہِ الْکَرِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اِنَّ عَلَیْنَا لَلْہُدٰی وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَۃَ وَالْاُوْلٰی

مالکِ کائنات عالمِ انسانیت کو اپنے کرم اور اپنی حکمتِ کاملہ سے آگاہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ ہدایت کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے اور دنیا و آخرت کا اختیار ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ مطلب یہ نہیں کہ تمھارا کوئی فرض نہیں ہے اور تم پر کسی قسم کی ذمہ داری نہیں ہے۔ بلکہ یہ اعلان درحقیقت دو قسم کے نظریات کی تردید ہے جو خالقِ کائنات سے ربط رکھنے والوں نے اپنے ذہن میں قائم کر رکھے ہیں اور جن کی بنا پہ گمراہی کا ایک ماحول عالمِ وجود میں آگیا ہے۔

خالقِ کائنات کے مسئلہ پر غور کرنے والے دو طرح کے ہیں۔

بعض افراد وہ ہیں جنھوں نے خالقِ کائنات کو اپنے مسائلِ حیات سے بالکل اجنبی اور بیگانہ بنا دیا ہے اور ان کا خیال ہے کہ اسے ہمارے معاملات میں دخل دینے کا حق نہیں ہے۔ اس کا کام خلق کرنا تھا، اس نے کر دیا۔ اب ہمارے خیر و شر کیا ہیں اور ہمارے فائدہ و نقصان کے مسائل کیا ہیں ان سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، انھیں ہم خود بہتر جانتے ہیں۔ اس نے ہمیں صاحبِ شعور و ادراک بنایا ہے۔ ہم صاحبانِ عقل و فہم ہیں، ہمارے پاس فکر و نظر کی قوتیں ہیں، ہمارے پاس قلب و دماغ کا سرمایہ ہے۔ ہمیں کسی کی ہدایت

کی ضرورت نہیں ہے، ہمیں کوئی قانون درکار نہیں ہے، نہ کسی ضابطۂ زندگی کی ضرورت ہے۔ ہم بے نیاز ہیں اور بے نیاز رہیں گے۔

ان بے چاروں کو اتنا بھی شعور نہیں ہے کہ اگر اس باشعور ہستی نے یہ شعور نہ دیا ہوتا تو کیا ہوتا؟ اس خالقِ عقل نے یہ جوہرِ عقل نہ مرحمت فرمایا ہوتا تو کیا ہوتا۔ یہ جو کچھ ہے سب اسی کے کرم کا نتیجہ ہے اور جو سرمایہ ہے سب اسی کا عطا کیا ہوا ہے۔ یہ انتہائی بدنصیبی ہے کہ انسان نے عقل و شعور کا مصرف بغاوت کو قرار دیا ہے اور اس کے ذہن میں شعور و ادراک کا کل فائدہ یہ ہے کہ پیدا کرنے والے کا انکار کر دیا جائے اور اس کی ہستی کو غیر ضروری، بے فیض اور بے فائدہ قرار دے دیا جائے۔ اسے کچھ بھی عظمتِ خالق کا اندازہ ہوتا تو اس کے خیالات یہ نہ ہوتے اور اس کا طریقۂ فکر و نظر ایسا نہ ہوتا، اسے کم از کم یہ شعور تو ہوتا کہ جس نے پیدا کر کے نعمتِ زندگی دی ہے، جس نے عدم کو وجود کا لباس پہنایا ہے، وہ ہمارے حال پر مہربان ہے اور ہمارے مسائل کو ہم سے زیادہ جاننے والا ہے۔ لیکن نفس پرست انسان نے خواہشات کو خدا بنا کر واقعی خدا کے وجود سے انکار کر دیا اور اسی کو سرمایۂ فکر و نظر سمجھنے لگا۔

یہ بات صرف دنیائے کفر و الحاد تک محدود ہوتی تو کسی حد تک صبر آجاتا اور یہ کہنے کا موقع ہوتا کہ جن افراد نے ہستیِ معبود ہی کو نہیں پہچانا ان سے اس سے زیادہ کیا توقع کی جاسکتی ہے۔ لیکن قیامت یہ ہے کہ تاریخ کے ایک موڑ پر یہی خیال مسلمانوں کے ذہن میں بھی پیدا ہو گیا تھا اور یہی انداز فکر امتِ قرآن نے بھی پیدا کر لیا تھا ـــــ آپ یہ تعجب نہ کریں

کہ اسلام میں ایسا کیوں کر ہو سکتا ہے اور وحدہٗ لاشریک کا کلمہ پڑھنے والی اُمّت اس اندازِ فکر کو کیوں کر اپنا سکتی ہے۔ اس لئے کہ ایک لمحہ کے لئے حیات مرسلِ اعظمؐ کے بعد کے حالات کا جائزہ لیں تو یہ مسئلہ خود بخود حل ہو جاتا ہے اور یہ سمجھ میں آجاتا ہے کہ مسلمانوں نے اپنے مسائل میں اپنے کو خود مختار اور زیادہ عارف و عاقل نہ سمجھ لیا ہوتا اور ربّ العالمین کو حیات و کائنات کے مسائل سے بیگانہ نہ کر دیا ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ خدا اور رسولؐ کے مقرر کئے ہوئے نمائندہ کے ہوتے ہوئے کوئی نیا انتخاب عمل میں آتا اور کسی نئے ذمہ دارِ امت کی ضرورت محسوس ہوتی۔ یہ انتخاب خود بتا رہا ہے کہ اُمّت کو خدا پر اعتماد نہیں ہے اور وہ اپنے وجود کو خدا اور رسولؐ سے زیادہ اپنے مسائل کا ذمہ دار سمجھتی ہے اور یہ ایک ایسا نقطۂ امتیاز تھا جس سے اُمّت کے دو حصے ہو گئے۔ خدا اور رسولؐ پر اعتماد کرنے والوں نے اس کے نمائندہ کو اختیار کیا اور اپنے نفس کے پرستاروں نے اس نمائندہ کو آگے بڑھایا جسے انھوں نے خود منتخب کیا تھا۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ امّت اسلامیہ دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک حصّہ اپنے نفس کا پرستار ہو گیا اور ایک نفس اللّٰہ کا فدار ہو گیا۔

ایسے افراد ہر دور میں پیدا ہوتے رہے ہیں جنھوں نے ربّ العالمین کو اپنے مسائل سے برطرف کر دیا ہے اور اپنے مسائل کے خود ذمہ دار بنے رہے ہیں۔ اور ایسے افراد بھی ہوتے رہے ہیں جنھوں نے کمال ایمان و عقیدہ کا اظہار کرتے ہوئے جملہ ذمہ داریاں اسی کے سر رکھ دی ہیں اور بظاہر ان کا خیال ہے کہ ہماری کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ یہ اسی کا فرض ہے کہ ہمیں راہِ راست پر لگائے اور یہ اسی کی ذمہ داری ہے کہ ہمیں جنّت تک پہنچائے۔ ہمارے پاس نہ کوئی اختیار ہے نہ ہماری کوئی ذمہ داری۔

یہ وہ گمراہ کن عقیدہ ہے جس کے پرستار بڑے خلوص سے کہہ دیا کرتے ہیں کہ جب بغیر حکم خدا کے پتہ بھی نہیں ہل سکتا تو بندہ کیسے جنبش کر سکتا ہے۔ بندہ کے جملہ اعمال کی ذمہ داری پروردگار پر ہے۔ ان افراد نے یہ سوچنے کی کبھی زحمت نہیں کی کہ اسلام کا عقیدہ یہ ہے کہ علم خدا کے بغیر پتّہ نہیں ہل سکتا۔ اس میں حکم کا کوئی دخل نہیں ہے۔ علم اور ہے اور حکم اور۔ علم کا قیاس حکم پر نہیں کیا جا سکتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ پتّوں کے سلسلے میں تو لفظ حکم کا استعمال بھی ہو سکتا ہے کہ ان کے پاس شعور و ادراک اور قدرت و اختیار نہیں ہے لیکن انسان کے بارے میں اس لفظ کا استعمال نہیں ہو سکتا۔ وہ صاحبِ شعور و ادراک ہے اور اس کے پاس جوہرِ عقل و فہم ہے۔ وہ پتّوں کو ہوا میں اُڑانے والا ہے خود پتّہ نہیں ہے۔ وہ پتّوں کو توڑنے والا ہے اور واضح لفظوں میں ہوا کا رُخ بدلنے والا ہے، ہوا کے رُخ پر اُڑنے والا نہیں ہے۔ صلوات ـــ

مقصدِ کلام یہ ہے کہ دنیا میں دو طرح کے انسان پیدا ہوتے رہے ہیں اور مالکِ کائنات نے اس آیت میں دونوں کے نظریات کی تردید کی ہے جو افراد اسے اپنے مسائلِ حیات سے الگ رکھنا چاہتے ہیں انھیں بھی معلوم ہونا چاہئے کہ ہدایت اور رہنمائی کی ذمہ داری اسی کی ہے اور دنیا و آخرت کا اختیار اسی کے ہاتھوں میں ہے اور جو لوگ اسے تمام تر ذمہ دار بنا دینا چاہتے ہیں اور اپنے کو ہر منزل پر سبکدوش کر لینا چاہتے ہیں انھیں بھی معلوم ہونا چاہئے کہ اس پر صرف ہدایت کی ذمہ داری ہے۔ انگلی پکڑ کر منزل تک پہنچانا اس کی ذمہ داری نہیں ہے۔ اس نے صاف لفظوں میں اعلان کر دیا ہے کہ ہم نے صحیح راستہ کی ہدایت کر دی، اب چاہے انسان شکریہ ادا کرے یا کافر و منکر ہو جائے۔ تو اب کہنا پڑے گا کہ اسلام کی صحیح تعلیم یہی ہے کہ خدا کو اپنے

مسائل سے الگ بھی نہ رکھا جائے اور اسے تمام تر ذمہ داری بھی نہ بنا دیا جائے اور یہی وہ درمیانی راستہ ہے جسے اہلِ بیت اطہارؑ نے اختیار فرمایا ہے اور جسے جبر و اختیار کی بحث میں جادۂ اعتدال سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور کیوں نہ ہوتا جن لوگوں کے عقائد میں عدالت داخل نہیں ہے وہ کبھی منزل سے آگے بڑھ جاتے ہیں اور کبھی پیچھے رہ جاتے ہیں اور جن کے عقائد میں عدالت ایک بنیادی نقطہ ہے وہ درمیانی راستہ پر رہتے ہیں، نہ کبھی آگے بڑھتے ہیں نہ پیچھے رہ جاتے ہیں۔ اور ہم نے تو یہ منظر میدانِ غدیر میں صاف صاف دیکھا ہے کہ نقطۂ اعتدال کو سمجھانے والے پیغمبر نے آگے بڑھ جانے والوں کو پیچھے بلایا اور پیچھے رہ جانے والوں کا انتظار کیا کہ سب اکٹھا ہو جائیں تو علیؑ کی ولایت کا اعلان کیا جائے اور یہ واضح کر دیا جائے کہ اسلام کا نقطۂ اعتدال یہی ہے اور اس سے آگے بڑھ جانے والا بھی ظالم ہے اور اس سے پیچھے رہ جانے والا بھی صراطِ مستقیم سے منحرف ہے۔ "لا ینال عہدی الظالمین" یاد رکھو ہمارا عہدہ ظالمین کو نہیں مل سکتا۔ صلوات،

یاد رکھئے! شریعت کی ہدایت کی ذمہ داری پروردگار پر ہے اور عالمِ انسانیت کو راہ دکھانے کا فرض اس نے اپنے ذمہ لیا ہے اور اسی فریضہ کی ادائیگی تھی جس نے تخلیقِ کائنات میں اس ترتیب کو پیشِ نظر رکھا کہ راہ راست پر چلنے والے بعد میں پیدا ہوں اور راہنما پہلے پیدا ہو جائے تاکہ کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ راستہ پوچھنے والے موجود تھے اور راستہ بتانے والا کوئی نہ تھا۔ منزل تک جانے والے موجود تھے اور منزل تک لے جانے والا کوئی نہ تھا۔ یہ حکمت الٰہی اور کریم پروردگار کا تقاضہ تھا کہ اس نے عدم کے سناٹے کو راہنما سے توڑا۔ راہ پیما سے نہیں۔ کائنات کا وجودِ اوّل راہبر کو بنایا "راہرو" کو نہیں۔ یا دوسرے لفظوں میں

یوں کہا جائے کہ اس نے اپنے قانون کے مزاج کو سمجھا دیا کہ آغازِ کائنات میں جب کچھ نہ تھا تو صرف راہنما تھا۔ اور انجامِ دنیا میں بھی جب ساری دنیا فنا ہو جائے گی تو راہنما کا وجود رہے گا اب جسے الٰہی راہنما کو پہچاننا ہو وہ یہ شمعِ ہدایت لیکر آگے بڑھے اور یہ دیکھے کہ جہاں فنا کا سلسلہ قائم ہو جائے وہ خدائی سلسلہ نہیں ہے اور جہاں "یَبْقٰی وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ" کی شان سے راہنما وجہ اللہ بن کر باقی ہے وہاں الٰہی نمائندگی ہے اور اسی کو خدا کی نیابت و جانشینی کا حق ہے۔ صلوات،

مالکِ کائنات نے اپنے اس فریضۂ ہدایت کو ہر دور میں ادا کیا اور ہر موڑ پر ایک نہ ایک راہنما کا انتظام کیا۔ تاریخ کے مختصر سے وقفہ میں ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاؑ کی آمد اس بات کی دلیل ہے کہ مالکِ کائنات نے کوئی دور، کوئی زمانہ، کوئی علاقہ، کوئی خطہ ایسا نہیں چھوڑا جہاں اپنی طرف سے راہنما کا انتظام نہ کیا ہو اور جس میں اپنی ہدایت نہ قرار دی ہو۔ یہ بدنصیبی جیسے صرف امتِ پیغمبر کے حصہ میں آئی ہے کہ ہر قوم و ملت پر رحم کرنے والے خدا کو اس کے حالِ زار پر رحم نہ آیا اور اس نے اس قوم کو حضورؐ کے بعد لاوارث چھوڑ دیا۔ العیاذ باللہ،

عزیزانِ محترم! کرمِ الٰہی پر کتنا بڑا اتہام ہے یہ سوچنا کہ خدا نے امتِ پیغمبرؐ کو لاوارث چھوڑ دیا ہے اور اسے نہ ملت سے کوئی محبت ہے نہ مذہب سے کوئی تعلق۔ وہ نہ اسلام کی بقا چاہتا ہے نہ قرآن کی زندگی۔ غنیمت ہے اب بھی مسلمان اپنے خیالات کی اصلاح کر لیں اور سرکارِ دو عالمؐ کی ولادت باسعادت کے مبارک موقع پر یہ عہد کریں کہ اب کسی ایسے عقیدہ و خیال کو اختیار نہ کریں گے جو روحِ مذہب کے منافی اور نظامِ اسلام کو درہم برہم کر دینے والا ہو۔

یاد رکھئے! الٰہی ہدایتوں کا یہ سلسلہ جناب آدمؑ سے چلتے چلتے جناب ابراہیمؑ تک

پہنچا۔ انھیں مالکِ کائنات نے رسول بھی بنایا نبی بھی۔ قائد بھی بنایا امام بھی۔ خلّت کا شرف بھی بخشا اور بت شکنی کا اعزاز بھی۔ انھیں معمارِ کعبہ بھی بنایا اور معمارِ امّت بھی اور سب سے بڑا شرف یہ عنایت فرمایا کہ انھیں ایک پورے سلسلۂ ہدایت کا مرکز و مصدر بنا دیا اور دونوں بیٹوں کو نبوت و رسالت کے عہدوں سے سرفراز فرما کر ان کے اعزاز کو لاجواب بنا دیا۔

دنیا جانتی ہے کہ جناب ابراہیم کے دو فرزند تھے۔ ایک جناب اسمٰعیلؑ اور ایک جناب اسحٰقؑ۔ جناب اسمٰعیلؑ کی اولاد میں حضور سرورِ کائناتؐ ہیں اور جناب اسحٰق کی نسل میں سارے انبیاء بنی اسرائیل۔ جناب اسمٰعیلؑ نے راہِ خدا میں قربانی دی اور جناب اسحاقؑ نے امت کی نمائندگی کی لیکن ایک مسئلہ اس وقت پیدا ہو گیا جب قربانیٔ اسمٰعیلؑ بے اثر دکھائی دینے لگی اور نسلِ اسحاقؑ میں انبیاء کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ دنیا انگشت بدنداں تھی کہ جس نے راہِ خدا میں زندگی قربان کی، جس نے ایک خواب کی بنیاد پر گلے پر چھری کا چلنا گوارا کر لیا، جو نوجوانی کے عالم میں منزلِ ذبح میں لیٹ گیا اور آخری سانس تک جادۂ تسلیم و رضا سے نہیں ہٹا۔ جس کی قربانی کو خدا نے منسوخ کیا مگر خود اس کے پائے ثبات میں جنبش نہیں آئی۔ اس کی نسل میں جو بھی آتا ہے وہ غیر نبی آتا ہے جو بھی پیدا ہوتا ہے وہ غیر رسول ہوتا ہے۔ نہ کوئی کتاب آتی ہے نہ کوئی شریعت۔ نہ کوئی نبی آتا ہے نہ کوئی رسول۔ تو کیا یہ قربانیٔ اسمٰعیل بالکل بے قیمت ہے۔ کیا اس کی بارگاہ میں ایثار و وفا کا کوئی مرتبہ نہیں ہے۔ کیا اس نے قربانیٔ اسماعیلؑ کو رد کر دیا ہے۔ اگر ایسا ہے تو ہم بھی اسے بے قیمت سمجھیں اور اپنے ذہن سے قربانی کی عظمت کو نکال دیں۔

اور اگر ایسا نہیں ہے تو کیا وجہ کہ جسے شرف قربانی نہیں ملا اس کی پوری نسل کو نبی بنا دیا اور جس نے ایثار و قربانی کا مظاہرہ کیا اس کی نسل میں کوئی نبی و رسول نہیں آ رہا ہے۔ یہ مسئلہ زیر بحث تھا کہ ایک مرتبہ آوازِ قدرت آئی میرے بندے! پریشان نہ ہو۔ میرے کرم میں کوئی کمی نہیں ہے، میرے خزانۂ قدرت میں کوئی نقص نہیں ہے۔ میں کمالات کا قدرداں ہوں، میں ایثار و قربانی کی عظمتوں کو پہچانتا ہوں بس مصلحت کا انتظار کر رہا ہوں۔ وقت آنے پر میں اپنے کرم کا مظاہرہ کروں گا۔ میرا منشاء ہے کہ اس سلسلہ میں پہلی ہی منزل پر تجھے انتظار کا عادی بنا دیا جائے تاکہ آخری منزل پر انتظار میں کوئی زحمت نہ ہو۔

جن لوگوں نے کل نسل اسمٰعیل کے پہلے راہنما کا انتظار کیا تھا وہ آج آخری کا بھی کر رہے ہیں اور جو کل انتظار کے مخالف تھے وہ آج بھی انتظار کی مخالفت کر رہے ہیں۔ تو میں کہوں گا کہ کل جیسے جیسے نسل اسحٰقؑ کے انبیاء گزرتے جا رہے تھے انتظار شدید تر ہوتا جا رہا تھا کہ اب زمانہ قریب آگیا ہے۔ اب آنے والا آ رہا ہے اور چونکہ اس سلسلہ کے آخری پیغمبر جناب عیسیٰ تھے اس لئے سب سے زیادہ اس آخری وارث اسمٰعیلؑ پیغمبر کا انتظار انھیں کو رہا ہوگا اور وہ ہر لحظہ اس بات کے منتظر رہے ہوں گے کہ کب خدا اس وارث اسمٰعیل کو بھیجے اور میرے بعد آنے والا سلسلۂ اوصیاء تمام ہو اور دنیا پھر کسی نبی سے روشناس ہو۔ اور شاید جناب عیسیٰؑ کی یہی ادا قدرت کو پسند آگئی کہ اس نے آواز دی کہ اے عیسیٰ تم نے پہلی منزل پر انتظارِ شدید کا شرف حاصل کیا ہے تو آخری منزل پر بھی یہ شرف تمھیں کو عنایت کروں گا۔ آج بھی آسمان پر عیسیٰ انتظار کر رہے ہیں اور انشاءاللہ وہ وقت آئے گا جب نسل اسمٰعیل کا

آخری امام پردۂ غیب سے ظہور کریگا اور آسمان سے جناب عیسیٰؑ آکر اس کے پیچھے نمازِ جماعت ادا کریں گے۔ صلوات۔

عزیزانِ محترم! یہ غلط فہمی نہ ہو کہ جناب اسمٰعیلؑ کے بعد اگر ان کی نسل میں انبیاء و مرسلین نہیں آئے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ معاذ اللہ ان میں کوئی صاحبِ کردار اور صاحبِ ایمان نہیں تھا۔ یا کسی کی عظمت و جلالت میں کوئی نقص تھا۔؟ ہرگز نہیں! یہ سب اللہ والے تھے۔ سب کا ایمان توحیدِ پروردگار پر تھا۔ سب اپنے جد حضرت ابراہیمؑ کی ملت پر قائم تھے۔ فقط عہدوں کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا اور وہ اپنے وقت کا انتظار کر رہا تھا اور شاید یہی مصلحت رہی ہو کہ جیسے جیسا عہدہ دینا ہوگا اسکے لئے ویسا ہی زمانہ اختیار کیا جائے گا۔ اور قدرت یہ بتانا چاہتی ہو کہ جس سلسلے کو ختم کرنا ہے اس کی نسل کو منصب پہلے دیا جائے گا اور جس کی نسل کے اقتدار کو باقی رکھنا ہے اس کا سلسلۂ منصب بعد میں قائم کیا جائے گا۔ اور یہی وجہ ہے کہ نسلِ اسحاقؑ کی منصبی کرامت ختم ہوگئی اور نسلِ اسمٰعیلؑ کی شرافت آج تک قائم ہے۔ آپ یہ نہ خیال فرمائیں کہ نسلِ اسحاقؑ میں بھی تو جناب عیسیٰؑ زندہ موجود ہیں اور اُدھر بھی ایک نبی قائم و دائم ہے۔ اس لئے کہ جناب عیسیٰؑ کے وجود میں تو کوئی شبہ نہیں ہے۔۔۔ وہ مسلّماتِ اسلام و قرآن میں ہے لیکن ان کی حیثیتِ نبوت ختم ہو چکی ہے اور اب وہ ایک نمائندۂ پروردگار کی حیثیت سے نہیں ہیں۔ وہ مسلمانوں کے نبی و رسول نہیں ہیں ان کی کتاب منسوخ ہو چکی ہے ان کی شریعت ختم ہو چکی ہے۔ ان کا دور تمام ہو چکا ہے اور ان سب کی زندہ دلیل یہ ہے کہ اب جب وہ آئیں گے تو کسی صاحبِ شریعت کو نماز پڑھانے کے لئے نہیں آئیں گے اور جب صاحبِ شریعت۔ "وارثِ شریعت" کے پیچھے نماز پڑھ لے تو سمجھ لیجئے گا کہ ایک کی شریعت ختم ہو چکی ہے اور ایک کی شریعت باقی

ہے۔ ایک کے عہدوں کی میعاد ختم ہو چکی ہے اور ایک کا منصب تا قیامِ قیامت قائم ہے۔ صلوات۔

عزیزانِ گرامی! دامنِ وقت میں گنجائش نہیں ہے اور دامنِ تاریخ میں بھی اتنی وسعت نہیں ہے کہ نسلِ اسمٰعیلؑ کے ایک ایک فرد کی جلالت پر روشنی ڈالی جا سکے۔ البتہ یہ بات بآسانی کہی جا سکتی ہے کہ نسلِ اسحاقؑ میں نبوتوں کے سلسلہ کے خاتمہ پر اور جناب عیسیٰؑ کے آسمان پر چلے جانے کے بعد سے امت کی قیادت کا شرف زیادہ حصہ نسلِ اسمٰعیلؑ ہی میں رہا ہے اور یہی وہ افراد تھے جو جزیرۃ العرب میں قوم و ملت کی راہنمائی کا فرض انجام دیتے رہے تھے تقریباً پانچ سو سال تک اوصیاءِ جناب عیسیٰؑ۔۔ کون کون تھا اور فریضۂ ہدایت کس کس کے سپرد تھا اس کا تفصیلی تذکرہ تاریخ میں نہیں ہے لیکن اجمالاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ سلسلہ بہرحال قائم تھا اور زمین حجتِ خدا سے خالی نہیں تھی۔ اب وہ کون تھا جو اس فرض کو انجام دے رہا تھا اسکا کوئی مفصل تذکرہ نہیں ہے۔ البتہ اس دور میں جب اوصیاءِ جناب عیسیٰؑ کے تذکرے اور انکے تبلیغی کارنامے پردۂ راز میں تھے نسلِ اسمٰعیلؑ کے کارنامے منظرِ تاریخ پر نظر آ رہے تھے اور ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ قدرت اپنی نمائندگی اور امت کی قیادت و رہبری کا کام انہیں نمایاں افراد کے سپرد کر چکی ہے جیسا کہ بعض نسخوں میں اس کے بارے میں صراحت بھی ملتا ہے۔ اس وقت اس موضوع پر بحث کرنا مقصود نہیں ہے۔ صرف یہ بتانا ہے کہ نسلِ اسمٰعیلؑ کے کارنامے منظرِ تاریخ سے ہٹائے نہیں جا سکتے اور صفحۂ تاریخ پر جیتے جاگتے ہیں۔ وہ جنابِ قصی بن کلاب جنہوں نے عرب کو قیادت کا سلیقہ سکھایا اور مختلف خداؤں میں بٹی ہوئی قوم کو اجتماعی شعور دیا۔ دنیا کو جینے کا انداز سکھایا اور ذلت کے گڑھے میں پڑی ہوئی قوم کو عزت کا احساس بخشا۔ اسی نسلِ اسمٰعیلؑ میں تھے جناب قصی کے نمایاں کارنامے دامنِ تاریخ میں محفوظ ہیں۔ ان کو دیکھنے کے بعد یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ وہ تاریکی کے دور میں منارۂ ہدایت

تھے اور جاہلیت کی فضا میں علم و عمل کی شمع روشن کئے ہوئے تھے۔

جناب قصیٰ کے بعد ان کے فرزند جناب عبد مناف کا کردار ہے جن کے ظاہری حسن و جمال کا یہ عالم تھا کہ انھیں "قمر بطحیٰ" کہا جاتا تھا اور باطنی وجاہت و شرافت کے اعتبار سے شعراء یہ اشعار نظم کیا کرتے تھے کہ جب مسافر کو کوئی میزبان نہ ملتا ہو وہ عبد مناف کے گھر چلا جائے، فقیر سے امیر ہو جائیگا اور نادار سے دولتمند بنکر واپس آئے گا۔ جناب عبد مناف نے اپنے ماں باپ کی نیابت میں عرب کی سرداری سنبھالی اور خانۂ کعبہ کی تولیت کا کام انجام دیا۔ تاریخ اسلام گواہ ہے کہ اجتماعی زندگی اور منظم حکومت کا شعور سب سے پہلے حضور سرور کائنات کے جد اعلیٰ جناب قصیٰ نے دیا ہے اور اس شعور کو کمال پختگی کا شرف جناب عبد مناف نے بخشا ہے۔

جناب عبد مناف کے بعد ان کے فرزند جناب ہاشم کا دور آتا ہے۔ جن کے کردار کی بلندی کے لئے یہ کافی ہے کہ ان کا نام ہاشم تھا نہیں ہو گیا تھا، ہاشم کے معنی چور چور کرنے اور ٹکڑے کرنے والے کے ہیں۔ آپکے اس لقب کا راز یہ تھا کہ جب عرب میں قحط پڑا تو آپ سفر تجارت پر گئے ہوئے تھے۔ جیسے ہی آپ کو اطلاع ملی کہ ملک میں قحط پڑا ہوا ہے فوراً واپس آگئے اور سارا آٹا روٹی کی شکل میں تبدیل کر کے اسے چور کر کے عرب کی لذیذ ترین غذا تیار کی اور ساری قوم کو کھلا دیا۔ تاکہ خلقت خدا بھوکی نہ رہے۔ انسانوں کا کیا ذکر، ہواؤں میں اڑتے ہوئے پرندے بھی آپکے کرم سے محروم نہ تھے اور ان کی غذا کا بھی بندوبست فرما دیا کرتے تھے۔ تحریری معاہدوں کا سنگ بنیاد جناب ہاشم ہی نے رکھا۔ جب آپ سفر تجارت پر گئے اور قیصر روم سے تعلقات قائم ہو گئے تو آپ نے پہلا کام یہ انجام دیا کہ ملک کے تاجروں پر سے سرکاری ٹیکس اٹھا لے اور انھیں سفر کی سہولتیں فراہم

کرنے کا معاہدہ کر لیا۔ جناب ہاشم کے اس احسان کو دنیا عربیت نظر انداز نہیں کر سکتی اور بالخصوص انسان کو یہ احساس ہے کہ آپنے اس معاہدے سے عرب کی تجارت کو منزل عروج تک پہنچا دیا ہے۔

جناب ہاشم کے فرزند اور جانشین جناب عبد المطلب تھے جو حضور سرور کائنات کے جد بزرگوار تھے اور جن کی عظمت اس وقت تک یادگار رہے گی جبتک دامن قرآن میں سورۂ فیل محفوظ ہے اور صفحۂ تاریخ پر ابرہہ کا واقعہ ثبت ہے۔

اس واقعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ ہاشمی خاندان کی قیادت میں خانہ کعبہ کی بڑھتی ہوئی شہرت و عظمت نے ابرہہ کو بے چین کر دیا اور اس نے دیکھا کہ عقیدۂ توحید مسلسل ترقی کر رہا ہے اور دنیا خانہ کعبہ کے گرد جمع ہو رہی ہے۔ اسے یہ مرجعیت و مرکزیت نہ دیکھی گئی اور اس نے اپنے شہر میں ایک عظیم الشان گرجا بنوا دیا۔ تاکہ لوگ خانۂ کعبہ کے بجائے اس کا طواف کریں اور کعبہ کی مرکزیت ختم ہو جائے لیکن چند ہی دنوں میں دیکھا کہ اللہ کا بنایا ہوا گھر اور ہے اور بندے کا بنایا ہوا گھر اور ـــ اتنا زر صرف کرنے کے بعد بھی دنیا ادھر متوجہ نہ ہوئی تو بالآخر یہ طے کیا کہ اس خانۂ کعبہ کو گرا دیا جائے اس کی تعمیر کو تباہ و برباد کر دیا جائے تاکہ لوگ ادھر سے فرصت پا کر ادھر متوجہ ہوں اور اس عزم کے ساتھ ہاتھیوں کا ایک لشکر لے کر مکہ کی طرف روانہ ہوا۔ منزلیں طے کر کے قریب مکہ پہنچا تو آبادی کے قریب پہنچ کر اس کے لشکر نے پہلا کام یہ کیا کہ اہل مکہ کے تمام جانور پکڑ لئے اور جناب عبد المطلب کے اونٹ بھی گرفتار کر لئے، تاکہ اہل مکہ مرعوب ہو جائیں اور کسی قسم کے مقابلہ کی تاب نہ لا سکیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ابرہہ کے اس ارادۂ عزم میں خانۂ کعبہ کا بھی

بھی کوئی قصور تھا؟ اس نے بھی کسی کا کچھ بگاڑا تھا کہ اس کے منہدم کرنے کا ارادہ کر لیا گیا؟ دنیائے اسلام جواب دیگی کہ نہیں! یعنی کعبہ کی تاریخ اس بات کو واضح کر رہی ہے کہ باطل بے قصور بھی اہلِ حق کو تباہ کر دینا چاہتا ہے اور جب باطل حق کے مقابلہ میں اپنی کمزوری اور ذلّت کا احساس کرتا ہے تو اس کے پاس ایک ہی حربہ رہ جاتا ہے کہ وہ حق کو تباہ و برباد کر دے تاکہ باطل کو فروغ حاصل ہو اور لوگ حق کی طرف سے منحرف ہو جائیں لیکن یہ بھی تاریخ کا ایک فیصلہ ہے کہ حق بہرحال زندہ رہتا ہے اور باطل بہرحال فنا ہو جاتا ہے۔ دنیائے اسلام اس واقعہ سے سبق لیتی تو بیت اور اہلبیتؑ کے رابطہ کو سمجھ لیتی۔ ابرہہ نے بیت کے مقابلہ میں بیت بنایا اور دنیا نے اہلبیتؑ کے مقابلہ میں افراد تیار کیے۔ ادھر بیت کی عظمت نہ گھٹ سکی تو اسے منہدم کرنے کا ارادہ کیا گیا اور ادھر اہلبیتؑ کے وقار میں فرق نہ آیا تو انہیں قتل کرنے کی سازش کی گئی لیکن خدا کا کرم ہے کہ دونوں کی جلالت محفوظ رہی اور آج بیت و اہلبیتؑ دونوں کے دشمن صفحۂ ہستی سے فنا ہو چکے ہیں مکہ معظمہ میں بیت محفوظ ہے۔ اور پردۂ غیب میں اہلبیتؑ موجود ہے۔ صلوات،

جناب عبدالمطلب کو اس واقعہ کی اطلاع ملی تو آپ ابرہہ کے دربار میں گئے اس نے نہایت ہی احترام سے بٹھایا اور یہ دلیل ہے کہ جناب عبدالمطلب کی جلالت سے دشمن بھی مرعوب تھے۔ پوچھا کہ عبدالمطلب آپ نے کیوں زحمت کی؟ آپ نے فرمایا کہ تیرے لشکر والوں نے میرے اونٹ پکڑ لئے ہیں۔ میں انہیں واپس لینے آیا ہوں۔ ابرہہ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ کہنے لگا۔ عبدالمطلب، میں تمہیں بڑا بلند نفس اور اللہ والا سمجھتا تھا۔ تم خانہ کعبہ کے متولی اور حرمِ خدا کے محافظ تھے مگر بڑے افسوس کی بات ہے کہ تمہیں اپنے اونٹ یاد رہ گئے اور اپنے خدا کا گھر یاد نہ آیا کہ اس کے

بارے میں مجھ سے سفارش اور التماس کرتے۔ جناب عبدالمطلب نے تیور بدل کے ارشاد فرمایا۔ ابرہہ! ان اونٹوں کا مالک میں ہوں، ان کی فکر مجھے ہے۔ اور اس گھر کا مالک کوئی اور ہے جو اسے بہرحال بچائے گا تو اب میری کیا ضرورت ہے؟

لہجہ کا سکون و اطمینان، ایمان و عقیدہ کے استحکام کی غمازی کر رہا تھا کہ اگر آج خدانخواستہ کسی بیت اللہ پر حملہ ہو جائے اور مسلمان یہ کہہ کے الگ ہو جائیں کہ جس کا گھر ہے وہ خود بچائے گا تو سب انہیں اسلام سے خارج کر دیں گے اور ان پر بے حسی کا الزام لگائیں گے کہ خانۂ خدا کا تحفظ واجب ہے اور یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ اس کے گرانے والے پر عذابِ خدا ہی نازل ہو جائے جب کہ خود اسی خانۂ کعبہ پر دورِ یزید میں حملہ ہوا لیکن نہ کوئی آسمانی لشکر آیا اور نہ کوئی عذاب نازل ہوا۔ تو پھر جناب عبدالمطلب کو یہ کہہ کر الگ ہو جانے کا کیا حق تھا اور ان کی یہ علیحدگی کس طرح قابلِ تعریف ہو گئی۔ اس منزل پر ایک لمحہ ٹھہر کر سوچنا پڑے گا اور ایمان کی عزت و پختگی کا اندازہ لگانا پڑے گا کہ اگر آج مسلمانوں کو یہ کہنے کا حق نہیں ہے اور اس کے کہنے کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا ہے کہ اس کے اعلان پر عذابِ الٰہی نازل ہو جائے تو کل جناب عبدالمطلب نے یہ کیوں کہا اور عذابِ الٰہی کیسے نازل ہو گیا۔ اور عذاب بھی کیسا کہ ابابیل کا لشکر آیا اور کنکریاں پھینک کر ہاتھیوں کو مع سواروں کے تباہ و برباد کر دیا۔ اتنے مختصر سپاہی اور اتنے گرانڈیل جانور۔ لیکن جب اُدھر والا حملہ آور ہوتا ہے تو ادھر والوں کے قد و قامت کام نہیں آتے اور سب فنا کے گھاٹ اُتر جاتے ہیں۔

یاد رکھئے! ابابیل اور اصحاب فیل کے واقعہ کو نگاہ میں رکھنے والے مسلمان کو کوئی حق نہیں ہے کہ وہ سپر پاور اور بڑی طاقتوں سے مرعوب ہو جائے۔ خدا بڑی طاقت کو چھوٹی طاقت کے ذریعہ ہی فنا کرتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ چھوٹی طاقت کا رشتہ خدا سے ہو ناخدا سے نہ ہو۔ صلوات،

جناب عبدالمطلب کے طرز عمل کو دیکھنے کے بعد دو ہی باتیں کہی جا سکتی ہیں کہ یا تو عبدالمطلب کی نگاہ اتنی دوربیں تھی کہ وہ آنے والے عذاب کو دیکھ کر اس کی خبر دے رہے تھے اور اپنے علم غیب کا اعلان کر رہے تھے یا ان کے بیان میں اتنا وزن تھا کہ جب کہدیا تو عذاب الٰہی نازل ہو گیا۔ دونوں ہی صورتوں میں ماننا پڑیگا کہ نسل اسمٰعیلؑ میں نبوت کے نہ ہونے کے باوجود ایسے بلند کردار افراد موجود تھے، جن کی باتوں پر آسمانوں میں انقلاب برپا ہو جاتا تھا۔ اور جن کے الفاظ سے عذاب الٰہی کھنچ کر آ جاتا تھا۔ صلوات،

جناب عبدالمطلب کے بعد ان کے فرزند جناب ابوطالب اور جناب عبداللہ کا کردار سامنے آتا ہے۔ جناب عبداللہ کے بارے میں اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ جناب عبدالمطلب نے یہ نذر کی تھی کہ اگر اللہ نے مجھے دس بیٹے عنایت کئے تو میں ایک بیٹا اس کی راہ میں قربان کر دوں گا۔ یہ جذبہ خود آواز دے رہا ہے کہ نسل اسمٰعیلؑ میں جذبۂ قربانی موروثی طور پر چلا آ رہا ہے اور اس میں کوئی نقص نہیں پیدا ہوا۔ حسن اتفاق کہ معبود نے دعا کو قبول کر لیا۔ اور جب نذر پورا کرنے کا وقت آیا تو قرعہ جناب عبداللہ کے نام نکلا۔ چاند سے فرزند کی قربانی کا مسئلہ بہت سخت تھا لیکن عبدالمطلب تیار ہو گئے اور شاعر نے جذبات وفا کی طرف شب عاشور کے حالات کے ذیل اس طرح اشارہ کیا کہ ـــ

حق کیلئے حصار وفا گھیرتے ہیں ہم ⁂ بیٹے کے بھی گلے پہ چھری پھیر دیتے ہیں ہم

لوگوں نے جناب عبدالمطلب سے اصرار کیا کہ اے وارث اسمٰعیلؑ کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ فدیہ دیدیجئے۔ اور چاند سے فرزند کو بچا لیجئے۔ جناب عبدالمطلب تیار ہو گئے اور طے پایا کہ دس اونٹوں کو فدیہ قرار دیکر قرعہ ڈالا جائے۔ قرعہ ڈالا گیا۔ جناب عبداللہ کے نام نکلا۔ دوسری مرتبہ اونٹ بڑھا کر بیس کر دیئے گئے۔ لیکن قرعہ انھیں کے نام نکلا۔ پھر تیس کئے گئے مگر انھیں کا نام نکلا۔ اور اس طرح دس دس کرکے سو تک نوبت پہنچی۔ اور آخری مرتبہ قرعہ اونٹوں پر نکل آیا جس سے جناب عبداللہ کی جان بچ گئی۔ سو اونٹ راہ خدا میں قربان ہو گئے اور اسلام نے اپنے دور شریعت میں اسی مقدار کو جان کا فدیہ قرار دیدیا۔ کل ابراہیمؑ نے دنبہ ذبح کیا تھا تو قربانی فرض ہو گئی اور آج عبدالمطلب نے سو اونٹ ذبح کئے تو وہی نفس کا بدل بن گیا۔ یہ ہے عظمت کردار کہ جو مرتبہ خلت کے بعد ابراہیمؑ کو ملا تھا وہی مرتبہ آج عبدالمطلب کو حاصل ہو رہا ہے۔ صلوات،

یہیں سے نفس عبداللہ کی قدر و قیمت کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ نگاہ قدرت میں ان کا مرتبہ کتنا عظیم اور بلند تھا۔ لیکن ان تمام باتوں اور اتنی عظیم اور بلند شخصیتوں کے باوجود سماج کا عالم دگرگوں تھا۔ عالم عربیت ایک گہری جہالت میں ڈوبا ہوا تھا عقیدہ، اخلاق، اجتماع، اقتصاد، سماج، فرد، تہذیب، تمدن کوئی ایسا مرحلہ نہیں تھا جہاں انھیں انسان کہا جا سکتا ہو۔ پورا سماج سراپا انتشار بنا ہوا تھا

پروردگار! کب تک یہ بت پرستی ہوتی رہے گی اور کب تک خلیل کی یادگار برباد ہوتی رہیگی۔ معبودا! کب تک یہ شراب نوشی اور عیاشی کا رواج رہیگا۔ کب تک لوگ غلام اور کنیز بنتے رہیں گے۔ کب تک سود کے ذریعہ غریبوں کا خون چوسا جائیگا۔ کب تک جوئے کے نام پر

حرام خوری ہوگی۔ کتنی بیٹیاں زندہ دفن ہوں گی۔ کتنی ماں بیٹے کیلئے ترکہ و میراث بنی رہیگی کتنے بھائی بھائی کا خون بہاتا رہے گا۔ کتنے سرِ راہ قافلے لٹتے رہیں گے۔ کتنی انسانیت کا خون ہوتا رہیگا۔ کتنی تہذیب بیجان اور تمدن بے روح بنا رہے گا۔ کتنی حیا و غیرت کا نیلام ہوتا رہیگا۔ کتنی شرافت سرِ بازار عریاں ہوتی رہے گی۔ کتنی عزت بکتی رہیگی۔ اور کتنی انبیاء کی ریاضت سکتے کے عالم میں پڑی رہے گی۔ کیا یہ سماج قابلِ رحم نہیں ہے۔ کیا یہ معاشرہ کسی مہربانی کا حقدار نہیں ہے۔ کیا قربانیٔ اسمٰعیلؑ کوئی منصب نہیں چاہتی۔ کیا سلسلۂ ہدایت و ارشاد کو قیامت تک نہیں چلنا ہے۔؟

ندائے قدرت آئی۔ میرے بندے ذرا انتظار کر۔ میں نے رحم و کرم کو روک رکھا ہے کہ مسلسل بارش سے پانی کی قدر و قیمت گھٹ جاتی ہے اور لوگ بارشِ رحمت کو بھی زحمت سمجھنے لگتے ہیں۔ لیکن جب تھوڑی پانی رک جاتا ہے اور چند روز تک بارش نہیں ہوتی تو ہوا کے حبس اور فضا کی گھٹن ہی کو دیکھکر بارش کی دعائیں ہونے لگتی ہیں اور پھر ایک ایک قطرۂ آب کو دُرِّ آبدار کا مرتبہ دیا جاتا ہے۔ بیسے عیسیٰ کے بعد نبوت کو اسی لئے روک لیا تھا کہ انسانوں کو نبی کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو جائے اور انھیں یہ معلوم ہو جائے کہ بظاہر انبیاء نہیں رہتے ہیں تو سماج کا کیا عالم ہوتا ہے اور جب یہ احساس بیدار ہو گیا اور ساری کائنات فریاد طلب ہو گئی ہے تو دیکھا وہ مکہ سے ایک گھٹا اٹھ رہی ہے۔ وہ خانۂ عبدالمطلب سے ابرِ گوہر بار اٹھ رہا ہے۔ وہ ربیع الاوّل کی صبح کو خاتمیت کا ابرِ گہر بار بارشِ رحمت کر رہا ہے۔ وہ دنیا جل تھل ہو رہی ہے۔ وہ کھیتیاں ہری بھری ہو رہی ہیں۔ وہ سبزہ لہلہا رہا ہے۔ وہ ریاضتِ انبیاء کام آ رہی ہے۔ وہ قربانیٔ اسمٰعیل گل کھلا رہی ہے۔ وہ نسلِ ابراہیم پر بہار آ رہی ہے۔ وہ باغِ رسالت

کا آخری پھول کھل رہا ہے۔ اور خارزارِ عالم کو دائمی گلزار بنا رہا ہے صلوات۔

۱۷ ربیع الاوّل کی صبح کیا سعادت نشان صبح تھی جب گلزارِ خلیلی میں بہار آ رہی تھی اور آمنہ کی گود میں عرب کا چاند چمک رہا تھا۔ قصرِ کسریٰ کے چودہ کنگرے گرتے ہوئے آواز دے رہے تھے کہ چودہ انوارِ حق کا حامل آ رہا ہے بحرِ ساوہ خشک ہو کر پکار رہا تھا کہ اس کی سخاوت کے سامنے دریا میں مجالِ روانی نہیں ہے۔ آتش کدہ فارس گل ہو کر آواز دے رہا تھا کہ ایک وارثِ خلیل آ رہا ہے۔ کائنات میں انقلاب برپا تھا۔ روحِ تہذیب و تمدن رقص کر رہی تھی۔ اسلام سرفراز ہو رہا تھا کفر کی بستی میں ایک کھلبلی مچی تھی اور عالمِ بالا میں جشنِ مسرت منایا جا رہا تھا۔

آنے والا اوّل مخلوقات ہونے کے باوجود اتنی دیر میں آ رہا ہے اور اسے اوّل کے بجائے آخر بنایا جا رہا ہے۔ یہ ایک لمحۂ فکریہ ہے لیکن اس کا واضح سا جواب یہ ہے کہ جتنی بڑی شخصیت کو آنا ہوتا ہے ویسا ہی انتظام کیا جاتا ہے معمولی حکام کی آمد کا انتظام چند لمحہ قبل شروع ہو جاتا ہے اور بڑی شخصیت کی آمد کا اہتمام چند روز اور چند ماہ قبل سے ہوتا ہے۔ مالکِ کائنات اپنے آخری حبیب صاحبِ معراج کو بھیجنے والا تھا۔ اس نے پہلے تمہید میں انبیاء کو بھیجا تاکہ زمین ہموار کریں۔ اس کے بعد اوصیاء کا سلسلہ قائم کیا کہ قوم قبولِ احکام کیلئے تیار ہو جائے۔ اس کے بعد مخصوص برگزیدہ بندوں کو مقرر کیا کہ وہ اپنے کردار سے قبولِ ہدایت کیلئے ذہن تیار کریں۔ اور اس طرح جب پورا ماحول تیار ہو گیا تو اپنے محبوب کو عرشِ اعظم سے فرشِ مکہ پر اتارا اور اس شان سے اتارا کہ گویا آدم صفوت لیکر آ رہے ہیں۔ نوح نہ ہمیت آ رہے ہیں۔ ابراہیم خلت و دوش آ رہے ہیں۔ موسیٰ تکلم بدست آ رہے ہیں۔ عیسیٰ مردہ جلاتے ہوئے

آرہے ہیں۔ قصیٔ تاجِ سیادت پہنے ہوئے آرہے ہیں۔ عبد مناف کلیدِ کعبہ لئے ہوئے آرہے ہیں۔ ہاشم سخاوتوں کے دریا بہا رہے ہیں۔ عبدالمطلب جذبۂ قربانی کی معراج دیکھ رہے ہیں۔ عبداللہ شانِ بندگی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ اور معراج کی رات کا دُولھا خزانۂ عرش سے زمینِ مکّہ کی طرف آ رہا ہے۔

دنیا کا قاعدہ ہے کہ جب کسی بڑی شخصیت کو آنا ہوتا ہے تو اس کے شایانِ شان انتظامات بھی کئے جاتے ہیں اور اسی مناسبت سے کئے جاتے ہیں کہ ان کو دیکھنے والا دُور ہی سے اندازہ کرلے کہ یہاں کیا ہونے والا ہے اور کون آنے والا ہے۔ سیاسی شخصیتوں کے لئے انتظام الگ ہوتا ہے اور مذہبی شخصیت کے لئے الگ۔ علم والوں کا انتظام اور ہوتا ہے اور دولت والوں کا اہتمام اور۔ صاحبانِ فن اس نکتہ سے باخبر ہیں اور اسی اعتبار سے انتظام بھی کرتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ مالکِ کائنات نے اپنے محبوب کو بھیجنے کیلئے کیا اہتمام کیا؟ جس سے آپ کی شخصیت کا بھی اندازہ ہو اور آپ کے مقاصدِ عالیہ کا بھی انکشاف ہو جائے۔ وُہ اسمٰعیل سے جنابِ عبداللہ تک مسلسل صاحبِ ایمان و کردار کا آنا اور اپنے اپنے طور پر دینِ خدا کی حفاظت کرنا دلیل ہے کہ آنے والا عظیم شخصیت اور بلند ترین متروکات کا وارث ہے اور اسے جملہ تبرکات کا حامل بنا کر بھیجا جا رہا ہے اور مقاصد کے اعتبار سے بھی عجیب و غریب انتظام ہے اور ایسا بلند انتظام ہے جسے انسان دُور سے دیکھتے ہی اندازہ کرلے کہ آنے والے کے عزائم و مقاصد کیا ہیں؟ اور وہ کن اقدار و مفاہیم کو پھیلانے کے لئے آرہا ہے۔

اسلام دو عظیم رشتوں کا جامع مذہب ہے۔ ایک خالق و مخلوق کا رشتہ

اور ایک مخلوق و مخلوق کا رشتہ۔ اس کے احکام انھیں دو رشتوں کے جامع اور اس کے دین کی وسعت و ہمہ گیری انھیں دونوں رشتوں سے وابستہ ہے۔ اس کا مقصد پہلے رشتہ سے یہ ہے کہ روئے زمین کا ایک ایک بسنے والا بارگاہِ بے نیاز میں سرِ تسلیم جھکا دے اور دنیا میں انسانیت عبادِ خدا بن جائے اور دوسری منزل میں اس کا مقصد قیامِ امن ہے اور وُہ یہ چاہتا ہے کہ بندے آپس میں اس طرح زندگی گزاریں کہ امن و امان قائم رہے اور کسی طرح کا فساد و خلل نہ ہونے پائے۔

بانیٔ اسلام انھیں دونوں مقاصد کی تکمیل کیلئے آرہا ہے۔ قدرت نے چاہا کہ اسے ایک ایسے ماحول میں بھیجا جائے کہ ہر دیکھنے والا دونوں مقاصد کا اندازہ کرلے۔ اس نے ایک ظرف جنابِ عبداللہ کا صلب اختیار کیا اور دوسرا ظرف جنابِ آمنہ کا بطنِ اطہر۔ صلبِ عبداللہ آواز دے رہا ہے کہ آنے والا عبدیت کا علمبردار بن کر آرہا ہے اور آمنہ کے بطنِ اقدس کا اشارہ ہے کہ آنے والا امنِ عالم کا ذمہ دار بن کر آرہا ہے۔ اب اگر صحیح زندگی گزارنا ہے تو اسی عبدیت کا سبق بھی لینا اور امن و امان کا بھی۔ عبدیت چھوڑ دو گے تو خدا سے مایوس ہو جاؤ گے اور امن و امان کا لحاظ نہ کرو گے تو سماج میں زندہ نہ رہ سکو گے۔ زندہ رہنا ہے تو عبداللہ کے لال کا کلمہ پڑھنا اور سکون و اطمینان سے زندگی گزارنا ہے تو آمنہ کی گود کے پالے کی آغوشِ محبت میں پناہ لینا۔ صلوات،

مرسلِ اعظم اس دنیا میں آئے اور یہ اعلان کرتے ہوئے آئے کہ جب زمانہ فسق و فجور سے بھر جاتا ہے۔ جب انسانی قدریں پامال ہونے لگتی ہیں جب لامذہبیت اور الحاد کا دور دورہ ہوتا ہے جب ظلم و جور عوام سے حکام تک عام ہو جاتے ہیں تو رب کریم اپنی رحمت کاملہ ایک محمدؐ کو بھیج دیتا ہے اور اس کے ذریعہ کائناتِ ظلم کو منقلب کر دیتا ہے اور یہ اشارہ ہے کہ جس طرح پہلے دورِ ظلم میں پہلے محمدؐ کو بھیجا تھا اسی طرح آخری دورِ ظلم و جور میں آخری محمدؐ کو پردۂ غیب سے باہر لائے گا۔ صلوات۔

جنابِ فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا

اسمِ مبارک	:	فاطمہؑ ،
لقب	:	زہرا، بتول، صدیقہ وغیرہ ،
کنیت	:	ام الائمہ ، اُم ابیہا ،
والد ماجد	:	حضرت محمد مصطفےٰ ؐ ،
والدۂ ماجدہ	:	جناب خدیجہؑ ،
ولادت	:	۲۰ر جمادی الثانیہ ۵ بعثت، مکہ معظمہ
اولاد	:	امام حسنؑ، امام حسینؑ، جناب زینب، جناب ام کلثوم، جناب محسنؑ
شہادت	:	۱۳ر جمادی الاولیٰ ۱۱ ہجری یا ۳ جمادی الثانیہ ۱۱ ہجری مدینہ منورہ ،
عمرِ مبارک	:	۱۸ر سال ،
قبرِ مطہر	:	بین قبر و منبرِ رسولؐ یا جنت البقیع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید الاولین والآخرین خاتم النبیین سیدنا ومولانا ابی القاسم محمد آل الطیبین الطاہرین ولعنۃ اللہ علی اعدائھم اجمعین

اما بعد فقد قال اللہ الحکیم فی کتابہ الکریم ۔بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِنَّ عَلَیۡنَا لَلۡہُدٰی وَ اِنَّ لَنَا لَلۡاٰخِرَۃَ وَ الۡاُوۡلٰی

مالک کائنات کا ارشاد ہے کہ "بیشک ہدایت کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے اور دنیا و آخرت کا اختیار ہمارے ہاتھوں میں ہے۔"

آیت کریمہ کا اندازہ بتارہا ہے کہ مالک کائنات نے ہر دور میں ہدایت کا انتظام اپنے ہاتھوں میں رکھا ہے اور کبھی بندوں کو یہ اختیار نہیں دیا کہ وہ اپنے ہادی اور راہنما کا انتخاب خود کریں۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء گذر گئے لیکن کسی ایک نبی کا تقرر قوم کے ہاتھوں میں نہیں رکھا گیا۔ اور نبی تو بڑی چیز ہے وصی نبی بھی قوم کی طرف سے مقرر نہیں ہوا۔ اور قوم کا کیا ذکر ہے خود نبی کو بھی یہ اختیار نہیں دیا گیا کہ اپنا وصی خود مقرر کرلے۔

جناب موسیٰ کا واقعہ قرآن مجید میں موجود ہے کہ جب حکم خدا سے فرعون کی ہدایت و راہنمائی کے لئے اٹھے تو عرض کرتے ہیں۔ پروردگار میں اکیلا ہوں۔ میری زبان بھی اتنی فصیح نہیں ہے جتنی فصیح زبان اس راہ میں درکار ہے۔ میرے حالات تجھے معلوم ہیں۔ معبود! میری مضبوطی کے لئے میرے بھائی ہارون کو میرا وزیر بنادے۔ انہیں میرے کارِ تبلیغ میں شریک کردے تاکہ ہم ایک کے بجائے دو ہو کر تیرے دین کی تبلیغ کریں۔ اور شاید فرعون پر اثر انداز ہوسکیں۔

موسیٰؑ کی دعا بارگاہ احدیت میں قبول ہوئی۔ ہارونؑ وزیر بنے۔ کار تبلیغ میں شریک ہوئے۔ فرعون کے دربار تک گئے۔ پیغام الٰہی پہنچایا۔ فرعون نے انکار کیا۔ ان سارے واقعات سے بحث کرنا مقصود نہیں ہے۔ بحث صرف اتنی ہے کہ جب جناب موسیٰؑ نے نام تک معین کر دیا تھا تو دعا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ خود ہی ہارونؑ کو اپنے ساتھ لے گئے ہوتے اور اگر دعا ہی کرنا تھی اور خدا ہی سے وزیر مانگنا تھا تو ہارونؑ کا نام نہ لیا ہوتا۔ اس کی مصلحت ہوتی تو ہارونؑ ہی کو مقرر کر دیتا ورنہ کسی اور کو ساتھ کر دیتا ___ یہ عجیب انداز دعا ہے کہ نام ونسب تک معین کر دیا ___ اور پھر دعا بھی کر رہے ہیں۔ جناب موسیٰؑ جواب دیں گے میں رہتی دنیا تک کے لئے ایک تقریر مقرر کئے دے رہا ہوں کہ مجھے اہلیت کا علم ہے اور ایسا علم ہے کہ خدا نے بھی اس سے انکار نہیں کیا لیکن اس کے باوجود میں نے دعا ہی کی ہے تقرر نہیں کیا۔ اب تم ہوشیار رہنا کہ وصی و وزیر کا تقرر صرف خدا کے ہاتھ میں رہے۔ امت کے ہاتھ میں نہیں اور اتنا تو سوچنا کہ جو کام نبی نہ کر سکے اسے امت کیا کرے گی ___ صلوات

یہ تبلیغ کے آغاز کی منزل ہے اور جناب موسیٰؑ اس قدر خاموش ہیں کہ ہارونؑ کے بغیر قدم اٹھانے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ میں کہوں گا جناب موسیٰؑ! حکم خدا ہے تو آگے بڑھئے۔ جب مہم کامیاب نہ ہوگی۔ اور مخالفتوں کا طوفان اٹھے گا تو کسی کو ساتھ لے لیجئے گا۔ ابھی تو پہلی ہی منزل ہے۔ ابھی سے کیا پریشانی ہے۔ کچھ دن تو کام کیجئے ورنہ دنیا کیا کہے گی کہ بغیر وصی و وزیر کے ایک قدم آگے نہ بڑھ سکے۔ اور اس طرح آپ کامیاب ہو گئے تو دنیا کو یہ کہنے کا موقع مل جائے گا کہ موسیٰؑ کا کوئی کمال نہیں تھا۔ وہ تو ہارونؑ تھے جنھوں نے مقصد کو کامیاب بنا دیا ورنہ ان کی زبان میں نہ فصاحت تھی اور نہ ان کی تبلیغ میں دم ___

جناب موسیٰؑ آواز دیں گے۔ مجھے یہ سب کچھ برداشت ہے۔ جس کا جو دل چاہے کہہ لے۔ لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ دنیا یہ سمجھ لے کہ موسیٰؑ جیسا پیغمبر بھی وصیؑ و وزیر کی مدد کے بغیر راہ تبلیغ میں قدم آگے نہیں بڑھاتا۔ اب جسے ہوش ہوگا وہ خود سمجھ لے گا کہ وزارت کا کام تبلیغ کے خاتمہ پر نہیں ہوتا ___ تبلیغ کے آغاز میں ہوتا ہے اور امت محمدیہ کو تو اتنا اور بھی معلوم ہونا چاہئے کہ پیغمبر آخرؐ نے خود اپنے کو بھی موسیٰؑ ہی سے تشبیہ دی ہے۔ گویا پیغمبرؐ اعلان کرنا چاہتے ہیں کہ نہ کل موسیٰؑ نے وزیر کے بغیر کار تبلیغ شروع کیا تھا اور نہ آج میں اپنے ہارونؑ کے بغیر تبلیغ کا کام شروع کروں گا۔ اور یاد رکھو غدیر خم تمھارے لئے ہے۔ پیغمبرؐ کے لئے نہیں۔ پیغمبرؐ نے تو دعوت ذوالعشیرہ ہی میں موسیٰؑ کی تاریخ دہرا دی تھی کہ جب تک مددگار نہ مل جائے گا۔ کار تبلیغ شروع نہ کروں گا۔ اور قدرت کا بھی اشارہ تھا کہ پیغمبرؐ! تم ۴۰ سال خاموش بیٹھے رہو یہ گوارا ہے۔ لیکن بغیر ناصر و مددگار کے کام شروع کر دو یہ گوارا نہیں ہے۔ اب یہ جا کر قدرت سے پوچھا جائے کہ پروردگار کیا قوم میں کوئی ایسا نہیں تھا۔ جو پیغمبرؐ کا مددگار اور دین کا ذمہ دار بن سکتا۔ آخر کچھ پیغمبرؐ کے ہمسن یا بڑے بھی تو رہے ہوں گے۔ انھیں کے اعتماد پر اعلان کرا دیا ہوتا۔ آواز آئے گی۔ مجھے سن و سال درکار نہیں ہے، علم و کمال درکار ہے۔ جب تک وہ نہ آئے گا جو پیغمبرؐ کے علم کا دروازہ اور کمال کا وارث ہوگا۔ رسالت کا اعلان نہ ہوگا۔ رسالت و توحید کا اعلان رک سکتا ہے۔ لیکن اس کی شخصیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اب یہ امت کو فیصلہ کرنا ہوگا کہ جو اسلام اسے نظر انداز کر کے آگے بڑھے گا اس کا توحید و رسالت سے کیا رشتہ ہوگا، یا دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ قدرت ۴۰ سال تک پیغمبر کو روکے رہی کہ جب تک "علیؑ ولی اللہ" کا اہتمام نہ ہو جائے گا۔ "لا الٰہ الا اللہ"

اور محمدؐ رسول اللہ" کا اعلان بھی نہ ہوگا۔ اب یہ امت کو اختیار ہے کہ خدائی
دین پر قائم رہے یا اس سے الگ ہو جائے ــــ اور میں تو یہ کہتا ہوں کہ یہ بھی
قدرت کا ایک انتظام تھا کہ جس طرح آغاز میں رسالت رکی رہی کہ جب تک
ولایت کا اعلان نہ ہوگا رسالت کا اعلان بھی نہ ہوگا۔ اسی طرح انجام میں قیامت
بھی رکی ہوئی ہے کہ جب تک پرچم اسلام پر "علیؑ ولی اللہ" نقش نہ ہو جائے گا۔
قیامت نہ آئے گی۔ علیؑ کا لال اسی دن کے لئے پردۂ غیب میں قائم ہے کہ وقت
آجائے تو پرچم اسلام پر "علیؑ ولی اللہ" کا نقش ابھار دیا جائے ۔ صلوات

پروردگار عالم نے ہر دور میں ہدایت کا انتظام اپنے ہاتھوں میں رکھا
ہے۔ اور ہدایت کے لئے دو اہم شرطیں قرار دی ہیں۔ ایک علم اور ایک کردار۔
علم نہ ہوگا تو دین کی تبلیغ نہ ہوگی۔ اور کردار نہ ہوگا تو دین اصلی حالت میں محفوظ نہ
رہ سکے گا۔ جو ذمہ دار ہوگا وہی دین کو تبدیل کر دے گا۔ دوسروں کا کیا ذکر
ہے ــــ اور اس علم و کردار کا اثر تھا کہ پیغمبر اسلامؐ نے ۴۰ سال کی خاموش
زندگی میں دشمنوں سے صداقت و امانت کا اقرار لے لیا تھا۔ علم و کمال کی
وہ منزل تھی جو عرب کے ذہن سے بالاتر تھی لیکن کردار و اعمال کو کسی حد تک
وہ بھی سمجھ سکتے تھے۔ اسی لئے پیغمبر اسلامؐ نے مسلسل اپنے اعمال و کردار کا مظاہرہ
کیا تاکہ دنیا دیکھ لے کہ دین خدا کا راہبر کتنا بلند کردار اور عظیم المرتبت ہوتا ہے
کتنا صادق القول تھا وہ پیغمبرؐ جسے اس عرب نے سچا مان لیا۔ جو خدائی کے سلسلے
میں بھی سچے نہ تھے۔ جن کی زبان ۳۶۰ بتوں کو خدا کہتے کہتے گھس گئی تھی جو زندگی
کے کسی شعبہ میں بھی سچ کی قدر و قیمت نہ پہچانتے تھے۔ انہوں نے بھی مرسل اعظمؐ
کو سچا مان لیا اور ایسا سچا مان لیا کہ نبیؐ انھیں ہر مرحلۂ حیات اور ہر منزل فکر
و نظر پر جھوٹا کہتے رہے اور وہ ہر منزل پر سچا کہتے رہے۔ حد یہ ہے کہ پیغمبرؐ کو

مجنون کہا۔ ساحر کہا۔ شاعر کہا۔ کاہن کہا لیکن جھوٹا نہ کہا۔ اس
لئے کہ انھیں بھی معلوم تھا کہ ان پر ہر الزام لگایا جا سکتا ہے۔ جھوٹ کا الزام
نہیں لگایا جا سکتا۔ اور پیغمبرؐ اسلام بھی مطمئن تھے کہ ہر الزام وقت کے
ساتھ دھل جائے گا لیکن اگر جھوٹ کا الزام لگ گیا تو اس کی صفائی دینا
پڑے گی۔ یہ تو وقت فیصلہ کرے گا کہ دونوں میں مجنون کون تھا
دین کا دعوت دینے والا مجنون تھا یا دعوت پر پتھر مارنے والے مجنون
تھے ــــ یہ زمانہ فیصلہ کرے گا کہ کھانا کھلانے والا جادوگر تھا یا کھانے
والے جادوگر تھے۔ یہ آنے والی نسل فیصلہ کرے گی کہ آیات قرآن بنانے
والا شاعر تھا یا سات قصیدوں پر فخر کرنے والی قوم شاعر تھی۔ یہ دنیائے
انصاف طے کرے گی کہ پروردگار کے اشارہ پر غیب کی خبریں دینے والا
کاہن تھا یا آثار قدم دیکھ کر مسائل کا فیصلہ کرنے والے کاہن تھے۔
لیکن یہ مسئلہ بڑا نازک تھا کہ اگر کسی نے ایک واقعہ میں بھی غلط بیانی
کا الزام لگا دیا تو نہ واقعہ پلٹ کر آئے گا نہ جھوٹ اور سچ کا فیصلہ ہو
سکے گا۔ ایمان لانے والے صادق کہتے رہیں گے۔ دشمن کاذب ثابت کرتے
رہیں گے۔ کتنا حسین کردار تھا پیغمبرؐ اسلام کا کہ سب کچھ ہو گیا کوئی جھوٹا نہ کہہ سکا
اور آپ نے اپنے کردار سے ثابت کر دیا کہ یاد رکھو۔ جو خدائی نمائندہ ہوتا
ہے اس پر ہر الزام لگایا جا سکتا ہے لیکن اسے جھوٹا کہنے کی ہمت نہیں ہو سکتی
دنیا والو! اس حقیقت کو سمجھ لو کہ واقعی سچا وہ نہیں ہے جسے چاہنے والے
صادق یا صدیق کہیں واقعی سچا وہ ہے جسے جان کے دشمن اور خون کے پیاسے
سچا کہیں ــــ اور یہی حقیقت دور بنی عباس میں پھر دہرائی گئی کہ کل دادا کو خون
پیاسے کفار نے صادق و امین کہا تھا۔ اور پوتے کو جان کے دشمن مسلمان جعفر صادقؑ

کہہ رہے ہیں اور قدرت آواز دے رہی ہے میرا نمائندہ ہر دور میں صادق ہوتا ہے اور ہر کام میں سچا ہوتا ہے۔ اس کا قول سچا۔ اس کا وعدہ سچا۔ اس کا عمل سچا۔ اس کا کردار سچا۔ اس کا دین سچا۔ اس کا ایمان سچا۔ اس کا خدا سچا۔ اس کا قرآن سچا اور وہ خود اتنا سچا کہ جاہلیت میں صادق کہا جائے تو وہی سمجھ میں آئے۔ اور اسلام میں صادق کہا جائے تو وہی ذہن میں آئے۔ صلوات

صداقت کی تاریخ بڑی حسین تاریخ ہے۔ اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ تاریخ نبوت میں صداقت کی سند ملی تو آخری نبی کو ملی اور تاریخ امامت میں صداقت کی سند ملی تو درمیانی امام کو ملی۔ شاید قدرت کی مصلحت یہ رہی ہو کہ آخری نبی کی صداقت کا اقرار لے لیا جائے تاکہ جب وہ گذشتہ نبوتوں کے بارے میں بیان دے تو وہ بھی صحیح ہو اور جب آئندہ وراثت کے بارے میں بیان دے تو وہ بھی صحیح ہو۔ اب وہ مسلمان کیا مسلمان ہوگا کہ نبی صادق گذشتہ کے بارے میں بیان کرے تو قبول کرلے اور آئندہ کے بارے میں کچھ کہے تو اسے ہذیان کہہ دے۔ ایسے مسلمان سے تو جاہلیت کے کفار ہی بہتر تھے۔ صلوات

امامت میں درمیانی امام کی صداقت کا اقرار لیا تاکہ آغاز بھی مستند ہو جائے اور انجام بھی مستند ہو جائے۔ یا یوں کہا جائے کہ جب بنی امیہ بنی عباس کو جھوٹا کہہ رہے تھے اور بنی عباس بنی امیہ کو جھوٹا کہہ رہے تھے۔ اور تاریخ حکومت میں کوئی کسی کو سچا ماننے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اس وقت تاریخ امامت اتنی پاکیزہ کردار تھی کہ اس نے ادھر سے بھی صداقت کی سند لی اور ادھر سے بھی صداقت کا اقرار لے لیا۔ صلوات

اور خدا جانے ۱۷ ربیع الاول کی تاریخ بھی کتنی حسین اور خوش قسمت تاریخ تھی کہ ہر صداقت اسی کے حصے میں آئی۔ نبیؐ صادق آیا تو اسی تاریخ میں اور امام صادقؑ آیا تو اسی تاریخ میں۔ گویا یہ تاریخ صداقت کو راس آگئی۔ اور ۸۳ھ میں سنہ عام الفیل کی تاریخ دہرا دی گئی۔ کل آمنہ کی گود میں نبیؐ صادق آیا تھا اور آج ام فروہ کی آغوش میں امام صادقؑ آیا ہے۔ یا یوں کہا جائے کہ کل عبداللہ کا لال محمدؐ صادق تھا اور آج محمد باقرؑ کا فرزند صادق محمدؐ ہے۔ صلوات

جناب ام فروہ وہ صاحبِ علم و کردار خاتون تھیں کہ جب حج کے موقع پر کسی شخص نے آپ کو ٹوکا کہ آپ بائیں ہاتھ سے حجر اسود کو کیوں بوسہ دے رہی ہیں تو آپ نے فرمایا کہ اپنا علم اپنے پاس محفوظ رکھ۔ مجھے تیرے علم کی ضرورت نہیں ہے۔ اسے کسی اور کے علم کی کیا ضرورت ہوگی جس کے لال نے اتنا علم دین رائج کیا ہو اور اتنے احکام شریعت پھیلائے ہوں کہ دین محمدی کو مذہب جعفری کا نام مل گیا ہو۔ صلوات

اس کے گھر میں صبح و شام علم کا چرچا۔ اس کے آنگن میں ہر آن شریعت کا تذکرہ۔ اور اس کی ڈیوڑھی پر بڑے بڑے امام سربسجود۔ تاریخ اسلام گواہ ہے کہ آج جتنے بڑے سے بڑے امام کہے جاتے ہیں سب اسی ڈیوڑھی کے فقیر تھے اور اسی امام جعفر صادقؑ کے شاگرد تھے۔ یہاں تک کہ امام ابو حنیفہ کا اعلان تھا کہ اگر دو سال امام جعفر صادقؑ کی شاگردی نہ کرتا تو ہلاک ہو گیا ہوتا۔ ارباب کرم! یہ انداز بیان بھی عجیب ہے کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہلاک ہو جاتا۔ اور مجھے تو یہی اعلان دیکھ کے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ پوتا اپنے دادا کا کیسا وارث ہے کہ کل دادا نہ ہوتا تو امت ہلاک ہو جاتی اور

آج پوتا نہ ہوتا تو امت ہلاک ہو جاتی ـــــ دادا نے جسے ہلاکت سے بچایا اسے خلافت مل گئی اور پوتے نے جسے ہلاکت سے بچایا اسے امامت مل گئی۔ اور یہ دنیا کا انصاف ہے کہ بچانے والے کو نہ کل خلافت ملی نہ آج حکومت دی گئی ـــــ لیکن آل محمدؐ مطمئن رہے کہ ہم اس خلافت و حکومت کے لئے کیا دوڑیں جو ہمارے غلاموں اور شاگردوں کو مل جایا کرتی ہے۔ اور میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ آل محمدؐ کے فخر کے لئے یہی کافی ہے کہ ان کے در کے فقیر کبھی بادشاہ بن گئے کبھی امام ـــ کوئی ایسا بھی امیر تو ہو جو اپنے فقیروں کو ایسا غنی بنا دے اور میں تو کہتا ہوں کہ اگر کوئی ایسا دولت مند ہوگا تو وہ امیر نہ ہوگا۔ بلکہ جناب امیر ہوگا۔ صلوات

یہ جناب ام فروہ حضرت قاسم کی بیٹی اور محمد بن ابی بکر کی پوتی تھیں جن کے بارے میں امیر المومنینؑ نے فرمایا تھا کہ محمد میرا فرزند ہے اگرچہ دوسرے کے صلب سے ہے۔ اتنی عظمت و جلالت کسے نصیب ہوگی کہ امام حسنؑ اور امام حسینؑ جیسے فرزندوں کا باپ اسے اپنا فرزند قرار دے اور شاید اس فرزندی میں بھی یہی مصلحت رہی ہو کہ کل جب خاندان نبوت میں محمد کی پوتی بیاہ کر آئے اور میرے ایک لال کی ماں بنے تو دنیا یہ نہ سوچے کہ میرے گھرانے میں کسی اور گھرانے کی وراثت آگئی ہے۔ بلکہ خاندان رسالت میں امامت ہی کی وراثت رہے۔ حکومت کی وراثت نہ آنے پائے اور یہیں سے یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ آج جو نافہم طعنے دیتے ہیں کہ امام جعفر صادقؑ کی رگوں میں کسی صدیق کا خون ہے تو کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ امام صادقؑ تو وہ مرکز صداقت ہیں جن کی رگوں میں باپ کی طرف سے بھی صداقت ہی کا خون ہے کہ باپ صادق۔ دادا صادق۔ پردادا صادق۔ جد اعلیٰ صادق۔

مورث اعلیٰ صادق اور ماں کی طرف سے بھی ایسی صداقت کہ ماں صادقہ نانا صادق۔ پرنانا صادق اور ایسا صادق کہ علیؑ جیسے صادق نے اسے اپنا فرزند بنا لیا کہ اس کی نسل میں میری صداقت کا خون چلے۔ کسی اور کا خون شامل نہ ہونے پائے۔ صلوات

اور کیا کہنا جناب اسماء کا کہ انھوں نے پہلی منزل پر خون حکومت کی تاثیر بدل کر اتنا طیب و طاہر بنا دیا کہ مولائے کائناتؑ نے محمد کو اپنا بیٹا بنا لیا۔ اور محمدؒ کی نسل کو اپنی نسل قرار دے دیا۔

جناب پیام اعظمی نے ایسے ہی موقع کے لئے ماں کی خدمتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

اپنے اولاد کی تقدیر بدل دیتی ہے
باپ کے خون کی تاثیر بدل دیتی ہے۔

صداقت صادق آل محمدؐ پر تفصیلی بحث پھر کسی موقع پر کی جائے گی اس وقت ہدایت کے پہلے جز پر بحث کرنا مقصود ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ دین رسولؐ کا یہ ذمہ دار علم و کمال کی کس منزل تھا۔

کس کی مجال ہے جو اس شخصیت کے علم و کمال پر روشنی ڈال سکے جس کے علم کی روشنی ساری کائنات میں پھیل گئی ہو۔ اور جس کے مدرسۂ فکر و نظر میں چار ہزار شاگردوں نے سبق حاصل کیا۔ مسجد کوفہ میں نو سو حلقۂ درس تھے جن میں صرف آپ کی حدیثیں بیان ہوتی تھیں اور آپ کے علوم کا چرچا ہوتا تھا۔ ہر طرف آپ کی صداقت کا شہرہ۔ ہر طرف آپ کے علم کا تذکرہ۔ اس دور کے حالات کا جائزہ لیا جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دنیائے علم میں بالکل سناٹا تھا اور صادق آل محمدؐ کے علاوہ کسی کی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ مختلف

مذاہب کے پیرو: لامذہب۔ دہریے۔ بے دین۔ دشمن، دوست سب آپ کی چوکھٹ پر جبیں سائی کرتے تھے۔ اور آپ سے مسائل دریافت کرتے تھے۔ اس مقام پر چند مسائل کا تذکرہ کیا جاتا ہے جن کا چرچا آج بھی ہے اور جن کا سہارا لے کر نا فہم افرادامت اسلامیہ کو دھوکہ دیتے رہے ہیں۔

امام جعفر صادقؑ کے دور میں ایک شخص جس کا نام جعد بن درہم تھا اس نے مٹی پانی جیسے مواد کو جمع کر کے کچھ کیڑے بنالئے اور مسلمانوں کو یہ سمجھانا شروع کر دیا کہ میں ان جانوروں کا خالق ہوں۔ لہٰذا مجھے بھی خدا مان لو ــــ بالکل وہی انداز جو آج کی دنیا میں پایا جاتا ہے کہ جس نے کوئی شے ایجاد کر لی وہی اپنی خدائی کا قائل ہو گیا۔ اور یہی تمنا پیدا ہو گئی کہ دنیا خدائے برحق کو چھوڑ کر اسی کو خدا مان لے۔ یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ خالق حقیقی نے ان اشیاء میں یہ صلاحیت نہ رکھی ہوتی تو آپ کی تخلیق کہاں سے آتی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ دھوکہ دینے والے کو حقیقت سے کیا تعلق ہے۔ دعویٰ شروع ہو گیا اور لوگ بہکنے لگے۔ ہر طرف ہنگامہ ہے کہ ایک نیا خدا پیدا ہو گیا ہے اور اس کی خدائی کا جواب نہیں دے سکتے۔ اتنا زمانہ گزرنے کے بعد بھی مسلمانوں کا عقیدہ اس منزل پر ہے کہ نا اہل کو خدا ماننے کے لئے تیار ہیں تو جو مسلمان ایسے ایسے افراد کو خدا مان سکتے ہیں۔ وہ اگر حاکم و بادشاہ مان لیں تو کیا تعجب۔ صلوات۔

امام جعفر صادق علیہ السلام تک یہ خبر پہنچی کہ دین اسلام خطرہ میں ہے اور ابن درہم اپنے کو خدا منوانے پر تلا ہوا ہے تو آپ اس کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا کہ تو ان جانوروں کا خالق ہے؟ اس نے کہا بیشک۔

فرمایا اچھا تو یہ بتا دے کہ ان کی تعداد؟

اس نے کہا یہ تو نہیں معلوم۔

فرمایا۔ اچھا یہ بتا دے کہ ان میں نر کتنے ہیں اور مادہ کتنے۔؟

عرض کی یہ بھی نہیں معلوم۔

فرمایا۔ اچھا جو مشرق کی طرف جا رہے ہیں انہیں مغرب کی طرف موڑ دے اور جو مغرب کی طرف جا رہے ہیں انہیں مشرق کی طرف موڑ دے۔

اس نے کہا یہ کس کے اختیار میں ہے۔

آپ نے فرمایا پھر تو کس بات کا خالق ہے نہ علم تیرے پاس ہے نہ قدرت تیرے پاس ہے نہ اختیار تیرے ہاتھ میں ہے۔ بس خدائی ہی خدائی ہے۔ (مناقب)

ارباب کرم! آپ نے دیکھا امت اسلامیہ کس منزل پر پہنچ گئی تھی۔ جہاں خدائی کے لئے بھی علم و اختیار کی ضرورت نہیں تھی۔ اور مسلمان خدا ماننے کے لئے تیار تھے۔ اب جو امت علم و قدرت کے بغیر خدا ماننے کے لئے تیار ہو جائے وہ کیا رہنما نہیں مان سکتی۔ صلوات

صادق آل محمدؐ نے فرمایا۔ اچھا اب بندگان کا اختیار دیکھ۔ میں اشارہ کرتا ہوں نر الگ ہو جائیں گے مادہ الگ ہو جائیں گے۔ مشرق والے مغرب میں آجائیں گے اور مغرب والے مشرق میں آجائیں گے۔

میں عرض کروں گا۔ مولا! آپ کے لئے یہ کون سا بڑا کام ہے جس کا جد مغرب کے آفتاب کو مشرق کی طرف موڑ سکتا ہے وہ کیا چند مخلوقات کا رخ نہیں موڑ سکتا۔ صلوات

دنیا نے امامت کا زور کہاں دیکھا۔ امامت دنیا کی حکومت کی طلبگار نہیں ہے۔ یہ چند روزہ تماشا ہے اور بہت جلد ختم ہونے والا ہے۔ امامت

اس اختیار کی مالک ہے جس کا سلسلہ زمین سے آسمان تک ہے اور جس کی وسعت شمس و قمر بحر و بر اور جنت و کوثر تک ہے۔ صلوات

دنیا انصاف کرے اگر صادق آل محمدؐ سامنے نہ آجاتے تو امت کا کیا حال ہوتا اور اسلام کس ٹھکانے لگتا۔ اور اگر کچھ سمجھ میں آجائے تو یہ سوچے کہ پروردگار نے ہدایت کا نظام اپنے ہاتھ میں کیوں رکھا ہے اور یہ اختیار امت کو کیوں نہیں دے دیا۔ امت جاہل و عاجز کو راہنما بنا سکتی ہے لیکن علام الغیوب اسی کو راہنما بنائے گا۔ جسے غیب تک کا علم عنایت کرے گا اور قادر مطلق اسی کو ہادی مقرر کرے گا جسے کائنات کا اختیار دیدے گا۔

— صلوات

ایک دوسرا واقعہ بھی اسی انداز سے ملتا جلتا ہے کہ ایک شخص ابوشاکر دیصانی حضرت کی خدمت میں آکر کہنے لگا کہ میں خدا کو خالق نہیں مانتا۔ آپ ثابت کیجئے۔ آپ نے فرمایا ٹھہر ابھی ثابت کرتا ہوں۔ ایک ایسے قلعہ کے بارے میں سوچ جس میں ایک طرف سونا بہہ رہا ہو۔ ایک طرف چاندی بہہ رہی ہو۔ نہ سونا چاندی پر غالب آئے نہ چاندی سونے کو نقصان پہنچائے۔ قلعہ کے دروازے ہر طرف سے بلند ہوں ہوا تک کا گزر نہ ہو اور ایک دن دروازہ کھلے تو اس میں سے تازہ مخلوقات برآمد ہونے لگے۔ بتا ان مخلوقات کو کس نے پیدا کیا ہے۔ اور ان کے لئے یہ سارا انتظام کس نے کیا ہے؟ اس نے کہا ایسا قلعہ ہے کہاں جس کی آپ مثال دے رہے ہیں؟ آپ نے ایک بچہ کے ہاتھ سے مرغی کا ایک انڈا لے کر پیش کر دیا۔ دیکھ اس کے اندر سونے جیسی زردی ہے چاندی جیسی سفیدی ہے۔ دروازے بند ہیں۔ چند دنوں کے بعد زندہ جانور برآمد ہونگے۔ اب اگر کوئی خدا نہیں ہے تو اس بند قلعہ میں مخلوق کون پیدا کرتا ہے۔

مشکل کشائی کر رہا ہے اور یہ بھی واضح ہو جائے کہ علی کو چھوڑنے کے بعد ابراہیمؑ کا واسطہ بھی نامکمل رہ جاتا ہے اور خانۂ خدا کا قرب بھی بے کار ہو جاتا ہے۔ اور کیوں نہ ہو اہلبیتؑ کو چھوڑ کر بیت سے پتھر ہی ہاتھ آئے گا طواف نہ ملے گا، طواف کرنا ہے تو اہلبیتؑ کو بھی پہچاننا پڑے گا، اور ان پر بھی ایمان لانا پڑے گا۔ صلوات،

دیوار کے شگافتہ ہونے پر پیچھے ہٹنے کے بجائے آگے بڑھ کر واضح کر دیا کہ فرار کرتی اگر کسی فرار کی ماں ہوتی لیکن مجھے پہچانو! میں حیدرؑ کرار کی ماں ہوں اور مجھے یہ دیوار کیا مرعوب کرے گی، میرا ہر رشتہ شجاعت کا ضامن اور ہمت و استقلال کا ذمہ دار ہے، میں ایک اسد کی بیٹی ہوں اور ایک شیر ذوالجلال کی ماں، میرے میدان سے ہٹنے کا کیا سوال ہے۔ صلوات،

آئیں تو اس بے نیازی سے آئیں کہ نہ ہمدردوں کا خیال ہے نہ عورتوں کا انتظار، نہ آب و دانہ کی فکر ہے نہ انتظامات ولادت کی کشمکش، اور زبانِ حال سے آواز دے رہی ہیں کہ یہ سب فکریں ہوتیں اگر میں خود سے آتی، لیکن جب کسی کے بلانے پر آئی ہوں تو اب انتظام اسی کے ذمہ ہے، میری کوئی ذمہ داری نہیں ہے، مجھے اس کے کرم پر اعتماد ہے کہ وہ کسی کو بے سہارا نہیں چھوڑے گا اور اگر کسی دنیا والے کی آمد ہوتی تو مکہ کی عورتوں کو طلب کرتی لیکن جب اُدھر والے کی آمد کا مسئلہ ہے تو خدمت کے لئے بھی اُدھر ہی کی عورتیں آئیں گی۔ چنانچہ روایت گواہ ہے کہ حوا آئیں، سارہ آئیں، مریم آئیں، حورانِ جنت آئیں اور فاطمہؑ بنت اسد کے مشکلات میں کام آئیں اور قدرت نے اعلان کر دیا کہ اب فرقِ مراتب پہچان لو! جو مریم وقتِ ولادت خدمت کے لئے آئیں ان کا مرتبہ بنتِ اسد کا مرتبہ نہیں ہو سکتا اور ان کا لال فاطمہؑ کے لال کا ہم پلہ نہیں ہو سکتا اور یہی وجہ ہے

کرامت دنیا نے بھی محسوس کیا اور اللہ نے بھی ثابت کر دیا۔ دنیا نے یوں محسوس کیا کہ مریم کے لال کو اللہ کا بیٹا کہا اور بنت اسد کے لال کو خدا مانا۔ اور خدا نے یوں محسوس کرایا کہ امامت کی آخری منزل پر مریم کے لال کو ماموم بنا دیا اور بنت اسد کے آخری فرزند کو امام بنا دیا۔ صلوات،

اور شاید قدرت کے اسی منصوبہ کی کارفرمائی تھی کہ دنیا پریشان ہو کر خانہ کعبہ کے قریب آئی لیکن جناب ابوطالبؑ نہیں آئے۔ ابوطالبؑ آواز دے رہے تھے کہ فاطمہؑ خود سے گئی ہوتیں تو میں تلاش میں نکلتا اور علیؑ میرے نمائندہ ہوتے تو انتظامات کی ذمہ داری میرے اوپر ہوتی لیکن جب خدا نے بلایا ہے اور آنے والا بھی اسی کا نمائندہ ہے تو ذمہ داری کا بار بھی اسی کے سر ہے۔ طالب و جعفر و عقیل کا انتظام میں نے کیا ہے اور علیؑ کا انتظام پروردگار کے ذمہ ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ جب حالات کی پریشانی کی بنا پر ابوطالبؑ کے فرزندوں کی کفالت کا موقع آیا اور یہ طے پایا کہ ایک ایک بچہ کو لے کر پال لیا جائے، اور ابوطالبؑ کا بوجھ ہلکا کر دیا جائے تو علیؑ بن ابی طالب کو پیغمبرؐ ہی لائے کہ دنیا پہچان لے کہ جن کی تربیت دنیا والوں کے ذمہ تھی انہیں دنیا والے لے گئے اور جس کی پرورش مالک کائنات کے ذمہ تھی اس کی ذمہ داری رسولؐ اسلام نے لے لی ہے۔ نعرۂ صلوات،

عزیزانِ محترم! علیؑ آغوش پیغمبرؐ سے دوبارہ ماں کی گود میں آئے ماں نے دستورِ عرب کے مطابق حفاظت کی غرض سے بچہ کو کپڑے میں لپیٹنا چاہا بچہ نے کپڑے کو پارہ پارہ کر دیا، دوسرے کپڑے میں لپیٹا، اس کا بھی یہی حشر ہوا سات پارچہ استعمال کئے اور بچہ نے سب کو پارہ پارہ کر دیا، اور ایک مرتبہ

آواز دی "یا اماہ خلینی سبحی" مادر گرامی مجھے چھوڑ دیجئے۔ مجھے تسبیح کرنے دیجئے۔ میں کہوں گا یا علیؑ تسبیح پروردگار کو بازو سے کیا تعلق، ماں مخالفت کر۔ تا بند کرنے دیجئے۔ آپ تسبیح پڑھنا چاہتے ہیں پڑھئے۔ تسبیح کو اس شانہ سے کیا تعلق ہے؟

امام کی مصلحت، امام ہی جانتا ہے لیکن واقعہ کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ علی منزلِ تسبیح میں ہاتھ کا باندھنا پسند نہیں کرتے۔ جبھی تو بار بار کہہ رہے ہیں مادر گرامی میرے ہاتھ کھول دیجئے میں تسبیح پروردگار کرنا چاہتا ہوں ابھی آپ نے۔ جو حکمت دنیا آخر تک نہ سمجھ سکی امامت نے اسے بچپنے ہی میں سمجھا دیا اور بتا دیا کہ تسبیح پروردگار میں کون سا انداز محبوب پروردگار ہے۔ صلوات۔

آخر کار مادر گرامی نے بچہ کو گہوارہ میں لٹا دیا اور کسی کام سے چلی گئیں ادھر ایک اژدہا آیا اور گہوارہ کی طرف بڑھ رہا، چاہتا تھا کہ مولود حرم پر حملہ کرے کہ ایک مرتبہ بچے نے گہوارے سے دونوں ہاتھ نکالے اور اژدہے کو دو ٹکڑے کر کے خاک پر ڈال دیا۔ صلوات،

دنیا انگشت بدنداں تھی کہ یہ کم سنی اور یہ ہمت، یہ گہوارہ اور یہ بہادری، لیکن علیؑ نے واضح کر دیا کہ جس کی طاقت دنیا کی دین ہوتی ہے وہ مشق و مہارت کے بعد شجاعت کا مظاہرہ کرتا ہے اور جس کی طاقت خدا داد ہوتی ہو وہ ایسے ہی کرامات کا اظہار کرتا ہے۔

اللہ رے کمالِ علیؑ ___ آغوش رسولؐ میں آئے تو آسمانی صحیفوں کی تلاوت کر دی، گہوارہ میں آئے تو اژدہے کے دو ٹکڑے کر دیئے اور قرآن مجید نے آواز دی کہ ہم نے طالوت کو اس لئے سردار لشکر بنا دیا تھا کہ ان کے پاس علم کی طاقت بھی تھی اور جسم کی قوت بھی۔ ہم مال و دولت اور جاہ و حشم نہیں

دیکھا کرتے۔ ہماری نمائندگی کے لئے علم و جسم کی دستگاہ ہوتی ہے، علیؑ نے
آواز دی۔ دنیا والو! اگر میری نمائندگی کی شان دیکھنا ہے تو مجھے جوانی
اور ضعیفی میں نہ دیکھو۔ میری کم سنی کا عالم دیکھو۔ خانۂ کعبہ سے نکل کر آغوش
نبیؐ میں آیا تو علم کا اعلان کیا، اور گہوارہ میں قدم رکھا تو طاقتِ جسم کا اظہار
کر دیا۔ اب میرے علاوہ اس کائنات میں کون نمائندۂ پروردگار ہو سکتا
ہے۔ ؟ صلوات،

واقعہ تمام ہوگیا، لیکن علیؑ کے اظہارِ شجاعت سے عالمِ عربیت
میں ایک ہنگامہ پیدا ہوگیا۔ جیسا کہ تاریخ کا بیان ہے کہ اس اژدہے
کا خاصہ یہ تھا کہ اسے سیاہ الولد کے نام سے یاد کیا جاتا تھا، اور عرب
میں جب کوئی بچہ پیدا ہوتا تھا تو لوگ اسے اژدہے کے قریب لا کر ڈال
دیا کرتے تھے، اگر اس کے نسب میں کوئی عیب ہوتا تو اژدہا اسے فنا کر دیتا
تھا اور اس طرح زندگی سے نجات و شرافت کا فیصلہ ہو جاتا تھا۔ علیؑ نے
اژدہے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا تو لوگ گھبرا کر پیغمبرِ اسلام کے
پاس آئے، حضور اب کیا ہوگا۔ ؟ اس بچہ نے تو قیامت ہی ڈھا دی، اب
ہمارے بچوں کا کیا حشر ہوگا اور ہم نجات کا فیصلہ کیسے کریں گے؟
مرسلِ اعظمؐ نے فرمایا۔ تمہیں تو اس واقعہ پر خوش ہونا چاہیئے کہ اگر یہی سانپ
معیار بنا رہ جاتا تو اس کے مرنے کے بعد پھر کوئی معیار نہ رہ جاتا۔ یہ قدرت کا کرم تھا
کہ اس نے فانی معیار کو ہٹا کر ایک ابدی اور دائمی معیار دے دیا، یاد رکھو آج سے
نسب کا معیار یہ علیؑ کی محبت ہے۔ اس کی محبت کو دیکھتے جانا اور نجات و شرافت
کا فیصلہ کرتے رہنا۔ صلوات،

بات آخری منزل تک لا رہا ہوں، اور زیادہ طول دینا نہیں چاہتا، علامہ
عبیداللہ امرتسری نے اپنی کتاب ارجح المطالب میں علیؑ کے ناموں میں حیدر کی
بھی وجہ بیان کی ہے کہ علیؑ نے اژدہے کے دو ٹکڑے کر دیئے تھے۔ یہ وجہ
صحیح ہو یا نہ ہو، اتنا ضرور ہے کہ اس نام کے ساتھ کوئی ایسا واقعہ ضرور وابستہ
تھا کہ لوگ اس نام سے لرزتے تھے، چنانچہ جب خیبر کے میدان میں آپ نے
مرحب سے کہا کہ میری ماں نے میرا نام حیدر رکھا ہے تو اس نے گھبرا کر واپسی کا
ارادہ کر لیا اور یہ طے کر لیا کہ اب سر کی خیر نہیں، لیکن خدا برا کرے ابلیس ملعون
کا کہ یہ اپنوں کا بھی نہیں ہوتا، کہنے لگا کہ مرحب کہاں واپس جا رہا ہے لوگ
تیرے بارے میں کیا کہیں گے۔ تیری شجاعت کس قدر رسوا ہوگی۔ اس نے
کہا کہ میری ماں نے وصیت کی ہے کہ حیدر نامی پہلوان سے نہ لڑنا ورنہ
زندگی کی خیر نہیں۔ ابلیس نے کہا، مرحب! کیا ایک نام کے بہت سے انسان
نہیں ہوتے ہیں یہ کیا ضروری ہے کہ یہ وہی حیدر ہوں جن کے بارے میں تیری ماں
نے وصیت کی ہے۔ ؟ شامت کا مارا پلٹ کر آیا اور جو انجام ہوا وہ آپ کو معلوم
ہی ہے! لیکن عزیزانِ گرامی! یہ معلوم ہوگیا کہ شیطان کا ایک حربہ یہ بھی ہے کہ
ایک نام کے بہت سے کہہ کر فضائل پر پردہ ڈال دیا کرتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے
کہ قرآن حکیم نے مقامِ فضیلت میں اہلبیتؑ کے کردار کا ذکر کیا ہے، نام نہیں
لیا، کہ یہ ابلیس کے پیرو یہاں بھی یہی نسخہ استعمال کریں گے۔ پیغمبرِ اسلامؐ نے بھی
اسی فطرت کا اندازہ کر کے میدانِ غدیر میں علیؑ کو مولا نہیں بنایا، بلکہ فرمایا
"یہ علی مولا ہے"۔ تاکہ ایک نام کے بہت سے نہ ہو جائیں۔ صلوات،
فضائل کو اس منزل پر لانے کے بعد ایک نظر ان حرف نمول پر بھی

ڈالنا ضروری ہے جن سے فضائلِ اہلبیتؑ کسی صورت سے برداشت نہیں ہوتے اور ہر منزلِ فضیلت پر کوئی نہ کوئی نقص نکالنے کی کوشش کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ جب عام فضائل میں یہ روش ہے جہاں مقابلہ کرنے کی بھی گنجائش ہے اور دوبارہ حاصل کرنے کی بھی گنجائش ہے تو اس فضیلت کا کیا عالم ہوگا جس میں مقابلہ کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، نہ کوئی انسان دوبارہ پیدا ہوسکتا ہے، نہ علیؑ کی اس فضیلت سے مقابلہ ہوسکتا ہے اور "بدقسمتی" یہ ہے کہ مسلمان آواگون کا بھی قائل نہیں ہے کہ اس امید میں زندگی گزار لیتا کہ شاید اگلے جنم میں خانۂ کعبہ میں پیدا ہوجائے، چنانچہ چاروں طرف سے مایوس ہونے کے بعد آخری راستہ یہ نکالا کہ مولا کی اس فضیلت ہی سے انکار کردیا جائے، فضیلت سے انکار کے دو راستے نکالے گئے، ایک راستہ یہ ہے کہ خانۂ خدا میں پیدا ہونا کوئی علیؑ کا کمال نہیں ہے۔ یہ تو انسان کا غیر اختیاری عمل ہے، جس میں اس کا کوئی بس نہیں ہے، انسان نہ پیدائش پر اختیار رکھتا ہے، نہ موت پر، کب کہاں موت آجائے کس کے بس کی بات ہے اور کہاں پیدا ہوجائے کس کے اختیار کی بات ہے، یہ مالکِ کائنات کے اختیار کی بات ہے اور اتفاق وقت کہ فاطمہؑ بنت اسد اس موقع پر خانۂ کعبہ ہی تک آگئیں اور وہیں علیؑ کی ولادت ہوگئی، ورنہ اس میں علیؑ کا کیا دخل ہے؟ میں کہتا ہوں کہ اولاً تو تاریخی واقعات اس اتفاق کے صریحی مخالف ہیں، ان میں الٰہی منصوبہ کے آثار پائے جاتے ہیں، اور قدرت کا انتظام صاف نظر آتا ہے لیکن اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ ایک اتفاقی بات تھی کہ علیؑ خانۂ کعبہ میں پیدا ہوگئے تو کیا یہ بھی اتفاق تھا کہ فاطمہؑ بنت اسد خانۂ کعبہ ہی تک آئیں، یہ بھی اتفاق تھا

کہ دیوارِ کعبہ میں در بن جائے، یہ بھی اتفاق تھا کہ وہ پیچھے ہٹنے کے بجائے آگے بڑھ جائیں، یہ بھی اتفاق تھا کہ دیوار دوبارہ جڑ جائے، یہ بھی اتفاق تھا کہ تین دن تک ہزار کوششوں کے باوجود قفل نہ کھل سکے، یہ بھی اتفاق تھا کہ تین دن کے بعد دوبارہ دیوار میں در بن جائے، یہ بھی اتفاق تھا کہ مریمؑ و حوا اور آسیہ و سارہ جیسی خواتین خدمت کے لئے چلی آئیں، یہ بھی اتفاق تھا کہ پیغمبرِ اسلامؐ استقبال کے لئے پہنچ جائیں، یہ بھی اتفاق تھا کہ بچہ آغوشِ پیغمبرؐ میں آکر آنکھیں کھول دے اور اگر یہ سب اتفاق تھا تو یہ اتفاق بھی ہزار اختیارات سے بہتر ہے اور کیا کہنا اس بندے کی فضیلت کا جس کے سلسلے کے اتفاقات بھی فضائل بن جائیں اور جب اتفاقات نے فضائل کے دریا بہا دیئے ہیں تو جب اختیارات کا سلسلہ شروع ہوگا تو بات کس منزل تک پہنچے گی؟ اور مجھے تو کہنا پڑے گا کہ علیؑ کی منزل اتنی بلند ہے کہ اتفاق سامنے آئے تو خانۂ کعبہ زچہ خانہ بن جائے اور اختیار سامنے آئے تو ایک ضربت ثقلین کی عبادت پر بھاری ہوجائے، صلوات،

عزیزانِ محترم! یہ انکارِ فضیلت کا پہلا رُخ تھا، دوسرا رُخ اس سے زیادہ دلچسپ ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ خانۂ کعبہ میں بتوں کا اڈہ تھا اور بت پرستوں کا دستور تھا کہ جب کوئی مشکل پڑتی تھی تو خانۂ کعبہ تک اپنے بتوں سے دعا مانگنے آیا کرتے تھے۔ معاذاللہ جناب فاطمہؑ بنت اسد بھی دستورِ عرب کے مطابق انھیں بتوں سے دعا کرنے کے لئے آئی تھیں کہ اچانک دیوارِ کعبہ میں در پیدا ہوگیا اور وہ اندر چلی گئیں اور علیؑ بن ابی طالب کی ولادت ہوگئی۔ میں کہوں گا کہ بے شک فاطمہؑ بنت اسد بتوں ہی سے دعا مانگنے گئی تھیں۔ اور

انھوں نے جب کہا تھا کہ پروردگار میں تجھ پر ایمان لائی، تیری کتابوں پر ایمان لائی، تیرے رسولوں پر ایمان لائی۔ تو ان کی مراد پروردگار سے بت ہی تھے۔ انھیں نے کتابیں نازل کی ہیں اور انھیں بتوں نے انبیاء کو نبی اور رسول بنایا ہے اور انھیں بتوں نے دیوار کو در بنا دیا ہے، اور انھیں بتوں نے دعاء قبول کر کے ایک بت شکن کو پیدا کر دیا ہے لیکن عزیزو اتنا اور بتا دو کہ جب یہ سب کام بت کرتے ہیں تو تمہارا خدا کیا کرتا ہے؟ اور اس کا کیا مصرف ہے؟ اس کے اختیارات کیا ہیں؟ اور اس کے اپنے اعمال و افعال کیا ہیں؟۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ بتوں کی نسلی محبت ہے جو اس قسم کے تصورات پر آمادہ کر رہی ہے ورنہ کوئی مسلمان یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ جناب فاطمہؑ بنت اسد بتوں سے دعاء کریں گی اور یہ سارے کرامات و کمالات بتوں سے ظہور میں آئیں گے، سچ ہے بت پرستوں کو بت ہی نظر آتے ہیں، بت شکن نہیں، صلوات،

لیکن اس مقام پر آنے کے بعد مجھے ایک فقرہ اور کہنا پڑے گا کہ اس اعتراض کی گنجائش کہاں سے پیدا ہوئی اور یہ خیال مسلمانوں کے ذہن میں آیا کہاں سے کہ جناب فاطمہؑ بنت اسد بتوں سے دعاء کرنے کے لئے آئی تھیں، بات صرف یہ ہے کہ اگر آج خانہ کعبہ میں بت نہ ہوتے تو اس اعتراض کی گنجائش بھی نہ ہوتی۔ یہ انھیں بتوں کے وجود کا کرشمہ ہے کہ دعائے فاطمہؑ بنت اسد مشکوک بنا دی گئی۔ اور اس پر بتوں سے دعاء کرنے کا الزام لگا دیا گیا۔ تو ارباب کرم ذرا اتنا اور سوچئے کہ اگر کہیں یہ بت آج تک رہ جاتے تو ہمارا کیا حشر ہوتا، ہمارا ہر سجدہ مشکوک ہوتا، ہماری ہر نماز مشکوک ہو جاتی ہمارا ہر فریضہ مشکوک ہو جاتا، ہمارا ہر عمل مشکوک ہو جاتا، حد یہ ہے کہ ہمارا دفن و کفن

تک مشکوک رہ جاتا۔ اور دنیا کو یہ کہنے کا موقع مل جاتا کہ مسلمانوں کو اللہ سے کوئی محبت نہیں ہے یہ تو بتوں کا کرشمہ ہے کہ یہ نمازیں بھی پڑھ رہے ہیں، سجدے بھی کر رہے ہیں، اطاعتیں بھی کر رہے ہیں، عبادتیں بھی کر رہے ہیں۔ ان کا ہر عمل انھیں بتوں کے لئے ہے، خانہ خدا تو فقط ایک بہانہ ہے جس کی طرف خواہ مخواہ رخ مڑ جاتا ہے ـــــ بتایئے دنیائے اسلام میں اس الزام کا کوئی جواب تھا اور کس مسلمان میں اتنی ہمت تھی کہ اپنے عمل کے اخلاص کو ثابت کر سکتا اور دنیا کو یہ بتا سکتا کہ ہمارا عمل اللہ کے لئے ہے اس کا بتوں سے کوئی تعلق نہیں ہے اور جب یہ اثبات ممکن نہیں تھا تو ماننا پڑے گا کہ اس انسان نے پوری دنیائے انسانیت و عبدیت پر احسان کیا ہے، جس نے خانہ کعبہ کو بتوں سے پاک کر دیا ہے اور سجدوں کو اللہ کے لئے بنا دیا ہے۔ دیکھا آپ نے علیؑ کی عظمت کیا ہے۔ عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد۔ دشمن نے اپنی جانب میں بنت اسدؑ پر الزام لگایا تھا لیکن یہی الزام فضائل کی بنیاد بن گیا اور یہ ثابت ہو گیا کہ علیؑ نے خانہ کعبہ کو بتوں سے پاک نہ کر دیا ہوتا تو مسلمانوں کی کل عبادت اور بندگی مشکوک ہو جاتی۔ اور علیؑ کا پوری دنیائے عبدیت و بندگی پر احسان ہے کہ انھوں نے سجدوں کو خلوص بخشا عبادتوں کو اخلاص عنایت کیا اور بتوں کی طرف جاتے ہوئے ذہنوں کو خدا کی طرف موڑ دیا۔ اور یہ بھی ایک بت شکنی ہے جو علیؑ نے ولادت کے وقت انجام دی ہے۔ علیؑ صرف پتھروں کے بتوں کے بت شکن نہیں ہیں۔ بلکہ علیؑ اس بت شکن کا نام ہے جس نے پتھر کے بت توڑے، غرور کے بت توڑے، شکوک و شبہات کے بت توڑے اور کعبۂ دل کو جملہ بتوں سے پاک کر کے عرش الرحمن بنا دیا، علیؑ نہ ہوتے تو خانہ کعبہ بیت اللہ نہ کہا جاتا۔ اور علیؑ نہ ہوتے تو قلب مومن عرش الرحمن نہ بنایا جاتا۔

عزیزانِ گرامی! بات آگئی ہے تو خاتمۂ کلام میں ایک اور فقرہ کہہ کے آپ کی بحث کو تمام کر دوں کہ دنیا علیؑ کی اس فضیلت سے کیا مقابلہ کرے گی، انبیاء اس منزل پر نہیں آسکے آپکو یاد ہوگا کہ جب جنابِ مریم کے یہاں جنابِ عیسٰیؑ کی ولادت کا وقت آیا تھا تو بیت المقدس میں رہنے والی مریم سے کہا گیا تھا کہ مریم باہر چلی جاؤ، یہ عبادت خانہ ہے زچہ خانہ نہیں ہے۔ اور جب علیؑ کی ولادت کا وقت آیا تو اپنے گھر میں رہنے والی بنت اسدؑ کو دیوار میں در بنا کے بلا لیا، حالانکہ بیت المقدس کی حیثیت عارضی تھی۔ وہ چند دنوں کے لئے قبلہ بنا گیا تھا، اور خانۂ کعبہ کی حیثیت دائمی ہے، وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قبلہ ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ بیت المقدس جیسے گھر میں کلمۃ اللہ روح اللہ بلکہ بقول نصاریٰ (ابن اللہ) نہ پیدا ہونے دیا جائے اور خانۂ کعبہ میں فرزند ابوطالب پیدا ہو جائے،

عزیزانِ محترم! یہ علیؑ نہیں پیدا ہو رہے ہیں، یہ قدرت واضح کر رہی ہے کہ جو شرف ابن اللہ، کلمۃ اللہ عیسٰیؑ کو نہیں ملا، وہ شرف فرزند ابوطالبؑ کو مل رہا ہے۔ اب فیصلہ کرو کہ ابوطالبؑ کافر ہیں یا مومن، اور فیصلہ کرنے سے پہلے سوچ لینا کہ اگر میری حکمت اور عدالت پر اعتراض کیا تو تمہارا بھی ایمان نہ رہ جائے گا۔ عزیزو! ابوطالبؑ اس مردِ مومن کا نام ہے جو ایمان کی چہار دیواری میں رہتا ہے، اُدھر عبدالمطلبؑ اِدھر علیؑ، اُدھر فاطمہؑ بنت اسد، اِدھر رسولِ اکرمؐ، عبدالمطلب کی وصیت گواہ ہے کہ ابوطالبؑ صاحبِ ایمان ہیں۔ فاطمہؑ بنت اسد کی زوجیت گواہ ہے کہ ابوطالبؑ مومن ہیں، رسولِ اکرمؐ کی تربیت گواہ ہے کہ ابوطالبؑ حافظِ اسلام و ایمان ہیں اور علیؑ کی ولادت گواہ ہے کہ ابوطالبؑ صاحبِ ایمان نہیں بلکہ کل ایمان کے باپ ہیں۔ بلند نعرۂ صلوات،

علیؑ کی تاریخ میں یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ علیؑ کی ولادت

بھی اللہ کے گھر میں ہوئی اور دنیا سے جاتے ہوئے علیؑ کی شہادت کا سلسلہ بھی اللہ کے گھر سے شروع ہوا،

زندگی کا آغاز بھی خانۂ خدا سے اور انجام بھی خانۂ خدا پر۔ اور کھلی ہوئی بات ہے کہ انسان کی سوانح عمری میں ولادت و وفات کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے، قدرت نے علیؑ کے آغاز و انجام کو مسجد سے مربوط کر کے واضح کر دیا کہ علیؑ والا وہی ہوگا جس کا ربط کعبہ و مسجد سے ہو، جو طواف کعبہ سے فرار کرے اور مسجد میں نماز پڑھنے سے کنارہ کشی کرے اس کا علیؑ سے کوئی تعلق نہیں ہے، علیؑ آئے تو عظمتِ کعبہ کا اعلان کرتے ہوئے آئے اور گئے تو عظمتِ مسجد کا اعلان کرتے ہوئے۔ صلوات،

مولائے کائنات حضرت علی ابن ابیطالب علیہ السلام

اسم مبارک	:	علیؑ، حیدر، ایلیاؑ،
لقب	:	مرتضیٰ، امیرالمومنین وغیرہ
کنیت	:	ابوالحسن، ابوالائمہ،
والد ماجد	:	عمران (کنیت ابوطالب)
والدہ ماجدہ	:	فاطمہؑ بنت اسد،
ولادت	:	۱۳ رجب ۳۰ عام الفیل، خانہ کعبہ، بروز جمعہ،
ازواج	:	جناب سیدہؑ، ام البنین وغیرہ
اولاد	:	امام حسنؑ، امام حسینؑ، جناب زینبؑ، جناب ام کلثومؑ، جناب عباسؑ، جناب محمد حنفیہؑ وغیرہ
شہادت	:	۲۱ رمضان المبارک یکشنبہ
عمر مبارک	:	۶۳ سال،
قبر مطہر	:	نجف اشرف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین خاتم النبیین سیدنا ومولانا ابی القاسم محمد وآلہ الطیبین الطاہرین ولعنۃ اللہ علی اعدائھم اجمعین اما بعد فقد قال اللہ الحکیم فی کتابہ الکریم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انا علینا للھدیٰ وان لنا للآخرۃ والاولیٰ

ارشاد جناب اقدس الٰہی ہوتا ہے، بے شک ہدایت کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے اور دنیا و آخرت کا اختیار ہمارے ہاتھوں میں ہے۔

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ مالک کائنات نے ہدایت بشر کا انتظام روز اول سے اپنے ہاتھوں میں رکھا ہے اور تاریخ انسانیت میں کوئی دور ایسا نہیں گزرا جب اس نے کوئی ہادی اور راہبر نہ مقرر کیا ہو، اور ہدایت انسانیت کا کوئی انتظام نہ کیا ہو۔ آغاز تخلیق میں بشر سے پہلے ابوالبشر کو راہنما بنا کے پیدا کرنا خود اس بات کی دلیل ہے کہ قدرت اس بات کو گوارہ نہیں کر سکتی کہ دنیا میں گمراہوں کا وجود رہے اور راہنما کا وجود نہ رہے، ہدایت حاصل کرنے والے رہیں اور ہدایت دینے والا نہ ہو، اس نے یہ طے کر لیا ہے کہ جب تک کائنات میں کوئی ایک ہدایت لینے والا رہے گا، ہدایت دینے والا ضرور رہے گا چاہے پردۂ غیب ہی میں کیوں نہ رہے اور کھلی ہوئی بات ہے کہ جب اس نے آغاز کائنات میں یہ برداشت نہ کیا تو انجام میں کیسے برداشت کرے گا بلکہ میں تو یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ تخلیق کائنات میں آدم کا سب سے پہلا راہنما بن کر پیدا

ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ راہنما، راہرو سے پہلے ہوتا ہے تو اب مجھے کہنا پڑے گا کہ جس طرح کل کوئی راہرو نہیں تھا لیکن راہنما تھا اس طرح کل کوئی راہرو نہ رہ جائے گا لیکن راہنما ہر حال قائم رہے گا۔ صلوات،

تخلیقِ آدمؑ نے یہ بھی واضح کر دیا کہ راہنما کی خلقت میں ایک خصوصی اہتمام بھی برتا جاتا ہے جیسا کہ روایتوں میں بیان کیا گیا ہے کہ قدرت نے خلقتِ آدم کیلئے خصوصیت کے ساتھ مٹی فراہم کرائی اور پھر مدتوں اسے خمیر کیا گیا۔ اور پھر پیکرِ آدمیت تیار کر کے اس میں اپنی روح پھونکی اور پھر ملائکہ سے سجدہ کرایا، جو اس بات کی دلیل ہے کہ راہنما کی تخلیق میں ایک خصوصی اہتمام برتا جاتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کل جب قدرت نے تخلیقِ آدمؑ میں اتنا اہتمام برتا تھا تو پھر تخلیقِ نوحؑ و ابراہیمؑ و موسیٰؑ و عیسیٰؑ میں یہ اہتمام کیوں نہیں برتا گیا۔ اور اگر برتا گیا تو اس کا تذکرہ دامنِ قرآن میں کیوں نہیں ہے۔؟

میرا خیال ہے کہ قدرت نے ہر نمائندہ کی خلقت میں کوئی نہ کوئی اہتمام ضرور برتا ہے، جیسا کہ تاریخ کے بعض واقعات کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے لیکن تفصیلی تذکرہ صرف خلقتِ آدم میں اس لئے کیا گیا ہے کہ انسان پہلی ہی منزل پر اس نکتہ کو پہچان لے، اس کے بعد تو خود ہی اندازہ کرے گا کہ جب پہلے راہنما میں یہ غیر معمولی اہتمام کیا گیا ہے تو دوسرے راہنماؤں میں یہ اہتمام کیوں نہ رکھا جائے گا اور یہی انداز ہم نے ہر منزل پر دیکھا ہے۔ نبوت کے آغاز میں پہلے نبی کو اہتمام سے پیدا کر دیا تاکہ نبوت کی انفرادیت کا اندازہ ہو جائے اور امامت کی منزل میں پہلے امام کو بڑے اہتمام سے خلق کر دیا تاکہ

امامت کی جلالت کا اندازہ ہو جائے۔ صلوات،

نبی سب نبی ہیں اور امام سب امام ہیں، لیکن تاریخ گواہ ہے کہ نبوت کی منزل میں آدمؑ کے علاوہ کسی کے لئے سجدہ کرایا گیا اور نہ امامت کی منزل میں علیؑ کے علاوہ کوئی خانہ کعبہ میں پیدا ہوا۔ وہ تاریخ نبوت میں آدمؑ کا امتیاز تھا اور یہ تاریخ امامت میں علیؑ کا امتیاز ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جس طرح آدمؑ خلیفۃ الناس نہیں بلکہ خلیفۃ اللہ تھے اس طرح علیؑ خلیفۃ المسلمین نہیں بلکہ خلیفۃ اللہ تھے۔ علیؑ کا درجہ معین کرنا ہے تو آدمؑ سے سلسلہ شروع کرو علیؑ کے سلسلہ میں کوئی دوسرا بشر نہیں آسکتا اور یہی وجہ ہے کہ مولائے کائنات نے خود اعلان فرمایا تھا کہ میں چوتھا خلیفہ ہوں اور جب جاننے والوں نے حیرت سے پوچھا مولا! یہ کیا فرما رہے ہیں، ہم تو آپ کو خلیفہ بلافصل اور پہلا امام مانتے ہیں تو فرمایا۔ بے شک میں چوتھا خلیفہ ہوں۔ عرض کی، مولا! ذرا سی وضاحت فرمائیں، آپ کا مقصد کیا ہے۔ فرمایا۔ اللہ نے قرآن حکیم میں چار خلافتوں کا تذکرہ کیا ہے، سب سے پہلے اس نے آدمؑ کو خلیفہ بنایا، اس کے بعد داؤدؑ کی خلافت کا اعلان کیا، اس کے بعد ہارونؑ کو خلیفہ بنایا اور آخر میں مجھے خلیفہ قرار دیا، تو میں ان تینوں خلفاء الٰہی کا چوتھا خلیفہ ہوں۔ صلوات،

مولائے کائنات نے اس تفصیل سے دو باتوں کو واضح کر دیا۔ اول تو یہ کہ میرا سلسلہ الٰہی خلفاء سے ہے مسلمانوں کے خلفاء سے نہیں، مجھے ان سے نہ ملانا اور میری منزل کا تعین کرنے کے لئے ان کا سہارا نہ لینا، یہ خاطی ہیں، میں معصوم یہ جاہل ہیں میں عالم، یہ گنہگار ہیں میں پاکیزہ کردار، یہ بت پرست ہیں میں بت شکن، یہ مشرکین کے گھروں کے پیدا ہیں اور میں خانہ خدا کا پیدا۔

یہ آغاز میں ظلمت تھے اور انجام میں مادیت اور میں آغاز میں نور کامل تھا اور انجام میں نورِ مجسّم، ان کی خلقت مادہ سے ہے، میری خلقت نور سے ہے، ان کی خلقت جہالت کے ساتھ ہوئی ہے میری تخلیق تلاوتِ قرآن کے ساتھ، ان کی خلقت مشرک عورتوں کے ہجوم میں ہوئی ہے میری خلقت حورانِ جنت کے حضور میں ـــ انھیں دنیا نے اپنا نمائندہ بنایا ہے مجھے اللہ نے اپنا جانشین بنایا ہے، انھیں امت کی امداد نے صاحبِ اقتدار بنایا ہے مجھے الٰہی کرم نے جنت و جہنم کا مختار بنایا ہے، انھیں دنیا کے خزانوں نے غنی بنایا ہے مجھے الٰہی دولت نے امیر بنایا ہے، انھیں بندوں کے مفادات نے القاب و خطابات عطا کئے ہیں میری شان میں عرشِ الٰہی سے آیتیں اتری ہیں اور مختصر یہ ہے کہ انھوں نے تاجِ شاہی کو زینتِ سر بنایا ہے اور میں نے تاجِ حکومت کو ٹھوکروں میں رکھا ہے۔ صلوات؛

دوسری طرف مولائے کائناتؑ نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ قرآن مجید میں جس خلافت کا ذکر ہے وہ انبیاء کی خلافت ہے اہلِ دنیا کی خلافت نہیں ہے۔ اس نے یا تو آدمؑ و داؤدؑ و ہارونؑ کی خلافت کا ذکر کیا ہے یا آیتِ ولایت میں میری حکومت کا تذکرہ کیا ہے ـــ یا انبیاء و مرسلین کی جانشینی کا تذکرہ کیا ہے یا میدانِ غدیر میں میری عظمت کا اعلان کیا ہے۔ پہلے خلیفہ سے دین کا آغاز کیا ہے یا آخری خلیفہ پر دین کی تکمیل کی سند دی ہے اس کے علاوہ اس کے دامن میں کسی خلافت کی گنجائش نہیں ہے، میں غلطوں کی بحث میں نہیں جانا چاہتا، میں اگر یہ تسلیم بھی کر لوں کہ سلاطین دنیا کے فضائل و مناقب میں بھی آیتیں نازل ہوئی ہیں اور قرآن حکیم نے انھیں بھی اپنا ممدوح قرار دیا ہے تو بھی یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ قرآنِ حکیم نے ان کی خلافت و حکومت کا کوئی تذکرہ کیا ہے، اور تذکرہ کیا، بحمد اللہ چاہنے والوں نے آج تک

دعویٰ بھی نہیں کیا۔ تو اب مجھے کہنا پڑے گا کہ جس خلافت و امامت و حکومت و ولایت کا ذکر قرآن میں ہے وہ علیؑ کا حصہ ہے اور جس کا تذکرہ تاریخ میں ہے وہ سلاطین دنیا اور شاہانِ وقت کا حصہ ہے، اب امت کو اختیار ہے چاہے خلافتِ قرآن پر ایمان لائے یا خلافتِ تاریخ پر اور جب اس کا فیصلہ ہو جائے گا تب میں دیکھوں گا کہ حسبنا کتاب اللہ کے دعویٰ میں کتنا اثر ہے اور مجھے یہ کہنے کا حق ہوگا کہ حسبنا کتاب اللہ کا دعویٰ ہم کرتے تو زیب بھی دیتا، یہ تاریخ کے پرستاروں کو حسبنا کا دعویٰ کرنے کا حق کہاں سے پیدا ہو گیا۔ لیکن ہم نے یہ دعویٰ نہیں کیا۔ اس لئے کہ خود قرآن ہی نے اپنے مفسروں کی طرف اشارہ کر دیا ہے، اور مرسلِ اعظم بھی تنہا قرآن کو چھوڑ کر نہیں گئے بلکہ آپ نے بھی اعلان کر دیا ہے کہ میں دو گراں قدر چیزیں چھوڑے جاتا ہوں، ایک قرآن اور ایک میری عترتؑ اور میرے اہل بیتؑ،

اب تو یہ واضح ہو گیا کہ تنہا قرآن پر ایمان لانے والا نہ خدا کا وفادار ہے نہ پیغمبر کا، اس کا ایمان نہ توحید پر ہے نہ رسالت پر، اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ" کے نعروں کی کوئی قیمت نہیں ہے، جب تک "عَلِیٌّ وَلِیُّ اللّٰہِ" پر ایمان نہ ہوگا، نہ "لا الٰہ الا اللہ" کام آئے گا نہ "محمد رسول اللہ" صلوات!

عزیزانِ محترم! مجھے آج اسی سلسلۂ خلافتِ الٰہیہ کی چوتھی اور سلسلۂ امامتِ کبریٰ کی پہلی کڑی کے بارے میں کچھ عرض کرنا ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ قدرت نے اس کی ولادت میں کیا اہتمام برتا ہے۔

تاریخ اسلام گواہ ہے کہ جب مولائے کائنات کی ولادت کا وقت

قریب آیا تو جناب فاطمہؑ بنت اسد خانۂ کعبہ کے قریب آئیں اور اپنے شکم اقدس کو دیوار کعبہ سے مس کر کے دعا کی، اے پروردگار! میں تجھ پر ایمان لائی، تیری کتابوں پر ایمان لائی، تیرے رسولوں پر ایمان لائی، معبود! اس بیت کا واسطہ، اس کے معمار ابراہیمؑ کا واسطہ اور اے میرے پروردگار اس مولود کا واسطہ جو میرے شکم میں ہے، میری مشکل کو آسان کر دے۔ راوی کہتا ہے کہ ابھی دعاء تمام نہ ہوئی تھی کہ دیوار خانۂ کعبہ شق ہوئی اور نیا در پیدا ہوا، جناب فاطمہؑ بنت اسد خانۂ کعبہ کے اندر گئیں اور مولائے کائنات کی ولادت ہوئی، تین روز خانۂ کعبہ میں مقیم رہیں، دیوار اپنی اصلی حالت پر پلٹ گئی، لوگوں کو واقعہ کی خبر ہوئی تو چاروں طرف سے لوگ ٹوٹ پڑے۔ یہ کیا قیامت ہوئی، یہ دیوار کیوں کر شق ہوئی، یہ دوبارہ کس طرح جڑ گئی، یہ فاطمہؑ بنت اسد ڈریں کیوں نہیں، اور کس طرح اندر چلی گئیں، اور چلی گئیں تو اب باہر کیوں نہیں آتیں؟

دروازہ کھولنے کی کوشش کی گئی، لوہار بلائے گئے، قفل توڑنے کی سعی ہوئی لیکن قفل کو نہیں ٹوٹنا تھا نہ ٹوٹا، دروازہ کو نہیں کھلنا تھا نہ کھلا، تین دن کے بعد از خود دیوار میں در پیدا ہوا، اور فاطمہؑ بنت اسد خانۂ کعبہ سے باہر آئیں، پیغمبر اسلامؐ استقبال کے لئے بڑھے، بچہ کو چچی کی آغوش سے اپنی آغوش میں لیا، بچہ کی آنکھیں بند تھیں، جیسے ہی نبیؐ کی آغوش میں آیا، آنکھیں کھول دیں، اور جمال رسالت پر نظر ڈالی، پیغمبرؐ نے فرط مسرت سے اعلان کیا۔ یا علیؑ! تو نے اپنی نظر کے لئے مجھے مخصوص کیا اور میں نے اپنے علم کے لئے تجھے مخصوص کیا۔ صلوات،

عزیزان گرامی! واقعہ کی تفصیلات آپ کی نگاہ کے سامنے ہیں، غور کیجئے تو ہر لفظ ایک فضیلت اور ہر لمحہ ایک کرامت ہے، ہر منزل ایک شرف ہے، اور ہر قدم ایک جلالت۔

زیادہ تفصیل کا محل نہیں ہے، صرف چند لفظوں کی طرف آپکے ذہنوں کو متوجہ کر دینا چاہتا ہوں، پہلی بات تو یہ ہے کہ جب بنت اسد کو ولادت کی تکلیف کا سامنا ہوا تو گھر سے باہر کیوں نکلیں، ایسے موقع پر خواتین اپنے گھر میں رہا کرتی ہیں اور دوسری عورتیں دعاء کے لئے مسجد اور عبادت گاہوں کی طرف جایا کرتی ہیں لیکن یہاں فاطمہؑ بنت اسد نے کسی سے ذکر بھی نہیں کیا، اور خانۂ کعبہ تک چلی آئیں، اور پھر آئیں بھی تو ایسی پریشان نہیں کہ گھبرا کر اپنا مدعا بیان کر دیتیں، بلکہ پہلے اپنے ایمان کا اعلان کیا، پھر اپنے مولود کی جلالت کا واسطہ دیا اور آخر میں دعاء کی، دعاء کے بعد بھی دیوار کعبہ شق ہوئی تو پیچھے ہٹنے کے بجائے آگے بڑھ گئیں ــــــ آج اگر خدانخواستہ اسی عمارت کی کوئی دیوار ٹوٹنے لگے تو آپ حضرات بھی یہاں نظر نہ آئیں گے، چہ جائیکہ ایک خاتون اور وہ بھی ایسے سخت وقت میں جب کہ عورتیں سایہ سے بھی ڈرا کرتی ہیں اور پرچھائیوں سے بھی دہشت زدہ ہو جاتی ہیں جناب فاطمہؑ بنت اسد پیچھے ہٹنے کے بجائے آگے بڑھ جاتی ہیں اور خانۂ کعبہ کے اندر داخل ہو جاتی ہیں، اس کے بعد یہ خیال بھی نہیں ہے کہ وہاں کون مددگار ملے گا، کہاں سے عورتیں آئیں گی، کون اس موقع پر ساتھ دے گا، کہاں سے آب و دانہ کا انتظام ہوگا، کہاں سے آنے والے فرزند کے ضروریات فراہم ہوں گے۔ اور اس کے بعد قیامت یہ ہے کہ منظر کو دیکھ کر سارے شہر میں کہرام برپا ہے، تمام افراد سمٹ کر خانۂ کعبہ کے قریب آگئے ہیں اور تین دن گزرنے پر بھی جناب

ابوطالب نہیں آئے، جنھیں آنا چاہئے تھا، اور جن کی یہ ذمہ داری تھی، آج اگر ایسے موقع پر کوئی خاتون گھر سے باہر چلی جائے تو سب سے زیادہ فکر شوہر کو ہوگی، اور پھر ایسے ماحول میں جبکہ گھر کا دروازہ بند ہو اور کعبہ تک پہونچنا ممکن نہ ہو، کیا ابوطالبؑ کو اپنے آنے والے لال کی فکر نہیں ہے، کیا فاطمہؑ بنت اسد کی زحمتوں کا خیال نہیں ہے، کیا انھیں مکہ کے ہنگامہ کی خبر نہیں ہے، کیا ان سے لوگوں نے اس عجیب و غریب حادثہ کو نہیں بیان کیا۔ یقیناً یہ سب کچھ ہوا، تو پھر سوال یہ ہے کہ ابوطالبؑ کیوں نہیں آئے؟ اور قیامت یہ ہے کہ تین دن کے بعد بھی پیغمبر اسلامؐ آئے ابوطالبؑ نہیں آئے۔

عزیزانِ گرامی! واقعہ کے خصوصیات صاف اعلان کر رہے ہیں کہ یہ ولادت کسی عام بچہ کی ولادت نہیں ہے، اس میں قدرت نے ایک خصوصی اہتمام برتا ہے، اور اس کا انداز دنیا کے دوسرے افراد کی ولادت سے بالکل جداگانہ ہے، جبھی تو دیوار میں در بنا کے بلایا گیا ہے، اور بچہ بھی کیسا بچہ کہ تین دن گذر گئے آنکھ ہی نہیں کھولتا۔ ماں فطری اعتبار سے پریشان ہے کہ خدانخواستہ کیا وجہ ہے کہ بچہ آنکھ نہیں کھولتا اور بچہ ہے کہ آنکھ بند کئے ہوئے ہے اور تین دن کے بعد جیسے ہی آغوش پیغمبرؐ میں آتا ہے فوراً آنکھیں کھول دیتا ہے۔ یہ کس نے بتایا کہ کس کی آغوش سے کس کی آغوش میں آگیا، یہ کیسے معلوم ہوا کہ خانۂ کعبہ سے باہر آچکا ہے، یہ کیسے اندازہ ہوا کہ یہ ماں کی آغوش نہیں ہے، رسالت کی آغوش ہے، اور یہ کس نے سکھایا کہ خانۂ کعبہ کے اندر آنکھ نہیں کھولنا چاہئے آغوش پیغمبرؐ میں آکر آنکھ کھولنا چاہئے، کیا بچہ کو ماں سے زیادہ کسی سے انس ہے اور اگر ایسا ہے تو ماں بچہ کی شکایت کیوں نہیں کرتی اور یہ کیوں نہیں کہتی کہ میرا چھوٹا بچہ (معاذاللہ) ایک نقص لے کر آیا ہے کہ اس کی آنکھیں نہیں کھلتیں اور پھر نبوت کو کیا ہوگیا ہے کہ جب بر بنائے فطرت بچہ آنکھ کھولتا ہے اور جو چہرہ سامنے ہوتا ہے اسے دیکھتا ہے تو نبوت کو یہ ادا اس قدر پسند آجاتی ہے کہ اتنی ہی سی بات پر سارے علم کا فیصلہ کر دیتا ہے اور نظر سے علم کا سودا ہو جاتا ہے۔

اربابِ کرم! شعراء کے یہاں نظر سے سیراب ہونا تو دیکھا تھا لیکن نظر سے کمالات کا منتقل ہونا نہیں دیکھا تھا، یہ آج دیکھ رہا ہوں کہ آنے والے بچہ نے ایک نظر میں سارے کمالات کا سودا کر لیا، یہ بچہ بھی عجیب بچہ ہے کہ بچپنے میں چہرۂ رسالت پر ایک نگاہ ڈالتا ہے تو علم رسالت کا سودا کر لیتا ہے اور جوانی میں بسترِ رسالت پر ایک نیند سو جاتا ہے تو مرضی پروردگار کا سودا کر لیتا ہے۔ صلوات،

تفصیلات کی ضرورت نہیں ہے، واقعہ کے خصوصیات نگاہ میں آگئے ہیں اب اس کے سوا کچھ کہنے کی گنجائش نہیں ہے کہ یہ خدا اور رسولؐ کا ایک جانا پہچانا منصوبہ تھا، جس کی رازدار جناب فاطمہؑ بنت اسد بھی تھیں اور جناب ابوطالبؑ بھی، اور بزرگوں پر اضطراب طاری نہ ہونا بھی اسی بنیاد پر تھا کہ سب کو مرضیِ الٰہی کی خبر تھی اور سب کو معلوم تھا کہ آج قدرت کا یہی اہتمام ہے اور واقعات کو اسی انداز میں پیش آنا ہے اور اگر الگ الگ تفصیلات دریافت کرنا چاہتے ہیں تو مختصر لفظوں میں یوں سمجھئے کہ جناب فاطمہؑ بنت اسد گھر سے نکل کر خانۂ کعبہ تک اس لئے آئیں کہ آج کا مولود میرا شناسندہ نہیں ہے، پروردگار کا شناسندہ ہے، دعا سے پہلے ایمان کا اعلان اس لئے کیا کہ نافہم اُمت میرے

ایمان کا اندازہ کر لے اور کل بحث ایمان میں آپ کی طرح ماں کا ایمان بھی جھگڑے میں نہ پڑ جائے، اور جب میرا ایمان ثابت ہو جائے گا تو دنیائے عقل و ہوش کو سوچنا پڑے گا کہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے مسلمان عورت کسی کافر مرد کی زوجیت میں نہیں رہ سکتی اور اس طرح میرے شوہر کے ایمان کا بھی اعلان ہو جائے گا۔ صلوات،

دعاء میں انبیاء اور کتب کا حوالہ دے کر اپنے ایمان کی وسعت اور اپنے معلومات کی بلندی کا اعلان کیا اور معصوم کا حوالہ دے کر واضح کر دیا کہ خانۂ کعبہ کے گرد بھی وسیلہ کے بغیر دعاء قبول نہیں ہوتی، اب وہ لوگ خانۂ خدا سے کہاں جائیں گے جو وسیلہ کے قائل نہیں ہیں اور خدا تک بلا وسیلہ پہنچنا چاہتے ہیں۔

مجھے تو کہنا پڑتا ہے کہ براہ راست جانے والے براہِ راست ہی جائیں گے، اب کہاں جائیں گے اس کا فیصلہ روزِ قیامت ہوگا، اور اگر آج جاننا چاہتے ہیں تو اس حدیث کو پڑھ لیجیے جس میں مسلمان نے اپنے خدا کو بھی جہنم میں ڈھکیل دیا ہے۔ اور یہ اعلان کر دیا ہے کہ جب جہنم کا پیٹ نہیں بھرے گا تو معاذ اللہ خدا بھی اپنا ایک پیر جہنم میں ڈال دے گا۔

عزیزو! اختیار جنت کو اپنا وسیلہ بناؤ تاکہ جنت تک جانے کا راستہ ملے، ورنہ براہ راست وہیں جانا پڑے گا جہاں پہلے سے معاذ اللہ اپنے خدا کو بھیج دیا ہے۔

معصوم کا واسطہ دینے کے بعد اپنے مولود فرزند کا واسطہ دیا تاکہ دنیا پہچان لے کہ میرا لال دنیا میں آنے کے بعد ہی مشکل کشا نہیں ہے، عالم انوار سے

قلعہ کی مثال دیکر یہ بھی واضح کر دیا کہ ایسا خناس قلعوں ہی میں پیدا ہوتا ہے اور ایسے عقیدے راحت و آسائش ہی میں جنم لیتے ہیں۔ صاحبان اقتدار سمجھ لیں کہ خدا کا اقتدار بند قلعوں کے اندر بھی چلتا ہے۔ اس نے انسان کو متوجہ کر دیا ہے کہ تم کہیں بھی رہو موت تمہیں تلاش کرے گی۔ چاہے بند قلعوں ہی میں کیوں نہ رہو ۔۔۔ صاحبان قصر و محل سمجھ لیں کہ دنیا کی گرفت سے آزاد ہو سکتے ہیں لیکن خدائی گرفت سے بچ کر نہیں نکل سکتے ۔۔۔ صلوات

ابو العوجاء نامی شخص کا نام سنا ہوگا۔ یہ ایک دہریہ مزاج اور بدزبان انسان تھا۔ مذہب پر اعتراض کرنا اس کا شعار تھا اور گفتگو ایسے انداز سے کرتا تھا کہ کوئی اسے منہ لگانے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اور اس طرح اس کی اور ہمت آ گئی تھی کہ ہر ایک سے یہ بھی دعویٰ کرتا تھا کہ کسی میں مجھ سے بحث کرنے کی ہمت نہیں ہے۔ نام کا بھی ابو العوجاء تھا اور مزاج کا بھی ٹیڑھا تھا۔ ایک مرتبہ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ مجھے آپ سے چند سوالات کرنا ہیں۔

آپ نے فرمایا کہ جو پوچھنا ہو پوچھو۔

اس نے پوچھا کہ آخر یہ حاجی لوگ کب تک مکہ کی زمین کو روندا کریں گے۔ کب تک ایک پتھر کی پوجا کرتے رہیں گے۔ کب تک ایک مکان کے گرد جانوروں کی طرح چکر لگاتے رہیں گے۔ کیا آپ کو یہ اعمال جاہلانہ نہیں معلوم ہوتے اور کیا اسلام کے پاس دوسرا مکان اور دوسرا کام نہیں ہے کہ مسلمان دوسرا کام کریں اور یہ جہالت کا کام چھوڑ دیں۔

آپ نہایت سکون سے اعتراض سنتے رہے اور جب اعتراض تمام

ہوگیا تو فرمایا۔ بھائی کعبہ ایک زمین کا نام نہیں ہے۔ اسے خدا نے اپنا حرم قرار دیا ہے۔ خانہ کعبہ ایک گھر نہیں ہے اسے خدا نے اپنا گھر بنایا ہے۔ مسلمان کسی زمین یا گھر کی عبادت نہیں کرتے اس خدا کی عبادت کرتے ہیں جس نے اس زمین اور مکان کو عزت دی ہے۔ یاد رکھ یہ گھر خلقت دنیا سے دو ہزار سال پہلے سے پیدا ہو چکا ہے۔ اسے اللہ نے بخشش کا وسیلہ اور رحمت کا ذریعہ بنایا ہے۔ ہم مسلمان گھر کا احترام نہیں کرتے اس نسبت کا احترام کرتے ہیں جو اس گھر کو پروردگار سے حاصل ہے۔

ابوالعوجا نے سوال کو اور آگے بڑھا دیا۔ ہم اس خدا ہی کو نہیں مانتے جس کی طرف گھر کی نسبت دی گئی ہے۔ اور گھر تو کم از کم سامنے موجود ہے۔ اس خدا کا تو پتہ بھی نہیں ہے کہ کہاں ہے۔ آپ نے ایک غائب ہستی کا پتہ دے دیا اور ہم غائب پر ایمان نہیں رکھتے۔

آپ نے فرمایا تو نے عقل سے کام نہیں لیا۔ وہ نگاہ سے غائب ہے۔ عقل سے غائب نہیں ہے۔ عقل کی نگاہ میں ہر جگہ موجود ہے۔ ہر آن موجود ہے۔ رگ گردن سے زیادہ قریب ہے۔ ہر ایک کی سنتا ہے۔ ہر ایک کے عمل کو دیکھتا ہے۔ ہر ایک کے راز دل کو جانتا ہے۔ اس کے وجود کا وہی انکار کر سکتا ہے جو اپنی عقل سے انکار کر دے۔ عاقل اس کے وجود سے انکار نہیں کر سکتا۔ خدا کا عقیدہ عقل سے پیدا ہوتا ہے نظر سے نہیں۔

ابوالعوجا نے کہا یہ سب تو صحیح ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس کے ہر جگہ ہونے کا ثبوت کیا ہے۔ وہ زمین پر ہے تو آسمان پر کیسے ہے اور آسمان پر ہے تو زمین پر کس طرح ہے۔ ایک شے مختلف مقامات پر کس طرح رہ سکتی ہے۔

حضرت نے فرمایا کہ تو نے خدا کا صحیح تصور ہی نہیں کیا۔ خدا وہ نہیں

ہے جو کسی مکان میں محدود ہو جائے۔ یہ تو مخلوق کا تصور ہے۔ خالق کا مطلب ہی یہ ہے کہ کسی مکان کا پابند نہ ہو اور ہر جگہ رہے۔

ابوالعوجا نے کہا ٹھیک ہے خالق کسی جگہ کا پابند نہیں ہے۔ لیکن اس کا خالق ہونا ہی کیسے ثابت ہوا؟ خالق مان لیا جائے تو کوئی بحث ہی نہیں ہے۔ اصل بحث تو یہی ہے کہ اس کے خالق ہونے کا کیا ثبوت ہے؟

آپ نے فرمایا۔ یہ بھی کوئی پوچھنے کی چیز ہے۔ یہی بتا دے کہ تجھے کس نے پیدا کیا ہے۔؟

اس نے فوراً جواب دیا۔ مجھے کسی نے نہیں پیدا کیا ہے۔

آپ نے فرمایا کہ اچھا تو کوئی چیز بغیر بنانے والے کے بھی بن سکتی ہے۔ وہ کون سی شے ہے جو بغیر بنانے والے کے وجود میں آگئی ہو؟

یہ سننا تھا کہ ابوالعوجا چکرا گیا اور گھبرا کر کہنے لگا۔ خیر اس موضوع کو چھوڑیئے۔ ابھی اعتراضات بہت ہیں۔ ایک مسئلہ یہی ہے کہ یہ حشر و نشر یہ حساب و کتاب یہ قیامت و آفت کیا بلا ہے۔ جب انسان مر کر مٹی کا ڈھیر ہو گیا اور خاک میں مل گیا تو حشر و نشر کا کیا مطلب ہے؟ یہ باتیں تو بالکل عجیب و غریب معلوم ہوتی ہیں۔

آپ نے فرمایا کہ اتنا سوچ لے کہ مرنے کے بعد حساب و کتاب نہ نکلا تو نہ میرا کوئی نقصان ہے نہ تیرا۔ میں نے مذہبی زندگی گذاری۔ تو نے لامذہب زندگی گذاری۔ مرنے کے بعد زندہ ہونا ہی نہیں ہے کہ تجھے خوشی ہو اور مجھے افسوس ہو یا تجھے افسوس ہو اور مجھے خوشی ہو لیکن اگر مرنے کے بعد حشر و نشر اور حساب و کتاب نکل آیا تو میں فائدہ میں رہوں گا۔ اور تیرا نقصان ہو جائے گا۔

ابوالعوجا گھبرا گیا اور کہنے لگا قرآن میں قیامت کے بارے میں ہے کہ

"جب اہل جہنم کی ایک کھال جل جائے گی تو ہم دوسری کھال بدل دیں گے تاکہ یہ عذاب کا مزہ چکھیں" سوال یہ ہے کہ گناہ تو ایک کھال نے کیا ہے۔ یہ دوسری کھال نے کیا بگاڑا ہے کہ اسے بھی جہنم میں جلایا جائے گا۔

حضرت نے فرمایا تو فلسفہ عذاب ہی نہیں سمجھا۔ دوسری کھال کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ کہیں اور سے لاکر پہنا دی جائے گی۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہی کھال دوبارہ درست کرکے پھر جسم پر چڑھا دی جائے گی۔ جس طرح ایک اینٹ کو توڑ کر دوبارہ اینٹ بنالی جاتی ہے اور ایک مادہ کو بگاڑ کر دوبارہ نئی شکل دیدی جاتی ہے۔

ابوالعوجا نے بات بدل دی۔ ابھی تو موت ہی کا فلسفہ سمجھ میں نہیں آیا جہنم کا کیا ذکر ہے۔ یہ پروردگار کا نظام موت کیا ہے۔ کوئی کسی مرض میں مرتا ہے کوئی کسی مرض میں مرتا ہے۔ کوئی بغیر مرض مر جاتا ہے۔ ہر طرف ایک نیا ہنگامہ ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ موت کے لئے ایک مرض معین ہو جاتا اور لوگ اسی مرض میں مرا کرتے۔ کم سے کم ایک نظام مقرر ہوتا اور اس قدر افراتفری تو نہ ہوتی۔

آپ نے فرمایا بیشک لیکن تو نے یہ نہیں سوچا کہ اس طرح لوگ اس مرض کے آنے تک کس طرح موت کی طرف سے مطمئن رہتے۔ اور انہیں موت کا خیال بھی نہ آتا۔ پروردگار عالم یہی نہیں چاہتا تھا۔ کہ لوگ موت سے غافل ہو جائیں اور بندگی چھوڑ دیں۔ اس نے موت کے اسباب اسی لئے الگ الگ رکھ دیئے ہیں کہ انسان کو ہر آن موت کا خیال رہے۔ اور کسی وقت موت سے غافل نہ ہونے پائے۔

عزیزانِ محترم! یہ ابوالعوجا کے مختلف سوالات تھے۔ جو اس نے مختلف مواقع پر امام جعفر صادقؑ سے کئے ہیں۔ سوالات کی نوعیت دیکھ کر اندازہ ہوگا کہ اس دور میں ذہن کس قدر بگڑ گئے تھے۔ اور ارباب حکومت کی جہالت وبے لسی نے انسانوں

کو کس قدر تیز وتند بنا دیا تھا کہ جس کا جو چاہے اعتراض کردے کوئی جواب دینے والا نہیں تھا۔ آج اگر خدا کی طرف کا معین کیا ہوا نمائندہ نہ ہوتا تو مذہب کا کیا حشر ہوتا اور اسلام کس ٹھکانے لگتا۔ اس کا اندازہ انہیں حالات سے کیا جا سکتا ہے اور میں تو گذارش کروں گا کہ ایک نظر دوبارہ سوالات پر ڈالئے تو اندازہ ہوگا کہ ذہن بھٹکے کہاں سے ہیں اور گمراہی کا راستہ کہاں سے نکلتا ہے ابوالعوجا کے ابتدائی سوالات ہی بتاتے ہیں کہ مذہب پر اعتراض کے دو رخ ہیں۔ یا انسان غیب کا انکار کردے یا نسبت کی اہمیت سے غافل ہو جائے۔ اگر ذہن میں غیب کا عقیدہ ہے اور نگاہ میں نسبت کی اہمیت ہے تو نہ کعبہ پر اعتراض ہو سکتا ہے اور نہ حجر اسود پر۔ نہ عبادات پر بحث ہو سکتی ہے نہ حشر ونشر پر۔ نہ جہنم پر حملہ کیا جا سکتا ہے نہ موت پر۔ یہ صرف غیب اور نسبت سے غفلت کا نتیجہ ہے کہ اتنے اعتراضات پیدا ہو گئے اور صبح وشام پیدا ہوتے جا رہے ہیں۔ ائمہ معصومینؑ کا یہی کردار تھا کہ انھوں نے اپنے چاہنے والوں کو ان دونوں چیزوں سے غافل نہیں ہونے دیا۔ اور خدا کا شکر ہے کہ آج ان کے غلاموں کا عقیدہ غیبت پر بھی ہے اور نسبت پر بھی۔ غیبت کے استحکام کے لئے ایک امام غائب پر ایمان رکھے ہوئے ہیں۔ اور نسبت کے احترام کے لئے پورے سلسلۂ عزا کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ جہاں ہر شے کا احترام نسبت ہی سے پیدا ہوا ہے اور پورا نظامِ نسبت برقرار رہے۔ یہ غیبت ونسبت سے دوری کا نتیجہ ہے کہ قوم میں ابوالعوجا جیسے لوگ پیدا ہو گئے اور یہاں انہیں دونوں عقیدوں کی برکت ہے کہ اپنی قوم میں کوئی ابوالعوجا نہیں پیدا ہوا۔ آپ نے غور کیا میں نے کیا عرض کیا۔ ایسے بدعقیدہ لوگ اسی جماعت میں پیدا ہوتے ہیں جہاں غیبت اور نسبت کا عقیدہ نہیں ہوتا۔

اور جہاں غیبت کی برکت اور نسبت کی عظمت ہوتی ہے وہاں گمراہی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ـــ صلوات

اور شاید یہی وجہ ہے کہ جب ایک شخص نے امام جعفر صادقؑ پر اعتراض کیا کہ کیا وجہ ہے کہ آپ کے شیعہ اعمال کم کرتے ہیں اور آپ کے دشمنوں کے اعمال دوستوں کے اعمال سے زیادہ ہیں ـــ تو آپ نے فرمایا کہ بات یہ ہے کہ شیطان ان کے عقائد کی طرف سے مایوس ہوگیا ہے اور اسے معلوم ہوگیا ہے کہ یہ عقیدہ میں نہیں بہک سکتے۔ تو وہ انھیں اعمال میں بہکا رہا ہے اور دوسروں کی طرف سے مطمئن ہوگیا ہے کہ عقیدہ میں بہک چکے ہیں تو سوچتا ہے کہ اب عمل میں کیا رکھا ہے۔ لگا رہنے دو۔ میرا نقصان بھی کیا ہوتا ہے۔ بلکہ کبھی عمل سے فرصت مل گئی تو ممکن ہے کہ عقیدہ کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ صبح و شام اعمال میں لگے رہیں اور عقیدہ کی طرف آنے کا موقع ہی نہ پائیں۔

ارباب کرم! دیکھا آپ نے۔ امامؑ نے کیا فرمایا؟ فرماتے ہیں کہ شیطان نے دو جماعتوں کو دو طریقوں سے گمراہ کیا ہے۔ کسی کو عمل سے گمراہ کیا ہے اور کسی کو عقیدہ سے۔ عقیدہ کی گمراہی بدتر ضرور ہے لیکن عمل کی گمراہی بھی گمراہی ہی ہے اس لئے اب دشمنانِ اہلبیتؑ کو بھی سوچنا پڑے گا اور دوستانِ اہلبیتؑ کو بھی سوچنا پڑے گا کہ شیطان کا جادو دونوں پر چل سکتا ہے اور اس کے اغوا سے کوئی محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اس نے ایک کو عمل میں لے لیا ہے اور دوسرے کو عقیدہ میں۔ اب واقعی بندۂ خدا وہ ہے جو نہ عمل میں بہکنے پائے نہ عقیدہ میں۔ اور یہی شان تھی ان اصحاب معصومین کی جو عمل میں بھی قابل رشک تھے اور عقیدہ بھی قابل تقلید۔ اور کیوں نہ ہوتا ایسے مرکز سے وابستہ تھے جہاں

گمراہی کا تصور بھی نہیں تھا اور ایسی ذات پر اعتماد کئے ہوئے تھے جو ادھر کی نمائندہ نہ تھی بلکہ اُدھر کی نمائندہ تھی۔

اور کردار کا یہ عالم تھا کہ سجدہ میں چلے جائیں تو زمین سربلند ہو جائے دسترخوان پر بیٹھ جائیں تو نعمتیں ناز کریں۔ باغ میں مزدوری کریں تو اسلام کو عزت مل جائے۔ غریبوں کو کھانا تقسیم کریں تو زندگی بھر کسی کو غربت کا احساس نہ ہو۔ صبر کریں تو صبر سرفراز ہو جائے۔ شکر کریں تو شکر شکریہ ادا کرے۔ چپ ہو جائیں تو مصحف ناطق کہے جائیں۔ اور بول پڑیں تو امام صادقؑ کہے جائیں۔ صلوات

ایک شخص نے امامؑ کے دسترخوان پر لذیذ کھانے دیکھ کر اعتراض کیا کہ آپ کو قیامت کے حساب و کتاب کا خیال نہیں ہے۔ جتنا اچھا کھانا کھایا جائے گا اتنا ہی سخت حساب دینا پڑے گا۔ آپ نے فرمایا یہ تو نے کہاں سے نکال لیا ہے۔ اس نے کہا قرآن مجید میں لکھا ہے۔ "ثُمَّ لَتُسْأَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ" تم سے قیامت کے دن نعمتوں کا سوال کیا جائیگا فرمایا افسوس کہ تو نے پروردگار کو اپنا ہی جیسا بخیل سمجھ لیا ہے کہ وہ دسترخوان پر کھانا کھلا کر پھر حساب لے گا۔ کاش تو نے کرم الٰہی کی معرفت حاصل کی ہوتی تو تجھے معلوم ہوتا کہ کریم کھلا کر کھانے کا حساب نہیں لیتا۔ اس نے کہا پھر آیت کا مطلب کیا ہے؟ آپ نے فرمایا یہ نعمت ہم اہلبیتؑ کی محبت ہے۔ جس کا قیامت کے دن حساب کیا جائے گا۔ اور اس حساب سے کوئی محفوظ نہ رہ سکے گا۔ اس سے بڑی کوئی نعمت نہیں ہے۔ کیا تجھے یاد نہیں ہے کہ جب تک ہماری ولایت دنیا میں نہیں آئی تھی ہر نعمت ناقص اور ناتمام تھی اور جب ہماری معرفت درمیان میں آگئی تو نعمتوں کی تکمیل ہوگئی۔ اور قدرت نے اعلان کر دیا "اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا" قیامت کے دن کھانے کا حساب نہیں دینا ہوگا غدیر کے اعلان کا حساب دینا ہوگا۔ اور جب اعلان کے بغیر

(صلوات — [illegible])

جنابُ امام حسن علیہ السلام

اسم مبارک	:	حسنؑ ،
لقب	:	مجتبیٰ ، زکی ، وغیرہ ،
کنیت	:	ابو محمدؑ ،
والدِ ماجد	:	حضرت علیؑ ابن ابیطالبؑ ،
والدۂ ماجدہ	:	جناب فاطمہ زہراؑ ،
ولادت	:	۱۵ رمضان المبارک ۳ھ مدینہ منورہ ،
ازواج	:	کنیزوں سمیت ۶۴
اولاد	:	جناب قاسم، حسن مثنیٰ، عبداللہ وغیرہ ۱۵ سے ۲۲ تک
شہادت	:	۲۸ صفر ۵۰ھ مدینہ منورہ ،
عمر شریف	:	۴۷ سال ،
قبر مطہر	:	جنت البقیع ،

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید الانبیاء

والمرسلین خاتم النبیین سیدنا و مولانا ابی القاسم محمد

وآلہ الطیبین الطاہرین ولعنۃ اللہ علیٰ اعدائہم اجمعین۔

اما بعد فقد قال اللہ الحکیم فی کتابہ الکریم،

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى

ارشادِ جناب احدیت ہوتا ہے، بے شک ہدایت کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے اور دنیا و آخرت کا اختیار ہمارے ہاتھوں میں ہے۔

تاریخِ انسانیت کا کوئی دور ایسا نہیں گزرا جب مالکِ کائنات نے ہدایت کا انتظام نہ کیا ہو اور عالمِ بشریت کی رہنمائی کے لئے کوئی نہ کوئی ہادی اور راہنما نہ معین کیا ہو۔ تاریخ خود گواہ ہے کہ اس نے ضرورت و حالات کے مطابق ایک ایک دور میں متعدد ہادی اور راہنما بھی معین کئے ہیں اور کوئی قریہ، کوئی شہر، کوئی بستی ایسی نہیں چھوڑی جہاں اپنا ہادی اور راہنما نہ بھیجا ہو تفصیلات ملیں یا نہ ملیں۔ قرآن مجید خود گواہ ہے کہ ایک ایک وقت میں متعدد راہنما رہے ہیں اور اپنے اپنے علاقہ میں ہدایت کا فرض انجام دیتے رہے ہیں۔ بلکہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک ہی علاقہ میں متعدد راہنما بھیجے گئے۔ اگر قوم ایک کی آواز کو ہوا میں اڑا دینا چاہے تو دوسرا تائید کرنے کے لئے موجود ہے۔ جناب موسیٰؑ اور جناب ہارونؑ کا واقعہ کسے نہیں معلوم کہ پروردگارِ عالم نے فرعون کی ہدایت کے لئے دونوں کو ایک ساتھ بھیجا، اور موسیٰؑ نے خود ہی یہ مطالبہ کیا کہ پروردگار میرے بھائی ہارون کو میرا وزیر بنا کر

میری پشت مضبوط کرے، حیرت کی بات ہے کہ موسیٰ نبی ہیں اور ہارون ان کے وصی، نبی اپنے وجود کو ہدایت کی منزل میں ناکافی سمجھ رہا ہے اور ایک وزیر کی ضرورت محسوس کر رہا ہے اور پیغمبر اسلام کے زمانہ میں وہ انقلاب آیا کہ نبی کے اٹھتے ہی کتاب کافی ہو گئی اور نبی کے وزیر کی ضرورت نہ رہی۔

کاش کوئی ہوتا جو موسیٰ سے کہتا۔ نبی خدا! یہ آپ کیا کر رہے ہیں ایک نبی کے لئے باعث توہین ہے کہ وہ منزلِ تبلیغ میں کسی وصی یا وزیر کی ضرورت محسوس کرے، آپ تشریف لے جائیں، اللہ آپ کی مدد کرے گا۔ نبی کو خدا پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔ وصی و وزیر کی کیا ضرورت ہے؟ لیکن جناب موسیٰ آواز دیں گے کہ انبیاء کی مصلحتوں کو تو نہیں سمجھ سکتا۔ اسے ہم بہتر جانتے ہیں کہ کس وقت کس چیز کی ضرورت ہے۔ یہ تیرے سمجھنے کی بات نہیں ہے۔

میں عرض کروں گا کہ کبھی نبوت پر بھی ایسا وقت آ سکتا ہے، جب نبی وصی کے بغیر اپنے وجود کو ناکافی سمجھے اور وصی کے وجود کو اپنے وجود کی تکمیل قرار دے۔

یقیناً ایسا ہی ہے اور ایسا نہ ہوتا تو دعوت ذوالعشیرہ میں مددگار کی جستجو نہ ہوتی اور نبی اکرمؐ اپنے اعتماد پر اعلانِ اسلام کر دیتے۔ فرق صرف یہ ہے کہ موسیٰ کو اپنے ہارونؑ کی ضرورت تھی اور پیغمبر اسلامؐ کو اپنے ہارونؑ کی ضرورت ہے اور اسی وجہ سے تو پیغمبرؐ نے کہدیا تھا یا علیؑ میری اور تمہاری وہی نسبت ہے جو موسیٰؑ اور ہارونؑ کی تھی۔ فرق بس یہ ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔ ہارونؑ کو مرتبہ نبوت بھی ملا تھا اور تم نبی نہ ہو گے، باقی جملہ ہارونی صفات و کمالات تمہارے اندر بطریق اولیٰ پائے جاتے ہیں۔ آپ اسے نقص اور کمزوری نہ سمجھیں، ہارونؑ کو

نبوت ضرور ملی لیکن موسیٰ کی زندگی ہی میں دنیا سے اٹھ گئے اور پورے بار موسیٰ کو اٹھانے کا ایک دن بھی نہ آیا اور علیؑ پیغمبر اسلامؐ کے بعد بھی زندہ رہے اور وصایت و وزارت کے رشتہ سے پورا کار و بار نبوت سنبھالے رہے، جب ہی تو پیغمبرؐ نے غدیر کے میدان میں اعلان کیا تھا کہ جس کا میں مولیٰ ہوں اس کا یہ علیؑ مولیٰ ہے۔ صلوات۔

موسیٰؑ اور ہارونؑ کے رشتہ کا تذکرہ کرتے ہوئے اس نکتہ کی طرف اشارہ کر دینا چاہتا ہوں کہ پروردگار عالم نے اس رشتہ کو اس قدر مضبوط بنایا کہ "برائے نام" بھی فرق نہیں رہنے دیا۔ چنانچہ اس موقع کو یاد کریں جب ۳ھ کے وسط میں جناب ام الفضل نے یہ خواب دیکھا کہ رسول اکرمؐ کے جسم کا ایک ٹکڑا بدن اقدس سے جدا ہو کر میری گود میں آ گیا ہے اور گھبرا کر پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ حضور! اس خواب کی تعبیر کیا ہے، مجھے تو بے حد وحشت محسوس ہو رہی ہے۔ آپؐ نے فرمایا، ام الفضل گھبراؤ نہیں، یہ وحشت کی منزل نہیں ہے مسرت کی منزل ہے، عنقریب میری بیٹی فاطمہؑ کے یہاں ایک فرزند متولد ہونے والا ہے جو میرا پارۂ جسم و جگر ہوگا اور تمہاری آغوش میں رہے گا۔ ام الفضل مسرت سے جھوم اٹھیں اور وقت کا انتظار کرنے لگیں۔ یہ میرا مقصد کہ رسولؐ کا پارۂ جسم و جگر میری آغوش میں رہے۔ زہراؑ کا لال میری گود میں پرورش پائے۔

خدا کے فضل سے وہ وقت بھی آیا جب ۱۵ ماہ مبارک کی صبح کو صدیقہ طاہرہ فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے یہاں حسنؑ مجتبیٰ کی ولادت ہوئی۔ اور ام الفضل کو اپنے خواب کی تعبیر ملی۔ مسرت کا عالم نہ پوچھئے، ادھر زہراؑ خوش ادھر

ام الفضل خوش۔ ادھر اسماء خوش۔ ادھر سرور کائنات خوش۔ ادھر نفس اللہ خوش ادھر اللہ خوش۔ زمین سے آسمان تک خوشی کا عالم ہے۔ ملائکہ مبارکباد دینے کیلئے آ رہے ہیں۔ حوریں وجد میں جھوم رہی ہیں۔ جنت سجائی جا رہی ہے۔ کوثر کا پانی فرط مسرت سے موجیں مار رہا ہے۔ زہراؑ کو لاڈلا ملا۔ علیؑ کو وصی ملا۔ نبیؐ کو وارث ملا۔ قرآن کو مفسر ملا۔ اسلام کو محافظ ملا۔ حرم خدا کو پاسبان ملا۔ دین الٰہی کو نگہبان ملا۔ ام الفضل کو تعبیر ملی۔ جنت کو سردار ملا۔ جبرئیل کو مخدوم ملا۔ عرش الٰہی کو گوشوارہ ملا۔ زمین کو زینت ملی۔ مدینہ کو رونق ملی۔ بیت رسالت کو جلالت ملی۔ امت کو مصلح ملا۔ اہل محبت کو مصداق اجر رسالت ملا۔ صلوات؛

اسماء بچہ کو زرد کپڑے میں لپیٹ کر پیغمبر اقدسؐ کی خدمت میں لائیں۔ حضورؐ فرزند مبارک ہو! سرکار نے ایک نظر غور سے دیکھا اور تیوریوں پر بل ڈال کر بولے اسماء یہ زرد کپڑے میں کیوں لپیٹا، میں نے منع کیا تھا کہ بچہ کو زرد کپڑے میں نہ لپیٹا جائے اسماء دوڑ کر گئیں اور سفید کپڑے میں بچہ کو لپیٹ کر سرکار دو عالمؐ کی آغوش میں دیدیا گویا جسم کو جان مل گئی، رحل کو قرآن مل گیا، پھول کو خوشبو مل گئی، گلستان کو باغبان مل گیا، طور کو جلوہ مل گیا، اور نور کو نور مل گیا۔ صلوات،

میں نہیں جانتا کہ حضورؐ نے رنگین کپڑے کی مخالفت کیوں کی اور بچہ کو سفید کپڑے میں لپیٹنا کیوں ضروری سمجھا۔ نبوت کی مصلحت نبوت ہی جانتی ہے، اتنا ضرور سمجھ میں آتا ہے کہ شاید حضورؐ کا اشارہ اس بات کی طرف تھا کہ میرے بچوں پر دنیا کا کوئی رنگ نہیں چڑھ سکتا۔ یہ اللہ کے رنگ میں رنگ کر آئے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ انھیں رنگین کپڑوں کی ضرورت بھی ہوگی تو یہاں کے رنگ کام نہ آئیں گے بلکہ آسمان سے جبرئیل آئیں گے، کوثر سے پانی آئے گا، جنت سے رنگ آئے گا اور

عید کے دن بچوں کے کپڑے رنگے جائیں گے۔

عزیزانِ محترم! اب آپ نے محسوس کیا کہ جن کے لباس پر دنیا کا رنگ نہ چڑھ سکے ان کے کردار پر دنیا کا رنگ کیا چڑھ سکتا ہے؟ صلوات۔

کتنے نادان ہیں وہ انسان جو کردار حسنؑ پر خواہش پرستیؔ کا الزام لگا کر طلاق و نکاح کی داستانیں سناتے ہیں اور دنیا پر یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ آل محمدؐ بھی معاذ اللہ سماج کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ قدرت نے مختلف مواقع پر واضح کر دیا کہ دنیا کے رنگ سے متاثر ہونا تمہارا کام ہے اور ہمارے رنگ میں کردار کو رنگ لینا آل محمدؐ کی شان ہے۔ صلوات،

بچہ رسولؐ کی آغوش میں ہے، علیؑ نگاہ کے سامنے ہیں۔ ایک مرتبہ رسولؐ نے مڑ کر دیکھا۔ یا علیؑ اس بچہ کا کیا نام رکھا ہے؟ عرض کی۔ حضور یہ کام آپ کا ہے۔ مجھے کیا تعلق۔ کیا میں آپ پر سبقت کر سکتا ہوں؟

رسول اعظمؐ نے مسرور ہو کر فرمایا۔

بے شک یا علیؑ! تم مجھ پر تقدم نہیں کر سکتے اور میں خدا پر تقدم نہیں کر سکتا۔ اس بچہ کا نام وہی معین کرے گا۔ گفتگو ہو رہی تھی کہ جبرئیل امین نازل ہوئے۔ عرض کی یا رسول اللہ! ارشاد احدیت ہے کہ آپ میں اور علیؑ میں وہی نسبت ہے جو موسیٰؑ اور ہارونؑ میں ہے، آپ علیؑ کے فرزند کا نام ہارون کے فرزند کے نام پر رکھیں۔ پیغمبر اسلام نے فرمایا۔ ہارون کے فرزند کا نام کیا ہے۔ عرض کی۔ شبر۔ فرمایا۔ لیکن یہ تو عربی زبان کا نام نہیں ہے۔ عرض کی اس کا ترجمہ ہے حسنؑ۔

رسول اعظمؐ نے بچہ کا نام حسنؑ رکھ دیا اور دنیا پر منزلت ہارونی کے

ساتھ یہ بھی واضح کر دیا کہ ہمارے نام بھی آسمان سے نازل ہوتے ہیں تو ہمارے کمالات کا کیا ذکر ہے۔ یا یوں کہا جائے کہ جب ہم برائے نام بھی دنیا کے محتاج نہیں ہیں تو منصب و کمالات میں کسی کے کیا محتاج ہوں گے۔ صلوات۔

نام طے ہوگیا، بظاہر شبر کا ترجمہ "حسنؑ" طے ہوا لیکن۔ یاپ کرم! یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ ترجمہ اصل سے زیادہ نیا نکلا۔ شبر تو ہارونؑ کے فرزند کا نام رہ چکا تھا لیکن حسنؑ تاریخ میں کسی کا نام نہیں ہوا تھا اور اسی لئے تاریخ کو اعتراف کرنا پڑا کہ حسنؑ و حسینؑ دونوں نام خزانۂ قدرت میں محفوظ تھے جنہیں پروردگارِ عالم نے اپنے نبیؐ کے نواسوں کے لئے محفوظ کر رکھا تھا۔

لفظ حسنؑ کوئی ایسا لفظ نہیں ہے جو کبھی عربوں کے ذہن میں نہ آیا ہو یا اس کا استعمال زبانِ عرب میں نہ ہوتا ہو، یہ لفظ استعمال ہوا اور سیکڑوں مرتبہ سماج کی نظروں سے گزرا لیکن نہ جانے کیا مصلحت پروردگار تھی کہ کسی نے اپنے بچہ کا یہ نام نہیں رکھا اور سب اسے بطور صفت ہی استعمال کرتے رہے اور اس سے دو باتیں واضح ہوگئیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ آل محمدؐ کا کمال اس منزل پر ہے کہ جس لفظ کو دنیا بطور صفت استعمال کرتی ہے وہ ان کی منزل تک آتے آتے نام بن جاتا ہے۔ صفت حالات کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ انسان پہلے بچہ ہوتا ہے، پھر جوانی میں یہ صفت شباب میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ضعیفی آتے آتے یہ صفت بھی رخصت ہو جاتی ہے اور اب بوڑھا کہا جاتا ہے لیکن نام وہی نام رہتا ہے جو پیدائش کے وقت رکھا گیا تھا۔ بلکہ مرنے کے بعد بھی وہی نام رہ جاتا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ حسنِ عمل و کردار "حسنؑ" کی ذات سے یوں وابستہ

ہے کہ بچے ہیں تو حسنؑ ہیں، جوان ہیں تو حسنؑ، ضعیف ہوں تو حسنؑ، خاموش رہیں تو حسنؑ، بول اٹھیں تو حسنؑ، جنگ کا ارادہ کریں تو حسنؑ، صلح کریں تو حسنؑ، حد یہ ہے کہ زندہ رہیں تو حسنؑ اور دنیا سے اٹھ جائیں تو حسنؑ۔ صلوات،

اس مقام پر ایک دوسرا نکتہ یہ ہے کہ لفظ حسنؑ بار بار نگاہوں کے سامنے آیا لیکن یہ انتظامِ قدرت تھا کہ کوئی متوجہ نہ ہو سکا، گویا قدرت نے اشارہ کر دیا کہ ہم نگاہوں سے اوجھل رکھنا چاہیں تو شے سامنے آکر بھی اوجھل ہی رہتی ہے اور ذہن متوجہ نہیں ہونے پاتے، اب سمجھئے فلسفۂ حیاتِ آل محمدؐ، ان کی غیبت اور ان کے ظہور کا معاملہ بھی عجیب ہے، یہ غیبت میں بھی ظاہر رہتے ہیں اور ظہور میں بھی غائب رہتے ہیں، ان کی زندگی میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ محفل میں رہتے ہیں اور سوائے صاحبانِ ایمان کے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ نگاہوں سے اوجھل رہتے ہیں اور صاحبانِ ایمان دیکھتے رہتے ہیں۔ یہ اپنے اپنے ایمان و یقین کی بات ہے کہ ایمان نہیں ہوتا تو پہلا محمدؐ بھی سامنے سے نکل جاتا ہے اور کفار و مشرکین کو خبر نہیں ہوتی اور ایمان و یقین ہوتا ہے تو آخری محمدؐ بھی پردۂ غیب میں رہتا ہے اور دنیائے ایمان مسلسل زیارت کرتی رہتی ہے۔ صلوات،

نام کا ذکر آ گیا تو نام کے بارے میں بھی ایک لفظ عرض کرتا چلوں۔ دنیا میں نام کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ نام کردار سے بھی کوئی تعلق نہیں رکھتا، آپ کسی کا کوئی نام رکھ دیجئے یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ اس کا کردار بھی ویسا ہی ہو، بلکہ بسا اوقات تو اس کے بالکل برعکس ہو جاتا ہے

بچہ جاہل پیدا ہوتا ہے اور نام عالم رکھا جاتا ہے، آدمی عاجز ہوتا ہے اور نام قادر
رکھا جاتا ہے، کمالات کا دور دور پتہ نہیں ہوتا اور نام فاضل و کامل رکھا جاتا
ہے۔ اور یہ اس بات کی علامت ہے کہ نام فقط ایک علامت ہے اس کا کردار سے
کوئی تعلق نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ اگر نام کردار کے خلاف بھی نکل جائے تو
کوئی نام رکھنے والے سے یہ مطالبہ نہیں کرتا کہ آپ نے ایسا نام کیوں رکھا
آپ نے عالم کہا تھا اور یہ جاہل رہ گیا۔ آپ نے فاضل کہا تھا اور یہ بے فضل
بلکہ فضول ہو گیا۔ نام رکھنے والا بھی یہی کہے گا کہ میں نے ایک علامت معین
کر دی تھی، زندگی اور سیرت و کردار کی ضمانت نہیں لی تھی اور نہ مجھے مستقبل
کے بارے میں ضمانت لینے کا حق تھا۔ اور جب نام کا مسئلہ اتنا آسان ہو
تو نبوت کے گھرانے میں اتنا اہتمام کیوں برتا گیا ... کہ زہراؑ، علیؑ پر سبقت
نہ کریں، نبیؐ خدا پر سبقت نہ کریں اور خدا جبرئیل امین کے ذریعہ موسیٰؑ اور
ہارونؑ کی تاریخ دہرا کر ایک نام تجویز کرے۔ اتنے معمولی سے کام کے لئے
اتنے بڑے اہتمام کی کیا ضرورت ہے؟ وہ کون سا کام ہے جو علیؑ نہیں
انجام دے سکتے ہیں۔ وہ کون سا کام ہے جو نبیؐ کے بس کا نہیں ہے کہ خدا
بھی اس میں شامل ہو جائے تو مسئلہ حل ہو۔

عزیزانِ محترم! میں نہیں جانتا کہ مصلحت کیا ہے؟ لیکن اتنا
جانتا ہوں کہ نام بندے رکھتے ہیں تو مستقبل کی ضمانت نہیں ہوتی،
وہ مستقبل کے حالات سے بے خبر ہوتے ہیں اور مستقبل ان کے اختیار
میں نہیں ہوتا اور نام خدا رکھتا ہے تو مستقبل کی ضمانت بھی ہوتی ہے اور کردار
کی علامت بھی اور یہی وجہ ہے کہ نبیؐ کا نام محمدؐ بھی اسی نے رکھا، علیؑ کا

نام بھی اسی نے رکھا، شہزادوں کا نام حسنؑ و حسینؑ بھی اسی نے رکھا، زہراؑ کا نام
فاطمہؑ بھی اسی نے رکھا اور نام بھی ایسا رکھ کر واضح کر دیا کہ جسے میں محمدؐ کہہ دوں وہ ہر حال
میں قابلِ تعریف ہے۔ جسے میں علیؑ کہہ دوں وہ ہر حال میں بلند ہے۔ جسے
میں فاطمہؑ کہہ دوں وہ محشر تک عذاب الٰہی سے بچانے والی ہے جسے میں حسنؑ و
حسینؑ کہہ دوں اس کے کردار میں حسن کے سوا کچھ نہ ملے گا۔ صلوات،

یہ ضرور ہے کہ مستقبل کے حالات کا علم تو نبیؐ اور امامؑ کو بھی ہوتا ہے
تو اس میں خدا کی کیا ضرورت ہے؟ جب اس نے علم دے دیا تو اسی کی روشنی
میں جو نام چاہیں معین کر دیں۔ لیکن اربابِ کرم! اولاً تو یہ مسئلہ نبیؐ ہی کے
نام سے شروع ہوتا ہے اور جب آغاز کار پروردگار سے ہوا ہے تو گویا گھرانے
میں ایک سیرت بن گئی کہ اب جو ہادی اور راہنما آئے گا اس کا نام بھی خدا ہی
تجویز کرے گا تاکہ جدھر کا راہنما ہو اُدھر ہی کا نام بھی رہے۔ صلوات،

دوسری بات یہ ہے کہ نبیؐ اور امامؑ کے علم میں تو شک بھی کیا جا سکتا ہے
اور یہ خطرہ بھی ہے کہ مستقبل میں ایک قوم پیدا ہو جائے جو نبیؐ اور امامؑ کے علم غیب
میں شک کرنا شروع کر دے۔ پیغمبرؐ نے چاہا کہ یہ نام میں معین نہ کروں کہ
علم غیب میں شک کرنے والے فقط علامت سمجھ لیں بلکہ اسے خدا معین کرے کہ ہر
مسلمان اسے کردار کی ضمانت سمجھے اور جو نہ سمجھے وہ علم خدا کا دشمن ہو کر اسلام ہی
سے خارج ہو جائے۔

ولادت کی مسرت کو سات دن گزر رہے تھے کہ گھر میں ایک نئی تقریب
مسرت آ گئی اور مرسل اعظمؐ نے فرزند کے عقیقہ کا اہتمام کیا، اسلام میں عقیقہ فریضہ
نہیں ہے لیکن سیرت رسولؐ ضرور ہے اور شاید اسی کی مصلحت ہے کہ انسان

کی مسرت اس کی ذات تک محدود نہ رہ جائے اور اس کی مسرت سے غرباء و فقراء اور مومنین کو بھی فائدہ پہنچ جائے۔

عقیقہ کا مطلب سر منڈانے کا نہیں ہے۔ سر منڈانا الگ ایک کام ہے اور عقیقہ الگ۔ عقیقہ سے مراد وہ جانور ہے جو بچہ کی طرف سے ذبح کیا جاتا ہے اور جس کا گوشت غرباء و فقراء اور مومنین مخلصین پر تقسیم کیا جاتا ہے۔ عقیقہ کے لئے یہ لازم نہیں ہے کہ وہ سر منڈانے کے ساتھ ہی ہو، بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں تقریبات الگ الگ ہوں۔ اور دونوں کو ایک وقت میں انجام نہ دیا جائے۔ سر منڈانے میں بالوں کا صدقہ مستحب ہے اور عقیقہ کرنے میں گوشت کی تقسیم یا ولیمہ جس کا کھلا ہوا مقصد یہ ہے کہ اسلام تقریبات کو شخصی یا تشریفاتی نہیں بنانا چاہتا۔ اس کا منشاء یہ نہیں ہے کہ خوشی اور مسرت کو گھر والوں تک محدود کر دیا جائے یا پھر اشراف اور رؤساء قوم کو شریک کر لیا جائے۔ اس کا منشاء یہ ہے کہ تمھاری مسرت کا انتظام ہم نے کیا ہے تو غریب بندوں کی خوشی کا انتظام تم کرو۔ شاید یہی مصلحت عید الفطر کے موقع پر فطرہ کی بھی ہے کہ ہم نے تمھیں سال بھر تک پالا ہے۔ کھلایا ہے۔ پلایا ہے۔ اب یہ کیسی ناانصافی ہو کہ تم اکیلے اکیلے عید منالو اور غریب بندوں کا لحاظ بھی نہ کرو۔ اب کم از کم اتنا تو سوچ لو کہ تم ہمارے مقابلہ میں کمزور تھے تو تمھاری پرورش کا انتظام ہم نے کیا۔ اب جو بندے تمھارے مقابلہ میں کمزور ہیں ان کی پرورش کا انتظام تم کرو۔ یہ ہے اسلام کا نظام مسرت۔ دنیا کی خوشی کا مطلب یہ ہے کہ غریبوں کو نظر انداز کر کے مسرت کا اظہار کیا جائے اور اسلام میں مسرت کی تکمیل ہی نہیں ہوتی جب تک غریبوں کو شامل نہ کر لیا جائے۔ رؤساء و اشراف

کا مہابانے کر زندہ رہنا دنیا کے قوانین کا کام ہے، اور غریبوں، بے کسوں، یتیموں، مفلسوں کی زندگی کا انتظام کر کے زندہ رہنا اسلام کا کام ہے۔ یہاں دولت خدیجہ عیش و عشرت کا ذریعہ نہیں ہے۔ غرباء و فقراء کی پرورش کا ذریعہ ہے۔ یہاں غنی نہیں بنائے جاتے جناب امیر بنائے جاتے ہیں۔ صلوات۔

بعض کتابوں میں اس مقام پر ختنہ کا بھی ذکر ملتا ہے جو قطعاً صحیح نہیں ہے۔ قدرت کا انتظام ہے کہ وہ امام معصوم کو ختنہ شدہ پیدا کرتی ہے اور شاید اس کا راز بھی یہ ہے کہ ختنہ ایک کثافت کے جدا کرنے کا نام ہے اور امام کا وجود ہر کثافت سے پاک و پاکیزہ ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کو سنت رسولؐ کہا جاتا ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ سنت رسولؐ کے عمل ہی کا نام نہیں ہے۔ رسولؐ کے فرمان کا بھی نام ہے۔ مسلمان کو یہ دیکھنے کا حق نہیں ہے کہ رسولؐ نے ذاتی طور پر کیا کیا اور کیا نہیں کیا۔ اسے یہ دیکھنا چاہئے کہ انھوں نے اس کے بارے میں کیا حکم دیا اور کیا فرمان نافذ کیا۔ اور جب یہ مسئلہ واضح ہو گیا تو اب نہ کہئے گا کہ رسولؐ نے گریہ کب کیا۔ ماتم کب کیا۔ تعزیہ کب بنایا۔ علم کب اٹھایا؟ اس کے لئے مسئلہ عمل رسولؐ کا نہیں ہے، مسئلہ اجازت رسولؐ کا ہے کہ انھوں نے ان اعمال سے کب روکا؟ اگر روکنا ثابت ہو جائے تو حرام ورنہ یہی عمل عین سنت و سیرت ہے۔ صلوات۔

پھر جبکہ روایت سے عزاداری کا ثبوت بھی فراہم ہوتا ہے اور صراحت کے ساتھ ملتا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے شہادت حسینؑ سے قبل ہی غم حسینؑ منایا ہے اور اسے باقاعدہ طور پر سیرت و سنت بنا دیا ہے۔ کس قدر نادان اور ظالم ہے وہ مسلمان جو ایسے عظیم عمل کو بدعت اور حرام قرار دیدے۔ کاش اس مسلمان کو غیرت ہوتی اور

پیدا تنا سوچا کہ رسولؐ زنبیل واقعۂ غم سنائیں اور اسے واقعہ کے بعد بھی جواز نظر نہ آئے۔ صلوات

مالک کائنات نے زہراؑ کے اس لال کو امت کا ہادی اور راہنما بنا کر بھیجا تھا اور انتظام ہدایت کی ایک کڑی بنایا تھا۔ اسی لئے ابتدا ہی سے ایسے انتظامات کئے جن سے یہ معلوم ہو جائے کہ یہ اور ہے امت اور، اس کی شان اور ہے دنیا کی شان اور، اس کی عظمت اور ہے دنیا کی عظمت اور، اور اسی کا ایک نمونہ یہ بھی ہے کہ مالک کائنات نے اس کے جسم نازنین کو بھی رسول اکرمؐ کے جسم نازنین سے مشابہ بنا دیا، اور تاریخ کو اقرار کرنا پڑا کہ رسول اعظمؐ کے نصف بدن سے حسنؑ زیادہ مشابہ تھے اور نصف بدن سے حسینؑ۔ سر سے سینہ تک حسنؑ کی مشابہت تھی اور پائے اقدس حسینؑ سے زیادہ مشابہ تھے اور شاید اس میں بھی مالک کائنات کی یہ مصلحت رہی ہو کہ ہاتھ حسنؑ کے حصہ میں دے دیا جائے اور پیروں کی مشابہت حسینؑ کے حصہ میں عطا کر دی، اس لئے کہ ان دونوں فرزندوں سے دو طرح کے کام لینے ہیں، حسنؑ کے دست اقدس سے صلح نامہ لکھوانا ہے اور حسینؑ کو میدان جہاد میں استقلال اور پامردی کا مظاہرہ کرنا ہے، اب میں امت کو سمجھا دوں کہ حسنؑ کا ہاتھ میرا ہاتھ ہے اور حسینؑ کے قدم میرے قدم ہیں، خبردار حسنؑ کی صلح یا حسینؑ کی جنگ پر اعتراض نہ کرنا ورنہ یہ اعتراض میری سنت و سیرت پر ہو جائے گا اور مجھ پر اعتراض کرنے والا مسلمان نہیں رہ سکتا۔ صلوات۔

قدرت نے اس قدر اہتمام کیا تو سرکار رسالت کا بھی فریضہ تھا کہ اپنے عمل سے ثابت کر دیں کہ یہ بچہ دنیا کے عام بچوں سے الگ ہے اور اسے اللہ نے امت کا راہنما بنا کر بھیجا ہے۔ اس کا قیاس دنیا کے عام انسانوں پر نہیں کیا

جا سکتا، اس کے ساتھ میں ایسا برتاؤ کر رہا ہوں جس کا دوسرے انسانوں کو اہل بھی نہیں سمجھا، تاریخ میں ایسے بے شمار واقعات ہیں جہاں یہ حقیقت واضح ہو کر سامنے آئی ہے اور اکثر واقعات تو دونوں بھائیوں کے درمیان مشترکہ طور پر ملتے ہیں اور شاید اس کا راز بھی یہی رہا ہو کہ پورے سلسلۂ امامت میں پہلا اور آخری واقعہ ہے کہ مالک کائنات نے زہراؑ کو دو لال دیئے ہیں اور دونوں کو عہدۂ امامت سے سرفراز فرمایا، ورنہ کوئی امام ایسا نہیں ہے جس کی اولاد میں دو امام پیدا ہوں اور اس کے گھر میں امامت یوں قائم ہوئی ہو جس طرح بیت زہراؑ میں آئی ہے اور جب مالک نے دونوں کو امام بنایا ہے تو اسی کی ذمہ داری ہے کہ فضائل و کردار میں بھی ایسی مشابہت و مناسبت رکھے کہ انسانوں کو دھوکہ نہ ہونے پائے اور لوگ فضیلت کی بحث میں نہ الجھنے پائیں قدرت کا یہی انتظام تھا کہ جو کچھ حسنؑ کو دیا اس میں حسینؑ کو شریک کر دیا اور جو کچھ حسینؑ کو دیا اس میں حسنؑ کو شریک بنا دیا۔ حد یہ ہے کہ شہادت کے عوض میں نسل حسینؑ میں امامت رکھی تو وہاں بھی یہ اہتمام کیا کہ ایک منزل پر دونوں کی نسل کو جمع کر دیا جائے کہ فرزند حسینؑ کے عقد کا موقع آئے تو دختر حسنؑ ہی کا انتخاب کیا جائے کہ نسل امامت آگے بڑھے تو کسی نہ کسی جہت سے دونوں بھائیوں کا حصہ رہے۔ یہ اور بات ہے کہ جس کی شہادت مخفی تھی اس کا سلسلہ بھی پردہ پوش ہو کر چلا۔ صلوات

مرسل اعظمؐ کا بھی یہی انداز ہے کہ سجدہ میں پشت پر جگہ دیتے ہیں تو کبھی اس بیٹے کو کبھی اس بیٹے کو۔ عید کے دن کاندھوں پر بٹھاتے ہیں تو ایک کاندھے پر اس فرزند کو اور دوسرے کاندھے پر اس فرزند کو۔ کتنا نازک موقع ہے رسالت اپنی زلفوں کو دو حصوں میں بانٹ کر دونوں بچوں کے حوالے کر رہی ہے اور بچے کھینچنے کی اداؤں کیسا تھ دوش رسولؐ پر بیٹھے ہیں، سوچئے کہ اگر کہیں دونوں بچے مچل گئے اور ایک نے ادھر

کھینچنا شروع کیا اور دوسرے نے اُدھر تو حضورؐ کی کیا کیفیت ہوگی اور سرکارِ دوعالمؐ کس کی خاطر رکھیں گے کس کی بات ٹالیں گے،

سرکار! یہ آپ نے کیا غضب کیا بچوں کے ہاتھ میں زلفوں کا اختیار دے کر اپنے کو پریشانی میں ڈال دیا، پیغمبر اسلامؐ فرمائیں گے، نادان! یہ تیرے سمجھنے کی باتیں نہیں ہیں، یہ میری مصلحت کی بات ہے۔

یاد رکھ! اگر میرے ذہن میں ذرا بھی شبہ ہوتا کہ دونوں بچوں کے ارادوں اور مشیت میں فرق آجائے گا تو میں کبھی زلفوں کا اختیار انہیں حوالے نہ کرتا، یہ اختیار تو میں نے دیا ہی اسلئے ہے کہ تم جیسے نافہم انسان سمجھ لیں کہ حسنؑ و حسینؑ کی مرضی میں ذرہ برابر فرق نہیں ہے جو حسنؑ کی مرضی ہے وہی حسینؑ کی مرضی ہے، اب نہ کہنا کہ ایک نے صلح کی اور ایک نے جنگ کی تو دونوں کی مرضی میں فرق آگیا، ہرگز نہیں، حسنؑ کی صلح حسینؑ کی صلح ہے اور حسینؑ کی جنگ حسنؑ کی جنگ ہے صلوات،

عزیزانِ محترم! وہ فطرت کا اہتمام تھا یہ رسالت کا انتظام تھا اب ذرا قدرت کی ناز برداری بھی ملاحظہ فرمائیے۔ بچپنے کا زمانہ ہے، دونوں شہزادے گھر سے باہر نکلے ہیں، اور حدیقہ بنی نجار کی ٹھنڈی ہوا کھا کر سو گئے ہیں۔ سیدہ عالمؑ پریشان ہیں۔ مرسلِ اعظمؐ تک خبر پہنچ گئی ہے۔ سرکارؐ! بچے کہیں چلے گئے ہیں، دیر ہوئی واپس نہیں آئے۔ سیدہ عالمؑ سخت پریشان ہیں۔ سرکار حسبِ قواعد تلاش میں نکلے، دیکھا کہ بچے حدیقہ بنی نجار میں آرام کر رہے ہیں۔ دونوں بچوں کو اٹھایا، شہزادو! تمہارے آرام کرنے کی جگہ یہ نہیں ہے چلو ماں پریشان ہے۔ بچوں کو اٹھایا اور فاطمہؑ کے گھر لانے کے بجائے اصحاب کی محفل میں لائے مسجد میں اصحاب کا مجمع تھا۔ بچوں کو سامنے پیش کیا اور فرمایا کہ میں بتاؤں کہ دنیا میں نانا اور نانی کے اعتبار سے سب سے بہتر کون ہے۔ اصحاب نے عرض کی ضرور۔

فرمایا حسنؑ و حسینؑ کہ ان کے نانا سید الانبیاء ہیں اور ان کی نانی خدیجۃ الکبریٰ

فرمایا کیا میں بتاؤں کہ ماں اور باپ کے اعتبار سے سب سے بہتر کون ہے۔؟

اصحاب نے عرض کی فرمائیں۔

فرمایا حسنؑ و حسینؑ کہ ان کا باپ علیؑ ہے اور ماں فاطمہ زہراؑ ـــــ فرمایا۔ میں بتاؤں کہ چچا اور پھوپھی کے اعتبار سے سب سے افضل کون ہے؟

عرض کی فرمائیے۔

فرمایا حسنؑ و حسینؑ کہ ان کا چچا جعفر طیار ہے اور ان کی پھوپھی ام ہانی اسی طرح سلسلہ جاری رہا اور سرکار شہزادوں کے فضائل بیان کرتے رہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب سیدہؑ پریشان تھیں تو معصوم بچوں کو مسجد میں کیوں لے آئے اور سیدہؑ کے گھر کیوں نہیں لے گئے، اصحاب میں کون بیقرار تھا یہاں کس کو پریشانی تھی، اور پھر اگر پریشانی تھی بھی تو یہ کون سا موقع تھا فضائل بیان کرنے کا۔ ماں گھر میں مضطر ہے اور آپ مسجد میں فضائل بیان کر رہے ہیں۔

عجب نہیں سرکار دوعالمؐ فرمائیں، تم نے مصلحت نہیں پہچانی، میرے بچے اس لئے نہیں گم ہوئے تھے کہ انہیں راستہ نہیں معلوم تھا، یا یہ راستہ بھٹک گئے تھے، میری سیدہؑ اس لئے نہیں پریشان تھی کہ اسے حفاظتِ الٰہی پر اعتماد نہیں تھا اور میں اس لئے نہیں تلاش کر رہا تھا کہ مجھے منزل نہیں معلوم تھی اور میں جگہ سے بے خبر تھا۔ یہ قدرت کا انتظام تھا کہ بچے باغ میں جا کر سو جائیں، سیدہؑ اپنے اضطراب کا اظہار کرے، میں تلاش میں نکلوں، اصحاب میں ہیجان پیدا ہو، دنیا کی نگاہ میں واقعہ کی اہمیت آجائے، سب لوگ گمشدگی کے بعد بچوں کو دیکھنے کیلئے آئیں اور میں شہزادوں کے فضائل بیان کروں، اس لئے کہ عام حالات کے

بیانات ذہن سے نکل جاتے ہیں اور حادثاتی حالات کے بیانات ذہنوں میں محفوظ رہ جاتے ہیں۔ یہ قدرت کا انتظام تھا کہ بچوں کے کمالات کا اعلان کرنا ہوا تو اس واقعہ کا اہتمام کیا اور باپ کے منصب کا اعلان کرنا ہوا تو غدیر کی دوپہر کا انتخاب کیا۔ صلوات

عزیزانِ گرامی! جب سب نے اپنے اپنے اہتمام و انتظام کا اظہار کر دیا تو اب خود امام حسنؑ کی ذمہ داری ہے کہ دنیا پر واضح کر دیں کہ میری مثال عام بچوں جیسی نہیں ہے اور مجھے قدرت نے خاص مقصد کیلئے خلق کیا ہے، میرا کام ہدایت لینا نہیں ہے، میرا کام ہدایت دینا ہے۔ شاید یہی راز تھا کہ جب مسجد میں پیغمبر اسلامؐ موعظ فرماتے تھے آیاتِ قرآنی اور احکام الٰہی بیان کرتے تھے تو امام حسنؑ گھر میں آکر ماں سے سارا واقعہ بیان کر دیا کرتے تھے، آج نانا نے یہ فرمایا، آج یہ مسئلہ بیان ہوا، آج یہ آیت نازل ہوئی اور جب امیرالمومنینؑ بیت الشرف میں تشریف لاتے تو جناب سیدہؑ فرماتی تھیں یا ابا الحسنؑ! آج میرے بابا نے یہ موعظ فرمایا، آج یہ مسئلہ بیان کیا، آج یہ آیت نازل ہوئی۔ امیرالمومنینؑ بظاہر حیرت سے پوچھتے بسیدہؑ! یہ تمہیں کیسے معلوم ہو گیا تم تو مسجد میں نہیں تھیں، تم نے تو اپنے بابا کو بیان کرتے نہیں دیکھا ہے۔

عرض کریں! میرا شہزادہ حسنؑ مجھ سے سارے واقعات بیان کر دیتا ہے

مولائے کائنات نے فرمایا، سیدہ! میں بھی اپنے لال کی گفتگو سننا چاہتا ہوں۔ دیکھوں میرا فرزند کس طرح اپنے نانا کی ترجمانی کرتا ہے۔

سیدہؑ نے عرض کی بے شک! آپ سماعت فرمائیں۔

امیرالمومنینؑ موعظ ختم ہوتے ہی فوراً بیت الشرف میں تشریف لائے اور ایک گوشہ میں بیٹھ گئے۔ امام حسنؑ گھر میں داخل ہوئے،

مادرِ گرامی نے حسبِ روایت فرمائش کی۔ بیٹا آج بابا نے کیا بیان کیا۔

حسنؑ نے دہرانا شروع کیا، لیکن آج زبان میں وہ روانی اور بیان میں وہ سلاست نہیں تھی۔ گھبرا کر عرض کی۔ مادرِ گرامی آج میرے بیان میں روانی اور میری زبان میں تیزی نہیں ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرا سردار مجھے دیکھ رہا ہے۔ یہ سننا تھا کہ امیرالمومنینؑ پردہ سے باہر آگئے اور دوڑ کر بچے کو گود میں اٹھا لیا، پیار کیا۔ شاباش میرے لال نبوت کے گھرانے کے بچے ایسے ہی ہوتے ہیں۔

دیکھا آپ نے! حافظہ وہ کہ جو نبیؐ نے بیان کیا وہ سب دہرا دیا، فصاحت وہ کہ وحی الٰہی کی ترجمانی کی اور وسعتِ نظر وہ کہ پس پردہ باپ کو دیکھ لیا۔ کیوں نہ ہو یہ امامت کی نگاہ ہے، اس کا انداز دنیا سے جداگانہ ہے، یہاں تو یہ عالم ہے کہ امامت پردہ میں چھپ جائے تو اسے دیکھ لیا جاتا ہے اور رسالت زیر کساء آجائے تو اس کی خوشبو محسوس کر لی جاتی ہے۔ صلوات،

بات آخری منزل تک آگئی ہے لیکن خاتمہ کلام میں چند فقرے اور عرض کرنا چاہتا ہوں۔ امام حسنؑ معصوم تھے، انھیں پروردگارِ عالم نے علم دے کر بھیجا تھا۔ سیدہ طاہرہ بھی معصومہ تھیں، ان کے پاس بھی علم لدنی تھا، نہ معصومہ عالم اس بات کی محتاج تھیں کہ امام حسنؑ بیان کریں تو انھیں مسائلِ شریعت کا علم ہو، نہ امام حسنؑ اس بات کے محتاج تھے کہ ماں سے بیان کریں تاکہ اگر کوئی غلطی ہو جائے تو ماں ٹوک دیں۔ اور خود جناب امیرؑ کا اشتیاق بھی معاذ اللہ اس بنا پر نہیں تھا کہ اپنے بیٹے کا امتحان لینا چاہتے تھے۔ یا یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ حسنؑ کس حد تک صحیح بیان کرتے ہیں۔ یہ کچھ نہیں تھا لیکن اس کے باوجود سیدہ طاہرہؑ فرمائش کرتی تھیں، امام حسنؑ بیان کرتے تھے اور جناب امیرؑ کے دل میں اپنے لال کے بیان کا اشتیاق پیدا ہوا: امامت و عصمت کی مصلحت امام اور معصوم

جائے لیکن اتنا ضرور واضح ہوگیا کہ امت کی گنہگار ماؤں اور اولاد کو ایک درس مل گیا کہ جب بچے کسی محفلِ وعظ سے پلٹ کر آئیں تو ماں کو پوچھنا چاہیے کہ آج کیا بیان ہوا اور بچوں کو بیان کرنا چاہیے اور پھر بزرگوں کو دیکھنا چاہیے کہ بیان کا کیا انداز ہے۔ تاکہ بچوں کی تربیت کا انتظام ہو جائے۔ آلِ محمدؐ کے بچے محتاجِ تعلیم و تربیت نہیں تھے لیکن ہمارے بچے بہر حال محتاج ہیں۔

اب انصاف سے بتائیے کہ آج کسی گھر میں اس سیرت پر عمل ہوتا ہے۔ کیا! آجکی عورتیں معصومۂ عالمؑ کی سیرت پر ہیں، کیا آج کے مرد مولائے کائناتؑ کی سیرت پر ہیں۔ کیا آج کے بچے امام حسنؑ کا اتباع کر رہے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ یہی وجہ تو ہے کہ دین تباہ ہوتا جا رہا ہے، دنیا غالب آتی جا رہی ہے، معلومات ختم ہوتے جا رہے ہیں اور لغویات کا شوق بڑھتا جا رہا ہے، قیامت ہے کہ آج مائیں بچوں سے گانے تو سنتی ہیں، مجلسیں نہیں سنتیں، آج باپ بچوں کو خرافات کی تعلیم تو دیتے ہیں، دین کی تعلیم نہیں دیتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مستقبل انھیں خرافات سے وابستہ ہے اور منکر و نکیر قبر میں آکے گانے ہی کے بارے میں سوال کریں گے۔

عزیزانِ گرامی! دنیا چند روزہ ہے، اسے ایک دن فنا ہو جانا ہے اور ہمیں آپکو پلٹ کر معبود کی بارگاہ میں جانا ہے، دنیا کو دھوکہ دینا آسان ہے، رب العالمین کو جواب دینا بہت مشکل ہے۔ اگر آج محبتِ اہلبیتؑ باقی ہے اور سیرتِ اہلبیت پر عمل کرنے کا جذبہ ہے، اگر یہ جشنِ مسرت صرف رسم نہیں ہے اور اس کے پیچھے کوئی حقیقت ہے تو یہ عہد کرکے اٹھئے کہ سیرتِ امام حسنؑ سے فائدہ اٹھائیں گے اور اپنے بچوں کو دین و مذہب کی تعلیم دیں گے، معصومۂ عالمؑ کی سیرت پر عمل کریں گے اور اپنے بچوں سے مذہبی مسائل پوچھیں گے مولائے کائناتؑ کے نقشِ قدم پر چلیں گے اور بچوں کے مذہبی معلومات کی نگرانی کرتے

رہیں گے۔

بات تمام ہوگئی۔ فضائل کو ایک کلمہ بیان کر کے تقریر کو تمام کر دینا چاہتا ہوں۔ بڑی نازک منزل ہے، ہمارے کردار میں اور معصومین کے کردار میں زمین و آسمان کا فاصلہ ہوگیا ہے۔ مشہور واقعہ ہے کہ امام حسنؑ اور امام حسینؑ ایک راستہ سے گزر رہے تھے، ایک مقام پر دیکھا کہ ایک ضعیف العمر انسان بیٹھا وضو کر رہا ہے اور اتفاق سے اس کا وضو صحیح نہیں ہے۔ دونوں شہزادے ٹھہر گئے اور سوچا کہ مسئلہ کی اصلاح کئے بغیر قدم آگے بڑھانا جائز نہیں ہے لیکن سوال یہ ہے کہ سمجھائیں تو کس طرح؟ ہماری طرح کہدیں کہ تیرا وضو صحیح نہیں ہے تو جاہل ہے، تو اخلاقِ آلِ محمدؐ کے خلاف ہے اور یہ کہدیں کہ وضو بہت عمدہ ہے تو یہ حکمِ الٰہی کے خلاف ہے۔ پہچانئے آلِ محمدؐ نے تبلیغِ دینِ حق میں کیا کیا راستے اختیار کئے ہیں، ایک مرتبہ قریب آکے فرمایا۔ حضور! آپ بزرگ آدمی ہیں۔ ہم دونوں بھائی وضو کرنا چاہتے ہیں، آپ ذرا زحمت کر کے یہ بتا دیجئے کہ دونوں میں کس کا وضو صحیح ہے؟ یہ کہہ کر دونوں نے وضو شروع کیا۔ جیسے ہی دونوں شہزادوں کا وضو تمام ہوا ضعیف العمر انسان چونک پڑا، بڑھ کر گلے سے لگا لیا۔ شہزادو! اس اخلاق کے قربان، اس تہذیب کے تصدق، تم دونوں کا وضو صحیح ہے، میں نے ہی غلط وضو کیا تھا!

بزورِ شمشیر اسلام کو پھیلانے والے دیکھیں کہ آلِ محمدؐ نے دین کی تبلیغ کس انداز سے کی ہے اور دنیا کو راہِ راست پر کس طرح لائے ہیں۔ نہ لڑائی نہ جھگڑا! نہ اختلاف نہ معرکہ۔ نہ بحث نہ مباحثہ، نہ روکنا نہ ٹوکنا! ایک ایسا حسین انداز کہ جسے تنبیہ کیجئے وہ بھی قربان ہو جائے اور جسے سمجھایا جائے وہ بھی گلے لگا لے۔ دنیا نے اخلاقِ پیغمبرؐ سنا ہے تو اخلاقِ حسنؑ کا مشاہدہ بھی کر لے اور یہ دیکھ لے کہ صاحبِ خلقِ عظیم کا

وارث کیسا ہوتا ہے اور اسلام کس تلوار سے پھیلتا ہے اور میں تو ایک فقرہ کہے بغیر بیان تمام نہیں کر سکتا کہ ہمارے کردار میں اور معصومینؑ کے کردار میں اتنا فرق ہو گیا ہے کہ کل بچے بڑوں کی اصلاح کر دیا کرتے تھے اور آج بڑے بھی بچوں کی اصلاح نہیں کر پا رہے ہیں، گویا امامت آواز دے رہی ہے کہ جو تمھارا ناممکن ہے وہ ہمارا مشغلہ ہے اور یاد رکھو ہمیں بچہ نہ سمجھنا ہم نے کتنے ہی بڑے بوڑھوں کی اصلاح کر دی ہے۔ ہماری عظمت امت کے بچے نہ سمجھیں گے، ہماری بلندی امت کے بوڑھے ہی سمجھے ہیں۔ جنھوں نے نانا سے یہ کہہ کر لینا چاہا تھا کہ بچوں کو ہمیں دے دیجئے ہم اپنے کاندھوں پر بٹھا لیں گے تو نانا نے انکار کر کے واضح کر دیا تھا و آلِ محمد دنیا کو اٹھانے کے لئے آئے ہیں، یہ اہلِ دنیا کے اٹھانے کے محتاج نہیں ہیں، صلوات،

جنابِ امام حسین علیہ السلام

اسمِ مبارک	:	حسینؑ ،
لقب	:	سید الشہداءؑ ،
کنیت	:	ابو عبداللہ ،
والدۂ ماجدہ	:	جنابِ فاطمہؑ ،
والدِ ماجد	:	حضرت علیؑ ،
ولادت	:	۳ شعبان المعظم ۴ھ ،
ازواج	:	پانچ ،
اولاد	:	چھ ،
شہادت	:	۱۰ محرم ۶۱ھ ،
عمر شریف	:	۵۷ سال ،
قبرِ مطہر	:	کربلائے معلّیٰ ،

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید الانبیاء
والمرسلین خاتم النبیین سیدنا و مولانا ابی القاسم
محمد وآلہ الطیبین الطاہرین ولعنۃ اللہ علیٰ اعدائہم
اجمعین۔ اما بعد فقد قال اللہ الحکیم فی کتابہ الکریم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى

ارشاد جناب احدیت ہوتا ہے۔ بیشک ہدایت کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے اور دنیا و آخرت کا اختیار ہمارے ہاتھوں میں ہے۔

آیت کریمہ نے صاف واضح کر دیا کہ مالکِ کائنات نے انسان کی ہدایت کی ذمہ داری اس کے سر نہیں ڈالی اور اسے بے مہار نہیں بنایا بلکہ زندگی کے ہر موڑ پر اس کی راہنمائی کا انتظام کیا ہے اور حیات کے ہر شعبہ میں اس کے لئے قواعد و قوانین وضع کر دیئے ہیں۔ اب یہ انسان کے اختیار کی بات ہے کہ وہ خدائے اہتمام پر اعتماد کرے یا اپنے لئے الگ سے کوئی نظامِ ہدایت معین کر لے۔ الٰہی نظام پر اعتماد کرنا بھی کوئی معمولی بات نہیں ہے اس کے لئے بے شمار قربانیاں دینی پڑتی ہیں، نفس کو پامال کرنا پڑتا ہے، زندگانی دنیا کو تباہ کرنا پڑتا ہے عیش دنیا کو خیرباد کہنا پڑتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ بظاہر اپنا ہو کے بھی دوسرے کا ہو جانا پڑتا ہے نہ انسان کا کوئی ارادہ رہ جاتا ہے، نہ اختیار، نہ خواہش رہ جاتی ہے نہ پسند نہ مرضی رہ جاتی ہے نہ مشیت، اب جو منشائے الٰہی چاہے وہی اپنی پسند ہے، اور جس پر اس کی نظر عنایت پڑ جائے وہی اپنا منظور نظر ہے۔

سرکار سید الشہداءؑ نے سرزمین کربلا پر قدم رکھنے کے بعد اسی نکتہ کی طرف اشارہ کیا تھا، لوگ بندگانِ دنیا ہیں، دین تو فقط زبانوں پر چڑھا ہوا ہے، جب تک دنیا سلامت رہتی ہے دین کا نام لیتے ہیں اور جب دنیا خطرہ میں پڑ جاتی ہے تو دین کو چھوڑ کر الگ ہو جاتے ہیں۔ امام حسینؑ سے بہتر اس حقیقت کا جاننے والا کون ہو سکتا ہے، آپ کے پاس علم امامت بھی ہے اور تجربہ حیات بھی۔ آپ نے اس منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور انہیں سمجھانا چاہا ہے جن کی آنکھیں بند ہیں اور جو دنیا سے یکسر غافل ہو گئے ہیں، مقصد یہ ہے کہ الٰہی نظام پر ایمان لانے اور نہ لانے میں وہی فرق ہے جو کربلا میں حسینیت اور یزیدیت میں تھا، نظام الٰہی کے ذمہ دار کا نام حسینؑ بن علیؑ تھا اور نظام دنیا کے پرستار کا نام یزید بن معاویہ اور حقیقت اسی لئے واضح کی گئی تھی کہ دنیا کربلا کی جنگ کو دو بادشاہوں کی جنگ نہ کہہ دے اور یہ خوب سمجھ لے کہ یہ ایمان و نفاق کا معرکہ ہے، اسلام و کفر کی جنگ ہے، عبدیت اور بے راہ روی کا معرکہ ہے، آدمیت اور ابلیسیت کی لڑائی ہے۔ محمدیت اور سفیانیت کی محاذ آرائی ہے، محمدیت کے نمائندہ کا نام حسینؑ اور سفیانیت کے بقیۃ السلف کا نام ہے یزید۔

سرکار سید الشہداء امام حسین علیہ السلام کے بیان کا حوالہ دینے کا مقصد یہ ہے کہ آج کے اس مقدس اجتماع میں اسی عظیم شخصیت کا تذکرہ کرنا ہے اور مختصر لفظوں میں اسی ہستی کے حالات و کردار پر روشنی ڈالنا ہے، امام حسینؑ کے کردار کے لئے سید الشہداء کا لفظ ہی بہت کافی ہے اور میرا خیال ہے کہ روئے زمین پر اس سے بڑا کوئی لقب نہیں ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں

ہر طرح کے القاب و خطابات پائے جاتے ہیں۔ بعض الفاظ نقص، عیب، کمزوری اور برائی کی علامت ہیں۔ جیسے شیطان، ابلیس، جاہل، فاسق، کافر، بدکار، عیاش وغیرہ کہ ان الفاظ کے سنتے ہی ذہن برائی کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور یہ خیال آتا ہے کہ ان الفاظ کا مصداق یقیناً کوئی بے ایمان اور بدکردار آدمی ہوگا اور بعض الفاظ سے اچھائی اور خوبی کا تصور قائم ہوتا ہے جیسے مومن، مظلوم، نبی امام، خلیفۃ اللہ، رشی، منی، اوتار اور اس طرح کے دوسرے بے شمار الفاظ جن کے سننے کے بعد یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ آدمی اپنی قوم اور اپنی ملت کا محترم اور باعزت آدمی ہے۔ اس کے کردار میں کوئی نہ کوئی حسن اور خوبی ضرور ہے ورنہ اسے اس مقدس نام سے نہ یاد کیا جاتا۔ لیکن ان دونوں قسم کے الفاظ کے ساتھ ایک خصوصیت یہ ہے کہ بعض الفاظ جماعتی اور قومی اعتبار سے فضیلت و منقصت رکھتے ہیں اور بعض الفاظ ہر قوم اور ہر جماعت میں حسن یا عیب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر نبی یا امام مسلمانوں میں عظمت کی علامت ہے ہندوؤں میں نہیں۔ اوتار یا رشی منی ہندوؤں میں بلندی کی دلیل ہے مسلمانوں میں نہیں۔ یہی حال ابلیس و شیطان، فرعون و قارون جیسے الفاظ کا ہے کہ یہ الفاظ ایک طبقہ کے لئے عیب کی حیثیت رکھتے ہیں اور ایک طبقہ میں یہی حسن ہیں۔ ابلیس، اللہ والوں کی نگاہ میں عیب ہے اور توحید خالص والوں کیلئے بہترین حسن ہے کہ ایک ایسا بندہ بھی پیدا ہوا ہے جس نے غیر خدا کے سامنے سر نہیں جھکایا اگرچہ خدا ہی نے حکم دیا تھا۔ فرعون و قارون، موسیٰ کے پرستاروں کی نگاہ میں عیب ہے۔ بنی اسرائیل کی نگاہ میں خدائی کی علامت تھا غرضکہ دنیا میں اچھائی کی علامتیں بھی پائی جاتی ہیں اور برائی کی علامتیں بھی۔ اور

آج کے دور میں تو پورا ایک ادب علامتوں پر قائم ہے۔ آج کون علامت کی اہمیت سے انکار کر سکتا ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ علامت کی دو قسمیں ہیں وہ علامتیں جو کسی ایک قوم، طبقہ، جماعت یا گروہ میں عظمت کا درجہ رکھتی ہیں اور وہ علامتیں جو ہر قوم، ہر ملت، ہر طبقہ اور ہر گروہ میں عظمت کا درجہ رکھتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو لفظ بین الاقوامی علامت کا حامل ہوگا وہ ان تمام الفاظ سے بالاتر ہوگا جن کی علامتیت صرف فرد، جماعت یا قوم سے وابستہ ہوگی اسی لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ تاریخ انسانیت میں "شہید" کا لفظ جملہ علامتوں سے بالاتر ہے۔ لفظ خدا علامت خیر ہے لیکن مسلمانوں میں۔ لفظ نبی و امام و خلیفہ علامت خیر ہے لیکن اللہ والوں میں۔ لفظ اوتار، پیغامبر، رشی، منی، گرو علامت خیر ہے لیکن ایک محدود طبقہ اور جماعت میں۔ لیکن لفظ "شہید" ایک ایسی علامت ہے جسے دنیا کی ہر قوم اپنائے ہوئے ہے اور اپنانے کے لئے تیار ہے۔ آج دنیا کے حالات کا جائزہ لیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ لفظ شہید اس قدر عام ہو گیا ہے کہ سیاسی میدان کے مرنے والے بھی شہید، روٹی کپڑے کے سوال پر قتل ہونے والے بھی شہید، ظالموں کے ساتھی بھی شہید، مظلوموں کے ہمراہی بھی شہید، حملہ آور بھی شہید، مجروح اور مظلوم بھی شہید، غرضکہ جس کے سینے پر گولی لگی وہ شہید، جس کے گلے پر خنجر چلا وہ شہید، جسے سولی پر چڑھایا گیا وہ شہید، جس کی زندگی کا خاتمہ کیا گیا وہ شہید۔ شرط صرف یہ ہے کہ کسی جرم و خطا پر نہ مارا گیا ہو ورنہ مقتول ہوگا شہید نہ ہوگا۔ گویا ساری دنیا نے اتفاق کر لیا ہے کہ شہادت کے لئے نیک کردار ہونا ضروری ہے اور شہید وہی انسان ہوگا جو بلند مقصد پر

قربان ہو جائے، چاہے اس کا مقصد کسی ایک جماعت اور گروہ کی نظر میں بلند ہو، اور جب یہ حقیقت واضح ہو گئی تو مجھے کہنا پڑے گا کہ علامتی میدان میں لفظ شہید ایک بین الاقوامی حیثیت رکھتا ہے اور اس کی عظمت سے دنیا کا کوئی انسان انکار نہیں کر سکتا، شاید یہی راز رہا ہو کہ پروردگار نے اپنے جملہ نمائندوں کی شہادت مقدر کر دی اور یہ چاہا کہ یہ دنیا سے جانے کے بعد بھی منزلِ عظمت پر فائز رہیں بلکہ انکی عظمت ہر قوم و ملت میں مسلم رہے، یہ اور بات ہے کہ ان میں اکثر شہادتیں وہ ہیں جنھیں پسِ پردہ ڈال دیا گیا، اور دنیا کو ان کی اطلاع بھی نہ ہو سکی، یا شہادت کی اطلاع ہوئی اسباب پردۂ راز میں رہ گئے اور نوعیتِ قتل کے مجہول ہو جانے کی بنا پر شہادت کا صحیح فیصلہ نہ ہو سکا امیرالمومنینؑ بھی شہید ہوئے اور امام حسن مجتبیٰؑ بھی حضور اکرمؐ بھی شہید ہوئے اور صدیقۂ طاہرہؑ بھی، امام زین العابدینؑ بھی شہید ہوئے اور امام محمد باقرؑ بھی، امام صادقؑ بھی شہید ہوئے اور امام کاظمؑ بھی، امام رضاؑ بھی شہید ہوئے اور امام تقیؑ بھی، امام نقیؑ بھی شہید ہوئے اور امام عسکریؑ بھی لیکن ان میں اکثر شہادتیں وہ ہیں جن پر پردہ پڑا ہوا ہے اور دنیا انھیں مشکوک بنائے ہوئے ہے۔ ہاں ایک شہادت ایسی ہے جس پر کوئی پردہ نہ پڑ سکا اور نہ پڑ سکتا تھا، قدرت نے اس کے لئے خاص انتظام کیا تھا، انبیاء و مرسلین کے دور سے اس کا اعلان ہوا تھا، خاتم النبیینؐ کی زبان سے تکرار ہوئی تھی، حسن مجتبیٰؑ کے بیانات سے اظہار ہوا تھا اور پھر عملی طور پر مدینہ چھوڑ کر، مکہ کو ترک کر کے، کوفہ سے کنارہ کشی اختیار کر کے ایک صحرا کا انتخاب کیا گیا، بچوں کو ساتھ لیا، عورتوں کو رفیقِ سفر بنایا، قافلہ تیار کیا، رفقاء و احباب فراہم کئے اور اس کے بعد شہادت کا موقع دیا، تاکہ کسی دور میں اس شہادت پر پردہ نہ پڑ سکے اور کوئی حکومت اسے دبا نہ سکے، نتیجہ یہ ہوا کہ ہر راہِ حق میں قربانی دینے والا شہید ہوا اور امام حسینؑ

سید الشہداء ہو گئے، سب کی عظمتوں پر پردے ڈال دیئے گئے لیکن حسینؑ کی عظمت اقوامِ عالم میں مسلم ہو گئی اور اسی شہادت کا طفیل تھا کہ جو خدا اور رسولؐ کے پرستار نہیں بنے وہ بھی حسینؑ کے قدموں میں سر جھکائے ہوئے ہیں، جو اسلام اور ایمان کو نہیں پہچانتے وہ بھی حسینی برہمن کہے جاتے ہیں اور حسینؑ آواز دے رہے ہیں، میرے چاہنے والو! میں ایک نانا کا نواسہ اور ایک خدا کا نمائندہ ہوں، تم میرے قدموں تک آ جاؤ میں تمہیں خدا تک پہنچا دوں گا، خبردار! میری منزل تک آ کر ٹھہر نہ جانا ورنہ تمہاری معرفت مجروح ہو جائے گی، دیکھو میں نے تمہاری ہدایت کا کتنا معقول انتظام کیا ہے کہ جب ساری دنیا میری طرف متوجہ تھی تو میں خاکِ گرم پر سجدہ کر رہا تھا تاکہ سب میری طرف آئیں اور میں خدا کی طرف لے جاؤں، صلوات۔

یہ ہے عظمتِ حسینؑ، جو صرف حسینؑ کا حصہ ہے اور جس میں کوئی دوسرا شریک اور حصہ دار نہیں ہے اور جسے خدا نے بھی اہمیت دی ہے اور اعلان کر دیا ہے کہ اے حسینؑ میں نے تجھے شہادت کے عوض تین فضیلتیں عنایت کی ہیں، شفا تیری تربت میں رکھی ہے، قبولیت دعا تیرے روضہ پر رکھی ہے اور امامت کو تیری نسل میں قائم کر دیا ہے۔

اب کون پوچھے کہ حسینؑ کی عظمت و منزلت کیا ہے۔ خدا شفا، قبولیت اور امامت دے رہا ہے، رسولؐ سجدہ میں پشت پر بٹھائے ہوئے ہیں، علیؑ دوش کاندھے پر اٹھا رہے ہیں، گھر میں زبان چسا رہے ہیں، محفل میں پیار کر رہے ہیں، محراب میں سجدہ کو طول دے رہے ہیں، منبر پر فضائل کا اعلان کر رہے ہیں، ازواج کے گھر شہادت کی داستان سنا رہے ہیں، اصحاب کی محفل میں معرفت کا سبق دے رہے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا بھی عظمتِ حسینؑ کے اعلان پر

آمادہ ہے اور رسول اکرمؐ بھی اور کیوں نہ ہوتا دونوں کو معلوم ہے کہ میرے نام کی بقاؑ حسینؑ سے ہے، خدا کو معلوم ہے کہ لا الٰہ الا اللہ حسینؑ کے دم سے باقی رہے گا، نبیؐ کو معلوم ہے کہ محمدؐ رسول اللہ کا کلمہ حسینؑ ہی زندہ رکھے گا۔

سر داد نداد دست در دست یزید ، حقا کہ بنائے لا الٰہ است حسینؑ

ماہ شعبان سنہ ۴ھ کی تیسری تاریخ تھی جب یہ زہراؑ کا چاند افق امامت پر نمودار ہوا، اور ام الفضل کو اپنے خواب کی تعبیر ملی، ولادت میں بھی قدرت نے ایک خاص اہتمام رکھا کہ زہراؑ کے اس فرزند کو شکم مادر میں صرف چھ ماہ رکھا اور اس کے بعد ایک طویل حیات عنایت کی جبکہ دنیا جانتی ہے کہ بچہ شکم مادر میں کم از کم ۹ ماہ کی مدت گزارتا ہے اور چھ ماہ کی مدت میں پیدا ہونے والا بچہ زندہ نہیں رہتا لیکن تاریخ کا بیان ہے کہ یہ امتیاز قدرت نے صرف جناب یحییٰ اور امام حسینؑ کو عنایت کیا تھا، کہ چھ ماہ کی مدت میں خلق کیا اور زندہ بھی رکھا اور شاید اسی لئے امام حسینؑ اکثر جناب یحییٰ کا تذکرہ کرتے تھے اور دونوں کے واقعات میں ایک حد تک مشابہت و مناسبت بھی پائی جاتی تھی، بعض حضرات نے اس ذیل میں جناب عیسیٰؑ کا نام بھی لیا ہے۔ لیکن مجھے اس سے بحث نہیں ہے، مجھے تو صرف یہ عرض کرنا ہے کہ قدرت نے امام حسینؑ کو ولادت ہی سے ایک امتیاز دیا ہے، باپ مولائے کائنات علیؑ ابن ابی طالب، ماں خاتون قیامت صدیقہ طاہرہ فاطمہ زہراؑ، نانا خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، نانی خدیجۃ الکبریٰ، بھائی امام حسنؑ مجتبیٰ، دادی حضرت فاطمہؑ بنت اسد، ہر طرف کمال، ہر رخ پر فضیلت، ہر جہت سے عظمت اور ہر اعتبار سے بلندی، ایک بھائی کے امام ہوتے ہوئے امامت ملی اور سارے انبیاء و مرسلین کی وراثت میں شہادت ملی، سلام ہو تجھ پر اے آدمؑ کے وارث، سلام ہو تجھ پر اے نوحؑ کے وارث، سلام ہو تجھ پر اے ابراہیمؑ

کے وارث، سلام ہو تجھ پر اے موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کے وارث، سلام ہو تجھ پر اے محمد مصطفےٰؐ کے وارث۔

منزل ولادت میں مدت کے مختصر رکھنے میں شاید یہ اشارہ رہا ہو کہ میرے حسینؑ میں نے عام بچوں سے ہٹ کر تیری ولادت کو مختصر رکھ کر بھی تجھے طویل حیات دی ہے، اب تیری ذمہ داری ہے کہ اگر میرے دین پر وقت پڑ جائے تو مختصر مدت میں قربانی دیکر میرے دین کو دائمی حیات دیدینا، حسینؑ نے بھی طے کر لیا کہ پروردگار تو نے مجھے چھ ماہ کی مدت میں حیات دی ہے تو میں بھی اپنے چھ ماہ کے بچے کو قربان کر کے تیرے دین کو بقائے دوام دے دوں گا۔

ولادت کی خبر پا کر رسول اعظمؐ بیت الشرف زہراؑ میں تشریف لائے، آواز دی میرے بچے کو لاؤ، جناب صفیہ خواہر جناب حمزہؓ نے عرض کی حضور ابھی بچہ کو غسل نہیں دیا گیا، اسے طیب و طاہر بنا لوں تو لاؤں۔ فرمایا یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ کیا میرے بچے کو بھی طہارت کی ضرورت ہے، جلدی لایئے، جسے اللہ نے طیب و طاہر بنایا ہے اسے غسل و طہارت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

دیکھا آپ نے! قدرت نے اپنے نمائندہ کو کیا طیب و طاہر بنا کر بھیجا ہے کہ غسل مولود کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ حالانکہ غسل مولود ایک امر مستحب ہے واجب نہیں اسے طہارت و نجاست سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ اس کی کوئی ذمہ داری انسان پر ہے، اور اس کے برخلاف غسل میت واجب ہے، موت کے بعد انسان پر ایک ایسی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے غسل دینا واجب ہو جاتا ہے، نبی اور امام کے یہاں یہ کیفیت بھی نہیں پیدا ہوتی لیکن قانون کو جاری رکھنے کے لئے ان کے یہاں بھی غسل میت ہوتا ہے اور یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ یہ غسل بربنائے نجاست نہیں ہے یہ اہتمام کیا جاتا

پھر غیر معصوم کو ہاتھ نہیں لگانے دیا جاتا، تاکہ دنیا پہچان لے کہ اگر موت سے نجاست پیدا ہوگئی ہوتی تو ہر کس و ناکس کو غسل دینے کا اختیار ہوتا لیکن یہاں موت نے اتنا طیب و طاہر بنا دیا ہے کہ زندگی بھر غیر معصوم کو ہاتھ لگانے کا اختیار تھا مرنے کے بعد اب وہ اختیار بھی نہیں رہ گیا۔

اب پہچانا آپ نے کہ امام کی منزل کیا ہوتی ہے۔ اور اس کی حیات و موت کا قدرت نے کیا اہتمام کیا ہے لیکن مجھے تو یہ عرض کرنا ہے کہ قدرت نے یہاں بھی امام حسینؑ کو ایک خصوصیت عنایت کی کہ ہر معصوم کے یہاں کسی نہ کسی بنیاد پر غسل میت برقرار رکھا، امام حسینؑ کو شہادت کا درجہ دے کر اس غسل سے بھی الگ کر دیا۔ آغاز میں غسل ولادت سے بھی الگ رکھا اور انجام میں غسل میت سے بھی الگ کر دیا اب دیکھئے کہ حسینؑ کی طہارت کیسی ہے؟ اور اس طہارت کا مزاج کیسا ہے؟ یہاں کسی غسل کی گنجائش نہیں ہے، اس کا آغاز بھی طیب و طاہر ہے اور اس کا انجام بھی طیب و طاہر

مجھے وضو و غسل کی بحث میں نہیں جانا ہے ورنہ اس کے بارے میں بھی عرض کرتا۔ اور ان تمام شبہات کی طرف اشارہ کرتا جو اکثر ذہنوں میں پائے جاتے ہیں، اس وقت تو صرف یہ عرض کرنا ہے کہ میری بحث ان غسلوں سے ہے جن کا تعلق انسان کے ذاتی وجود سے ہے اور میں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ آل محمدؐ ذاتی طور پر طیب و طاہر بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ نہ ان کے آغاز وجود میں کسی نجاست کا تصور ہے نہ انجام وجود میں، مجھے عارضی مسائل سے بحث کرنا نہیں ہے ورنہ ان پر بھی روشنی ڈالتا۔ اس وقت صرف یہ عرض کرنا ہے کہ آیت تطہیر کے دائرہ کی وسعت پر بحث کرنے والے نبیؐ کا یہ فرمان سنیں، صغیر جلدی لاؤ، میرا بچہ طاہر ہے، اسے طہارت کی ضرورت نہیں ہے دنیا پاک کرنے اور پاک رکھنے کی بحث میں پڑی ہوئی ہے اور پیغمبرؐ واضح کر رہے ہیں

کہ میرے اہلبیتؑ پیدا ہی طیب و طاہر ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں پاک کرنے اور نہ کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

انفرادیت کا تذکرہ ہے تو چند خصوصیات کی طرف اور اشارہ کر دیا جائے۔ امام حسینؑ کی زندگی میں اکثر ایسے واقعات پائے جاتے ہیں جن میں امام حسنؑ برابر کے شریک ہیں۔ جناب ام الفضل کا خواب۔ عید کے دن دوش رسولؐ پر سوار ہونا، سجدہ میں پشت پیغمبرؐ پر بیٹھنا، مباہلہ کے میدان میں جانا، آیت تطہیر میں شامل رہنا، سورہ دہر کے نزول کی منزل میں بیمار ہو کر نذر کرنا، کتابت کے فیصلہ میں حصہ لینا، ہرنی کے بچہ کا آجانا، فدک کا گواہ بن کر جانا، جنت کا سردار ہونا، لیکن اس کے باوجود ان واقعات کو انفرادیت ہی میں شمار کیا جائے گا، اس لئے کہ انفرادیت کا تعلق امت کے دوسرے افراد سے ہوتا ہے اہلبیتؑ تو آپس میں سب ایک دوسرے کی مثال ہیں، یہاں یہ سوچنا ہی غلط ہے کہ کس میں کون سا کمال ہے اور کس میں کون سا کمال نہیں ہے۔ منزل اظہار میں فرق ہو سکتا ہے لیکن منزل کمال میں کسی فرق کی گنجائش نہیں ہے پھر بھی میں بعض ایسے خصوصیات کی طرف اشارہ کروں گا جو پروردگار عالم نے خصوصیت کے ساتھ امام حسینؑ ہی کو عنایت کئے ہیں ان سے دوسرے ائمہ کی عظمت پر اثر نہیں پڑتا لیکن امام حسینؑ کی عظمت کا اظہار ضرور ہوتا ہے۔

مسجد میں مرسل اعظمؐ ہیں منبر پر تشریف فرما ہیں، مسائل شریعت کا بیان ہو رہا ہے، آیات قرآنی کی تلاوت ہو رہی ہے۔ احکام الٰہی پہنچائے جا رہے ہیں، کہ ایک مرتبہ پیغمبرؐ نے دیکھا چھوٹا شہزادہ چلا آ رہا ہے، پیر دامن میں الجھا، بچہ زمین پر گرا، پیغمبرؐ نے خطبہ قطع کیا، منبر سے اترے اور بچے کو منبر پر لے جا کر نئے سرے سے بیان شروع کیا۔ مسلمانو! اسے پہچانو، یہ میرا حسینؑ ہے۔ اس کی

معرفت حاصل کرو، اس کے فضائل پہچانو اور وقت پڑ جائے تو اس کی مدد بھی کرنا۔

کہاں سرکار دو عالم کا خطبہ، حلال و حرام شریعت کا بیان، احکام الٰہی کی تبلیغ اور کہاں بچہ کا گرنا، بھلا اس گرنے کی اہمیت کیا ہے، بچے گرتے ہی رہتے ہیں، اصحاب کا مجمع تھا، حضور کسی کو اشارہ کر دیتے وہ بچہ کو بڑھ کر اٹھا لیتا، یہ خطبہ کو قطع کرنے کی کیا ضرورت تھی، یہ منبر سے اترنے کی کیا ضرورت تھی، اور اگر اتر بھی آئے تھے اور بچہ کو اٹھا بھی لیا تھا تو منبر پر لے جانے کی کیا ضرورت تھی اور اگر لے بھی گئے تھے تو سارا بیان چھوڑ کر فضائل بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ عجب نازک منزل ہے، میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کہدوں کہ معاذ اللہ پیغمبرؐ نے غلط کیا ہے اور بچہ کی محبت میں بہک گئے ہیں تو اسلام جاتا ہے اور یہ کہدوں کہ حسینؑ کے پیر پھسل گئے اور گر گئے تو ایمان جاتا ہے، بھلا معصوم کے قدم میں لغزش کہاں ہو سکتی ہے، یہ کہدوں کہ پیغمبرؐ بیمار رہے ہوں گے اور مرض میں بہک کر حسینؑ کے فضائل بیان کرنے لگے تو مذہب ہاتھ سے جاتا ہے، کیا کہوں، کچھ کہنے کی جرأت نہیں ہے، کیا یہ کہدوں کہ یہ سب صحیح تھا، حسینؑ کا آنا بھی صحیح تھا، صحن مسجد میں گرنا بھی صحیح تھا، رسولؐ کا خطبہ کو قطع کرنا بھی صحیح تھا، منبر سے اترنا بھی صحیح تھا، بچہ کو اٹھانا بھی صحیح تھا اور دوبارہ منبر پر جا کر فضائل بیان کرنا بھی صحیح تھا تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ان تمام امور کی ضرورت کیا تھی ؟ یہ فضائل آل محمدؐ کی منزل ہے، اس کو سمجھنے کے لئے بڑا کلیجہ درکار ہے، یہ منزل ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے، واقعہ میں جو کچھ ہو رہا تھا سب عین مشیت الٰہی اور مرضی پروردگار تھا، خدا چاہتا تھا کہ حسینؑ مسجد میں آکر گریں، رسولؐ منبر سے اتر کر آئیں اور پھر منبر پر جا کر بیان بدل کر حسینؑ کا تعارف کرائیں تاکہ دنیا پہچان لے کہ پیرے

حسینؑ کی منزل کیا ہے ؟ بیان پیغمبرؐ حدیث ہے اور میرا حسینؑ قرآن ہے، جب قرآن حدیث کے سامنے آجائیگا تو حدیث کو رکنا پڑے گا اور قرآن کو مقدم کرنا پڑیگا رسول اسلامؐ نے منبر سے اتر کر اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ اب کوئی منبر پر بیٹھنے والا اس قرآن ناطق کے سامنے حدیث کا نام نہ لے، یہ تو فقط انقلاب امت تھا، کو چند ہی دنوں کے بعد قرآن ناطق کے مقابلہ میں حدیثیں پیش ہونے لگیں۔

ارباب کرم! ذرا غور کریں، صاحب حدیث اپنی حدیث کو روک کر حسینؑ کی بات کو آگے بڑھاتا ہے اور امتی حسینؑ کے سارے گھرانے کی بات کاٹ کر حدیث کو آگے بڑھانا چاہتے ہیں اور حدیث بھی وہ جس کا کوئی "وارث" نہیں ہے، صاحب حدیث کی حدیث پیچھے ہٹ جائے اور "لا وارث" حدیث آگے بڑھ جائے یہ ہے امت اسلامیہ کا اسلام اور یہ ہے حسبنا کتاب اللہ کا نتیجہ۔

رسولؐ نے خطبہ قطع کرکے یہ بھی واضح کر دیا کہ میں نے موضوع بدلا نہیں، خبردار! یہ نہ کہنا کہ حلال و حرام شریعت کو چھوڑ کر حسینؑ کے فضائل شروع کر دیئے اور اپنے فرض تبلیغ سے ہٹ گئے۔ نہیں، نہیں، یہ حسینؑ کے کمالات بھی میری تبلیغ کا ایک جزو ہیں اور میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اب تک جتنے احکام و قوانین بیان ہوئے ہیں ان کا زندہ رکھنے والا حسینؑ ہی ہے، میرا اسلام تمہارے دم سے نہیں، حسینؑ کے دم سے زندہ رہے گا، میں نے حسینؑ کا تعارف اسلئے ضروری سمجھا ہے کہ لوگ میری شریعت کو لاوارث نہ سمجھیں یا اپنے ہی کو وارث نہ سمجھ لیں، میں نے خطبہ کو توڑ کر واضح کر دیا ہے کہ محمدیت کا وارث حسینؑ ہے کوئی دوسرا نہیں۔

مسجد رسولؐ میں بھی حسینؑ کی شان کچھ نرالی ہی ہے، مسلمانوں کا مجمع ہے،

نماز کا عالم ہے، بندگی کی منزل ہے، عبدیت کی معراج ہے، رسول اکرمؐ کا سجدہ ہے، اور پشت پہ زہراؑ کا لال ہے، سجدہ کو طول دیا جا رہا ہے لیکن حسینؑ کو اتارا نہیں جاتا، کہا جاتا ہے کہ جبرئیل نے رسولؐ کے بازو تھام لئے، خبردار! جب تک میرا حسینؑ پشت سے نہ اتر جائے سجدہ سے سر نہ اٹھایئے گا، میں نہیں جانتا کہ جبرئیل آئے یا میکائیل، اتنا ضرور جانتا ہوں کہ یہ رسولؐ کی بشری زندگی کا واقعہ نہیں ہے کہ بچہ کی محبت کہہ کر ٹال دیا جائے، یہ عبادتِ الٰہی کا معاملہ ہے، شریعت اسلام کا مسئلہ ہے، سجدہ کی منزل ہے، اسے رسالت کا مسئلہ ماننا پڑے گا۔ اور رسالت کی منزل میں کوئی کام بغیر وحی الٰہی کے نہیں ہو سکتا جبرئیل نہ آئے ہوں کوئی اور آیا ہو، مجھے بحث کی کیا ضرورت ہے، مجھے تو صرف یہ کہنا ہے کہ سجدہ کو طول وحی الٰہی سے ہو رہا ہے، رسالت کی منزل میں، رسولؐ کا کوئی کام بغیر مرضیٔ پروردگار کے نہیں ہوتا، اب وحی الٰہی کو کیا ضرورت ہے کہ وہ رسولؐ کو روک کر سارے نمازیوں کو مصیبت میں مبتلا کرے، یہ خدا بہتر جانتا ہے۔ میں کون تبصرہ کرنے والا، میں تو صرف واقعہ جانتا ہوں کہ سجدہ کو طول ہوا اور جب سرکار نے سر اٹھایا تو مسلمانوں نے پوچھا۔ کیا خدانخواستہ کوئی حادثہ پیش آ گیا تھا۔ فرمایا، نہیں! میرا حسینؑ میری پشت پر آ گیا تھا، اب کوئی کہتا کہ اتار دیا ہوتا، ہٹا دیا ہوتا، یہ کوئی طریقہ ہے کہ آپ کے بچہ کے لئے ہم اتنی دیر تک سجدہ میں پڑے رہیں، یہ نماز ہے بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ نہ جانے کیا کیا خیالات ذہن میں آئے ہوں گے لیکن کسی میں بولنے کی جرأت نہیں ہے اور حسینؑ مسکرا رہے ہیں، آج کیسا سجدہ کرا دیا، نانا نے بھی خوب طول دیا اور امت کو بھی ہوش آ گیا، اب تو دنیا

پہچانے گی میرا رتبہ کیا ہے۔ اور میرا منصب کیا ہے؛ یاد رکھو میں نماز میں بھی آتا ہوں تو منزل پشتِ رسولؐ ہوتی ہے اور میرا کام سجدہ کو طول دینا ہوتا ہے، دنیا پہچان لے میری منزل صاحبِ معراج کی پشتِ اقدس ہے اور میرا مقصد سجدوں کی زندگی ہے۔

خبردار! میرا بہانہ لے کر سجدوں کو ترک نہ کر دینا۔ سجدہ میری زندگی ہے سجدہ میری ادا ہے، سجدہ میری آبرو ہے، سجدہ میری آبرو ہے، جو عمر دنیا والوں میں کھیلنے کی ہوتی ہے اس وقت میں سجدہ کراتا ہوں اور جو عمر دنیا میں آرام کی ہوتی ہے اس وقت میں سجدہ میں سر کٹاتا ہوں۔

امت پر کیا گزر گئی یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے، لیکن خدا نے طے کر لیا کہ جب تک حسینؑ پشت سے نہ اتریں گے نبیؐ کا سر سجدہ سے نہ اٹھے گا، کسی کو برا لگتا ہے تو لگے، کوئی کڑھتا ہے تو کڑھے، کسی کے دل پر بجلی گرتی ہے تو گرے، ہم تو اپنے حسینؑ کے فضائل کا اظہار یوں ہی کریں گے، تمہیں حسینؑ کے عمل کی اہمیت نہیں معلوم، میں تو جانتا ہوں کہ یہ حسینؑ کیا ہے؟ اور اس کی عظمت کیا ہے؟ مجھے تو معلوم ہے کہ یہ آج پشت پر بیٹھ کر سجدہ کو زندگی دے رہا ہے اور کل کربلا کے میدان میں سجدہ کر کے رسالت کو زندگی عطا کرے گا۔

عزیزانِ محترم! مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ قدرت نے فضائل اہلبیتؑ کے اظہار و اعلان میں ایک نیا ہی طریقہ اختیار کیا ہے، امت پر کیا گزر جائے اس کی کوئی پروا نہیں ہے، آلِ محمدؐ کے فضائل منظرِ عام پر آ جائیں، کسی سے برداشت ہو سکے یا نہ ہو سکے محفل میں زہراؑ کی تعظیم کی جائے گی، کوئی آنکھ دیکھ سکے یا نہ دیکھ سکے عید کے دن ناقہ بنا جائے گا، کسی کے دل پر قیامت گزر جائے سجدہ کو طول دیا جائے گا اور کسی کے پیروں میں چھالے پڑیں یا دل میں پھپھولے پھوٹیں غدیر کی دوپہر میں مجمع کو روک کر

ولایتِ علیؑ کا اعلان کیا جائے گا۔

یہ تو حسینؑ کی ذاتی ادائیں تھیں اور ان کے اپنے کمالات تھے، قدرت نے روزِ اوّل سے حسینؑ کو وہ رتبہ دیا ہے جس کی کوئی نظیر نہیں ہے گویا قدرت یہ واضح کرنا چاہتی ہے کہ ہم نے اس فرزند کو کس خاص مقصد کے تحت پیدا کیا ہے اور اس سے ایک عظیم کام لینا ہے' ایسا نہ ہوتا تو حسینؑ کی پوری تاریخِ زندگی الفاظِ قرآن میں بیان نہ ہوتی۔ ذرا آیت یاد کریں، ہم نے انسان کو وصیت کی ہے کہ اپنے ماں باپ کے ساتھ بہتر سلوک کرے' اس کی ماں نے زمانۂ حمل میں بھی مصیبتیں برداشت کی ہیں اور اسے دنیا کے حوالے کرنے کے بعد بھی' اس کے حمل اور دودھ پینے کا زمانہ ۳۰ مہینہ کا ہے' جب وہ انسان ۴۰ سال کا ہو گیا اور جسم میں توانائی آگئی تو اس نے ہماری بارگاہ میں دعا کی' پروردگار مجھے توفیق دے کہ میں ان نعمتوں کا شکریہ ادا کروں جو تو نے مجھے اور میرے والدین کو عنایت کی ہیں' اور میری ذریت میں ایک صالح نسل پیدا کر میں تیری طرف متوجہ ہوں اور میرا سرِ تسلیم تیری بارگاہ میں خم ہے۔"

تاریخِ اسلام بتلائے کہ وہ کون سا بچہ ہے جس کا حمل اور رضاعت کا زمانہ ۳۰ مہینے کا ہے، رضاعت کے دو سال نکالنے کے بعد شکمِ مادر میں چھ ماہ کون بچہ رہا ہے کس کی ماں نے یہ سب زحمتیں برداشت کی ہیں کہ روزِ اوّل سے قتل و شہادت کی خبریں سن رہی ہے، کس نے اللہ سے دعا کی ہے اور آخری لمحات میں کن نعمتوں کا شکریہ ادا کیا ہے، کس کے ماں باپ انعمت علیہم کی منزل میں ہیں، اور کس کی ذریت میں صالح نسل پیدا ہوئی ہے اور آج تک قائم ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ حسینؑ بن علیؑ کے سوا کوئی اس آیت کا مصداق نہیں ہے اور یہ صرف زہراؑ کے لال کا شرف ہے کہ قرآن حکیم نے اس کی پوری سوانح حیات ولادت سے لے کر نسل و ذریت تک بیان کر دی ہے اور اس نے بھی طے کر لیا ہے کہ خدا کی کتاب میری ولادت سے میری ذریت تک کے واقعات بیان کرے گی اور میں اسے نوکِ نیزہ پر سنا کر محفوظ کر دوں گا۔

اب نہ قرآن حسینؑ سے جدا ہو گا اور نہ حسینؑ قرآن سے، جب تک قرآن زندہ رہیگا تاریخِ حسینؑ زندہ رہے گی اور جب تک نامِ حسینؑ زندہ رہیگا قرآن قائم و دائم رہے گا اور آخری دور میں قرآن اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ منظرِ عام پر آئیگا تو وہ بھی فرزندِ حسینؑ ہی کے ذریعہ آئیگا۔

دنیا والوں نے نہیں پہچانا کہ حسینؑ کیا ہے؟ اور اس کی عظمت کیا ہے؟ آسمان والے پہچانتے ہیں کہ اس کی قدر و قیمت اور عظمت و جلالت کیا ہے؟ واقعہ یاد کیجئے جب فاطمہؑ کے گھر اس فرزند کی ولادت ہوئی اور یہ خبر زمین سے آسمان تک پہنچی، جنت آراستہ ہوئی، کوثر کو جوش آیا، طوبیٰ نے موتی لٹائے، حوروں نے جشن منایا تو فرشتوں کا بھی ایک گروہ جبرئیل امین کی قیادت میں در زہراؑ پر مبارکباد کیلئے حاضر ہوا۔ راستہ میں ایک جزیرے سے گزر ہوا، دیکھا کہ اللہ کا ایک معتوب فرشتہ فطرس پڑا ہوا ہے۔ وجہ عتاب یہ ہے کہ فطرس کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ اب میں بھی ایک بڑی مخلوق ہوں۔ اللہ نے مجھے بہت کچھ عنایت کیا ہے اور اللہ کو یہ ادا پسند نہیں آئی۔

جبرئیل کی نظر پڑی، ٹھہر گئے۔ فطرس کیا حال ہے؟ فطرس نے گھبرا کر کہا۔ جبرئیل! کیا قیامت آگئی ہے؟ یہ زمین کی طرف کیوں جا رہے ہو؟ فرمایا کہ آخری نبیؐ کے یہاں ایک فرزند پیدا ہوا ہے ہم اسکی مبارکباد کیلئے جا رہے ہیں۔ فطرس نے

کہا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ میں بھی لے چلوں شاید اسی مولود کے طفیل میرا یہ عتاب برطرف ہو جائے مشائے الٰہی تھا کہ فطرس کا عتاب حسینؑ ہی کے طفیل برطرف ہو۔ جبرئیل نے پروں پر اٹھایا، مرسل اعظمؐ کی خدمت میں لائے۔ واقعہ بیان کیا، پیغمبرؐ نے فرمایا حسینؑ کے گہوارہ کے قریب لے جاؤ، اس کے بال و پر کو حسینؑ کے گہوارے سے مس کرو، نئی زندگی عطا ہوگی۔ جبرئیل گہوارے کے قریب لائے، بازوؤں کو مس کیا، نئے بال و پر ملے۔ اور فطرس یہ کہتا ہوا چلا "مَنْ مِثْلِي أَنَا عَتِيقُ الْحُسَيْن"۔ کون میرے مثل ہے، میں حسینؑ کا آزاد کیا ہوا ہوں۔

غور کرنے کی بات ہے کہ فطرس رسول اکرمؐ کی خدمت میں آیا تھا اور آپ نے حسینؑ کے گہوارے کی طرف بھیج دیا کیوں ہر کا۔ کیا آپ دعا نہیں کر سکتے۔ کیا آپ بال و پر عطا نہیں کر سکتے۔ ؟ آپ فرمائیں گے۔ میں سب کچھ کر سکتا ہوں لیکن آج حسینؑ کا کمال ظاہر کرنا ہے اور امت کو بتا دینا ہے کہ بخشش درکار ہے تو حسینؑ کے دروازے پر آؤ حسینؑ کے بغیر میں نہیں بخشواتا تو کوئی اور کیا بخشوائے گا۔

آیئے جبرئیل امین سے کہیں یہ آپ یہاں کہاں لے آئے؟ عتاب خدا کا ہے اسی سے کہیئے کہ وہ برطرف کر دے۔ حسینؑ سے کیا مطلب ہے؟ خدا کے معاملات میں حسینؑ کیا کر سکتے ہیں۔ جبرئیل آواز دیں گے: ناسمجھو اسی لئے لایا ہوں کہ دنیا پہچان لے کہ قدرت کے یہاں بھی کوئی کام بغیر وسیلہ کے نہیں ہوتا۔ اب جو لوگ وسیلۂ آل محمدؐ کے قائل نہیں ہیں وہ اپنے بارے میں سوچیں کہ ان کا کیا انجام ہوگا۔

پیغمبر اعظمؐ نے فطرس کے بازوؤں کو حسینؑ کے گہوارے سے مس کرایا، جسم سے نہیں تاکہ غلاموں کو ایک مستقل سہارا مل جائے کہ سنہ ۶۱ھ کے بعد حسینؑ کا جسم تو نہ ملے گا لیکن وہ جگہ ضرور ملے گی جہاں حسینؑ آرام فرما رہے ہیں۔ اب اگر امت کو ہوش ہو تو فطرس سے سبق لینا۔ اس نے گہوارے سے بازوؤں کو مس کیا تو نئے بال و پر ملے، تم ضریح حسینؑ سے اپنے جسم کو مس کرنا نئی زندگی ملے گی اور تمہاری زندگی کیا ہے، حسینؑ نے اسلام کو زندگی دی ہے، مذہب کو زندہ کیا ہے، قرآن کو زندہ کیا ہے، اور مختصر یہ ہے کہ اسلام زندہ ہو گیا بس کربلا کے بعد ـــــ خاتمہ کلام میں ایک فقرہ فطرس کا بھی کہہ چلوں، فطرس بڑی نادانی کی بات کر رہا ہے۔ ابھی کل تعلّی و بلندی پر عتاب نازل ہو چکا ہے اور آج یہ دعویٰ ہے کہ کون میرے مثل ہے؟ ایک دفعہ ٹھوکر کھا کر انسان دوبارہ سنبھل جاتا ہے۔ تجھے کیا ہو گیا ہے کہ اتنے دن معتوب رہنے کے بعد بھی تجھے ہوش نہیں آیا اور ایسے نازیبا دعوے کر رہا ہے۔ اب اگر کہیں عتاب نازل ہو گیا تو دوسرا کوئی بخشوانے والا کبھی نہ ملے گا۔ فطرس کہے گا نادانو! تم نے نہیں پہچانا، میں اپنے انجام کو خوب پہچانتا ہوں، میں عتاب کی مصیبت جھیل چکا ہوں، مجھے حالات کا صحیح اندازہ ہے مجھے معلوم ہے کہ کل عتاب نازل ہو گیا تھا لیکن آج عتاب نازل نہیں ہوگا تم پوچھو گے کیوں؟ تو سنو کل میرا دعویٰ بغیر دلیل کے تھا اسلئے عتاب نازل ہو گیا تھا آج دعویٰ کیساتھ دلیل بھی ہے اسلئے عتاب کا کوئی خطرہ نہیں ہے یاد رکھو میں نے فقط بے مثل ہونے کا اعلان نہیں کیا ہے بلکہ یہ بھی کہا ہے کہ میں حسینؑ کا آزاد کردہ ہوں۔ جب حسینؑ کا سہارا مل گیا تو عتاب کی کیا مجال ہے؟

ارباب نظر! مجھے تو یہ کہنا پڑتا ہے کہ جس کا وسیلہ ملک کو بے مثل بنا دے وہ خود کیسا لاجواب ہوگا۔

اور فطرس کے مقصد نے غلاموں کا مقدر کھول دیا، اب کہنا پڑے گا کہ رب بھی بے مثل، نبی بھی بے مثل، علی بھی بے مثل اور جب یہ سب بے مثل تو حبیب بھی بے مثل، مسلم بھی بے مثل، مسلم بن عوسجہ بھی بے مثل اور جب غلام بے مثل تو بھائی کیسا بے مثل ہوگا، بیٹا کیسا بے مثل ہوگا، دل کے ٹکڑے کیسے بے مثل ہوں گے اور خود کیسا لاجواب ہوگا۔

امام زین العابدین علی الحسین علیہ السلام

اسم مبارک :۔ علیؑ

کنیت :۔ ابو محمد

والد ماجد :۔ امام حسین علیہ السلام

والدۂ ماجدہؑ :۔ حضرت شہربانو (شاہ زنان)

ولادت :۔ ۱۵ جمادی الاولیٰ ۳۸ھ یا ۵ شعبان المعظم

اولاد :۔ گیارہ فرزند ۔ چار دختر

شہادت :۔ ۲۵ محرم ۹۵ھ

عمر مبارک :۔ ۵۷ سال

قبر مطہر :۔ جنت البقیع ۔ مدینہ منورہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید الانبیاء والمرسلین خاتم النبیین سیدنا ومولانا ابی القاسم محمد وآلہ الطیبین الطاہرین ولعنۃ اللہ علیٰ اعدائہم اجمعین اما بعد فقد قال اللہ الحکیم فی کتابہ الکریم ۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى

ارشاد جناب رب العزت ہوتا ہے "بیشک ہدایت کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے اور دنیا وآخرت کا اختیار ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ آیت کریمہ کے ذیل میں جو بات قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ مالک کائنات نے ہدایت بشر کا انتظام خود انسان کے حوالے نہیں کیا بلکہ اپنے لطف وکرم کی بناء پر یہ ذمہ داری اپنے اوپر رکھی ہے۔

کون تھا دنیا میں جو اس کے سر کوئی ذمہ داری ڈال سکتا ۔ کس کی مجال تھی جو اس پر کوئی فریضہ عائد کر سکتا۔ وہ قادر مطلق تھا اور بندہ عاجز وناتواں۔ وہ خالق کائنات تھا اور بندہ ذرۂ ناچیز۔ وہ عالمین کا پالنے والا تھا اور بندہ ایک حقیر بے مقدار۔ کس انسان کی مجال تھی جو اللہ پہ کوئی ذمہ داری عائد کر سکتا۔ یہ اس کا کرم تھا کہ اس نے اتنا عظیم فرض خود اپنے ذمہ عائد کر لیا اور اپنے بندوں کو اس بار گراں سے سبکدوش کر دیا۔ اب بندوں کی ذمہ داری صرف اطاعت ہے ۔ ان کا کام صرف فرماں برداری ہے اور بس۔

کون تصور کر سکتا ہے اس کرم بے پایاں کا ۔ کہ جس مسئلہ کو حل کرتے ہوئے عالم کفر کی صدیاں گذر گئیں اور مسئلہ حل نہ ہو سکا۔ اس مسئلہ کو مالک کائنات نے لمحوں میں حل کر دیا اور انسان کو کسی زحمت میں مبتلا نہیں ہونے دیا ۔ اور نہ فقط مسئلہ کو حل کر دیا بلکہ انسان کو باخبر بھی کر دیا کہ وہ انتظام ہدایت کے سلسلے میں کوئی زحمت نہ کرے

اور مالکِ کائنات کے کرم پر اعتماد کرے اور یہ حق بھی دے دیا کہ بندہ خدا سے ہادی اور رہنما کا مطالبہ کرے اور یہ کہے کہ جب تو نے ہدایت کا وعدہ کیا ہے تو آج ہمارا ہادی رہنما کہاں ہے اور اس دور کے لئے ہدایت کا کیا انتظام کیا ہے؟

اسی سوال اور اسی تقاضے کا لحاظ تھا کہ اس نے ہر دور میں حجت کا اہتمام کیا اور کسی دور کو حجت خدا سے خالی نہیں رکھا۔ ایسا نہ ہو کہ ہدایت لینے والے موجود رہیں اور ہدایت دینے والا نہ رہے۔ دنیائے اسلام کو آج بھی حق ہے کہ وہ رب العالمین سے یہ مطالبہ کرے کہ تو نے اس دور کے لئے ہدایت کا کیا انتظام کیا ہے اور مالکِ کائنات کا فرض ہے کہ وہ ہدایت کا اہتمام کرے ورنہ اپنے نظام کو ناقص و ناتمام تسلیم کرے۔

نظامِ قدرت ناقص و نامکمل نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ آج بھی کوئی ہادی و رہنما ہے جو امت کی ہدایت کا اہتمام کر رہا ہے اور بندوں کی طرف سے نہیں بلکہ خدا کی طرف سے ہے۔ اب یہ قدرت کے اختیار کی بات ہے کہ وہ اسے کہاں رکھے اور کس حال میں رکھے۔ اس مقام پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اگر نگاہوں سے غائب ہے تو ہونے کا فائدہ کیا ہے۔ اس لئے کہ اس طرح تو خود خدا پر سے اعتماد اٹھ جائے گا اور اس کے بارے میں بھی یہی کہا جائے گا کہ جب نگاہوں سے غائب ہے تو کیا انتظام کرے گا؟ قدرت نے واضح کر دیا کہ جس طرح میری غیبت پر ایمان رکھنا ضروری ہے اسی طرح میری حجت کی غیبت پر بھی ایمان رکھنا ضروری ہوگا۔

قدرت نے ہر دور میں ہدایت کا انتظام کیا ہے اور ایک نہ ایک ہادی و رہنما مقرر و معین کیا ہے اور یہ انسان کی طرف سے کوئی ذمہ داری نہیں ہے بلکہ اس کا کرم ہے کہ اس نے انسان کو ایک عظیم زحمت سے بچا لیا اور کائنات کے عظیم ترین مسئلہ کو لمحوں میں حل کر دیا۔ مذہب اسلام میں ائمہ معصومینؑ کی ولادت کے موقع پر

جو اعمال بیان کئے گئے ہیں اور جن میں نماز، روزہ اور صدقہ وغیرہ کی تاکید کی گئی ہے اس کا بھی شاید اسی طرف اشارہ ہے کہ آج کے دن مالکِ کائنات کے کرم کی تجدید ہوئی ہے لہٰذا بندہ کا فرض ہے کہ اس کی بارگاہ میں سجدہ شکر ادا کرے اور اس کی نعمتوں کا شکریہ ادا کرتا رہے۔ خود معصومینؑ نے بھی پوری زندگی اسی شان سے عبادت اور سجدہ گذاری میں طے کی ہے کہ تاریخ کائنات میں کہیں اس کا جواب نہیں مل سکتا اور یہ اسی لئے ہے کہ جب ہادی پانے میں سجدہ شکر ضروری ہے تو جس کو ہادی یا رہنما بنایا گیا ہے وہ کس طرح سجدۂ شکر نہ ادا کریگا ــــ صلوات

اہلبیتؑ طاہرین کو اللہ نے کچھ ایسے فضائل و کمالات عطا کئے ہیں جن کی مثال آدمؑ و عالم کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ایک امت پیغمبرؐ ہی کا کیا ذکر ہے۔ عبادت و اطاعت کے ذیل میں تو میرا دل چاہتا ہے کہ ایسے بندہ پروردگار کا تذکرہ کروں جس کی عبادت شاہکار اور اس کے سجدے یادگار رہوں۔ ایسا عابد و زاہد کہ بزمِ عبادت بے رونق ہو جائے اگر وہ نہ رہے اور ایسا سجدہ گذار کہ کاروانِ عبدیت بے قافلہ سالار ہو جائے اگر وہ نہ رہے۔ وہ عظیم انسان جسے اللہ نے عرب و عجم کی شرافت و سیادت کا مرکز بنایا ہے جس کی ذاتِ اقدس پر عرب کو بھی ناز ہے اور عجم کو بھی۔ عربیت کا وہ عالم کہ جانِ ہاشم۔ روحِ عبدالمطلب۔ قلبِ ابوطالبؑ۔ راحتِ علیؑ اور نورِ نگاہ حسینؑ مظلوم اور عجمیت کا وہ امتیاز کہ شہزادی عجم شہربانو کا لال بادشاہ فارس یزدجرد کا نواسہ اور آخر میں اس کی نسل میں جس کے دورِ حکومت پر مرسلِ اعظمؐ کو ناز کہ میں ایک بادشاہ عادل کے دور میں پیدا ہوا ہوں اور یہیں یہ اگر مجھے کہنا پڑتا ہے کہ اگر دورِ عادل میں پیدا ہو جانا اپنی عدالت کی نشانی اور تمہید ہے تو نسلِ عادل میں آنا کتنی بڑی حسین تمہید ہوگی اور پھر جب عدالت پر عصمت کا رنگ

چڑھ جائے گا تو کردار کی بلندی کا کیا عالم ہوگا اس کا اندازہ تو کوئی معصوم ہی کرسکتا ہے۔ غیر معصوم کے بس کی بات نہیں ہے

دنیائے اسلام کے فاتحین نے قوم عجم کو ذلیل کرکے عرب و عجم کی تفریق کی وہ بنیاد رکھی تھی جو آج تک ختم نہیں ہوسکی اور اسلام میں عرب و عجم کا سلسلہ باقی ہے۔ وہ پیغمبر اسلامؐ جس نے کھلے لفظوں میں اعلان کیا تھا کہ عجم پر عرب کو کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے۔ فضیلت کا معیار تقویٰ ہے۔ اس کی امت نے قومیت کو معیار فضیلت بنالیا اور اس کی مسند پر بیٹھنے والوں نے تفریق کی خلیج کو اتنا وسیع کردیا کہ آج تک پُر نہ ہوسکی۔ قربان جائیے فلسفہ آل محمدؐ کے کہ انھوں نے اپنے جد کے دین کو بچانے کے لئے کوئی قدم اُٹھا نہیں رکھا اور جہاں جہاں اہل دنیا نے دین کو رُسوا کرنے کی کوشش کی وہیں آل محمدؐ نے کردار کی شمعیں روشن کردیں اور اپنے جد کے دین کو رسوائی و ذلت سے بچالیا۔

تاریخ اس حقیقت کو فراموش نہیں کرسکتی کہ جب امیرالمومنینؑ کے دور حکومت میں آپ کے عامل "حُریث" نے عجم کی دو خواتین کو قیدی بناکر بھیجا تو سارا سماج قیدیوں کو ذلت و رسوائی کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا اور اسلام کا مسخ شدہ تصور ذہن میں رکھنے والے یہی امید کررہے تھے کہ اب علیؑ ان خواتین کے ساتھ کنیز دں جیسا برتاؤ کریں گے اور انھیں عجمیت کی قرار واقعی سزا دیں گے۔ لیکن ایک مرتبہ پورے ماحول کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں جب مولائے کائنات نے یہ فیصلہ سُنایا کہ ان میں سے ایک کا عقد میرے فرزند حسین کے ساتھ ہوگا اور دوسری کا عقد محمد بن ابی بکر کے ساتھ —— یعنی امامت کی نسل میں بھی یہ شرافت چلے گی اور حکومت کی نسل میں بھی اور میں تو سمجھتا ہوں کہ محمد سے عقد کرنے میں شاید ایک مصلحت یہ بھی رہی ہو کہ حکومت کا

بس چلتا تو قومیت کا فساد پھیلا کے اسلام میں تفریق پیدا کردیتی —— یہ امامت ہے کہ اسے اختیار ملتا ہے تو حکومت کے ایوان کو بھی قومی تفریق کے مٹانے کا مرکز بنا دیتی ہے۔

عقد ہوگیا اور بظاہر عقد کوئی اتنا اہم مسئلہ بھی نہیں تھا لیکن حالات و ماحول کا جائزہ لیا جائے تو اس عقد کی صحیح عظمت و اہمیت کا اندازہ ہوگا۔ امام حسین جیسا عظیم الشان اور عظیم المرتبت انسان جس پر ذاتی شرافت اور نسبی نجابت دونوں کو ناز تھا۔ ہاشمی گھرانہ۔ ابوطالب کا لال۔ پیغمبر اسلامؐ کا نواسا۔ بھلا کون گھرانہ تھا جہاں حسینؑ کا پیغام دیا جاتا اور انکار ہوجاتا۔ کون سا انسان تھا جو حسینؑ کی دامادی پر ناز نہ کرتا۔ لیکن یہ مولائے کائناتؑ کا کمال کردار تھا کہ آپ نے ایک عجمی خاتون کو اپنی بہو بنا کر دنیا پر واضح کردیا کہ قومی تعصب کا شکار ہونا تمھارا کام ہے اور قومی تفریق کو مٹا کر فنا کردینا ہمارا کام ہے۔ اور شاید یہی راز تھا کہ قدرت نے بھی اس کا یہ انعام دیا کہ عجم کو فتح کرنے کا کام حکومت نے کیا اور کلمہ آج تک امامت ہی کا پڑھا جارہا ہے۔ جو اسلام بزور شمشیر پھیلتا ہے وہ فنا ہوجاتا ہے اور جو اسلام بزور کردار آگے بڑھتا ہے وہ زندہ و پائندہ ہوجاتا ہے۔

ماحول پہ ماحول پڑھنے کی تاریخ میں یہی دو عظیم مثالیں ملتی ہیں۔ ایک بیٹی کو زندہ دفن کردینے والے سماج کے سامنے بیٹی کی تعظیم کے لئے اُٹھنا اور ایک عرب و عجم کے تعصب کی ماری ہوئی قوم کے سامنے عجمی قیدی خاتون کو بہو بننے کا شرف دینا اور حسن اتفاق سے یہ دونوں مثالیں ایک ہی خانوادہ میں ملتی ہیں۔ بیٹی کی عظمت کا اظہار نبیؐ نے کیا ہے اور عرب و عجم کی تفریق کو مٹا دینے کا سہرا وصی کے سر رہا ہے۔ نہ کل نبیؐ نے یہ پرواہ کی کہ میرا سماج کیا کہے گا اور نہ آج وصی کو اس کی فکر ہے کہ لوگوں پہ

اس کا ردعمل کیا ہوگا۔ کل پیغمبرؐ یہی سوچ رہے تھے کہ جو قابل تعظیم ہے اسکی تعظیم ہونی چاہیئے چاہے سارا سماج مخالف ہو جائے اور آج علیؑ یہی سوچ رہے ہیں کہ جسے مرسل اعظمؐ نے خواب میں بشارت دی ہے اسے بہو بنانا ہے چاہے ساری دنیا مخالف ہو جائے۔ دنیا کا منہ دیکھ کر عمل کرنے والے دنیادار ہوتے ہیں اور دنیا سے منہ موڑ کے مرضی پروردگار تلاش کرنے والے "اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ" کے مصداق ہوتے ہیں۔

عقد ہوا اور بڑے اہتمام سے ہوا۔ عجمیت کی عزت بڑھی۔ عربیت کا غرور ٹوٹا اور ایک قیدی خاتون خاندان رسالت کی بہو بن گئی۔ دنیائے تعصب کے چہرے پہ ہوائیاں اڑنے لگیں۔ یہ کیسا انقلاب آیا اور یہ کیا ہوگیا ــــ؟ قدرت نے غرور کے منہ پر ایک اور طمانچہ مارا کہ کل جس عجم خاتون کی زوجیت برداشت نہیں ہو رہی تھی اور لوگ حیرت سے امامت کا منہ دیکھ رہے تھے آج وہی خاتون ایک امام وقت کی ماں قرار پا رہی ہے۔ ۱۵ رجمادی الاولیٰ کی وہ مبارک تاریخ آئی جب شہربانو کی گود آباد ہوئی اور قدرت نے انھیں وہ فرزند عنایت کیا جو بزم عابدین کی رونق اور کاروان ساجدین کا سردار قافلہ ہے۔

قدرت نے بنوامیہ سے باقاعدہ طور پہ سر دربار ٹکرانے کا کام انھیں عجم خاتون کے فرزند کے ذمہ رکھا اور ایک مرتبہ اموی غرور کو پھر آواز دی کہ عرب و عجم کی تفریق پر ناز کرنے والو۔ ذرا فرق تو محسوس کرو۔ کل ایک عجم خاتون علیؑ کے دربار میں آئی تھی تو اسے رشتہ کا شرف عطا کیا گیا تھا۔ اور آج رسولؐ کی بیٹیاں تمہارے دربار میں قیدی بن کر آئی ہیں تو انھیں اس طرح ذلیل و رسوا کیا جا رہا ہے۔ پہچان لو اسلام کس کے پاس ہے اور کس کے پاس نہیں ہے۔ رسول اکرمؐ سے کس کا رشتہ ہے اور کس کا رشتہ نہیں ہے اور میں تو یہ عرض کروں گا کہ پروردگار نے شام کا تختہ الٹنے کا

کام بھی انھیں جناب شہربانو کے فرزند سے لیا۔ تاکہ قید و بند کی مصیبتیں برداشت کرنیوالا دربار کی چولیں ہلا دے تو یزیدیت کو احساس ہو کہ ہاشمی گھرانے کا رشتہ عجم سے بھی ہوتا ہے تو جلال و کمال میں کوئی فرق نہیں آتا اور اموبیت عربیت پر بھی ناز کرتی ہے تو شکست خوردہ ہو جاتی ہے۔

بعض مورخین نے جناب شہربانو کی آمد کو خلیفہ دوم کے دور میں لکھا ہے اور اور یہ ظاہر کرنا چاہا ہے کہ یہ "خلافت مآب" کا احسان تھا کہ انھوں نے شہربانو کا عقد امام حسینؑ سے کرا دیا لیکن اولاً تو یہ داستان بالکل بے بنیاد ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ اس میں احسان یا تعلقات کا کوئی دخل نہیں ہے اس روایت کا مضمون یہی ہے کہ خلیفہ وقت نے انھیں کنیز بنا کر بیچنے کا ارادہ کیا تو امیرالمومنینؑ نے فرمایا کہ شہزادیاں فروخت نہیں ہوتیں اور اس طرح بھی دونوں شخصیتوں کا کردار کھل کر سامنے آگیا کہ دولت کی ہوس کہاں ہے اور عزت کی پاسداری کہاں ہے اور میں تو یہ کہوں گا کہ یہاں عقد کی داستانیں گڑھنے کی بیماری ہے اور ہر رشتہ میں اپنا دخل ضروری ہے۔ کبھی عقد شہربانو میں اپنا حصہ ثابت کیا جائے اور کبھی عقد ام کلثوم کی داستان وضع کی جائے۔ لیکن یہ قدرت کا انتظام ہے کہ جو روایت بھی تیار کی گئی اس میں مذمت ہی کا پہلو نکلا۔ مدح نہ نکل سکی۔ آل محمدؐ سے رشتہ جوڑنا کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ جب کوئی نا اہل رشتہ جوڑا گیا تو نتیجہ میں حقیقت کھل کر سامنے آگئی اور قدرت نے واضح کر دیا کہ جنھیں رشتہ کا پاس و لحاظ نہیں ہے انھیں کمالات و فضائل کا کیا خیال ہوگا۔

یہ حادثہ ضرور ہے کہ جناب شہربانو کا انتقال اپنے فرزند کی ولادت کے دس دن کے اندر ہی ہوگیا اور عالم ظاہر میں اپنے لال کے کمالات کا مشاہدہ نہ کر سکیں۔

لیکن اس انتظام قدرت میں بھی ایک مصلحت تھی اور اس کا راز اس وقت کھُلا جب بچپنے سے پالنے والی ماں دستر خوان پر بیٹھیں اور امام زین العابدینؑ نے کھانے میں ساتھ نہ دیا اور کسی نے پوچھا کہ فرزند رسولؐ آپ اپنی پالنے والی ماں کے ساتھ کھانا کیوں نہیں کھاتے تو آپ نے فرمایا کہ مجھے یہ اندیشہ ہے کہ کہیں میرا ہاتھ اُس شے کی طرف نہ بڑھ جائے جس طرف میری ماں کی نگاہ ہو اور اس طرح ماں کے احترام میں فرق آجائے گا۔

ظاہر ہے کہ وہ خاتون واقعی ماں نہیں تھیں اور امام کے بارے میں یہ اندیشہ بھی نہیں تھا کہ وہ اس طرف ہاتھ بڑھا دیں گے جس طرف ماں کی نگاہ اُٹھ رہی ہے۔ اس لیے کہ امام معصوم اور صاحب علم غیب ہوتا ہے۔ اس کی زندگی میں ایسے اقدامات کا امکان نہیں ہے لیکن بتانا یہ ہے کہ جب میں ایک پرورش کرنیوالی ماں کا اتنا احترام کرتا ہوں تو حقیقی ماں کا احترام کیا ہوگا ــــ

امام کا مقصد قطعاً یہ نہیں تھا کہ میرا ہاتھ اُدھر بڑھ جائے گا جدھر ان کی نگاہ ہے بلکہ مقصد یہ تھا کہ اُن کا ہاتھ اُدھر بڑھ سکتا ہے جدھر میرا ہاتھ بڑھ رہا ہے اس لئے کہ میں صاحب علم غیب ہوں اور وہ عالم غیب نہیں ہیں۔ یہ ایک اخلاق آل محمدؐ ہے کہ بیان کو اس انداز سے پیش کیا جائے کہ دامن تہذیب و احترام پر دھبہ نہ آنے پائے اور میرے اس دعویٰ کی دلیل وہ واقعہ ہے کہ جب معصومہؑ عالم کی وفات کے بعد شہزادے گھر میں آئے اور جناب اسماء نے کھانا پیش کیا اور شہزادوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ آپ کو معلوم ہے کہ ہم نے کبھی ماں کے بغیر کھانا نہیں کھایا۔ سوال یہ ہے کہ امام حسنؑ اور امام حسینؑ ماں کے بغیر کھانا نہیں کھاتے اور ان کے فرزند کا یہ عالم ہے کہ وہ ماں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا نہیں کھاتے

کیا امامت کے کردار میں بھی اختلاف ہوتا ہے اور کیا امام کا انداز بھی دنیا والوں کی طرح بدلتا رہتا ہے۔ نہیں ہرگز نہیں۔ راز صرف یہ ہے کہ امام حسنؑ اور امام حسینؑ اور حضرت زین العابدینؑ کے حالات میں ایک نمایاں فرق ہے ان کی ماں معصومہ تھیں۔ وہاں کسی طرف سے غلطی کا امکان نہیں تھا اور یہاں امام زین العابدینؑ کی ماں غیر معصومہ ہیں۔ غیر معصومہ کے اقدام میں غلطی کا امکان ہے۔ اس لئے انھوں نے یہ سیرت اختیار کی ــــ

امام زین العابدینؑ کا دور حیات اس انداز سے گذرا کہ ۳۸ھ سے ۴۰ھ تک دادا کے زیر سایہ رہے۔ ۴۰ھ میں مولائے کائنات کی شہادت کے بعد ۵۰ھ تک کا زمانہ باپ اور چچا کے ساتھ گذرا۔ ۵۰ھ کے بعد ۶۱ھ تک باپ کے ساتھ رہے اور ۶۱ھ کے بعد سے ۳۵ سال تک تنہا زندگی گذاری اور آپ کے شریک کار آپ کے فرزند امام محمد باقرؑ رہے۔ جن کی عمر واقعہ کربلا میں صرف ۳ سال تھی۔

یعنی یوں کہا جائے کہ امام زین العابدینؑ نے دنیا میں قدم رکھا تھا تو شہزادگی کے عالم میں۔ ماں شہزادی عجم۔ باپ شہزادۂ عرب۔ دادا حاکم اسلام اور خلیفۃ المسلمین ــــ لیکن دو ہی برس میں یہ بساط اُلٹ گئی۔ اِدھر ماں کا انتقال ہوا۔ اُدھر دادا کی شہادت ہوئی۔ اِدھر مصائب کا ہجوم۔ اُدھر واقعہ کربلا ــــ واقعہ کربلا کے بعد تاراجی مدینہ ــــ تاراجی مدینہ کے بعد غارت گری مکہ ــــ غرض کہ امام کی پوری زندگی مصائب برداشت کرنے میں گذر گئی لیکن ان مصائب کا نہ کردار پہ کوئی اثر پڑا نہ خدمت اسلام پر۔ بلکہ مصائب نے خدمت کا اور موقع دے دیا اور تاریخ کو یہ اقرار کرنا پڑا کہ آپ نے دین اسلام کو اس وقت زندہ کیا

جب کوئی دوسرا زندہ کرنے والا نہیں تھا۔ سرکار سیدالشہداء معاف فرمائیں۔ میرا یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ امام حسینؑ حفاظت اسلام کے لئے اُٹھے تو انھیں کم از کم ۷۲ ساتھی مل گئے لیکن امام زین العابدینؑ نے اس وقت یہ ذمہ داری سنبھالی ہے جب چند خواتین اور ایک کمسن فرزند کے سوا کوئی نہ تھا اور پھر مقصد کو اس طرح بچایا کہ دین بھی رہ گیا اور دین والے بھی رہ گئے۔ آج دنیا کے گوشہ گوشہ میں جو نسل رسولؐ اور سادات کرام کا سلسلہ ہے وہ کرم ہے اسی وجود امام زین العابدینؑ کا اور صدقہ ہے اسی محافظ اسلام کا کہ اس نے مصائب برداشت کرکے اتنی بڑی قوم بھی بچالی اور اتنا عظیم مذہب بھی بچالیا اور اب کہنا پڑتا ہے کہ امرت آکے دیکھے "انا اعطیناک الکوثر" کسے کہتے ہیں جس کی نسل میں ایک کے باقی رہنے کی گنجائش نہ تھی۔ اس کی نسل میں ایک سے کتنے ہو گئے۔ اب اگر امام زین العابدینؑ کو آدم آل محمدؐ نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ آدمؑ کی نسل طوفان نوحؑ میں تباہ ہو گئی اور نوحؑ آدم ثانی قرار پاگئے لیکن امام زین العابدینؑ نے جو نسل چھوڑی ہے اس پر کسی طوفان اور سیلاب کا زور بھی نہیں چل سکا اور کیوں نہ ہوتا جنتی ماحول کے پروردہ ماں باپ کی نسل طوفانوں کو برداشت نہیں کر سکتی لیکن کربلا کے مصائب جھیلنے والے بزرگوں کی نسل پر طوفانوں اور سیلابوں کا اثر نہیں ہو سکتا۔

کیا کہنا اس امام سجادؑ کا جس کی زندگی میں ہر شے نرالی ہے اور جس کی فضیلت کا ہر گوشہ نیا ہے۔ ماں شہزادی عجم۔ باپ سردار جنت۔ خود آدم آل محمدؐ۔ سجدہ زینت ساجدین۔ عبادت رونق عابدین۔ کتاب زبور آل محمدؐ۔ صحیفہ انجیل اہلبیتؑ۔ خوشی مرضی پروردگار اور تکلم فاتح دربار دربار زادہ۔

آپ کے مشہور القاب زین العابدین اور سید الساجدین ہیں۔ عبادت کرنے والوں کی

زینت اور سجدہ گذاروں کا سردار۔ عبادت کا یہ عالم ہے کہ باغ میں ۵۰۰ درخت ہیں اور روزانہ ہر درخت کے نیچے دو رکعت نماز ادا کرتے ہیں اور دنیا کو محسوس کرایا جاتا ہے کہ شکر پروردگار ادا کرنے والے ایسے ہوتے ہیں ہزاروں نعمتیں کھا کر نام خدا نہ لینے والے اور ہوتے ہیں اور ایک ایک برگ و ثمر پر شکر خدا ادا کرنے والے اور۔

اور جب کسی نے آکر عرض کی فرزند رسولؐ۔ آپ بجد عبادت کرتے ہیں اتنی عبادت کس کے امکان میں ہے تو آپ نے فرمایا بیٹا محمد باقرؑ ذرا وہ صحیفہ تو لاؤ جس میں میرے جد امیر المومنین علیؑ ابن ابی طالب کی عبادتوں کا تذکرہ ہے۔ امام محمد باقرؑ صحیفہ لائے۔ آپ نے سامنے رکھ کر فرمایا۔ ذرا میرے جد کی عبادتوں کا حال تو دیکھو۔ اور یہ کہہ کر ارشاد فرمایا کہ کس کی مجال ہے جو علیؑ کی منزل عبادت تک پہونچ سکے —— میں عرض کروں گا مولا۔ آپ زین العابدینؑ ہیں۔ بزم عابدین کی زینت ہیں۔ یہ آپ کیا فرما رہے ہیں۔ آپ کی عبادت کے برابر کس کی عبادت ہو سکتی ہے؟ آپ فرمائیں گے تجھے نہیں معلوم میری عبادت یقیناً ایسی ہے کہ پروردگار نے مجھے زین العابدینؑ قرار دیا ہے اور روز قیامت مجھے اسی لقب سے پکارا جائے گا لیکن میری عبادتوں کا سارا زور میری نمازوں سے ہے میرے سجدوں سے ہے۔ میرے تضرع و زاری سے ہے۔ میرے خضوع و خشوع سے ہے۔ میری خاکساری سے ہے۔ میری بندگی سے ہے۔ لیکن میرے جد کا تو یہ عالم تھا کہ ان کی ایک ضربت عبادت ثقلین پر بھاری تھی تو اب سوچو کہ جس کی ایک ضربت کا یہ عالم ہے اس کی ساری ضربتیں کیسی ہوں گی اور جس کی ضربوں کا یہ عالم ہو گا اس کی نمازیں کیسی ہوں گی۔ اس کے سجدے کیسے ہوں اس کی عبادتیں کیسی ہوں گی اور اس کی بندگی کی شان کیا ہو گی ——؟

اس کے بارے میں تو صرف اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ مصلے پر آجائے تو بھی عبادت اور مصلے چھوڑ کر سو جائے تو بھی عبادت۔ سجدہ میں جھک جائے تو عین رضائے پروردگار اور بستر رسولؐ پر سو جائے تو رضائے پروردگار کا سودا ــــ

عبادتوں کی اس کثرت میں بھی محویت اور توجہ کا یہ عالم تھا کہ ابلیس ملعون اژدہے کی شکل میں مصلے کے قریب آتا ہے اور آپ کے پائے اقدس کے انگوٹھے چبانے لگتا ہے اور جب آپ کے خضوع و خشوع میں کوئی فرق نہیں آتا ہے تو عاجز آکر چلا جاتا ہے اور فضا میں ایک آواز گونجتی ہے۔ "انت زین العابدین" تو زینت عابدین ہے۔ تیری عبادت پر شیطان کا اثر نہیں ہے۔ تیری توجہ پر دنیا کی کوئی طاقت اثر نہیں ڈال سکتی۔

اس مقام پر چند باتیں قابل غور ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ شیطان اژدہے کی شکل میں کیوں آیا۔ کیا کوئی اور شکل ممکن نہیں تھی۔ وہ تو مختلف شکلیں اختیار کر سکتا ہے۔ پھر یہی شکل کیوں پسند آئی۔ شاید راز یہ رہا ہو کہ اسی شکل میں آدم کے پاس آکے آزما چکا تھا اور "اپنے خیال میں" کامیاب بھی ہو چکا تھا تو چاہا کہ اس آدم کو بھی اسی انداز سے اپنی طرف کھینچ لیا جائے لیکن جلال امامت نے آواز دی۔ ابلیس آدمؑ کی منزل اور ہے۔ سید الساجدینؑ کی منزل اور۔ تو نے اتنا تو سوچا ہوتا کہ تو نے خود بھی اقرار کر لیا تھا کہ مخلص بندوں کو نہیں گمراہ کر سکوں گا تو اب کس لیے آیا ہے۔ ابلیس کہے گا میں بھی یہی چاہتا تھا کہ دنیا پہچان لے کہ جن بندوں کے مقابلہ میں میں نے شکست کا اقرار کیا ہے وہ ایسے بندے ہیں۔ دنیا داروں کے مقابلہ میں شکست کا اقرار نہیں کرتا۔

واقعہ کو دیکھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اب امامؑ نماز توڑ دیں گے۔

جان بچانے کی فکر کریں گے۔ اذیت سے فرار کریں گے اور کچھ نہ ہوگا تو کم از کم سانپ کو دیکھ کر رو دیں گے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ نہ گریہ ہے نہ فرار۔ نہ پریشانی ہے نہ اضطراب میں عرض کروں گا مولاؑ! یہ آپ کا کیا عالم ہے۔ ایسے حالات میں ایسا سکون؟ آواز دیں گے فرار کا بیٹا ہوتا تو فرار کر جاتا۔ حیدر کرار کا لال ہوں۔ دنیا کا نمائندہ ہوتا تو سانپ کو دیکھ کر رونا شروع کر دیتا لیکن نمائندہ پروردگار ہوں ڈرنے کا کیا سوال ہے۔

عرض کروں گا مولاؑ! یہ سب کچھ صحیح ہے۔ ہماری جانیں نثار بیشک آپ نمائندہ پروردگار ہیں۔ فرزند رسولؐ۔ زین العابدین ہیں۔ سید الساجدین ہیں۔ فاتح کوفہ و شام ہیں۔ جان حسینؑ اور وارث حسنؑ ہیں۔ لیکن مولا یہ بھی اژدہا ہے۔ موذی ہے کاٹنے والا ہے۔ زہریلا ہے۔ آپ فرمائیں گے یہ سب صحیح ہے لیکن میں علیؑ کا لال بھی ہوں۔ کاش تم نے علیؑ کی تاریخ بھی پڑھی ہوتی تو تمھیں تعجب نہ ہوتا۔ جب ایک علیؑ گہوارے میں اژدہے کے دو ٹکڑے کر سکتا ہے تو دوسرا علیؑ نماز میں مطمئن کیسے نہیں رہ سکتا اور یہ بھی یاد رکھو کہ میں الٰہی نمائندہ ہوں اور الٰہی نمائندوں کی شان یہ ہے کہ وہ سانپ سے نہیں ڈرا کرتے۔ موسیٰ قوم کی گمراہی سے خائف تھے سانپ سے نہیں۔ تم نے دیکھا ہے کہ سانپ غار میں آیا تو نبیؐ نہیں ڈرے اور گہوارے کے پاس آیا تو علیؑ نہیں ڈرے۔ تو جس گھر میں ڈرنے کی رسم ہی نہیں ہے وہاں ڈرنے کا سوال ہی کیا پیدا ہوتا ہے۔ یہ سوال تو وہاں ہوتا ہے جہاں ڈرنے کے سوا کچھ نہیں ہوتا ــــ

امام کے سجدوں کے بارے میں یہ امتیاز بھی قابل توجہ ہے کہ آپ نے جن حالات میں سجدہ کیا ہے اس کی نظیر تاریخ عالم میں نہیں مل سکتی۔ یوں تو آپ کی

زندگی کا معمول تھا کہ ہر نعمت پر سجدہ۔ ہر آیت سجدہ پر سجدہ۔ ہر نماز کے بعد سجدہ اور ایسا سجدہ کہ پیشانی پر گھٹے پڑ گئے تھے اور ہر سال اسے جدا کیا جاتا تھا لیکن ان سجدوں کے درمیان وہ سجدہ جو عصر عاشور کے بعد کربلا کی خاک پر ہوا ہے۔ وہ سجدہ جو جلے ہوئے خیام کی راکھ پر ہوا ہے۔ وہ سجدہ جو شام غریباں کے سناٹے میں ہوا ہے۔ وہ سجدے جو شام کے زندان میں ہوئے ہیں۔ یہ وہ سجدے ہیں جن کی کوئی مثال نہیں مل سکتی اور دنیا جانتی ہے کہ عمل کی اہمیت حالات کے اعتبار سے بڑھ جایا کرتی ہے۔ پُرسکون حالات میں نماز اور ہوتی ہے اور مصائب و آلام کے ہجوم میں سجدہ اور۔ سردی کے سکون آمیز دور میں روزے اور ہوتے ہیں اور گرمی کی تپش خیز ہوائیں روزے اور ــــ مکہ میں رہ کر حج کرنا اور ہوتا ہے اور مدینہ سے چل کر پیدل حج کرنا اور ــــ یہ آلِ محمدؐ کا امتیاز تھا کہ انھوں نے ہر عمل میں اپنی انفرادیت محفوظ رکھی ہے اور کسی منزل پر دامن بندگی کو ہاتھ سے نہیں چھوٹنے دیا۔ سجدہ کا ذکر آ گیا ہے تو یہ نکتہ بھی ذہن میں رکھ لیجیے کہ امام زین العابدینؑ پہلے وہ شخص ہیں جنھوں نے خاک شفا کی تسبیح اور سجدہ گاہ ایجاد کی ہے۔ اس سے پہلے معصومۂ عالم کی زندگی میں تسبیح کا ذکر ملتا ہے لیکن دھاگے میں گرہیں بنا کر یا قبر جناب حمزہ کی خاک سے۔ امام زین العابدینؑ نے خاک کربلا سے تسبیح بنائی ہے اور گویا یہ واضح کر دیا ہے کہ تسبیح پروردگار کے لئے موزوں ترین خاک قبر سید الشہداء کی خاک ہے۔ اپنے دور میں حمزہ سید الشہداء تھے تو دادی نے ان کی قبر کی مٹی سے تسبیح بنائی تھی اور اب میرا باپ سید الشہداء ہے تو میں نے اس کی خاکِ قبر سے تسبیح تیار کی ہے اور اس خاک کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس پر تسبیح پڑھنے والا خاموش بھی ہو جاتا ہے تو تسبیح کے دانے خود ذکر پروردگار کرتے رہتے ہیں۔ اور کیوں

نہ ہوتا جس خاک میں خونِ حسینؑ جذب ہو گیا ہو اس کا ذرہ ذرہ تسبیح پروردگار نہ کرے گا تو کیا کرے گا۔ یہاں تو یہ عالم ہے کہ گلے سے لہو کی دھار نکلتی ہے تو" بقول اقبال" نقش الا اللہ ہی ثبت ہوتا ہے ــــ

چنانچہ مشہور واقعہ ہے کہ آپ کے دست مبارک میں تسبیح تھی اور آپ محو گفتگو تھے۔ درمیان گفتگو تسبیح کے دانوں کو گردش دیتے جا رہے تھے۔ کسی نے ٹوک دیا کہ آپ تسبیح سے کھیل رہے ہیں، تو آپ نے فرمایا تجھے اس خاک کی حقیقت کیا معلوم؟ یہ خاک خود تسبیح پروردگار کر رہی ہے۔

کیوں نہ ہو ایک امام کی خاک قبر ہے اور ایک امام کا دست حق پرست۔ ایک سجدہ گذار کی تربیت ہے اور ایک سید الساجدین کا ہاتھ۔ اب تسبیح میں کیا کسر باقی رہ جاتی ہے۔

خاک کربلا کی سجدہ گاہ بھی آپ ہی کی ایجاد ہے۔ اس کے پہلے پیغمبر اسلامؐ کے زمانہ میں سجدہ گاہ کا رواج تھا اور مختلف اسلامی حدیثوں میں یہ تذکرہ ملتا ہے کہ آپ جانماز کے علاوہ ایک کھجور کا ٹکڑا بطور سجدہ گاہ استعمال کیا کرتے تھے۔

اب میں نہیں جانتا کہ حضور کو جانماز پر سجدہ کرنے میں کیا زحمت تھی کہ الگ سے ایک شئے رکھا کرتے تھے اور حضور کو یہ خیال کیوں نہیں آیا کہ اس طرح بت پرستی کا الزام آ جائے گا اور اگر ایسا نہیں ہے اور حضور جان بوجھ کر الگ شے پر سجدہ کر رہے تھے تو ماننا پڑے گا کہ سجدہ گاہ پر سجدہ کرنا بدعت نہیں بلکہ سجدہ گاہ کو ہٹا کر سجدہ کرنا بدعت ہے۔

اور اس سے بالاتر یہ کہا جائے کہ اگر سجدہ گاہ پر سجدہ کرنے سے بت پرستی کا الزام آتا ہے تو ہم سے پہلے یہ الزام سرکار دو عالمؐ پر آئے گا۔ لیکن حیرت ہے کہ

کل کسی شخص نے یہ اعتراض نہیں کیا کہ ہم میں اور آپ میں فرق ہی کیا ہے۔ ہمارے سامنے بھی ایک بت ہوتا ہے اور آپ کے سامنے بھی ایک شے ہوتی ہے۔ اگر مشرک ہیں تو ہم دونوں اور اگر موحد ہیں تو ہم دونوں ـــــ لیکن مرسل اعظمؐ سجدہ کرتے رہے اور نہ کسی صحابی نے ٹوکا نہ کسی کافر نے اعتراض کیا۔ یہ شعور آج ہی کے مسلمانوں میں پیدا ہوگیا ہے اور یہ فکر آج ہی کے مسلمان کو لاحق ہوگئی ہے کہ اس طرح بت پرستی کی شکل پیدا ہو جاتی ہے۔

مجھے یہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں کہ بت پرستی کے معنی بت کو سجدہ کرنے کے ہیں بت پر سجدہ کرنے کے نہیں ہیں اور سجدہ گاہ میں سجدہ گاہ پر سجدہ ہوتا ہے..... سجدہ گاہ کو سجدہ نہیں ہوتا۔ مجھے تو صرف یہ کہنا ہے کہ یہ فرق کل کے کافر کو معلوم تھا اور آج کے مسلمان کو معلوم نہیں ہے۔ تو اب دو ہی باتیں ہیں یا مسلمان تعصب اور تنگ نظری کا شکار ہوگیا ہے اور افتراق و اختلاف کو برقرار رکھنے کے لئے الزام لگاتا ہے تو بہتان تراشنے والوں کی سزا جہنم ہے ـــــ یا مسلمان اتنا بھولا اور ناواقف ہوگیا ہے کہ اسے بت اور سجدگاہ کا فرق معلوم نہیں ہے تو ایسے مسلمان کا فرض ہے کہ وہ جاہلیت زدہ کفار سے سبق لے اور یہ دیکھے اسے اب اتنا بھی شعور نہیں رہ گیا ہے جتنا کل کے جاہلیت زدہ کافر میں تھا۔ سچ ہے۔ جو ذہن بت پرستی کے سایہ میں پرورش پاتا ہے اسے ہر منزل پر بت پرستی ہی نظر آتی ہے۔ یہ مسلمان کسی بت شکن کا پرستار ہوتا تو یہ خیال ہی ذہن میں نہ پیدا ہوتا۔

عبادت کے سلسلے میں دو چھوٹے چھوٹے واقعات کی طرف اور بھی اشارہ کرکے بیان کو تمام کر دینا چاہتا ہوں۔ واقعات اپنی ظاہری حیثیت کے اعتبار سے چھوٹے اور مختصر ہیں لیکن افادیت اور درسِ بندگی کے اعتبار سے بیحد اہمیت رکھتے

ہیں۔ کاش مسلمان معصومینؑ کی سیرت کے انھیں چھوٹے چھوٹے واقعات پر نظر رکھتے تو آج زندگی کا خاکہ کچھ اور ہی ہوتا اور سماج میں جو بات پیدا ہو گئی ہے وہ ہرگز نہ ہوتی۔ ساری خرابی یہ ہے کہ سیاست دنیا کو مذہب کا جزو بنا دیا گیا ہے اور مذہب کے مسائل اہل سیاست کی سیرت کی روشنی میں حل کئے جا رہے ہیں جب کہ تاریخ گواہ ہے کہ خود اہل سیاست نے بھی اپنے مذہبی مسائل خود حل نہیں کئے ہیں بلکہ اہلبیتؑ ہی کی چوکھٹ پر آئے ہیں اور جب مسائل حل ہو گئے ہیں تو یہ اعلان کر دیا ہے کہ اگر آپ نہ ہوتے تو ہم ہلاک ہو جاتے ـــــ

امام محمد باقرؑ کی کمسنی ہے۔ چند برس کی عمر ہے۔ امام زین العابدینؑ مصروف عبادت ہیں۔ اتفاق سے کمسن شہزادہ کنویں میں گر جاتا ہے۔ ہر طرف سے ایک شور برپا ہو گیا۔ نکالنے کی تدبیریں شروع ہو گئیں۔ لیکن نہ گرنے والا کنویں میں شور مچاتا ہے اور نہ نماز پڑھنے والا اپنی نماز توڑتا ہے۔ سکون و اطمینان سے عبادت ہو رہی ہے اور لوگ پریشان ہیں۔ یہاں تک کہ نماز تمام ہوئی۔ زوجہ نے عرض کی۔ فرزند رسولؐ! یہ عجب انداز عبادت ہے کہ بچہ کنویں میں ہے اور آپ نماز کو طول دیئے جاتے ہیں۔ ایسے موقع پر تو نماز توڑ دینا بھی جائز ہو جاتا ہے ـــــ فرزند رسولؐ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کنویں کے قریب آئے اور آواز دی۔ لا میری امانت کو واپس کر۔ یہ سننا تھا کہ پانی بلند ہوا ـــــ اور سطح کے قریب آیا۔ امام نے بچہ کو اٹھا لیا اور ماں سے کہا لے اپنے فرزند کو ـــــ اور اتنا تو یقین کر لے کہ میں جس کی بندگی میں مصروف تھا وہ میرے فرزند کی حفاظت ضرور کرے گا ـــــ امام کا ارشاد بھی صحیح ہے اور ماں کا اضطراب بھی حق بجانب ہے۔ امام بہرحال امام ہیں۔ ماں امام نہیں ہے۔ اس کے پاس ممتا کی وہ دولت ہے جو پریشان کئے ہوئے ہے۔ اس سے آپ یہ نہ خیال کریں

معاذاللہ ان کے ایمان و یقین میں کوئی کمی آگئی ہے۔ نہیں نہیں۔ یہ بشریت کے تقاضے ہیں جن پر عمل کیا جا رہا ہے اور یہی تقاضے جب دب جاتے ہیں تو عصمت اُبھر کر سامنے آجاتی ہے۔

امامؑ کا اطمینان آواز دے رہا ہے کہ مجھے پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے جب کنواں یوسف کی جان نہیں لے سکا تو فخرِ یوسف کو کیسے ہلاک کر سکتا ہے اور یاد رکھو۔ یہ اتفاقی حادثات نہیں ہیں کہ انسان مضطرب ہو جائے۔ اتفاق سے وہ گرتا ہے جس کے پیر میں لغزش آجاتی ہے۔ میرا فرزند معصوم ہے اس کے قدم میں لغزش کا سوال نہیں ہے۔ یہ تو ایک امتحانِ قدرت اور اہتمامِ ہدایت تھا کہ میرا خلوص بھی ظاہر ہو جائے اور بچّہ کا سکون بھی سامنے آجائے۔ امت کے لئے درسِ ہدایت بھی فراہم ہو جائے کہ شدتِ مصائب میں بھی مالکِ کائنات پر اعتبار کرنا چاہیئے اور پریشان نہیں ہونا چاہیئے۔ اور وہ کیسے پریشان ہوگا جو نماز میں مصلے پر آکر اپنے پروردگار سے محوِ گفتگو ہو اور "اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ" کی تلاوت کر رہا ہو۔ اضطراب اُن کا حصہ ہے جو اطاعتِ شیطان کر کے نماز چھوڑ دیتے ہیں اور اس لائق نہیں رہ جاتے کہ پروردگار کی بارگاہ میں حاضری دے سکیں۔ اور اطمینان ان کا حصّہ ہے جو زندگی عبادتِ الٰہی میں بسر کرتے ہیں اور اتنی عبادت کرتے ہیں کہ پروردگار انھیں زین العابدینؑ کا لقب دے دیا کرتا ہے۔

تاریخ میں ایک واقعہ اور ملتا ہے کہ امامؑ مصروفِ نماز تھے اور اتفاقاً گھر میں آگ لگ گئی۔ چاروں طرف سے شور برپا ہو گیا۔ لوگ بجھانے کی فکر میں لگ گئے اور امامؑ کی نماز کو طول ہوتا جا رہا ہے۔ خدا خدا کر کے نماز تمام ہوئی تو کسی نے بڑھ کر عرض کی۔ فرزندِ رسولؐ گھر میں آگ لگی ہوئی ہے اور آپ کو فکر ہی نہیں ہے۔ یہ کون سا اندازِ عبادت

ہے کہ انسان اس قدر غافل ہو جائے، فرمایا۔ بھائی مجھے وہاں کی آگ نے یہاں کی آگ سے غافل بنا دیا تھا۔

یہ ہے اندازِ تبلیغ۔ ایک لفظ نے ذہن کا دھارا موڑ دیا۔ کوئی صاحبِ ایمان انسانؐ ہے جو اس فقرہ کو سننے کے بعد ایک لمحہ کے لئے چونک نہ جائے۔ اور کوئی صاحبِ شرافت ہے جس کے ذہن میں عبادتِ الٰہی کی اہمیت کا شعور بیدار نہ ہو جائے۔ ایک معصوم اور آخرت کی آگ کا اتنا خیال اور ہم غیر معصوم اور اس قدر غافل ـــ میں تو یہ عرض کروں گا کہ معصوم نے دو مسئلے بیک وقت حل کر دیئے۔ یہ بھی بتا دیا کہ جسے آخرت کا خیال ہوتا ہے اسے دنیا کے مصائب کی پرواہ نہیں ہوتی اور یہ بھی واضح کر دیا کہ جو اُدھر متوجہ ہو جاتا ہے اس کا اِدھر کا انتظام خود بخود ہو جایا کرتا ہے۔ میں نماز توڑ بھی دیتا تو کیا کرتا آگ ہی تو بجھاتا۔ وہ کام تو بالآخر ہو ہی گیا اور میرے خلوص میں بھی کوئی فرق نہیں آیا۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہر آدمی غیر ذمہ دار ہو جائے اور گھر میں آگ لگا کر نماز شروع کر دے۔ نہیں نہیں اسلام مقابلہ کا مذہب نہیں ہے۔ اسلام خلوص کا مذہب ہے۔ اب ساری دنیا بھی ایسا ہی عمل کرے تو امام کی منزل کو نہیں پہونچ سکتی۔ ان کا عمل ان کے خلوص کی پیداوار تھا اور یہ عمل ان کے عمل کی پیداوار ہوگا۔ یہ ایمانؐ یقین کی ایک منزل ہے جو ہر کس و ناکس کو حاصل نہیں ہوتی۔ بس انسان کا فرض ہے کہ ایسا یقین ایسا ایمان۔ ایسا عقیدہ اور ایسا عمل پیدا کرے کہ مسائلِ حیات خود بخود حل ہو جائیں اور عبادتِ الٰہی میں فرق نہ آنے پائے۔ یہ عبادت سے کنارہ کشی ہی کا اثر ہے کہ آج زندگی میں بے شمار مسائل پیدا ہو گئے ہیں اور حل کرنیوالا کوئی نہیں ہے۔ انسان نصرتِ الٰہی پر اعتماد کرتا تو نہ آگ سے مرعوب ہوتا نہ پانی سے۔ شہزادہ کنویں میں گرا تو امام کے خلوصِ عمل پر اثر نہیں پڑا اور گھر میں آگ لگی تو اخلاصِ عبادت پر کوئی اثر

نہیں پڑا۔ اور یہ کہنا پڑا کہ میں نے انھیں دونوں واقعات میں کردار کے دو عظیم جلوے دیکھے ہیں۔ کل بھی ابراہیمؑ کو آگ میں جاتے دیکھا تھا اور موسیٰؑ کو پانی میں اور وہاں بھی سکون ہی نظر آیا تھا ۔۔۔ بس فرق یہ ہے کہ وہاں آگ حکم خدا سے گلزار ہو گئی تھی اور موسیٰؑ حکم خدا سے نیل کی موجوں میں رہے اور زندہ رہے اور یہاں حکم خدا نہیں ہے بلکہ بندگی خدا ہے جو آگ کو خاموش کئے ہوئے ہے اور پانی کو فرمانبردار بنائے ہوئے ہے۔ ہمت نہیں ہے لیکن ایک فقرہ کہہ کے بیان کو تمام کرنا چاہتا ہوں کہ جو کام کل براہ راست حکم خدا سے ہو رہا تھا وہ کام آج بندگی خدا سے لیا جا رہا ہے اب جو حکم خدا کے سہارے زندہ رہے وہ جناب ابراہیمؑ اور جناب موسیٰؑ ہیں اور جس نے بندگی کے سہارے مشیت کو اپنا بنا لیا وہ زین العابدین اور سید الساجدین ہیں۔

امام محمد باقر علیہ السلام

اسم مبارک	محمد
لقب	باقر، شاکر، ہادی، امین
کنیت	ابو جعفر
والد ماجد	امام زین العابدینؑ
والدہ ماجدہ	فاطمہ بنت حسنؑ
ولادت	یکم رجب ۵۷ھ۔ مدینہ منورہ بروز جمعہ
ازواج	دوؑ
اولاد	ساتؑ
شہادت	۷ ذی الحجہ ۱۱۴ھ دوشنبہ
عمر مبارک	۵۷ سال
قبر مطہر	جنت البقیع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی اشرف الاولین والآخرین خاتم النبیین سیدنا و مولانا ابی القاسم محمد و آلہ الطیبین الطاہرین و لعنۃ اللہ علی اعدائہم اجمعین اما بعد فقد قال اللہ الحکیم فی کتابہ الکریم ـــــ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِنَّ عَلَیْنَا لَلْهُدٰی وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰی

ارشاد جناب اقدس الٰہی ہے: "بیشک ہدایت کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے اور دنیا و آخرت کا اختیار ہمارے ہاتھوں میں ہے۔" آیت کریمہ نے صاف واضح کر دیا کہ مالک کائنات نے ہر دور میں اپنے فریضۂ ہدایت کو ادا کرنے کے لئے ہادی و رہنما معین کئے ہیں اور تاریخ انسانیت کا کوئی دور ایسا نہیں گذرا جس میں دنیا حجت خدا سے خالی رہ گئی ہو۔

ہدایت کے معنی ہیں راستہ دکھانا۔ ہاتھ پکڑ کر منزل تک پہونچا دینا ہدایت کی ذمہ داری نہیں ہے۔ ہدایت کا مفہوم منزل تک پہونچا دینا بھی اسی معنی کے اعتبار سے ہے کہ اگر چلنے والا راستہ پر چلنے کے لئے تیار ہے تو راہنما آخری منزل تک اسے راستہ بتاتا رہے گا۔ ورنہ جبر و اکراہ کی صورت میں ہدایت ہدایت نہ رہ جائے گی قہر و استبداد کی شکل اختیار کرے گی۔ اور اس طرح عدالت پروردگار پر بھی حرف آجائے گا کہ ایک انسان کو بجبر و قہر منزل تک پہونچا دیا اور دوسرے کو مختار و آزاد بنا کر چھوڑ دیا۔

ہدایت کے مفہوم میں "راستہ دکھانا" شامل ہے تو ہدایت کا کام وہی شخص انجام دے سکتا ہے جو خود راستہ جانتا ہو ـــ ورنہ اگر کوئی شخص خود راستہ سے بے خبر

ہے تو وہ کسی کو کیا راستہ دکھا سکتا ہے۔ مثل مشہور ہے "کو خویشتن گم است کرا رہبری کند" "جو خود ہی راستہ گم کئے ہوئے ہے وہ دوسرے کی کیا رہبری کرے گا۔" رہبری کے لئے شرط اول یہی ہے کہ انسان خود راہ و چاہ سے باخبر ہو اور راستہ کے ایک ایک خطرہ سے آگاہ ہو تاکہ قافلہ اس کے اعتماد پر چلے تو نہ خود گمراہ ہو نہ قافلہ کو گمراہ کر سکے ورنہ شوق راہنمائی میں قافلہ کو لے کر چل پڑا تو ایک منزل کے بعد اعلان کرنا پڑے گا کہ میں تمہاری برادری کا انسان ہوں مجھ سے غلطیاں بھی ہوتی ہیں۔ خطائیں بھی ہوتی ہیں۔ میں راستہ بھٹک بھی جاتا ہوں۔ مجھ پر شیطان غالب بھی ہو جاتا ہے۔ لہذا اگر مجھے راستہ سے بھٹکا ہوا دیکھو تو راستہ پر لگا دو تاکہ دونوں صحیح راستہ پر چلیں۔

سوال یہ ہے کہ جب آپ کو صحیح راستہ نہیں معلوم ہے تو آپ سے راہنما بننے کے لئے کس نے کہا تھا۔ اور آپ نے کم سے کم یہ تو سوچا ہوتا کہ جب راہنما کو خود ہی راستہ نہیں معلوم ہوگا تو قوم کو کیسے معلوم ہوگا کہ آپ سیدھے راستہ پر ہیں یا بھٹک گئے۔ یہ تو دوسری جہالت کی بات ہے ـــ اور اگر قوم کو راستہ معلوم ہے تو وہ کتنی بدنصیب قوم ہے جو راہ و چاہ کو جانتے ہوئے ایسے انسان کے پیچھے چل پڑے جسے راستہ کی خبر نہ ہو۔

ہم نے اسلام میں ایسے راہنما کے نقش قدم اختیار کئے ہیں جو کہتا ہے: "مجھ سے جو چاہو پوچھو۔ میں آسمان کے راستوں کو زمین کی راہوں سے بہتر جانتا ہوں۔" جو ایسے راستوں کا جاننے والا ہوگا وہی منزل مقصود تک پہونچا بھی سکتا ہے اور میں تو یہ کہنے کا حق رکھتا ہوں کہ مولائے کائنات کا یہ ارشاد گرامی کہ میں آسمان کے راستوں کو زمین کے راستوں سے بہتر جانتا ہوں۔ اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ آسمان میں جانے کے بھی راستے ہیں اور انسان آسمان کی طرف بھی جا سکتا ہے۔ اور یہ اشارہ اس لئے کر دیا کہ سیکڑوں سال کے بعد اگر انسان آسمان کی طرف جانے لگے تو اس کے ذہن میں یہ غرور نہ پیدا ہو کہ اس نے وہ کام انجام دیا ہے جس کی طرف اسلام کے رہنماؤں

کا ذہن بھی نہیں پہونچا تھا۔ اسلام کے راہنما نے یہ عقدہ ۱۴ سو سال پہلے ہی کھول دیا تھا۔ اور واضح کر دیا تھا کہ علمی راہ میں ترقی کرنے والو! تم میرا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ تمہارا فرض ہے کہ میری بارگاہ علم میں سر تسلیم خم کرو۔ جب ۱۴ سو سال بعد کے ترقی یافتہ اہلِ علم علیؑ کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو کل کے عرب صحرائی کیا مقابلہ کرتے جنہیں اپنے برابر والوں کے برابر بھی علم نہیں تھا ـــــ صلوات

آسمان کے راستوں سے واقفیت کے اعلان میں یہ مصلحت بھی ہو سکتی ہے کہ زمین والوں کا کیا ذکر ہے آسمان والے بھی ہدایت حاصل کرنا چاہیں تو مجھ سے بہتر کوئی راہ نما نہ ملے گا اور اس بستی میں بھی کوئی ایسا انسان نہیں ہے جو مجھ سے بہتر راہ چاہ سے باخبر ہو۔ حیرت کی بات ہے کہ امت اسلامیہ نے ایسے "عالم آگاہ" راہ نما کو چھوڑ کر ان لوگوں کو مسند صدارت پر جگہ دے دی جنہیں خود اپنی بھی خبر نہیں تھی اور یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ میں کب تک راہ راست پر رہتا ہوں اور کب راستہ سے بھٹک جاتا ہوں۔ ورنہ اتنا بھی معلوم ہوتا تو سیدھے راستہ پر چلنے میں کیا زحمت تھی۔ صلوات۔

دین اسلام کا یہ امتیاز رہا ہے کہ اس نے کسی دور میں بھی جاہل رہنماؤں کو اختیار نہیں کیا۔ اور روز اول سے اپنا امتیاز علم و کمال کو قرار دیا ہے۔ ملائکہ کے علمی کمال میں کوئی کمی نہیں تھی۔ ان کی تسبیح و تہلیل میں کوئی نقص نہیں تھا۔ ان کے تقدس پر کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ان کی عصمت مسلم تھی۔ ان کی عبادت کا یہ عالم تھا کہ جو رکوع میں ہے وہ رکوع میں ہے۔ جو سجدہ میں ہے وہ سجدہ میں ہے۔ جو قیام میں ہے وہ قیام میں ہے۔ کوئی ہواؤں کا ذمہ دار ہے۔ کوئی بارش کے قطروں کا محاسب و محافظ ہے۔ کوئی تخلیق بشر کا نگراں ہے۔ کوئی وحی کا امین ہے۔ کوئی جنت کا رضوان ہے۔ کوئی جہنم کا مالک ہے۔

کوئی ارواح کا قابض ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود کوئی منصب ہدایت کا حقدار نہیں تھا۔ اور سب کے سب آدم کے مقابلہ میں آئے تو خلافت الٰہیہ کے لئے ناموزوں ثابت ہوئے۔ اس لئے کہ دین الٰہی میں ذاتی تقویٰ اور تقدس معیار نہیں ہے۔ ہدایت قوم و ملت معیار ہے اور ہدایت کے لئے علم ضروری ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ منزل ہدایت میں صرف عمل کافی نہیں ہے، علم بھی لازم ہے اور اب ہر انسان یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ جب ملائکہ معصوم تھے اور صرف علم میں آدم سے کم تھے تب تو خلافت الٰہیہ ملی نہیں۔ تو اگر کوئی علم میں بھی خالی الذہن ہو اور عمل میں بھی غیر معصوم ہو تو وہ منصب خلافت کا کیوں کر حقدار ہو سکتا ہے۔ صلوات

قانون ہدایت کا یہی تحفظ تھا کہ مالک کائنات نے ہر دور میں صاحبان علم و کمال کو پیدا کیا اور انہیں ہدایت امت کا ذمہ دار بنایا۔ ان کی تخلیق دنیا کی تخلیق سے الگ رہی۔ ان کا کمال دنیا کے کمال سے الگ رہا۔ ان کا کردار دنیا کے کردار سے الگ رہا۔ اور یہ سب اس لئے رہا کہ انہیں دنیا کو ہدایت دینے کے لئے پیدا کیا گیا تھا۔ اور کائنات کو ہدایت لینے کے لئے پیدا کیا گیا تھا۔ ان کے بچپنے کے حالات دیکھئے تو اندازہ ہوگا کہ جتنا علم اہل دنیا زندگی بھر میں نہیں حاصل کر سکتے اس سے زیادہ علم وہ اپنے ہمراہ لے کر آتے ہیں۔ بچپنے میں ایسے ایسے عقدے حل کرتے ہیں کہ بوڑھوں کے دماغ چکرا جاتے ہیں۔ امیر المومنینؑ کا آغوش رسولؐ میں تلاوت صحف کرنا آپ نے سنا ہی ہے۔ تین دن کی عمر ہے اور توریت و انجیل و زبور کی تلاوت ہو رہی ہے۔ اور یہ بتایا جا رہا ہے کہ آج موقع ہے دیکھ لو اور سن لو۔ کل ممکن ہے کہ میری حجت کے بچپنے کے حالات نہ دیکھ سکو تو یہ ذہن میں رہے کہ میری نسل میں جو بھی امام بن کر آئے گا وہ اسی انداز سے کمال کا حامل ہوگا اور اس

کے علم کا بھی عالم ہوگا ـــــ وہ اپنے علم کا اظہار نہ کرے یہ ممکن ہے لیکن علم سے خالی ہو یہ ممکن نہیں ہے ـــ اور اظہار بھی کرے تو کس کے سامنے کرے۔ جب تھوڑے تھوڑے علم کے اظہار پر دنیا بہک جاتی ہے۔ اور کبھی دیوانہ کہنے لگتی ہے اور کبھی خدا ـــــ تو اگر سارے علوم کا اظہار کر دیا جائے تو کائنات کا دماغ ہی الٹ جائے گا۔ یہ تو میرا مقدر تھا کہ مجھے ایسا حسین موقع مل گیا جیسا موقع خود پیغمبر اسلامؐ کو بھی نہیں ملا تھا۔ تو نے تلاوت کر دی لیکن میری تلاوت کا مقصد یہ نہیں تھا کہ میں وہ جانتا ہوں جو حضور سرور کائنات بھی نہیں جانتے (معاذ اللہ) ـــ سرکار مجھ سے کہیں بہتر جانتے ہیں۔ وہ نبیؐ ہیں اور میں ان کا وصی۔ میرے امتیاز کی منزل صرف یہ ہے کہ مجھے مقدر سے ایسا موقع مل گیا۔ کہ حضور جیسا سننے والا موجود تھا تو میں نے تلاوت کر دی۔ اور سرکار کو کوئی ایسا مخاطب نہیں ملا اس لئے آپ نے تلاوت نہیں کی۔ خبردار یہ نہ سوچنا کہ سرکارؐ کے علم میں کوئی نقص تھا یہ موقع کی بات ہے۔ کسی کو سامعین مل جاتے ہیں کسی کو نہیں ملتے۔ اپنے ہی ماحول میں اندازہ کر لیجئے کہ جیسا مجمع ہوتا ہے ویسی ہی مجلس پڑھی جاتی ہے۔ اہل علم کا مجمع ہوتا ہے تو علمی مسائل چھیڑے جاتے ہیں اور سیدھے سادے عوام ہوتے ہیں تو فضائل و مصائب کا تذکرہ کر کے ثواب حاصل کر لیا جاتا ہے۔ جیسا مجمع ہوتا ہے ویسا ہی بیان ہوتا ہے۔ یوں ہی اندازہ کر لو کہ سرکار دو عالم کے وقت ولادت ایسا کون تھا جسے قرآن پڑھ کر سناتے اور اس کے سامنے آسمانی کتابوں کی تلاوت کی جاتی میرے سامنے تو سرکار جیسا مخاطب موجود تھا۔ میں نے اپنے کمال کا مظاہرہ کر دیا اور شاید قدرت کا یہی اہتمام تھا کہ حضور کو کوئی مخاطب ملے یا نہ ملے مجھے ضرور مل جائے۔ اور وہ تلاوت کریں یا نہ کریں لیکن میں اپنے علم و کمال کا اظہار ضرور کر دوں۔ اس لئے کہ مرسل اعظمؐ نے تلاوت نہیں کی لیکن دنیا نے انہیں

نبیؐ مان لیا۔ اور میں نے تلاوت کر دی جب بھی مجھے امام نہیں مانا گیا۔ تو آپ سوچیں جب تلاوت کرنے کے بعد ہٹ دھرمی کا یہ عالم ہے تو اگر کہیں تلاوت نہ کی ہوتی تو کیا ہوتا۔ صلوات۔

تاریخ عصمت میں جس فرد کے حالات کا جائزہ لیں گے اس میں کمالات کا یہی انداز نظر آئے گا۔ اور فضائل کا یہی استحکام نگاہ کے سامنے آئے گا۔ یاد رہے کہ قدرت نے حالات کے اعتبار سے اظہار کمال کے مواقع الگ الگ عنایت کئے ہیں اور جیسا موقع ہوا ویسے کمال کے اظہار کا حکم ہوا۔ کسی کی شجاعت ظاہر ہوئی۔ کسی کا کرم ظاہر ہوا۔ کسی کے صبر کا اظہار ہوا۔ کسی کی عبادت کا اظہار ہوا۔ کسی کا علم سامنے آیا۔ کسی کی صداقت سامنے آئی۔ کسی کا علم دیکھنے میں آیا۔ کسی کی شان تسلیم و رضا نظر آئی۔ کسی کا تقویٰ دیکھا گیا۔ کسی کی طہارت نظر آئی۔ کسی کا عسکری جلال دیکھنے میں آیا۔ اور کسی کی شان ہدایت انشاء دیکھنے میں آئے گی کہ ایک مرکز پر سارے کمالات جمع ہوں گے۔ ایک نقطہ میں سارا قرآن سمٹا ہوگا۔ اور ایک فرد ہوگا جو بیک وقت محمدؐ بھی ہوگا۔ علیؑ بھی۔ حسنؑ بھی ہوگا حسینؑ بھی۔ عابدؑ بھی ہوگا باقرؑ بھی۔ صادقؑ بھی ہوگا کاظمؑ بھی۔ رضاؑ بھی ہوگا تقیؑ بھی ـــ نقیؑ بھی ہوگا عسکری بھی اور روح صداقت آواز دے گی۔ اولنا محمدؐ واوسطنا محمدؐ وآخرنا محمدؐ وکلنا محمدؐ۔ صلوات

حالات ہی کے اعتبار سے جس شخصیت کو سب سے پہلے اظہار کمال کا ایک مدت کے بعد موقع ملا وہ امام محمد باقرؑ تھے۔ جن کا جشن ولادت یکم رجب کو منایا جاتا ہے اور جن کی تاریخ سے اس پُر بہار مہینہ کا آغاز ہوتا ہے جس کے آغاز میں امام محمد باقرؑ کی ولادت ہے اور انجام کے قریب سرکار دو عالمؐ کی بعثت و معراج۔ اب آپ خود سوچ سکتے ہیں کہ کتنا باعظمت زمانہ ہے جس میں کوئی علم لے کر آ رہا ہے کوئی

معراج کی منزلوں میں جا رہا ہے ـ صلوات

آپ سے پہلے کمالات کے اظہار کا کچھ موقع مولائے کائنات کو ملا تھا۔ لیکن آپ کے دور میں دو مشکلات تھیں۔ ایک تو یہ کہ علمی ماحول اس منزل تک نہیں پہنچا تھا کہ لوگ آپ کے علم سے باقاعدہ فائدہ اٹھا سکتے۔ اور دوسری بات یہ کہ آپ براہ راست محاذ پر تھے۔ اس لئے آپ کی زندگی کو خانہ جنگیوں میں مبتلا کر دیا گیا تھا۔ کہ آپ کے کمالات سامنے نہ آنے پائیں۔ امام محمد باقرؑ کے ساتھ یہ امتیاز تھا کہ آپ کے دور میں علم و فلسفہ کافی حد تک آگے بڑھ چکا تھا۔ اور امت اسلامیہ کے علاوہ دوسرے افراد بھی علوم و فنون سے کافی دلچسپی لینے لگے تھے۔ اہل علم کی قدر و قیمت کا اندازہ ہونے لگا تھا۔ اور تشنگان علوم کی ایک اچھی خاصی تعداد فراہم ہو گئی تھی اور یہ بھی ایک امتیاز تھا کہ آپ براہ راست محاذ جنگ پر نہیں تھے اور جب آپ کے سامنے ریاست کی پیش کش ہوئی تو آپ نے نہایت خوبصورتی سے نظر انداز کر دیا۔ تاکہ ارباب اقتدار حکومتی دار و گیر میں معروف ہو جائیں۔ اور ہم تھوڑا سا وقت نکال کر اپنے فضائل کمالات کا اظہار کر دیں۔ حکومتیں آپ کی طرف سے غافل نہیں تھیں۔ اور برابر درپئے آزار تھیں۔ اور کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوا کہ سامان آزار ہی ذریعہ تبلیغ بن گیا جیسا کہ آئندہ اشارہ کیا جائے گا۔ فی الحال تو صرف یہ عرض کیا جا رہا ہے کہ مالک کائنات نے رسولؐ کے اس وارث کو علمی کمالات کے نشر کرنے کے لئے منتخب کیا تھا۔ اسی لئے نام محمدؐ دیا اور لقب باقر۔ باقر کے معنی شگافتہ کرنے والا ـ اور چونکہ آپ نے علمی مسائل میں کافی وسعت دی ہے۔ اور ایسے ایسے اسرار واضح کئے ہیں جہاں تک عام انسانوں کا ذہن بھی نہیں پہنچ سکتا تھا اس لئے اہل دنیا نے بھی آپ کو باقر تسلیم کیا ہے۔ اور آپ کے اس علمی کمال کا اعتراف کیا ہے۔ امت اسلامیہ کے چند امام۔ ابوحنیفہ، زہری، اوزاعی اور عطا سب آپ کے شاگرد تھے

اور آپ کے علوم و کمالات سے استفادہ کر رہے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ شاگرد کو امت کا امام تسلیم کر لیا گیا۔ اور استاد کی امامت سمجھ میں نہ آسکی اور یہ بھی کوئی نئی بات نہیں ہے جس کو علیؑ نے ہلاکت سے بچایا تھا وہ امت کا راہنما ہو گیا۔ اور جس علیؑ نے بچایا تھا وہ دنیا کی نگاہ میں کچھ نہ ہو سکا۔ صلوات

امام محمد باقرؑ کی ولادت و حیات میں قدرت نے ایک نیا اہتمام کیا ہے کہ ۵۷ھ میں یکم رجب کو آپ کی ولادت ہوئی اور ۱۱۴ھ میں ۷ ذی الحجہ کو شہادت۔ ۵۷ سال اس دار دنیا میں زندگی گزاری۔ مختلف حکام دنیا کا دور حکومت دیکھا اور ہر ایک کے سحر ساری کو موسوی انداز سے باطل کرتے رہے جس کی تفصیل چند لمحوں کے بعد عرض کی جائے گی۔ اس وقت تو صرف ایک نکتہ کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ آپ کی حیثیت سلسلہ امامت میں پانچویں امام کی ہے اور سلسلہ عصمت میں ساتویں معصوم کی۔ اور انہیں دونوں چیزوں کو جمع کر لیا جائے تو آپ کا سن ولادت بھی نکل آتا ہے اور عمر مقدس بھی۔ ۵ اور ۷ مل کر ۵۷ ہوتے ہیں اور ۵۷ھ ہی آپ کی ولادت کا سال ہے۔ اور حسن اتفاق سے یہی ۵۷ سال عمر شریف بھی ہے۔ گویا فطرت اعلان کر رہی ہے کہ آج جو فرزند عالم وجود میں آ رہا ہے وہ عصمت کا بھی وارث ہے اور امامت کا بھی ـ اور اس کی زندگی عصمت کے اظہار کمال میں بھی گذرے گی اور امامت کے اعلان جمال میں بھی ـ صلوات

آپ کی ولادت باسعادت کی خبر ایک مدت پہلے خود مرسل اعظمؐ دے گئے تھے۔ جب آیت اولی الامر نازل ہوئی اور جابر بن عبداللہ انصاری نے سوال کیا کہ حضور وہ اولی الامر کون ہیں جن کی اطاعت واجب کی گئی ہے تو آپ نے اپنے جملہ وارثوں کے نام یکے بعد دیگرے بیان فرمائے۔ اور جب پانچویں وارث کا نام آیا تو فرمایا، جابر تم میرے اس وارث سے ملاقات بھی کرو گے۔ اور دیکھو جب اس سے

ملاقات کرنا تو میرا سلام کہہ دینا۔ زمانہ گزرتا گیا۔ مرسلِ اعظمؐ نے انتقال بھی فرمایا ایک عرصہ کے بعد مولائے کائنات کی شہادت بھی ہوئی۔ مولائے کائنات کے بعد امام حسنؑ مجتبیٰ شہید ہوئے۔ امام حسنؑ کے بعد ۶۱ھ میں واقعہ کربلا بھی پیش آیا۔ اور جابر کا یہ عالم ہے کہ آنکھوں کی بینائی تقریباً زائل ہو چکی ہے۔ ضعیف بھی ہو گئے ہیں اور تقریباً نابینا بھی۔ لیکن اعتماد یہ ہے کہ جب تک رسولؐ کے پانچویں وارث سے ملاقات نہ ہو جائے گی اور اس تک حضورؐ کا سلام نہ پہنچا دیں گے۔ موت نہیں آسکتی۔ اسی انتظار میں کبھی مسجدِ پیغمبرؐ میں آ کے بیٹھتے۔ کبھی مدینہ کی گلیوں میں یا باقر یا باقرؑ کی آوازیں بلند کرتے۔ عالم یہ تھا کہ سننے والے جابر کو دیوانہ کہنے لگے تھے۔ اور عوام کا خیال یہ تھا کہ ضعیفی کی وجہ سے دماغ صحیح کام نہیں کر رہا ہے۔ اور یہ اس طرح یا باقر یا باقرؑ کا نعرہ لگا رہے ہیں۔ کسی نے پوچھا جابر کسے تلاش کر رہے ہو؟ جابر نے فرمایا۔ پیغمبرؐ نے اپنے پانچویں وارث سے ملاقات کی خبر دی ہے۔ اس کی جستجو کر رہا ہوں۔ لوگوں نے کہا جابر تمھیں کیا ہو گیا ہے۔ یہ تمھارا انداز عجیب و غریب ہے۔ جابر نے کہا کچھ بھی ہو جب پیغمبرؐ حبیب نے کہا ہے تو ملاقات ضرور ہوگی۔ لوگ مذاق اڑاتے رہے دیوانہ کہتے رہے۔ اور جابر اپنا نعرہ لگاتے رہے۔ اور دل کو یہ اطمینان رہا کہ لوگوں کے مذاق اڑانے سے بیانِ پیغمبرؐ غلط نہیں ہو سکتا۔ اور ان کے دیوانہ کہنے سے کوئی دیوانہ نہیں ہو سکتا۔ ان کا کیا بھروسہ ہے یہ تو کل حضورؐ کو بھی دیوانہ کہہ رہے تھے۔ اور جب امت امامت کے مسئلہ میں سرکار پر ہذیان کا الزام لگا سکتی ہے تو میری کیا حیثیت ہے ۔۔۔ صلوات

تلاش جاری رہی۔ یہاں تک کہ ایک دن امام محمد باقرؑ سے ملاقات ہو گئی۔ آپ نے فرمایا جابر جسے تلاش کر رہے ہو وہ میں ہی ہوں۔ جابر نے کہا شہزادے ذرا دو قدم آگے بڑھو۔ امام آگے بڑھے۔ کہا ذرا پیچھے ہٹو۔ امام پیچھے ہٹے۔ جابر نے بڑھ کر گلے سے لگا لیا۔ کہا یہ وہی علامت ہے جو حضورؐ نے بیان کی تھی۔ یہ وہی اندازِ رفتار

ہے جو سرکارِ دو عالمؐ کا تھا۔ آپ نے فرمایا جابر وہ سلام کیوں نہیں پہنچاتے جو میرے جد نے بطورِ امانت تمھارے پاس محفوظ کرایا ہے۔ جابر نے عرض کی فرزندِ رسولؐ میں اسی سلام کے لئے تو آپ کو تلاش کر رہا تھا۔ یہ کہہ کر پیشانی اقدس کو بوسہ دیا۔ اور اب یہ معمول ہو گیا کہ روزانہ درِ دولت پر حاضر ہوتے اور امامؑ سے استفادہ کیا کرتے تھے۔ کہاں جابر کی ضعیفی اور کہاں امامؑ کا بچپنا۔ لیکن جابر نے علوم و کمالات حاصل کر کے واضح کر دیا کہ علم و کمال سن و سال کا پابند نہیں ہوتا۔ اور یاد رکھو امامت کا بچپنا صحابیت کے بڑھاپے سے بہتر ہوتا ہے۔ صحابیت اہل محفل کا شرف ہے اور امامت اہل بیت کا حصہ ہے اور اہلبیتؑ گھر کے حالات سے زیادہ واقف ہوتے ہیں ۔۔۔ صلوات (مناقب)

اس منزل کمال پر یہ واقعہ بھی ملتا ہے کہ ایک مرتبہ امام محمد باقرؑ نے فرمایا جابر تم میرے جد کی خدمت میں رہے۔ مولائے کائنات کا دور دیکھا۔ امام حسن مجتبیٰؑ اور امام حسینؑ سے شرف استفادہ حاصل کیا۔ بتاؤ اب تمھاری منزلِ ایمان کیا ہے؟ ۔ عرض کی فرزندِ رسولؐ میں اس سلسلے میں کیا عرض کر سکتا ہوں۔ لیکن جب آپ نے سوال کر لیا ہے تو عرض کر رہا ہوں کہ اب دنیا نگاہوں سے یوں گر گئی ہے کہ غربت کو دولت سے بہتر سمجھتا ہوں۔ ضعیفی کو جوانی سے بہتر سمجھتا ہوں مرض کو صحت پر ترجیح دیتا ہوں اس لئے کہ دولت میں بہکنے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ اور غربت میں خدا یاد آتا ہے۔ جوانی میں لغزش کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ اور ضعیفی میں انسان موت کو یاد کرنے لگتا ہے۔ صحت میں خدا کو بھول جاتا ہے اور مرض میں خدا یاد آتا ہے۔

آپ نے فرمایا بس! جابر اتنی محفلوں میں رہنے کے بعد ابھی ایمان اس منزل سے آگے نہیں بڑھا ہے؟ عرض کی فرزندِ رسولؐ۔ اب اس سے بعد [illegible]

منزل ہے۔ ہماری منزل تمام ہو گئی۔ لیکن فرزند رسولؐ یہ تو فرمایئے کہ آپ کی شان ایمان کیا ہے۔ اور آپ حضرات کی معرفت کا کیا انداز ہے؟

امام کے جواب کو عرض کرنے سے پہلے ایک فقرہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگر یہ سوال ہمارے آپ کے سامنے آتا تو کیا ہم اتنا بھی کہہ سکتے تھے جتنا جابر نے کہا۔ خدا کی قسم ہم اظہار ایمان میں مبالغہ بھی کرتے تو شاید اتنا بلند جواب نہ دے سکتے جتنا عظیم جواب جابر نے دیا ہے۔ ہم تو تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ کوئی انسان غربت کو دولت پر ترجیح دے گا۔ مرض کو صحت پر ترجیح دے گا۔ ضعیفی کو جوانی پر ترجیح دے گا۔ ہمارے یہاں تو ہر آن دولت کی دعا ہے۔ صحت کی تمنا ہے اور جوانی کو باقی رکھنے کی کوشش ہے۔ دنیا کا کون انسان ہے جو دولت کے بجائے غربت کی تمنا کرے۔ صحت کے بجائے مرض کی آرزو کرے۔ جوانی کے بجائے ضعیفی کی تمنا کرے۔ یہ جابر کا کمال ایمان تھا کہ جتنا ہم نے سوچا بھی نہیں اتنا انہوں نے کر کے دکھلا دیا۔ لیکن امامؑ نے اسے بھی ناکافی کہہ دیا۔ اب آپ خود تصور کریں کہ جابر کے دل پر کیا گذری ہو گی اور جابر کے علاوہ کوئی دوسرا انسان ہوتا تو اس کے دل پر کیا گذر جاتی۔ یہ جابر کا ظرف تھا کہ جانتے تھے کہ اہلبیتؑ اور عترت رسولؐ کا مرتبہ صحابیت سے بلند تر ہوتا ہے اور ان کے پاس کوئی منزل ایمان ایسی ضرور ہو گی۔ جس پر دوسرے افراد امت فائز نہیں ہیں ـــــ اسی لئے عرض کی فرزند رسولؐ! وہ منزل ایمان کیا ہے جس پر آپ حضرات فائز ہیں۔ امامؑ نے فرمایا جابر تمہارے ایمان میں نقص یہ ہے کہ تم نے اپنے حالات کا فیصلہ خود کر لیا اور یہ کہہ دیا کہ میں غربت کو ترجیح دیتا ہوں۔ میں ضعیفی کو ترجیح دیتا ہوں۔ میں مرض کو ترجیح دیتا ہوں ـــــ جابر یہ "میں" کیا ہے ـ ایمان میں اس "انا" کی گنجائش نہیں ہے۔ یاد رکھو۔

جب تک "میں" سلامت رہے گا ایمان کامل نہیں ہو سکتا۔ ہمارے اور تمہارے ایمان میں یہی فرق ہے کہ تم اپنی بہتری کا فیصلہ خود کرتے ہو۔ اور ہم اس فیصلہ کو رب العالمین پر چھوڑ دیتے ہیں۔ ہماری نظر میں نہ غربت بہتر ہے نہ دولت نہ صحت بہتر ہے نہ مرض ــــ نہ جوانی بہتر ہے نہ ضعیفی۔ ہم تو اسی کو بہتر سمجھتے ہیں جسے پروردگار ہمارے حق میں بہتر سمجھتا ہے۔ صلوات

ارباب کرم! امامؑ اور غلام کے ایمان و عرفان میں کتنا فرق ہے اور میرے خیال میں اتنا فرق تو ہونا ہی چاہئے تھا۔ صحابیت کا ایمان اس سے آگے بڑھ بھی نہیں سکتا اور امامت کا ایمان اس سے گھٹ بھی نہیں سکتا اور راز بھی یہ ہے کہ صحابیت لاکھ نیک کردار ہو جائے اس کا ارادہ اپنا ارادہ ہوتا ہے اور اس کی مشیت اپنی مشیت رہتی ہے۔ امامت کا مسئلہ اس سے مختلف ہے یہاں ارادہ و مشیت سب رب العالمین کے ہاتھوں میں ہے اور اس کا اعلان ہے "اے اہلبیتؑ! تم وہی چاہتے ہو جو خدا چاہتا ہے"۔ اور جب ارادہ و مشیت بھی ارادہ و مشیت پروردگار کا تابع ہے تو اپنے فیصلہ کا امکان ہی کیا ہے۔ اب تو یہ وہی چاہیں گے جو خدا چاہے گا۔ وہی بولیں گے جو خدا چاہے گا۔ وہی کریں گے جو خدا چاہے گا۔ ان کی زندگی ہے تو اللہ کے لئے۔ ان کی موت ہے تو اللہ کے لئے۔ اور ان کا نعرہ ہے تو انا للہ ــــ صلوات

عزیزان محترم! یہیں سے ایک مسئلہ اور بھی حل ہو گیا کہ کل جب جنگ خندق میں مولائے کائنات میدان کی طرف چلے تو مرسل اعظمؐ نے فرمایا۔ آج "کل ایمان کل کفر کے مقابلہ میں جا رہا ہے" ـــ اور دنیا حیرت زدہ تھی کہ یہ کل ایمان کا کیا مطلب ہے اور اگر ایک انسان کل ایمان ہو گیا تو باقی افراد کا کیا حشر ہو گا۔ کیا وہ سب ایمان سے خارج ہو جائیں گے۔ کیا ایمان میں

علیؑ کے علاوہ کسی کی گنجائش نہیں ہے ۔ لیکن آج واضح ہوگیا کہ جب تک ذات اور مشیت کی نسبت انسان کی طرف رہتی ہے ایمان کامل ہوتا ہے اور انسان کل ایمان نہیں ہوتا۔ اور جب ذات اور مشیت بھی اسی کے حوالے ہوجاتی ہے تو کل ایمان کی منزل آجاتی ہے۔ علیؑ کے ساتھ یہی منزل تھی۔ علیؑ نے ہجرت کی رات نفس بیچ کر ذات کو اس کا بنا دیا۔ اور منزل عمل میں رسالتؐ کے نقش قدم پر قدم جما کر ذات کو اس کا بنا دیا۔ اب اس کے بعد پیغمبرؐ کا فریضہ ہے کہ کمال کردار کا اعلان کریں۔ اور یہ بتا دیں کہ اب نہ نفس علیؑ کا نفس ہے اور نہ ارادہ علیؑ کا ارادہ ہے۔ چنانچہ پیغمبرؐ نے دونوں حقیقتوں کو ایک لفظ میں سمیٹ کر خندق کے دن اعلان کر دیا کہ آج "کل ایمان کل کفر کے مقابلہ میں جا رہا ہے۔ صلوات

یہیں سے "کل کفر" کے معنی بھی سمجھ لیجئے کہ رسالت کی نگاہ میں کفر کا آغاز وہاں سے ہوتا ہے جہاں ذات کو اپنی ذات اور ارادہ کو اپنی ملکیت سمجھا جاتا ہے۔ اور دونوں پر خدا سے زیادہ بندہ کا حق تصور کیا جاتا ہے ایمان کے لئے اولیٰ بالتصرف کا عقیدہ واجب ہے۔ جہاں سے اس عقیدہ میں فرق آیا اور کسی شے کے اپنی ملکیت ہونے کا تصور پیدا ہوا وہیں سے سرحد کفر شروع ہوجاتی ہے۔ اور اگر آپ دونوں کی علامتیں پہچاننا چاہتے ہیں کہ کب ذات خدا کی ملکیت رہتی ہے اور کب اپنی ملکیت بن جاتی ہے کب ارادہ تابع مشیت ہوتا ہے اور کب ارادہ اپنا بن جاتا ہے۔ تو اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ میدان جہاد میں چلے آیئے اور دیکھئے اگر خدا ذات کو واپس لینا چاہتا ہے اور بندہ واپس کر دے تو یہ ہے ایمان اور اگر واپس کرنے میں تکلف کرے تو یہ ہے آغاز کفر۔ اگر نبیؐ اپنے فیصلہ پر عمل

کرنے کے لئے بلائے اور مجاہد چلا آئے تو یہ ہے ایمان اور اگر مجاہد اپنی جان کی فکر میں نبیؐ کے فیصلہ کو نظر انداز کر دے تو یہ ہے ابتدائے کفر ــــــ اور شاید اسی نکتہ کی طرف جنگ احد میں مولائے کائناتؑ نے اشارہ فرمایا تھا کہ جب پیغمبر اسلامؐ نے پوچھا یا علیؑ! سب چلے گئے تم کیوں نہیں گئے؟ تو فرمایا یا رسولؐ اللہ کیا ایمان کے بعد کفر اختیار کر لوں ــ مولائے کائنات کا یہ اعلان صاف واضح کر رہا ہے کہ نفس کو اپنا نفس سمجھنا کفر ہے اور ارادہ کو اپنا تابع سمجھنا شرک۔ کمال ایمان یہی ہے کہ خدا کی راہ میں جان بھی قربان کر دے اور نبوت کے سانچے میں زندگی بھی ڈھال دے۔ صلوات

جناب جابرؓ کا ذکر آگیا ہے تو ایک واقعہ کی طرف اور اشارہ کر دوں ایک مرتبہ جناب جابرؓ حضرتؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کچھ رقم کی درخواست پیش کی۔ آپ نے فرمایا ہم اہلبیتؑ کے پاس مال دنیا سے کیا ہے۔ جابر خاموش ہوگئے۔ تھوڑی دیر گذری تھی کہ ایک شاعر آگیا۔ عرض کی فرزند رسولؐ! آپ کی شان میں ایک قصیدہ عرض کیا ہے۔ سنانا چاہتا ہوں آپ نے فرمایا بے شک سناؤ۔ اس نے قصیدہ عرض کیا۔ آپ نے خادم کو حکم دیا۔ اس نے اندر سے ایک تھیلی لا کر دیدی۔ اس نے عرض کی حضور ایک اور کہا ہے۔ آپ نے فرمایا وہ بھی سناؤ۔ اس نے وہ بھی سنا دیا۔ آپ نے ایک تھیلی درہم و دینار کی اور عنایت کر دی۔ اس نے عرض کی حضور ایک قصیدہ اور ہے۔ آپ نے فرمایا وہ بھی سنا ڈالو۔ اس نے قصیدہ سنا دیا اور آپ نے ایک تھیلی اور عنایت کر دی۔ اس نے عرض کی کہ فرزند رسولؐ یہ اشعار میں نے خلوص سے کہے ہیں۔ میرا مقصد آپ کی مدح و ثنا ہے۔ درہم و دینار نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا یہ صحیح ہے لیکن وہ تمہارا کام تھا یہ میرا کام ہے۔ یہ کہہ کر دعائے آخرت بھی دی۔ کیا کہنا اس شاعر کا جس نے

خلوص سے مدح امامؑ کرکے دنیا بھی حاصل کرلی اور دین بھی حاصل کر لیا۔ شعراء کرام کے لئے یہ ایک درس عبرت ہے کہ مدح معصومؑ میں دنیاوی جذبات شامل نہ کریں۔ اور خلوص دل سے مدح سرا کریں۔ پھر دیکھیں کہ اس بارگاہ سے کیا ملتا ہے اور مومنین کرام کے لئے بھی یہ ایک درس بصیرت ہے کہ خلوص کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سارے معاملات کو آخرت پر ڈال دیا جائے۔ اور مذہبی معاملات کو مفت کا کام بنا دیا جائے۔ امام محمد باقرؑ نے واضح کر دیا کہ خلوص سے مدح کرنا شاعر کا کام ہے اور شاعر کی خدمت کرنا قوم کا فرض ہے۔ صلوات

اس واقعہ سے وہ تمام مسائل بھی حل کئے جا سکتے ہیں جو اکثر ذہنوں میں پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اور حلال و حرام کی بحثیں الجھتی رہتی ہیں — اور حیرت انگیز بات تو یہ ہے کہ امامؑ نے درہم و دینار سے شاعر ہی کو نوازا ہے۔ اور آج ذکر اہلبیتؑ پر تحفہ و ہدیہ و نذرانہ لینے پر شاعر ہی اعتراض کرتا ہے۔ اس سے زیادہ احسان فراموشی کی اور کیا مثال ہو سکتی ہے۔ شاعر مخلص ہوتا ہے تو عاقبت پر نگاہ رکھتا ہے۔ اور فن کار ہوتا ہے تو اعتراض پر نگاہ رکھتا ہے۔ صلوات

امام نے شاعر دربار کو درہم و دینار کی تھیلی عنایت کر دی لیکن جابر کے ذہن میں ایک ہلچل مچ گئی۔ منتظر ہیں کب یہ شاعر جائے اور میں اپنا مدعا بیان کروں۔ خدا خدا کرکے وہ رخصت ہوا اور جابر کا بیان شروع ہوگیا فرزند رسولؐ ابھی تو آپ نے مجھ سے فرمایا تھا کہ گھر میں کچھ نہیں ہے اور اتنی دیر میں درہم و دینار کی تھیلیاں نکل آئیں۔ آخر یہ کیا مصلحت ہے کہ ایک چاہنے والے کو یوں نواز دیا جائے اور ایک کو یوں محروم رکھا جائے۔ آپ نے فرمایا جابر! حجرہ کے اندر جا کر دیکھ

تو حجرہ اب بھی خالی ہے۔ لیکن ہم اہلبیتؑ کو پروردگار نے کچھ اسرار و اختیارات دے رکھے ہیں جنھیں دوسروں پر واضح نہیں کیا جا سکتا۔ جابر یہ ایک راز الٰہی ہے جو تمھارے سامنے آیا۔ ہم اہلبیتؑ صاحبان اقتدار بھی ہیں اور بظاہر مفلس و نادار بھی۔

امامؑ کی مصلحت امامؑ ہی بہتر جانتا ہے۔ لیکن واقعہ سے یہ اندازہ ضرور ہو جاتا ہے کہ یہ جابر کو ایک قسم کی تعلیم تھی کہ انسان کو حالات پر صبر کرنا چاہئے۔ اور حتی الامکان قناعت سے کام لینا چاہئے۔ ہاتھ پھیلانا مناسب نہیں ہے۔ وہ کسی کے سامنے ہو۔ اور پھر جب امامؑ کے دربار میں آ گئے تو وہ اگر مناسب سمجھیں گے تو خود ہی عنایت کر دیں گے۔ انھیں تو سب کے حالات کا علم ہے —— یہی فرق ہے صحابی کے ایمان میں اور آل محمدؐ کے عرفان میں۔ صحابی ضرورت مند ہو جائے تو دست سوال پھیلا دیتا ہے۔ اور آل محمدؐ فاقے بھی کرتے ہیں تو دست سوال دراز نہیں کرتے۔ ان کی شان عمل یہ ہے کہ اپنی منزل ہوتی ہے تو جو کی سوکھی روٹی زانو سے دبا کر توڑتے ہیں۔ اور دوسروں کا معاملہ ہوتا ہے تو بھرا گھر لٹا دیتے ہیں۔ سورۂ دہر ان کی اسی شان کرم کا گواہ ہے کہ سائل کو کھانا کھلا دیتے ہیں لیکن خود پانی سے افطار کرکے سو جاتے ہیں۔ صلوات

امام محمد باقرؑ کی زندگی کے تذکرہ میں چند مسائل کا تذکرہ کرنا بے حد ضروری تھا لیکن اب اس کا محل نہیں رہ گیا۔ خاتمہ کلام میں صرف بعض نکات کی طرف اشارہ کر دینا کافی ہے علم کے سلسلے میں ایک مشہور واقعہ یہ ہے کہ حاکم شام ہشام بن عبدالملک کو حضرت کے علوم و کمالات اور آپ کی طرف دنیائے اسلام کی توجہ خاص کی خبر ملی تو اس نے چاہا کہ آپ کو مدینہ سے دمشق

بلاکر نظر بند کر دیا جائے اور لوگوں کو ملاقات کرنے کا موقع نہ دیا جائے۔

چنانچہ اس نے فوری طور پر حضرت کو طلب کر لیا۔ آپ مدینہ سے روانہ ہوئے تو امام جعفر صادق آپ کے ہمراہ تھے۔ منزلیں طے کرتے ہوئے دمشق، پہونچے۔ یہاں تین دن بیرون دربار روکا گیا تاکہ قوم کی نگاہ میں ان کی عزت گھٹ جائے اور تین دن کے بعد داخلہ کی اجازت ملی تو اس اہتمام کے ساتھ کہ دربار میں تیر اندازی کا مقابلہ ہو رہا تھا۔ ہشام نے حضرت کو دیکھتے ہی کہا کہ آپ بھی تیر اندازی فرمائیں۔ آپ نے فرمایا کہ ضعیفی میں تیر اندازی کی تاب کہاں۔ ہر چیز کی ایک عمر ہوتی ہے۔ اس نے اصرار کیا۔ مقصد یہ تھا کہ یہ عاجز رہ جائیں تو قوم کو یہ سمجھانے میں آسانی ہوگی کہ آل محمدؐ کے پاس دعوے بہت ہیں جوہر کچھ نہیں ہے۔ لیکن قدرت کا اہتمام تھا کہ تو نہی تیرے ہی ذریعہ کمال کا اعلان ہو۔ اصرار تمام کے بعد تیر و کمان حضرت کے سامنے پیش کر دیئے گئے۔ آپ نے ایک تیر نشانہ پر مارا۔ ٹھیک نشانہ پر بیٹھا۔ دوسرا تیر اس تیر پر مارا۔ تیسرا تیر اس تیر پر مارا۔ یہاں تک کہ نو تیر اسی طرح مارے کہ فضا میں تیروں کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا۔ ہشام یہ دیکھ کر بد حواس ہو گیا۔ اور کہنے لگا یہ فن آپ نے کہاں سے سیکھا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ہم اہلبیتؑ دنیا میں کچھ نہیں سیکھتے۔ ہمارے کمالات پروردگار کا عطیہ ہیں۔ ہشام یاد رکھنا بچپنے میں ایک مرتبہ تیر اندازی کی تھی یا بڑھاپے میں آج تیر اندازی کی ہے۔ لیکن کمال میں فرق نہیں آیا۔ اب دنیا سمجھ لے کہ امامت میں بچپنے اور ضعیفی میں فرق نہیں ہوتا۔ صلوات

ارباب کرم! یاد رکھیے اگر ظالم نے یہ اہتمام نہ کیا ہوتا تو شاید امامؑ کے اس کمال کے اظہار کا کوئی راستہ بھی نہ نکلتا۔ لیکن یہ قدرت کا انتظام

تھا کہ جتنا ہی تم ذلیل کرنا چاہو گے اتنا ہی ہم مرتبہ کو بلند کرتے رہیں گے اور تو بھی کہ تمھارے ہی دربار میں فضائل و کمالات کا اعلان ہو۔ دربار تمھارا ہوگا اور فضائل اس کے بیان ہوں گے۔ بارگاہ تمھاری ہوگی اور قبضہ اس کا ہوگا یا یوں کہا جائے کہ قصر فرعون کا ہوگا۔ اور پرورش موسیٰ کی ہوگی۔ صلوات

ہشام نے حالات کو دیکھ کر امامؑ کو رخصت کر دیا۔ آپ واپس چلے تو راستہ میں ایک مقام پر عیسائیوں کا ایک ہجوم دیکھا۔ دریافت فرمایا یہ ہجوم کیسا ہے۔ لوگوں نے کہا کہ یہ عیسائیوں کا ایک عالم ہے جو سال میں ایک مرتبہ گرجا سے باہر نکلتا ہے اور لوگ اس کی زیارت کو جمع ہوتے ہیں آج وہی دن ہے اور قوم اپنے عالم کی زیارت کے لئے جمع ہوئی ہے۔ آپ مجمع کی طرف بڑھ گئے اور صفوں کے درمیان کھڑے ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ عالم برآمد ہوا اور مجمع پر ایک نگاہ دوڑائی۔ نگاہ چہرۂ امامت پر جا کر ٹھہر گئی۔ گھبرا کر پوچھا کہ آپ یہاں کیسے آئے؟ آپ تو کوئی شخص اجنبی ہیں۔ آپ ہماری امت میں ہیں یا امت مرحومہ میں۔ آپ نے فرمایا امت مرحومہ میں۔ اس نے پوچھا اس کے عالموں میں ہیں یا جاہلوں میں؟ آپ نے فرمایا میں جاہل نہیں ہوں۔ اس نے کہا کچھ پوچھنے آئے ہیں یا میں ہی آپ سے سوال کروں۔؟ آپ نے فرمایا آپ ہی سوال کریں۔ اس نے کہا اگر آپ امت محمدیہ کے عالم ہیں تو بتایئے کہ وہ کون سا وقت ہے جو نہ دن میں ہے نہ رات میں؟ آپ نے فرمایا طلوع فجر سے طلوع آفتاب تک کا وقت ہے کہ یہ ساعت بہشت ہے۔ اس میں بیماروں کو ہوش آجاتا ہے۔ دردمندوں کو سکون مل جاتا ہے اور رات بھر کے جاگے ہوئے لوگوں

کو نیند آجاتی ہے۔

اس نے کہا آپ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ اہل جنت غذائیں استعمال کریں گے لیکن پیشاب پخانہ کی ضرورت نہ ہوگی۔ کیا دنیا میں اس کی کوئی مثال ہے؟ آپ نے فرمایا بیشک۔ شکم مادر میں بچہ غذا کو استعمال کرتا ہے اور اسے کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔

اس نے کہا کہ آپ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ جنت کے لوگ ساری غذائیں استعمال کریں گے لیکن غذاؤں میں کوئی کمی نہ آئے گی۔ کیا اس کی بھی کوئی مثال ہے؟ آپ نے فرمایا بیشک۔ شمع ہے کہ ایک شمع سے ہزاروں شمعیں جلائی جاتی ہیں۔ اور نور میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ اس نے کہا کہ وہ کون سے دو بھائی ہیں جو ایک ساتھ پیدا ہوئے اور ایک ساتھ مرے لیکن ایک کی عمر ۵۰ سال کی تھی اور دوسرے کی عمر ۱۵۰ سال کی۔ آپ نے فرمایا کہ جناب عزیزا اور جناب عزیر۔ کہ دونوں ایک ساتھ پیدا ہوئے اور ۳۰ سال کے بعد جناب عزیر کو اللہ نے سال بھر کے لئے موت دیدی پھر جب بیدار ہوئے تو ۲۰ سال مزید زندہ رہے اور اس طرح وقتِ موت ان کی عمر ۵۰ سال تھی اور ان کے بھائی کی عمر ۱۵۰ سال۔ وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ اور کہنے لگا کہ آپ تو کہتے تھے کہ میں عالموں میں نہیں ہوں۔ یہ کیسا علم ہے؟ آپ نے فرمایا کہ میں نے فرمایا محمدؐ بن علیؑ بن الحسینؑ نہیں ہوں۔ اس نے کہا آپ محمدؐ ہی ہیں۔ فرمایا نہیں وہ میرے جد تھے۔ کہا آپ ایلیا (علیؑ) کے بیٹے ہیں۔ فرمایا ہاں۔ ان کے فرزند شبیرؑ کا بیٹا ہوں۔ یہ سننا تھا کہ راہب مسلمان ہوگیا۔ اور کہنے لگا بیشک آپ اللہ کے برگزیدہ بندے ہیں۔ اور

اللہ ایسے افراد کو ایسا کمال عنایت کرتا ہے۔ صلوات

عزیزانِ محترم! واقعہ پر تبصرہ کا وقت نہیں ہے۔ صرف ایک فقرہ سن لیجئے اور بیان تمام کردوں۔ امامؑ نے اپنے کردار سے واضح کردیا کہ شمع جہاں بھی رہے گی روشنی دیتی رہے گی۔ ہشام یہ سمجھا تھا کہ ہمیں ذلیل کرے گا۔ لیکن دنیا نے دیکھ لیا کہ ہم دربار میں بھی گئے تو ہوش اڑا دیئے اور گرجا کی طرف مڑ گئے تو اسلام کی شمع روشن کرکے آئے اور یہی وہ شمع ہے جس سے ہزاروں شمعیں روشن ہوں گی۔ اور کیوں نہ ہوں۔ فتح ہمارا مقدر ہے اور کامیابی ہماری میراث۔ پہلے محمدؐ نے عیسائیت کو مباہلہ میں شکست دی تھی۔ اور دوسرے محمدؑ نے اس کے گھر میں شکست دی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ کل کے محمدؐ کی گود میں حسینؑ پلے تھے اور آج کا محمدؑ حسینؑ کی گود میں پلا ہے۔ کل کے محمدؐ نے صرف جزیہ لیا تھا اور آج کے محمدؑ نے کلمہ بھی پڑھوالیا ہے ــــ صلوات

امام جعفر صادق علیہ السلام

اسم مبارک	جعفرؑ
لقب	صادقؑ
کنیت	ابو عبداللہ
والد ماجد	امام محمد باقرؑ
والدہ ماجدہ	ام فروہ بنت قاسم ابن محمد ابن ابی بکر
ولادت	۱۷ ربیع الاول ۸۳ھ بروز جمعہ مدینہ منورہ
ازواج	فاطمہ بنت الحسین۔ حمیدہ مصفاۃ
اولاد	امام موسیٰ کاظمؑ اسماعیل عبداللہ ام فروہ
	اسحاق محمد عباس علی اسماء صغریٰ
شہادت	۱۵ شوال ۱۴۸ھ مدینہ منورہ
عمر مبارک	۶۵ سال
قبر مطہر	جنت البقیع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی اَشْرَفِ الْاَنْبِیَاءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ خَاتِمِ النَّبِیِّیْنَ سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا اَبِی الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ وَّآلِہِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاہِرِیْنَ وَلَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلٰی اَعْدَائِہِمْ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ اللّٰہُ الْحَکِیْمُ فِیْ کِتَابِہِ الْکَرِیْمِ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِنَّ عَلَیْنَا لَلْہُدٰی وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَۃَ وَالْاُوْلٰی۔

مالک کائنات کا ارشاد ہے۔ بے شک ہدایت کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے اور دنیا و آخرت کا اختیار ہمارے ہاتھوں میں ہے۔

یہ ایک ایسے صادق القول کا قول ہے جس کے کلام میں غلطی اور فریب کا کوئی امکان نہیں ہے، اور جب اس نے کہہ دیا ہے کہ ہدایت کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے تو چاہے تاریخ میں کوئی ثبوت ملے یا نہ ملے یہ ماننا پڑے گا کہ اس نے ہر دور، ہر عہد، ہر زمانے اور زندگی کے ہر موڑ پر ہدایت کا انتظام کیا ہے اور ایسا نہ ہوتا تو چند ہزار سال کی مدت میں ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء اور پھر ان کے اوصیاء و خلفاء کی گنجائش کہاں ہوتی۔ انبیاء کی کثرت خود اس بات کی دلیل ہے کہ اس نے کوئی خطۂ ارض کوئی علاقۂ زمین اور کوئی زمانہ ایسا نہیں چھوڑا جس میں ہدایت کا انتظام نہ کیا ہو، اور اس انتظام میں یہ لحاظ رکھا ہو کہ جس دور میں جیسی ضرورت ہو ویسا ہی نبی بھیجا جائے۔ ویسی ہی کتاب نازل کی جائے۔ ویسا ہی قانون بنایا جائے اور ویسی ہی شریعت مقرر کی جائے تاکہ انسان اس قانون سے فائدہ اٹھا سکے اور نمائندہ پروردگار حالات زمانہ کے مطابق دنیا

کی ہدایت کر سکے۔

اس مقام پر یہ مسئلہ مزید قابلِ غور ہے کہ اللہ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء میں ایک کو بھی عورت نہیں بنایا، اور پوری تاریخ ہدایت میں کسی ایک عورت کو بھی یہ موقع نہیں دیا گیا کہ وہ منصب نبوت و رسالت کی حامل ہو، ایک سے ایک صاحب ایمان و کردار خواتین گزری ہیں اور ایک سے ایک بلند نفس منزلت مقام پر آئیں لیکن کسی ایک کو بھی منصب الٰہی نہیں دیا گیا، تو کیا یہ سوچ لیا جائے کہ معاذ اللہ دینِ خدا میں عورت کا کوئی مرتبہ نہیں ہے یا دینِ الٰہی بھی عورت کے حق میں اتنا ہی ظالم ہے جتنے ظالم دنیا کے دوسرے قوانین ہیں۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو عورتوں کو منصب ہدایت کیوں نہیں دیا گیا اور انہیں اس شرف سے کیوں محروم رکھا گیا؟

تاریخ انسانیت میں بے شمار عورتیں گزری ہیں جنہوں نے قیادت کا منصب سنبھالا ہے اور باحسن وجوہ انجام دیا ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ عورت کی حکومت کبھی کامیاب نہیں ہوئی اور اس نے دنیا کو صالح نظام زندگی نہیں دیا تو مجھے معاف فرمائیں، مردوں کے دامن بھی کچھ کم داغدار نہیں ہے، زبان سے کہہ دینا بہت آسان ہے لیکن ایک مرتبہ دونوں کی تاریخ پر نظر ڈال لیجئے تو سارا حال معلوم ہو جائے گا۔ روئے زمین پر پہلا خون مرد ہی نے بہایا ہے، سفینۂ نوح سے کھلی بغاوت مرد ہی نے کی ہے، جناب ابراہیم کو آگ میں مرد ہی نے پھینکا ہے، جناب موسیٰ کو آوارۂ وطن مرد ہی نے بنایا ہے، جناب عیسیٰ کو اپنی جانب میں سولی پر مرد ہی نے چڑھایا ہے، بندگانِ خدا کو لوٹ کر خزانے جمع کرنے والا قارون مرد ہی تھا، خدا کے مقابلہ میں دعوائے خدائی کرنے والا نمرود مرد ہی تھا، کعبہ کے مقابلہ میں

گرجا بنانے والا ابرہہ مرد ہی تھا، اور اس کے مقابلہ میں دوسری طرف قصرِ فرعون میں موسیٰ کی پرورش کرنے والی آسیہ عورت تھیں، عیسیٰ کو شریر یہود سے پناہ میں رکھنے والی مریم عورت تھیں، جناب اسمٰعیلؑ کے لئے شدت عطش میں پانی فراہم کرنے والی ہاجرہ عورت تھیں، رسول اعظمؐ کو سکونِ زندگی عطا کرنے والی خدیجہ عورت تھیں، بلکہ ایک عورت نہ ہوتی تو نہ بعثت کی غربت دولت سے تبدیل ہوتی، نہ تکذیب کا ماحول تصدیق میں منقلب ہوتا، نہ کاسہ لیسوں کا مجمع ہوتا، نہ کلمہ گویوں کا ہجوم ہوتا، نہ بزم پیغمبرؐ میں بھیڑ بھاڑ ہوتی، نہ اسلام میں یہ شان و شوکت نظر آتی اور مجھے تو یہ بھی کہنا پڑتا ہے کہ تاریخ اسلام میں صدر اسلام کے ٹکڑے توڑنے والے اور دولت لے کر غنی و مالدار بن جانے والے مرد تھے اور اپنے ٹکڑوں پر پوری امت کو پالنے والی فاطمہ زہراؑ کی ماں خدیجۃ الکبریٰؑ عورت تھیں، صلوات۔

یہ نہ سمجھئے کہ عورت کو کوئی شعور نہیں ہے، عورت کا کوئی کردار نہیں ہے، عورت کا کوئی ایمان نہیں ہے اور جب یہ سب کچھ نہیں ہے تو پھر سوال اپنے مقام پر ہے کہ اللہ نے عورتوں کو منصب دار کیوں نہیں بنایا۔

ہماری دنیائے اسلام اس ایک سوال کے سامنے انگشت بدنداں ہے اور تقریر و تحریر سے "اسلام میں عورتوں کے حقوق" ثابت کرنے والے علماء اسلام اس سوال کے مقابلہ میں ساکت و صامت نظر آتے ہیں۔ ہم نے مانا کہ اسلام نے عورتوں کو عزت دی ہے، وقار بخشا ہے، مرتبہ دیا ہے، میراث میں حصہ دیا ہے، تجارت کا حق دیا ہے، کسب معاش کی اجازت دی ہے، نکاح کرنے کا اختیار دیا ہے، تعلیم و تدریس کے حقوق دیئے ہیں، اولاد پر اطاعت واجب کر کے شہزادی کا مرتبہ دیا ہے، شوہر کی شریک حیات بنا کر گھر کا ذمہ دار بنایا ہے، باپ کی

آغوش میں رکھ کے قابلِ تعظیم و احترام بنایا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اتنی عزت و حرمت کے باوجود منصب کیوں نہیں دیا، اور سوالاکھ نبیوں میں ایک آدھ عورت کو یہ عہدہ کیوں نہیں بخشا۔؟

میرے خیال میں یا تو دنیائے اسلام اس اعتراض کا جواب دے اور دنیائے کفر و الحاد کو مطمئن کرے کہ حقوقِ نسواں کا نعرہ بلند کرنے والا اسلام اس منزل پر کیوں خاموش ہے اور یہاں عورتوں کے حقوق کی حمایت و رعایت کیوں نہیں کی گئی، اگر یہ امر ممکن نہیں ہے اور اس اعتراض کا کوئی جواب نہیں ہے تو صاف لفظوں میں اعتراف کرلے کہ جہاں تک حقوق کا تعلق ہے اسلام نے کسی منزل پر عورتوں کو محروم نہیں رکھا اور نہ مردوں سے پیچھے رکھا ہے، لیکن منصب کے معاملہ میں اس کی دنیا دوسری ہے، اس کا تعلق مرد اور عورت سے نہیں ہے بلکہ مصلحتِ الٰہی اور علمِ پروردگار ہے۔ بات صرف مرد و عورت کی ہوتی تو دنیا کے سارے مرد نبوت و رسالت کے دعویدار ہو جاتے، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کے بعد سے کروڑوں اور اربوں مرد صاحبِ ایمان و کردار گزرے ہیں اور ہیں لیکن کسی کو منصبِ نبوت و رسالت نہیں ملا۔ جو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ منصب خدائی مصلحت سے وابستہ ہے۔ اس میں علم و قابلیت اور استعداد و صلاحیت کی بحث نہیں ہے، قابلیت و صلاحیت اور کردار و ایمان شرطِ منصب ہیں لیکن یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ ہر صاحبِ ایمان و کردار کو منصب دے دیا جائے اور ہر قابل و فاضل انسان نبی اور رسول بن جائے۔ اور جب دنیائے اسلام نے عاجز آ کر یہ اعتراف کر لیا تو ایک قدم مجھے بھی بڑھنا پڑا کہ جب عورتوں کی نبوت و امامت کا مسئلہ آیا تو سب نے

تسلیم کر لیا کہ یہ کام خدا کا ہے، ہمارا نہیں ہے، اور جب اپنے گھر کی قیادت و خلافت کا مسئلہ آیا تو سب نے طے کر لیا کہ یہ حق بندوں کا ہے خدا کا نہیں ہے۔

احبابِ کرام! میرا تمام دنیائے اسلام کو چیلنج ہے کہ یا تو عورتوں میں کوئی ایسا نقص ثابت کریں جس کے بعد ان میں منصب کی صلاحیت نہ رہ جائے یا یہ اعتراف کرلیں کہ عہدۂ الٰہی اللہ کے اختیار میں ہے، اس میں امت کو دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ صلوات،

اس مقام پر یہ نکتہ بھی ذہن میں رکھنے کے قابل ہے کہ کوئی صاحب یہ نہ سوچیں کہ آپ نے نبوت کا قیاس خلافت اور امامت پر کیوں کر لیا؟ ہم اس بات کے قائل ہیں کہ نبوت و رسالت میں ایک ایسی خصوصیت پائی جاتی ہے جس کا وجود عورت میں نہیں ہو سکتا اور اس کا علم صرف ذاتِ پروردگار کو ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس نے مردوں کو نبی و رسول بنایا ہے، عورتوں کو نہیں بنایا۔ لیکن اس کا قیاس خلافت و امامت پر نہیں ہو سکتا اور امت نے بعد پیغمبر جو اختیار لیا ہے وہ خلافت و امامت کا اختیار ہے، نبوت و رسالت کا اختیار نہیں ہے، لیکن احبابِ کرام! مجھے پھر یہ کہنا پڑے گا کہ اگر یہ طے ہو جائے کہ نبوت و رسالت میں ایسی خصوصیت ہے جس کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں ہے اور خلافت و امامت میں ایسی کوئی شے نہیں ہے تو امتِ اسلامیہ نے پیغمبر اسلامؐ کے بعد امہات المومنین کو خلیفۂ رسول کیوں نہیں بنایا؟ جبکہ یہ تاریخ کی ایک حقیقت ہے کہ محبتِ رسول، علم و فضل، روایت و حدیث وغیرہ کے اعتبار سے وہ ہر خلیفہ سے بہتر تھیں، جملہ خلفائے اسلام کی حدیثیں سب ملا کر اتنی نہیں ہیں جتنی حدیثیں صرف ام المومنین عائشہ کی ہیں۔ کسی خلیفۃ المسلمین کو رسولؐ سے

وہ قربت اور محبت حاصل نہیں تھی جو ام المومنین کو حاصل تھی، اور کسی کے ساتھ پیغمبر اسلامؐ نے اتنی رعایتیں نہیں برتی تھیں جتنی ان کے ساتھ برتی ہیں، اور کسی کی اس قدر ناز برداری نہیں کی ہے جتنی ان کی ناز برداری کی ہے تو پھر امت نے یہ عہدہ انھیں کیوں نہیں دیا۔ اور گستاخی معاف! مجھے تو یہ شکوہ خود ان کے والد بزرگوار سے ہے کہ انھوں نے منبر رسولؐ پر جاکر یہ تو کہدیا کہ علیؑ کے ہوتے ہوئے میں خلافت کا اہل نہیں ہوں، یہ کیوں نہ کہا کہ اپنی دختر نیک اختر کے ہوتے ہوئے یہ حق مجھے نہیں پہنچتا اور قاعدہ کے اعتبار سے یہ منصب انھیں ملنا چاہیئے۔

ممکن ہے کوئی نافہم یہ اعتراض کرے کہ نبیؐ کے بعد امت اسلامیہ اور شہر نبی پر چاروں طرف سے حملے کے امکانات تھے، منافقین منتظر بیٹھے تھے، مشرکین خار کھائے تھے، یہودی اپنی شکست کے انتقام کی فکر میں تھے، عیسائی الگ جلے ہوئے تھے اور مرتدوں کا فتنہ الگ سر اٹھا رہا تھا ایسے موقع پر اسلام کو علم و فضل، جمال و کمال، روایت و حدیث سے زیادہ لشکر کشی اور معرکہ آرائی کی ضرورت تھی، اس لئے یہ منصب کسی عورت کو نہیں دیا جا سکتا تھا، ورنہ اسلام کے تباہ ہو جانے کا اندیشہ تھا لیکن ارباب کرم! میں کسی عام عورت کی گفتگو نہیں کر رہا ہوں، میں ایک مخصوص خاتون کی گفتگو کر رہا ہوں، میری بحث جناب فاطمہ زہراؑ سے نہیں ہے کہ ان کے بارے میں یہ کہدیا جائے کہ ان میں معرکہ آرائی اور لشکر کشی کی صلاحیت نہیں تھی، میری گفتگو ایک ام المومنین سے ہے جن میں یہ صلاحیت بدرجۂ اتم موجود تھی اور وقت کے خلیفہ سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ خلیفۂ وقت کو تو میدان میں مقابلہ کرتے نہیں دیکھا گیا لیکن ام المومنین کو

بہر حال میدان جمل میں دیکھا گیا ہے، پھر ان کی خلافت سے ایک فائدہ یہ بھی ہوتا کہ جہاں جہاں خلیفۂ وقت کے دل میں مروّت پیدا ہو گئی تھی وہاں بھی وہ سخت اقدامات کرتیں اور کسی سے مروّت سے کام نہ لیتیں۔ جس کا زندہ ثبوت یہ ہے کہ خالد بن ولید کے معاملہ میں خلیفۂ رسولؐ نے صحابی رسول سمجھ کر مروّت سے کام لیا اور انکی ناقابل معافی غلطی کو نظر انداز کر دیا لیکن ام المومنین اپنے نظریات میں اتنی سخت تھیں کہ صحابی رسول کیا نفس رسول کو بھی معاف نہیں کر سکیں اور لشکر لے کر مقابلہ پر آگئیں۔

تاریخ کے یہ حقائق گواہ ہیں کہ رسول اکرمؐ کے بعد اسلام میں اتنا عظیم انقلاب آیا تھا کہ کوئی کسی کا پرسان حال نہیں تھا اور جب یہ امت رسولؐ کی چہیتی بیوی کی نہ ہوئی تو اکلوتی بیٹی کی کیا ہوگی اور جب خلافت کی دوڑ میں بزرگوں کو بچوں کا خیال نہ رہ گیا تو دوسروں کا کیا خیال آئیگا؟

ان حقائق سے واضح ہو جاتا ہے کہ دین اسلام میں نہ خدا نے عورتوں کو عہدہ دیا ہے نہ امت نے، تو اب یہ سوال بہر حال رہ جاتا ہے کہ پروردگار اگر عورت اس قابل نہیں ہے تو اس کی ہدایت کا کیا انتظام ہوگا؟ اور مرد اس کی عملی ہدایت کیونکر کریں گے، وہ اس کے اعمال بجالانے سے قاصر ہیں اور وہ ان کے اعمال سے استفادہ کرنے سے عاجز ہے تو پھر درمیانی راہ کیا نکلے گی؟

قدرت نے آواز دی گھبراؤ نہیں، میں منصب نہ دوں گا لیکن عورتوں میں بھی ایسی پاکیزہ کردار خواتین پیدا کر دوں گا جن کا عمل عورتوں کے لئے شمع ہدایت بن جائے گا اور جن کے نقش قدم پر چل کر دنیا کی عورتیں دنیا و آخرت کی نیکیاں

حاصل کر لیں گی، میں ان کے کردار کی ضمانت لوں گا، میں انھیں زیورِ عصمت سے آراستہ کروں گا اور اتنا طیب و طاہر بناؤں گا کہ مردوں کی طہارت کا اعلان کروں یا نہ کروں ان کی طہارت کا اعلان ضرور کروں گا عصمتِ مریم پر وقت پڑے گا تو ان کی طہارت کا اعلان کروں گا اور چادرِ زہراؑ میں اجتماع ہوگا تو ان کے حق طہارت کا اعلان کروں گا۔

اربابِ کرم! میں نے بار بار عرض کیا ہے کہ جسے خداوندِ عالم ہدایت کا انتظام سپرد کرتا ہے اس کی خلقت میں بھی ایک خاص اہتمام رکھتا ہے چنانچہ مریم کو نمونۂ عمل بنایا تو انھیں اپنے گھر کے لئے وقف کر دیا اور فاطمہ زہراؑ کو قیامت تک کے لئے شریکۃ الرسول بنایا تو ولادت میں وہ اہتمام رکھا کہ کائنات کی کسی خاتون کے لئے نہیں کیا گیا۔

تاریخِ اسلام گواہ ہے کہ جب جناب خدیجہؑ نے تمام اشرافِ قریش سے عقد کرنے سے انکار کر دیا اور امانت و دیانتِ پیغمبر کو دیکھ کر از خود پیغامِ عقد دے کر رسول اکرمؐ سے عقد کر لیا، تو عرب میں ایک کھلبلی مچ گئی "خدیجہ نے یتیم عبداللہ سے عقد کر کے ہماری سیادت و قیادت کی توہین کی ہے، ایک غریب و نادار سے عقد کر کے ہماری دولت و ریاست کا مذاق اڑایا ہے، اپنی طرف سے تحریکِ عقد کر کے ہمارے رسوم و قوانین کی تذلیل کی ہے، اور ایک غیر مذہب کے مرد سے عقد کر کے ہمارے عقائد و نظریات کی توہین کی ہے" عقد کے بعد جیسے جیسے مرسلِ اعظمؐ کے نظریات سامنے آتے گئے مخالفتوں کا رخ خدیجہ کی طرف تیز تر ہوتا گیا، اب مکہ کی گلیوں میں صرف پیغمبر پر پتھر نہیں پڑ رہے تھے، نبیؐ کے ساتھ مخالفت و بغاوت کی

چکی میں سب گھر والے بھی پس رہے تھے، اور دنیا جانتی ہے کہ عورتوں کا مزاج زیادہ جذباتی ہوتا ہے اور وہ رسم و رواج کی زیادہ پابند ہوتی ہیں، عرب عورتوں کی نظر میں خدیجہ کا یہی ظلم کیا کم تھا کہ انھوں نے رسم و رواج کی مخالفت کی ہے اور ایک ایسے مرد سے عقد کیا ہے جو ہمارے خداؤں کو بُرا کہتا ہے، ان کی مخالفت کرتا ہے انھیں بےحس، بےجان اور بےمصرف کہتا ہے اور خدیجہ طلاق بھی نہیں لے لیتیں اور عقد سے نکل بھی نہیں آتیں بلکہ ان کی نصرت کر رہی ہیں، ان پر ایمان لے آئی ہیں، اور اپنی دولت سے ان کی امداد بھی کر رہی ہیں، اُن کے مذہب کو آگے بڑھا رہی ہیں اور سنا گیا ہے کہ ان کے شکم میں کوئی فرزند بھی ہے، یعنی ایک وارث کا بھی بندوبست ہو گیا ہے۔ غضب ہو گیا، قیامت آگئی، کاش کوئی انھیں ختم کر دیتا کاش ایسی عورت سماج میں نہ پیدا ہوتی، کاش اسے موت آگئی ہوتی کہ ہمارا مذہب نہ بدنام ہوتا، ہمارے قبیلہ کی ناک نہ کٹتی، خدا جانے یہ عورت کہاں سے آگئی؟ اور ابھی تک زندہ ہے۔ اب تو ایک ہی راستہ ہے کہ ولادت کے موقع پر سب اس کا بائیکاٹ کر دیں اور کوئی اس کے قریب نہ جائے ہمارے بتوں نے چاہا تو یہ تڑپ تڑپ کے مر جائے گی اور ہمیں ہمیشہ کے لئے سکون مل جائے گا۔

عورتوں کے مزاج سے جتنے سخت اقدام کی توقع کر سکتے ہوں، اسی روشنی میں حالات کا جائزہ لیجئے اور سوچئے کہ خدیجہ کا عالم کیا ہے اور کس طرح سارے سماج کی مخالفت کا نشانہ بنی ہوئی ہیں۔ مگر اللہ رے صبر و ثبات کہ پائے استقلال میں کوئی جنبش نہیں، عقیدہ میں کوئی فرق نہیں، حمایتِ اسلام اور خدمتِ پیغمبرؐ میں کوئی کوتاہی نہیں۔ اور دل آواز دے رہا ہے کہ حق کے جادہ پر ہوں تو خدا مددگار ہے، اس کے نبیؐ کا ساتھ دیا ہے تو

وہ حفاظت کرنے والا ہے، اس کے مذہب کی راہ میں قربانی دی ہے تو وہ قدردان ہے لیکن بشریت کہہ رہی ہے خدیجہ! جب ایسے وقت میں عورتیں نہ آئیں گی تو کیا ہوگا؟ جب کوئی مددگار نہ ملے گا تو کیا حشر ہوگا؟ کہ دفعتاً کانوں میں آواز آئی — اماں گھبرایئے گا نہیں، اپنے ایمان پر ثابت قدم رہیئے، خدا نگہبان ہے، خبردار! کفار کی عورتوں سے مدد نہ لیجئے گا۔ پروردگار آپکی مدد کا انتظام کرے گا۔ خدیجہ چونک پڑیں، یہ کس نے سہارا دیا ہے، یہ کس کی آواز آئی ہے، یہ دفعتاً دل کو سکون کیوں حاصل ہو گیا ہے۔ مجھے سوچنے کی کیا ضرورت ہے، مجھے فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے، مجھے تو یاد ہے کہ جب جناب فاطمہ بنت اسد پر یہ وقت پڑا تھا تو ان کے پاس کوئی نہ تھا اور وہ خانۂ خدا میں تنہا تھیں تو جو خدا ان کے لئے انتظام کر سکتا ہے وہی خدا میرے لئے بھی انتظام کر سکتا ہے، بلکہ عجب نہیں کہ یہ بھی مصلحتِ خدا ہو کہ عرب کی عورتیں قریب نہ آئیں اور میری مدد کے لئے جنت سے حوریں آئیں آسمان سے ہاجرہ، مریم، سارہ اور آسیہ آئیں اور سب مل کر میرا ہاتھ بٹائیں، اور میں یہ سمجھوں کہ خدا کی طرف سے ہدایت کے ذمہ دار کی شان ہی کچھ اور ہوتی ہے اور مجھے تو ایک انتظامِ قدرت یہ بھی نظر آ رہا ہے کہ پروردگار! میری لاڈلی کا رشتہ فاطمہؑ کے فرزند سے کرنا چاہتا ہے جبھی تو اپنے گھر میں لڑکے کو پیدا کیا اور رسالت کے گھر میں لڑکی کو اُتارا ہے۔ صلوات،

عزیزانِ گرامی! ہوا وہی جو خدیجہ نے سوچا تھا، حورانِ جنت آئیں مریم و سارہ و حوّا و ہاجرہ آئیں اور صدیقہ طاہرہؑ کی ولادت با سعادت ہوئی، وہ کتنی مبارک صبح تھی جب نبیؐ کے گھر مصداق کوثر آ رہی تھی، خدیجہ کی گود آباد ہو رہی تھی اور ابتر کا طعنہ دینے والے ابتر ہو رہے تھے، ان ستوں کا

اندازہ کون کر سکتا ہے، امامت خوش تھی کہ امام الائمہ آئی، اسلام خوش تھا کہ نگہبان آئی، عالمِ نسواں خوش تھا کہ راہنما آئی، جنت خوش تھی کہ خاتونِ جنت آئی، خدیجہ خوش تھیں کہ میری راحتِ جان آئی، رسولِ اکرمؐ خوش تھے کہ میری نورِ نظر آئی، توحید خوش تھی کہ مباہلہ میں میرے وقار کی محافظ آئی، قرآن خوش تھا کہ میری منزلِ تطہیر آئی۔ صلوات،

آئی اور کس شان سے آئی، فاطمہ بن کر آئی تو قوم کو جہنم سے نجات دلانے کا پیغام سنایا، بتول بن کے آئی تو آیتِ تطہیر کے لئے ایک عظیم مفہوم آیا، عذرا بن کے آئی تو طہارت کو ایک عظمت ملی، صدیقہ بن کے آئی تو صداقت کو ایک معیار اور مباہلہ کو ایک مصداق ملا، زہرا بن کے آئی تو دونوں عالم روشن اور منور ہو گئے، خاتونِ جنت بن کے آئی تو حورانِ جنت نے نثار ہونا شروع کر دیا اور درخت طوبیٰ نے موتی نچھاور کر دیئے، سیدۃ النساء بن کے آئی تو عورتوں کو راہنما مل گیا، شریکۃ الرسول بن کر آئی تو رسالت کو غمگسار مل گیا اور آمنہ کے انتقال کے بعد آئی تو ام ابیہا کا مصداق بن گئی۔ صلوات،

اتنے انتظام و اہتمام کے بعد یہ نہ سوچئے گا کہ اگر منصب رسالت و امامت نہیں ملا تو کردار میں کوئی کمی رہ گئی۔؟ نہیں! یہ بھی ایک مصلحت الٰہی ہے کہ اس نے فاطمہ کو منصب نہیں دیا ورنہ فاطمہ کے کمالات و اوصاف میں کوئی کمی نہیں تھی، اور شاید وہ مصلحت یہ رہی ہو کہ اللہ نے باپ کو منصب رسالت سے نوازا، اور شوہر کو منصب امامت سے سرفراز کیا اور دنیا میں فاطمہ زہراؑ کو ہر منصب سے الگ رکھا، کہ اگر کبھی منصب میں جھگڑے پیدا ہوں اور لوگ منصب کے نام پر اختلاف کریں، منکر پیدا ہوں، مخالف پیدا ہوں، باغی پیدا ہوں، غاصب پیدا ہوں

دشمن پیدا ہوں تو ایک معصوم کردار ایسا بھی رہا ہے جو منصب کے جھگڑوں میں نہ پڑے اور اس کی عصمت ہر منصب دار کے کام آسکے، چنانچہ تاریخ اسلام گواہ ہے کہ جب منصب نبوت پر وقت پڑا تو بھی فاطمہؑ ہی کام آئیں اور جب منصب امامت پر وقت پڑا تو اس وقت بھی فاطمہؑ ہی کام آئیں۔

دُنیا اس تاریخی حقیقت کو جھٹلا نہیں سکتی کہ مباہلہ کے میدان میں رسالت پر وقت پڑا تو فاطمہ زہراؑ ہی گواہی کے لئے آئی تھیں اور فدک کے مسئلہ میں امامت پر وقت پڑا تھا تو فاطمہ زہراؑ ہی نے ترجمانی کی تھی اور دنیا پر واضح کر دیا کہ اختلاف منصب کا نہیں ہے یہ امت آیت تطہیر کو بھی بھلا چکی ہے اور جو امت اپنے نبیؐ کی بیٹی کی وفادار نہیں ہے وہ کسی اور کی وفادار نہیں ہو سکتی۔ صلوات،

ولادت کے بعد صدیقہ طاہرہ پانچ سال تک پدر گرامی کے ساتھ رہیں سنہ ۱۰ھ میں خدیجۃ الکبریٰ کا انتقال ہو گیا تو فاطمہؑ کی کفالت کی ذمہ داری جناب ام سلمہ کے سر آئی، مگر اللہ رے بلندیٔ کردار کہ خود جناب ام سلمہ کا بیان ہے کہ حضور اکرمؐ نے مجھے فاطمہؑ کو تربیت دینے کے لئے میرے حوالے کیا تھا لیکن خدا گواہ ہے کہ میں نے فاطمہؑ سے سیکھا ہے، فاطمہؑ کو سکھایا نہیں۔

یہ ایک غیر منصب دار کی شان ہے: کاش دنیا کو اب بھی ہوش آجاتا کہ جب اس گھرانے کے غیر منصب دار تعلیم و تربیت کے محتاج نہیں ہیں تو منصب دار کیسے محتاج ہو جائیں گے، فاطمہؑ کے کردار نے رسالت کی عظمت کو بھی واضح کر دیا اور امامت کی جلالت پر بھی روشنی ڈال دی کہ یاد رکھو! میرے گھرانے میں نہ رسالت کسی کی محتاج ہے نہ امامت اور اس نکتہ کو کم از کم انھیں ضرور سمجھنا چاہئے،

جن سے میرا کوئی رشتہ ہے۔ البتہ اگر کوئی مجھ سے ہی تعلق نہیں رکھتا تو اس سے شکوہ بھی نہیں ہے، جو میرا نہ ہوگا وہ کسی اور کا ہوگا۔ صلوات،

صدیقہ طاہرہ کے فضائل و کمالات پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ انسان کے فضائل دو طرح کے ہوتے ہیں۔ بعض فضائل اس کے اختیارات و اعمال و افعال سے پیدا ہوتے ہیں اور بعض کمالات خداداد ہوتے ہیں جن میں کسی انسان کو کوئی دخل نہیں ہوتا، یہ کمالات پروردگار کیوں عطا کرتا ہے یہ ایک مستقل موضوع ہے جس پر بحث کرنے کا محل نہیں ہے، ممکن ہے کہ یہ کمالات مستقبل کے پیش نظر دیئے جاتے ہوں اور یہ ظاہر کرنا ہو کہ یہ انسان مستقبل میں ایک عظیم منصب یا کمال کا حامل ہونے والا ہے، اس لئے ولادت ہی سے اسے غیر معمولی فضائل و کمالات کا حامل بنا دیا گیا ہے اور ممکن ہے کہ یہ بعض خصوصیات برنبائے امتحان ہوں کہ ہم نے تجھے اس قدر کمالات عطا کئے ہیں اب دیکھنا ہے تو ان کمالات کی کہاں تک لاج رکھتا ہے، اور ان کے وقار کا کہاں تک تحفظ کرتا ہے؟

مثال کے طور پر انسانیت ایک شرافت و عزت ہے اور کسی انسان کا پروردگار پر حق نہیں تھا کہ اسے انسان ہی بنایا جاتا، اس کے اختیار میں تھا کہ وہ چاہتا تو انسان بناتا اور چاہتا تو جانور بنا دیتا۔ یہ اس کے کرم کی بات ہے کہ اس نے انسان کو انسان ہی پیدا کیا اور اسے پیدائشی طور پر عقل و ادراک فکر و نظر، قلب و دماغ، شعور و تعقل کی دولت سے سرفراز کر دیا، اب یہ اس کے اختیار کی بات ہے کہ چاہے ان جواہرات کی قدر کرے اور اپنی انسانیت کا تحفظ کر کے کرامت و شرافت کا تاج اپنے سر پر رکھ لے یا انھیں خاک میں

بلادے اور خود بھی حیوان سے بدتر بن جائے، ہم نے تاریخ میں دونوں طرح کے انسان دیکھے ہیں، وہ انسان بھی دیکھے ہیں جنھوں نے انسانیت کا اس قدر خون کیا کہ آخر کار جانور ہونے کی تمنا کرنے لگے، کاش میں جانور ہوتا، کاش میں حیوان ہوتا، کاش میں چڑیا ہوتا، اور ایسے انسان بھی دیکھے ہیں جنھوں نے جوہرِ آدمیت کو اتنا بلند کیا کہ مقابلہ پر آنے والے فرشتے بھی دروازہ کے بھکاری بن گئے۔ کوئی کپڑے لئے چلا آرہا ہے، کوئی کھانا لئے چلا آرہا ہے، کوئی جھولا جھلا رہا ہے، کوئی چکی پیس رہا ہے، کوئی سلام کرنے آرہا ہے، کوئی روٹی مانگنے آرہا ہے، کوئی آیت لا رہا ہے، کوئی انگوٹھی لئے جا رہا ہے۔ صلوات،

مقصد یہ ہے کہ پیدائشی کمالات میں دونوں قسم کے احتمالات پائے جاتے ہیں، امتحان بھی ہو سکتا ہے اور احترام بھی، لیکن انسانیت کے مشترکہ صفات کے علاوہ کوئی کمال اسی وقت دیا جاتا ہے جب انسان میں کوئی خصوصیت پائی جاتی ہو اور قدرت کو اس سے کوئی مخصوص کام لینا ہو ورنہ عدالت پروردگار پر حرف آئے گا۔ علمائے اسلام نے آباء و اجداد پیغمبرؐ کی شرافت و جلالت کی شرط اسی لئے لگائی ہے کہ مذہب الٰہی کا ذمہ دار اور منصب الٰہی کا ورثہ دار کوئی پست و ذلیل انسان نہیں ہو سکتا، ورنہ عہدہ بھی بدنام ہو جائے گا اور مقصد بھی حاصل نہ ہو سکے گا۔

اس تمہید کی روشنی میں آل محمدؐ کے حالات کا جائزہ لیا جائے تو ہر ایک کے یہاں مخصوص امتیازات و خصوصیات نظر آئیں گے۔ اس وقت صرف معصومۂ عالمؑ کے خصوصیات پر روشنی ڈالنا ہے اور مختصر لفظوں میں یہ کہنا ہے کہ اللہ نے صدیقہ طاہرہؑ کو ابتدا ہی سے ایسے کمالات و فضائل عنایت کئے تھے جو کائنات

کی کسی خاتون کو نہیں ملے، نسب و خاندان کے اعتبار سے باپ سید الانبیاء ماں ملیکۃ العرب، بیٹے سرداران جوانان اہل جنت، بیٹیاں محاذ اسلام کی بے سپاہ محافظ، اور شوہر ایسا جس کے ایک چہرہ میں آدمؑ کا علم، نوحؑ کا زہد، ابراہیمؑ کی خلت، موسیٰؑ کی ہیبت، عیسیٰؑ کا تقویٰ سب سمٹ آئے۔ گویا ایک نقطہ ہے جس میں سارا قرآن سمٹا ہوا ہے۔ صلوات،

حالات کے اعتبار سے یہ امتیاز ہے کہ پیدا ہوئیں تو خاتم المرسلینؐ کے گھر، خدمت کے لئے آئیں تو حوران جنت، پاسبانی کا فرض انجام دیا تو مریم و حوا اور ہاجرہ و آسیہ نے، دربانی کے لئے آئے تو آسمان کے ملک، سجدہ کرنے کے لئے آیا تو ستارہ زہرا، کپڑے لایا تو رضوان جنت، آسیہ گردانی کے لئے آئے تو روح الامین اور سلام کرنے آئے تو رحمۃ للعالمینؐ صلوات،

جسمانی اعتبار سے بھی سر وہ جس کی بلندی کو کوئی پا نہ سکے، ہاتھ وہ جن کے کرم پہ ہل اتیٰ قربان، قدم وہ جن کی رفتار رسول اللہ کی رفتار، زبان وہ جس کا انداز رسول اکرمؐ کا انداز، نگاہ وہ جس کے تیور باپ کے تیور، لہجہ وہ جس کی جھنکار شوہر کی ذوالفقار، گھر میں بیٹھ جائیں تو صلح خاتم النبیینؐ کا نمونہ، دربار میں آجائیں تو فاتح خیبر کی ترجمان، چادر اوڑھ کے لیٹ جائیں تو آیت تطہیر نازل ہو جائے، نقاب ڈال کر بیت الشرف سے باہر آجائیں تو مباہلہ کا میدان سر ہو جائے، بزم رسالت میں آجائیں تو پیغمبرؐ تعظیم کے لئے اٹھ جائیں، دربار حکومت میں آجائیں تو چہروں سے نقابیں الٹ جائیں۔ صلوات،

معنوی اعتبار سے تو کمالات کا اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا، قرآن کی آیتیں گواہ کہ زہرا، صدیقہ، طاہرہ، معصومہ، راضیہ، مرضیہ اور مرکز عصمت ہیں، نبیؐ کے ارشادات گواہ کہ فاطمہؑ سردار خواتین جنّت، بہترین نساء عالم، مرکز مرضیٔ پروردگار، محبوب ترین خلائق، انسانیت کے پیکر میں حور صفت، شفیعۂ محشر اور بالاجنّت ہے۔ اور مختصر یہ کہ ابوالبشر آدم بھی وہ نہیں جو فاطمہ زہراؑ ہیں۔ ان کی خلقت کا امتیاز یہ تھا کہ اللہ نے بغیر ماں باپ کے پیدا کیا تھا لیکن آسمان پر پیکر بنانے کے لئے مٹی زمین سے منگائی تھی اور سیدہ کا امتیاز یہ ہے کہ زمین پر تخلیق کے لئے سیب جنت آسمان سے فراہم کیا جاتا ہے۔

آپ ارباب نظر خود فیصلہ کریں کہ آدم کا رخ کدھر ہے اور سیدہؑ کا رخ کدھر ہے، اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، خاک کا رخ زمین کی طرف ہوتا ہے اور نور کا رخ بلندی کی طرف ہوتا ہے۔ صلوات،

اور یہ باتیں میں کہتا تو شاید دنیا اعتبار نہ کرتی اور اسے غلو، مبالغہ اور خطابت و شاعری کا نام دے دیتی لیکن اسے کیا کیا جائے کہ خود مرسل اعظمؐ کہیں اعلان فرما گئے ہیں کہ اگر علیؑ نہ ہوتے تو میری بیٹی فاطمہؑ کا کوئی ہمسر نہ ہوتا۔ نہ آدمؑ نہ غیر آدمؑ، آدم و غیر آدم کی وسعت دیکھئے، اور سیدہ کی عظمت کا اندازہ لگائیے۔ مجھے تو کہنا پڑتا ہے کہ نبیؐ و علیؑ کو چھوڑ کر انبیاء ہیں، اولیاء ہیں، مرسلین ہیں، صاحبان کتاب ہیں، صاحبان شریعت ہیں کوئی ایسا نہیں ہے جو فاطمہؑ کا جواب بن سکے۔ اور جب انبیاء جواب بننے سے قاصر ہیں تو حوا، سارہ، ہاجرہ، مریم و آسیہ کا کیا ذکر ہے؟ حوا ایک

معصوم کی شریک زندگی ہیں اور بس، سارا ایک معصوم کی زوجہ ہیں اور بس، آسیہ ایک نیک کردار خاتون ہیں اور بس، ہاجرہ ایک معصوم کی زوجہ ہیں اور ایک معصوم کی ماں ہیں اور بس، اور مریم ایک معصوم کی ماں ہیں اور بس لیکن کیا کہنا فاطمہ زہراؑ کا، عصمت ہر طرف سے حصار کئے ہوئے ہے، چادر تطہیر پردہ کھینچے ہوئے ہے، صداقت طواف کر رہی ہے، عظمت آستانہ پر سجدہ ریز ہے، بلندی بھیک مانگ رہی ہے رفعتیں سلام کر رہی ہیں، جدھر دیکھئے جلالت کا پہرہ ہے، جدھر نظر اٹھائیے عصمت و عظمت کی پاسبانی ہے، باپ ہے تو سید المرسلینؐ اور معصوم، شوہر ہے تو سید الاوصیاء اور معصوم، بچے ہیں تو سردار جوانان اہل جنّت اور معصوم، ایک ایک رشتہ کی عظمت گزشتہ خواتین کو مبارک اور ہر رشتہ کی عظمت فاطمہ زہراؑ کو مبارک،

مریم از یک نسبت عیسیٰؑ عزیز
وز سہ نسبت فاطمہ زہراؑ عزیز

نعرۂ صلوات

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام

اسم مبارک	موسیٰ
لقب	کاظم
کنیت	ابو ابراہیم
والد ماجد	امام جعفر صادقؑ
والدہ ماجدہ	جناب حمیدہ
ولادت	۷ صفر ۱۲۸ھ مقام ابواء (مدینہ منورہ)
ازواج	ایک
اولاد	فرزندان و دختران
شہادت	۲۵ رجب ۱۸۳ھ (جمعہ) بغداد
عمر مبارک	۵۵ سال
قبر مبارک	کاظمین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی اشرف الانبیاء والمرسلین خاتم النبیین سیدنا ومولانا ابی القاسم محمد وآلہ الطیبین الطاہرین ولعنۃ اللہ علی اعدائہم اجمعین۔ اما بعد فقال اللہ تعالیٰ الحکیم فی کتابہ الکریم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِنَّ عَلَیْنَا لَلْھُدٰی وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَۃَ وَالْاُوْلٰی

ارشاد جناب احدیت ہوتا ہے "بیشک ہدایت کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے اور دنیا و آخرت کا اختیار ہمارے ہاتھوں میں ہے۔

مالک کائنات کے اس اعلان نے صاف واضح کر دیا کہ ہم نے ہر دور میں عالم بشریت کی ہدایت کا انتظام کیا ہے۔ اور کوئی دور ایسا نہیں چھوڑا جس میں ایسے بلند کردار اور پاکیزہ صفات افراد نہ رہے ہوں جنہیں ہماری طرف سے نمائندگی کا شرف حاصل تھا۔ اور وہ روئے زمین پر ہماری جانشینی کا فرض انجام دے رہے تھے۔ آدم سے لے کر خاتم تک ہم نے انبیاء کا سلسلہ قائم رکھا اور جب نبوت کو آخری مرحلہ پر پہنچا دیا تو اپنے حبیب کو حکم دیا کہ خبردار اس وقت تک دنیا سے رخصت نہ ہونا جب تک اپنے بعد کے لئے ہادی و راہنما کا انتظام نہ کر دینا۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو گویا اپنی رسالت کا بھی فرض انجام نہیں دیا۔ ایسی رسالت بیکار ہے جس کا سلسلہ قیامت سے پہلے ختم ہو جائے۔ اور دنیا ہادی و راہنما سے خالی ہو جائے۔ کمال رسالت یہی ہے کہ اس کا سلسلہ قیامت تک قائم رہے۔ تم ایک بشری شکل میں نہ رہو لیکن تمہارا پیغام رہے۔ تمہارا اسلام رہے۔ تمہارا نظام رہے تمہارا قرآن رہے۔ تمہارا ایمان رہے اور اس شان سے رہے کہ گویا تم زندہ اور موجود

ہو اور اس انداز سے رہے کہ ہر دیکھنے والا سمجھے کہ ابھی محمدؐ زندہ ہیں اور محمدیت کا سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ کردار خود آواز دے کہ یہاں اول بھی محمدؐ ہے اوسط بھی محمدؐ ہے آخر بھی محمدؐ ہے، اور کُل کے کُل محمدؐ ہیں۔ صلوات

مسئلہ ہدایت انتہائی نازک مسئلہ ہے۔ یہ اتنا آسان کام نہیں ہے جتنا اہلِ دنیا نے آسان سمجھ رکھا ہے۔ اس کے لئے سب سے اہم شرط یہ ہے کہ انسان تمام احکام الٰہیہ سے کمل طور پر باخبر ہو اور کسی مقام پر یہ نہ کہے کہ مجھے نہیں معلوم نہ یہ کہے کہ میرا خیال یہ ہے۔ ایسا وسیع علم ہو کہ ہر مسئلہ میں حکم پروردگار بیان کرے اور ایسا محیط علم ہو کہ کسی منزل پر ساکت نہ رہ جائے۔

تاریخ عصمت کا مطالعہ کیا جائے تو یہاں ہر شخص اسی شان کا حامل نظر آئے گا۔ جسے دیکھو علم کا بحرِ ناپیدا کنار۔ جسے دیکھو فضیلتوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر جسے دیکھو کمالات کا مخزن۔ جسے دیکھو مناقب کا مرکز ـــــ دنیا کی کون سی فضیلت ہے جو یہاں نہیں ہے۔ حد یہ ہے کہ دنیا بہکی بھی ہے تو خدا ہی مانا ہے کچھ اور نہیں مانا۔ صلوات

کمالات کی یہ مرکزیت اس بات کی دلیل ہے کہ انہیں مالک کائنات نے ہدایت کا ذمہ دار اور دین کا محافظ بنا کر بھیجا ہے۔ ان کے کردار کا یہ عالم ہے کہ یہ دنیا میں قدم رکھتے ہیں تو بندگی کا درس دیتے ہوئے آتے ہیں۔ تاریخ کا مشہور و معروف واقعہ ہے کہ مرسل اعظمؐ نے دنیا میں قدم رکھا تو سر سجدۂ معبود میں رکھا۔ مولائے کائنات نے زمین کعبہ پر قدم رکھا تو سر سجدۂ معبود میں رکھا۔ ہر امام کا یہی انداز رہا۔ ہر معصوم کا یہی انداز رہا۔ یہاں تک کہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے حالات میں بھی صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ جیسے ہی آپ نے دنیا میں قدم رکھا دونوں گھٹنے ٹیک کر پیشانی خاک پر رکھ دی۔ اور آغاز حیات سے واضح کر دیا کہ نہ ہم سجدہ سیکھنے کے محتاج ہیں نہ کسی کے سکھانے کے محتاج ہیں۔ ہم اپنی معرفت اپنے ساتھ لے کر آتے ہیں اور اپنا

ذوق بندگی اپنے ہمراہ رکھتے ہیں۔ سیکھنے سکھانے کے محتاج وہ ہوتے ہیں جن کا کام ابتدائی ہوتا ہے۔ ہمارے لئے یہ سجدہ کوئی نئی چیز نہیں ہے کہ کسی کے سکھانے کے محتاج ہوں۔ ہم جب عالم انوار میں تھے جب بھی سجدہ کر رہے تھے اور اس دنیا میں آئے ہیں جب بھی سجدہ کر رہے ہیں۔ صلوات

ہدایت و راہنمائی کے لئے علم و کردار و صداقت کے ساتھ ایک اہم صفت یہ بھی ہے کہ انسان میں قوت حلم و برداشت درجہ کمال پر ہو اس لئے کہ جب اہل دنیا نے اپنا نظام ہدایت الگ بنا لیا ہے اور اللہ کے نمائندوں کو نظر انداز کر دیا ہے۔ تو قدم قدم پر مقابلے بھی ہوں گے۔ مصائب بھی پڑیں گے۔ شدائد بھی ہوں گے۔ راستے بھی روکے جائیں گے۔ کانٹے بھی بچھائے جائیں گے۔ پتھر بھی مارے جائیں گے۔ اب اگر خدائی نمائندہ جذبات و خواہشات کا پیکر ہوگا تو اس کی ساری زندگی صرف مقابلوں میں گذر جائے گی اور کار ہدایت انجام نہ پا سکے گا۔ ضرورت ہے کہ نمائندۂ پروردگار اتنا حلیم و بردبار ہو کہ مصائب پڑتے رہیں وہ اف نہ کرے۔ کانٹے بچھے رہیں اور پھولوں کی روش کی طرح گذر جائے۔ پتھر برستے رہیں اور وہ انھیں بارش رحمت تصور کرتا رہے۔ دندان مبارک شہید ہو جائیں اور وہ مارنے والوں کو ہدایت کی دعا دے۔ گلے پر خنجر چل رہا ہو اور وہ بخشش امت کی دعا کرے۔ حق غصب ہو رہا ہو اور وہ قوم کی مشکل کشائی کرے۔ پہلو شکستہ ہو جائے اور اس کے رحم و کرم میں کمی نہ ہو۔ جگر کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں اور وہ تلوار اٹھانے سے ممانعت کرے۔ ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑ جائیں اور وہ بددعا کے لئے ہاتھ نہ اٹھائے۔ حکومت زہر دغا کھلا دے اور وہ صبر و شکر سے کھالے۔ سلطنت آزار پر آزار پہنچائے اور وہ اپنے کام میں مصروف رہے اور ایک لمحہ کے لئے قدم پیچھے نہ ہٹائے۔ زندگی قید خانہ میں گذر جائے مگر سجدۂ طویل میں بھی مغفرت کی دعائیں۔

ہی کرے اور دنیا پر واضح کر دے کہ ستم کرنا تمہارا کام ہے۔ رحم کرنا ہمارا کام ہے۔ گمراہ کرنا تمہارا کام ہے اور ہدایت کرنا ہمارا کام ہے۔ قیدی بنانا تمہارا کام ہے۔ اور قید و بند سے آزاد کرانا ہمارا کام ہے۔ ظلم و جور کی زندگی گذارنا تمہارا کام ہے اور صبر و ضبط کی نمائندگی کرنا ہمارا کام ہے۔ تم شداد و فرعون و نمرود کے بنائے ہوئے ہو اور ہم اَرْحَمُ الرَّاحِمِين اور ربّ العٰلمین کے نمائندے ہیں ــــــ صلوات

خدا گواہ ہے کہ کائنات کی تاریخ میں سوائے آلِ محمدؐ کے کہیں ایسا کردار نظر نہیں آتا۔ آلِ محمدؐ میں بھی بعض افراد ایسے ہیں جن کے کردار میں یہ بات نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب ظلم پریشان رہتا ہے تو حق کو قدرے سکون مل جاتا ہے۔ اور جب باطل کو سکون مل جاتا ہے تو حق کے لئے زندگی تلخ ہو جاتی ہے۔

امام موسیٰ بن جعفرؑ کی زندگی کچھ ایسی ہی قیامت خیز زندگی تھی۔ جب ظلم و جور کے مجسموں کو زندگی کا سکون نصیب ہو گیا تھا اور بنی امیہ کے مقابلے میں بنی عباس فاتح ہو کر عالمِ اسلام پر قابض ہو چکے تھے۔

بنی عباس کے لئے آلِ محمدؐ کو ستانا یوں بھی زیادہ ضروری تھا کہ انھوں نے حکومت ہی آلِ محمدؐ کے نام پر حاصل کی تھی اب اگر آلِ محمدؐ منظر عام پر آگئے تو انھیں چھوڑ کر کوئی حکومت کی طرف توجہ بھی نہ کرے گا۔ ضرورت ہے کہ انھیں منظر عام سے ہٹایا جائے اور عوام پر یہ ظاہر کیا جائے کہ اسلام کے حقیقی وارث اور امت کے واقعی ذمہ دار ہم ہی ہیں۔

اس راہ میں دو اہم وسائل درکار تھے۔ پہلی بات یہ تھی کہ مصائب کے لئے اسے منتخب کیا جائے جو بنی ہاشم کا سربراہ اور کمالات کا مرکز ہو۔

کہ اصلی خطرہ اسی کی ذات سے ہو سکتا ہے۔ اور عوام کے ذہنوں پر وہی مسلط ہو سکتا ہے دوسرے لوگوں سے وہ خطرہ نہیں ہے وہ ہیں جیسے انسان ہیں اور ان کا کام ہماری ہی جیسی زندگی گذارنا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مصائب میں بھی یہ احتیاط برتی جائے کہ وہ منظر عام سے ہٹ جائیں۔ اور حکومت کا دامن داغدار نہ ہونے پائے۔ اس کی ایک شکل یہ ہے کہ انھیں قیدخانوں میں رکھا جائے یا گھروں ہی میں بند کر دیا جائے تاکہ یہ عوام سے نہ ملنے پائیں۔ اور عوام ان کی بارگاہ تک نہ پہنچنے پائیں۔ اور دوسری شکل یہ ہے کہ اگر اس طرح بھی عوام ان سے برگشتہ نہ ہو سکیں اور لوگوں سے قریب ہی رہیں تو ان کی زندگی خاتمہ کر دیا جائے اور اس طرح زہر دیا جائے کہ حکومت کے سر کوئی بدنامی بھی نہ آنے پائے۔ یہ اور بات ہے کہ قدرت کا انتظام بالکل الگ تھا اور اس نے طے کر دیا تھا کہ جس قدر انھیں دنیا سے دور رکھا جائے گا دنیا اسی قدر ان سے قریب ہو گی۔ اور جس طرح ان کے خون ناحق سے دامن بچانے کی کوشش کی جائے گی اسی طرح خون ناحق خود آواز دے گا کہ اگر حکومت کی سازش نہ ہوتی تو صفائی کی ضرورت بھی نہ ہوتی۔ تاریخ گواہ ہے کہ جتنا جتنا حکومتوں نے اپنا دامن صاف رکھنا چاہا اتنا ہی خون ناحق رنگ لایا اور قدرت نے آواز دی کہ اگر تم نے زمین کے سارے دھبے دھو ڈالے ہیں تو ہم شفق کی خون ناحق کا عکس بنا دیں گے۔ اور دنیا پر واضح کر دیں گے کہ اہل دنیا کی حکومت صرف زمین پر ہوتی ہے اور نمائندۂ پروردگار کا اقتدار آسمان والوں پر بھی ہوتا ہے۔ صلوات

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی زندگی انھیں مصائب و آلام اور اسی کشمکش حیات و موت کا شکار رہی۔ ۷ صفر ۱۲۸ھ میں منصور عباسی کے دور میں پیدا ہوئے۔

منصور کے مظالم کے لئے یہی کیا کم تھا کہ اس نے امام جعفر صادقؑ کو زہر دلوایا تھا اور کھلی ہوئی بات ہے کہ جو باپ کو زندہ نہ رہنے دے وہ بیٹے کو کس طرح زندہ رہنے دے گا۔ جب تک حضرت کے کمالات منظر عام پر نہیں آئے حکومت کا رویہ قدرے نرم رہا لیکن جیسے ہی کمالات کا اندازہ شروع ہوا یہ احساس تیز تر ہو گیا کہ ابھی جعفر صادقؑ کا وجود باقی ہے۔ ہم سمجھتے تھے کہ ہم نے انہیں زہر دے کر ختم کر دیا ہے لیکن موسیٰ بن جعفر کا کردار بتا رہا ہے کہ ابھی جعفرؑ صادق زندہ ہیں۔ میں کہوں گا منصور! ایک موسیٰ بن جعفرؑ پر کیا منحصر ہے تو اگر پوری نسل کو بھی تباہ کر دے گا تو قیامت تک جو پیدا ہوتا رہے گا اپنے وقت کا جعفرؑ صادق ہی ہوگا صلوات۔

بنی عباس کے پاس امام کو ستانے کے مختلف راستے تھے۔ ان کے سامنے ایسے مسائل چھیڑے جائیں کہ یہ حکومت وقت کی مصلحت کے خلاف جواب دیں اور حکومت کو سزا دینے کا جواز مل جائے۔ ان کے خاندان کے افراد کو انعامات اور جائزے دے کر توڑ لیا جائے۔ اور پھر ان پر یہ الزام رکھا جائے کہ یہ اپنے گھر میں حکومت کے خلاف سازش کرتے ہیں۔ اور ان کا ارادہ اقتدار کے خلاف خروج کرنے کا ہے۔

ایک راستہ یہ بھی ہے کہ مختلف افراد کو ان کے پاس جاسوس بنا کر بھیجا جائے اور وہ اپنے کو چاہنے والا ظاہر کر کے انھیں شرعی حقوق دیں اور جب یہ قبول کر لیں تو ہم یہ اعلان کر دیں کہ یہ ہمارے مقابلہ میں اپنے کو بادشاہ وقت اور حاکم امت سمجھتے ہیں ـــــ لیکن سوال یہ ہے کہ حکومت جو کچھ سوچ سکتی ہے وہ سب ادھر ہی کا تو علم ہے۔ یہ علم ان افراد کے مقابلہ میں کام آسکتا ہے جو یہیں سے پڑھے ہوئے ہیں۔ لیکن جو اپنے علوم و کمالات اُدھر سے لے کر

آئے ہیں ان پر یہ جادو کہاں چل سکتا ہے۔ جادو جادو پر چلتا ہے معجزہ پر نہیں چلتا۔ اور معجزہ ہر جادو کا اثر باطل کر دیتا ہے۔ مقابلہ ہوتا رہا اور دنیا نے دیکھ لیا کہ بالآخر فتح امامت ہی کے ہاتھوں رہی اور آج جب کہ منصور دوانقی ہادی۔ مہدی، ہارون جیسے سلاطین کی قبروں کا نام و نشان تک نہیں ہے بصرہ و بغداد کے قیدی موسیٰؑ بن جعفرؑ کا روضہ آسمان سے آنکھیں ملا رہا ہے اور آواز دے رہا ہے سلاطین دنیا آؤ اور حق کی فتح کا مشاہدہ کرو۔ یاد رکھو دولت کا زور گھٹ جاتا ہے۔ حکومت کا نشہ اتر جاتا ہے کرسی الٹ جاتی ہے۔ تخت سیلاب میں بہہ جاتے ہیں۔ تاج قدموں میں آجاتے ہیں۔ لیکن علم و کردار نہ پامال ہوا ہے نہ ہو سکتا ہے۔ اس کی تابانیاں باقی رہتی ہیں اور باقی رہیں گی ـــــ وہ زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔ وہ قائم ہے اور قائم رہے گا ـــــ صلوات

آیئے امام موسیٰ کاظمؑ ہی کی زندگی سے چند واقعات پیش کریں جن سے یہ صحیح اندازہ ہو سکے کہ حکومت نے کیا چاہا تھا اور امامت نے اس کے جادو کو کس طرح باطل کیا۔ علم و کردار کی بحث میں بعض واقعات علم کے ذیل میں پیش کئے جائیں گے۔ اور بعض کردار کے ذیل میں ـــــ علم کی منزل میں وہ مشہور و معروف واقعہ ہی کافی ہے کہ جب ہارون رشید نے علی ابن یقطین کو وزیر بنانا چاہا اور حضرت نے اجازت دیدی کہ شاید اسی طرح میرے چاہنے والے حکومت کے شر سے محفوظ رہیں اور حکومت کو خبر پہنچائی گئی کہ علی بن یقطین موسیٰؑ بن جعفرؑ کے مرید ہیں۔ انھیں بلا وجہ اپنا وزیر کیوں بنا رکھا ہے تو حضرت نے ایسے وسائل اختیار فرمائے کہ علی بن یقطین کی عزت میں بھی اضافہ ہوا اور دشمنوں کو ذلیل اور رسوا بھی ہونا پڑا۔

ایک مرتبہ لوگوں کے درمیان وضو کے مسئلہ پر بحث ہوگئی کہ وضو کا طریقہ کیا ہے۔ علی بن یقطین نے امام موسیٰ کاظمؑ سے دریافت کیا۔ آپ نے اہلسنّت کے طریقہ سے وضو کرنے کی تلقین کردی۔ علی بن یقطین حیرت میں پڑگئے کہ یہ امامؑ نے کیا فرمادیا ہے۔ لیکن امام کا حکم تھا بحث نہیں کرسکتے تھے۔ بالآخر عمل کرنا شروع کردیا۔ ادھر لوگوں نے ہارون کو اطلاع دی کہ علی بن یقطین امام موسیٰ کاظمؑ سے مل گئے ہیں۔ اور انھیں کے مذہب پر عمل کررہے ہیں۔ انھیں حکومت سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ہارون نے کہا کہ اس کا امتحان میں خود کروں گا۔ ایک دن وضو کے وقت چھپ کر دیکھنے لگا۔ دیکھا کہ علی بن یقطین سرکاری طریقہ سے وضو کررہے ہیں۔ دوڑ کر لپٹ گیا۔ کہنے لگا کہ لوگوں نے تمھارے خلاف بڑی بڑی شکایتیں کی تھیں لیکن مجھے یقین ہوگیا کہ تمھارا عقیدہ صحیح ہے۔ لوگ تم سے حسد کرتے ہیں۔ اُدھر دوسرے روز امامؑ کا پیغام پہنچا کہ ابن یقطین! اب ہمارے طریقہ سے وضو کیا کرنا۔ اب ضرورت ختم ہوگئی ہے۔

دیکھا آپ نے۔ یہ ہے امامؑ کا علم اور یہ ہے شانِ رہنما۔ کب کس چیز کی ضرورت ہوتی ہے یہ امام ہی جانتا ہے۔ دنیا نے چاہا تھا کہ امامؑ کے چاہنے والے کو تہ تیغ کرادے لیکن امامت نے فوراً ہی بچا لیا اور واضح کردیا کہ ہم بچانا چاہیں تو کوئی فنا نہیں کرسکتا۔ جب کل کا فرعون کل کے موسیٰ کو فنا نہیں کرسکا تو آج کا فرعون آج کے موسیٰ کو کیا فنا کرسکتا ہے —— صلوات

اسی طرح کا ایک واقعہ اور بھی کتابوں میں ملتا ہے کہ ہارون رشید نے علی بن یقطین کو ایک خلعت بطور انعام دیا۔ علی بن یقطین نے اسے فرزند رسولؐ کی خدمت میں بھیج دیا کہ یہ آپ کے شایان شان ہے۔ آپ نے واپس کردیا کہ ابن یقطین! اسے محفوظ رکھو یہ تمھارے کام آئے گا۔ ابن یقطین کو صدمہ ہوا کہ امام نے قبول نہیں فرمایا۔ لیکن حکم تھا محفوظ کردیا۔ اُدھر کسی نے اس عمل کو دیکھ لیا تھا۔ فوراً جاکر ہارون کو خبر کی کہ جس خلعت کو آپ نے ابن یقطین کے حوالے کیا تھا وہ انھوں نے اپنے امام کو دیدیا ہے۔ ہارون کو غصہ آیا فوراً ابن یقطین کو طلب کیا۔ اور کہا یہ کیا قصہ ہے کہ جو کچھ میں تمھیں دیتا ہوں وہ تم دوسروں کے حوالے کردیتے ہو۔ ابن یقطین نے کہا کہ امیر واقعہ کیا ہے؟ ہارون نے کہا کہ وہ خلعت کہاں ہے جو میں نے عنایت کیا تھا؟ علی بن یقطین نے کہا کہ میرے غلام کو میرے گھر بھیج دیا جائے۔ فلاں مقام پر رکھا ہے۔ غلام گیا اور خلعت لے آیا۔ ہارون کا حال غیر ہوگیا اور کہنے لگا یہ حاسد بے ایمان کب تک تم سے جلتے رہیں گے۔ مجھے یہ خبر دی گئی تھی کہ وہ خلعت تم نے اپنے امامؑ کو دیدیا ہے۔ لیکن اب یہ معلوم ہوگیا کہ سب جھوٹ ہے۔ ابن یقطین دربار سے چلے آئے۔ اور شکر خدا بجا لائے۔ قربان ایسے ذرہ نواز اور غلام پرور امامؑ کے کہ خلعت کو واپس کرکے غلام کی جان بچالی گویا امامؑ نے علی بن یقطین کو دربار ہارون میں بھیج کر آواز دی ابن یقطین میرے شیعوں کو بچانا تمھارا کام ہے اور تمھاری حفاظت کرنا میرا کام ہے۔ صلوات

یہ صرف جوانی کی بات نہیں ہے۔ بچپنے ہی سے علم وکمالات کا یہی عالم تھا۔ چنانچہ تاریخ کا بیان ہے کہ ایک شخص نے امام جعفر صادقؑ سے پوچھا کہ امام کی صفت کیا ہے آپ نے فرمایا کہ امام لہو ولعب میں مصروف نہیں ہوتا۔ اتنے میں اس نے دیکھا کہ امام موسیٰ کاظمؑ ایک بکری کا بچہ لئے چلے آرہے ہیں۔ حیرت ہوئی یہ کیسے امام ہیں کہ بکری کے بچے سے کھیل رہے ہیں۔ متوجہ ہوا تو دیکھا کہ حضرت اس سے فرمارہے ہیں کہ کیا کھڑا دیکھ رہا ہے۔ سجدۂ پروردگار کیوں نہیں کرتا۔ اس نے اپنے دل میں کہا بیشک اللہ کے نمائندے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ مقصد یہ نہیں ہے کہ جانور سے سجدہ کرایا جائے مقصد یہ ہے کہ انسانوں کو ہوش آجائے کہ جب ہم جانوروں کے

سجدہ نہ کرنے سے راضی نہیں ہیں تو انسانوں کی سرکشی سے کس طـــرح راضی ہو جائیں گے ـــــ صلوات

ظاہر ہے کہ اہل دنیا ان کمالات کو برداشت نہ کر سکتے تھے۔ اور ہر آن ان کو فکر تھی کہ کس طرح انھیں دنیا کی نگاہ میں ذلیل کر دیا جائے۔ اور دنیا پر ظاہر کر دیا جائے کہ ان کے پاس واقعاً کوئی کمال نہیں ہے یا یہ دنیا کے طلب گار ہیں۔ چنانچہ ایک شخص جس کا نام تھا نفیع انصاری ـــ وہ خود بیان کرتا ہے کہ ایک مرتبہ میں ہارون کے دربار میں باریابی کے لئے گیا اور دربانوں نے دروازہ پر روک دیا۔ دیر تک کھڑا رہا اور کوئی صورت نہ نکل سکی اتنے میں میں نے دیکھا کہ موسیٰؑ بن جعفرؑ آئے اور جیسے ہی آئے دربانوں نے راستہ دیدیا اور فوراً دربار میں داخل ہو گئے۔ مجھے یہ بات بے حد ناگوار گذری اور میں نے یہ طے کر لیا کہ جب یہ باہر آئیں گے تو میں انھیں ذلیل کروں گا۔ آخر کیا وجہ ہے کہ مجھے اجازت نہیں ملی اور یہ بلا اجازت اندر چلے گئے ـــ چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد جب حضرت دربار سے باہر تشریف لائے تو اس نے بڑھ کر راستہ روکا اور جیسے ہی آپ نے گھوڑے پر سوار ہونے کا ارادہ کیا اس نے پوچھا جناب آپ کون ہیں؟ آپ نے فرمایا تیرے سوال کا مطلب کیا ہے۔ اگر تو میرے شجرہ کے بارے میں سوال کرتا ہے تو میں محمد مصطفےٰؐ کا فرزند ہوں۔ اور اگر میرے وطن کے بارے میں پوچھتا ہے تو ایسی جگہ کا رہنے والا ہوں جس کی زیارت کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ اور اسی میں مسلمان کی نجات ہے۔ اور اگر صرف توہین کرنا چاہتا ہے تو یاد رکھ کہ ہماری فضیلت کو عرب کے کفار و مشرکین بھی پہچانتے ہیں۔ کیا تجھے یاد نہیں ہے کہ جب بدر کے میدان میں عتبہ شیبہ اور ولید جیسے افراد کفار کی طرف سے لڑنے کے لئے آئے۔ اور لشکر اسلام کی طرف سے انصار نے لڑنے کا ارادہ کیا تو کفار نے

یہی جواب دیا تھا کہ ہم کل کے عزت داروں کو اپنا مقابل نہیں سمجھتے۔ ہمارے مقابلہ میں انھیں بھیجو جو خاندانی وجاہت اور آبائی شرافت رکھتے ہوں۔ ہمیں کفار نے بھی اپنے برابر نہیں سمجھا۔ ہمارا کیا ذکر ہے اور میری شخصیت کے بارے میں پوچھتا ہے تو یاد رکھ ہم خاندان کی یادگار ہیں جن پر ہر نماز میں درود پڑھنا فرض ہے۔ اور اگر انسان درود نہ بھیجے تو نماز ہی نہ رہ جائے۔ یہ سننا تھا کہ مرد انصار نے گھبرا کر گھوڑے کی لجام چھوڑ دی اور اپنے راستہ چلا گیا۔

دیکھا آپ نے عداوت کا انداز۔ دنیا کسی فضیلت کو برداشت ہی نہیں کر سکتی ہے اور قدرت نے طے کر لیا ہے کہ جب تم راستہ روکو گے تو ہم فضیلت کی ایک نئی راہ نکال دیں گے۔ بھلا ان کا راستہ کون روک سکتا ہے جن کے لئے خانہ کعبہ کی دیواریں در بن گیا اور در نے بن کر فضیلت کا ایک نیا باب کھول دیا۔ ـــــ صلوات۔

امامؑ کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ ہے کہ اپنے پرائے۔ مسلمان، غیر مسلم سب درپے آزار تھے۔ غیر مسلمین کا منشا تھا کہ اسلام ذلیل ہو۔ مسلمانوں کا مقصد تھا کہ اہلبیتؑ رسولؐ کی توہین کی جائے اور درمیان میں ایک امام موسیٰ بن جعفرؑ کی ذات تھی جو ہر محاذ پر مقابلہ کر رہی تھی۔ اور دشمنوں کو مسلسل شکست پر شکست دے رہی تھی۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ ایک عیسائی راہب آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ مجھ سے بڑا توریت و انجیل کا عالم کوئی نہیں ہے؟ آپ نے فرمایا بھائی یہ تو بتا دے کہ حضرت مریم کی والدہ کا نام کیا تھا؟ اور حضرت عیسیٰ کس روز کس وقت کس جگہ پیدا ہوئے تھے۔ اس نے کہا کہ یہ تو مجھے نہیں معلوم ہے۔ آپ نے فرمایا بس اسی علم پر عالمیت کا دعویٰ کرتا ہے۔ عیسائیوں کا راہب اور حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں بے خبر۔ کہئے تو عرض کر دوں فرزند رسولؐ یہ ایک

عیسائی ہی پر کیا منحصر ہے۔ آپ کے جد کے ماننے والے بھی ایسے ہی عالم ہیں جنھیں آج تک نہ معلوم ہو سکا کہ مرسل اعظمؐ کس دن دنیا میں تشریف لائے اور کس دن تشریف لے گئے۔ اور عجب نہیں کہ فرزند رسولؐ فرمائیں کہ اسی لئے تو میں نے یہ مسئلہ اٹھایا ہے کہ امت کو معلوم ہو جائے کہ جو اپنے نبی کے بارے میں اتنا بے خبر ہوتا ہے اُسے امتی ہونے کا بھی حق نہیں ہے۔ امت کا ذمہ دار اور نبیؐ کا وارث ہونا تو بڑی بات ہے۔ صلوات

یہ کہہ کر حضرت نے فرمایا یاد رکھ حضرت مریم کی والدہ کا نام یونانی زبان میں مرثا ہے۔ جس کا عربی ترجمہ "وہیبہ" ہوتا ہے۔ اور حضرت عیسیٰ کا حمل جمعہ کے دن ظہر کے وقت قرار پایا تھا۔ جب جبریل امین حضرت مریم پر نازل ہوئے اور انھیں روح عیسیٰ سے سرفراز فرمایا۔ مرسل اعظمؐ نے اسی لئے اس دن کو عید قرار دیا ہے کہ یہ ایک قدرت پروردگار اور تخلیق پیغمبر کا دن ہے۔ مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ اس دن اور اس ساعت میں عبادت پروردگار کریں۔ اور معبود کی بارگاہ میں سر نیاز خم کریں۔ حضرت عیسیٰ کی ولادت سہ شنبہ کے دن ہوئی۔ جب ساڑھے چار گھنٹے دن چڑھ چکا تھا۔ اور وہ دریائے فرات کا کنارہ تھا جہاں حضرت عیسیٰ نے اس دنیا میں قدم رکھا ہے۔ پروردگار نے ان کی برکت سے فرات میں بے حساب برکت رکھ دی ہے۔ اور اب اس سے سارے اطراف کے لوگ فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ولادت کے موقع پر حضرت مریم نے کسی سے بات نہیں کی اور نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ جب تمھارے خاندان میں کوئی بدکردار نہیں تھا تو تمھارے یہاں بغیر شوہر کا بچہ کیسا ہے ——— اور حضرت عیسیٰ نے گہوارے سے اپنی مادر گرامی کی عصمت کی گواہی دی۔

راہب حیران ہو گیا اور کہنے لگا اچھا یہ بتایئے کہ میری ماں کا نام کیا ہے آپ نے فرمایا کہ تیری ماں کا نام سریانی میں عنقالہ ہے اور عربی میں "ملیتہ" تیرے دادا کا نام عنفور ہے اور تیرے باپ کا نام عبد المسیح ہے حالانکہ عبد اللہ ہونا چاہئے تھا۔ اس لئے کہ بندہ اللہ کا بندہ ہوتا ہے مسیح کا نہیں۔ اور اے راہب تیرے نانا کا نام جبریل ہے جسے عبد الرحمٰن ہونا چاہئے تھا۔ اس لئے کہ ملائکہ کے نام میں شرکت جائز نہیں ہے۔ انسان کو انسانوں کا سا نام رکھنا چاہئے ملائکہ جیسا نہیں۔

یہ کہہ کے فرمایا کہ کیا میں تیرے دادا کے قتل کا واقعہ بھی بیان کر دوں کہ شام والوں نے کس طرح اس کے گھر کا محاصرہ کر کے اسے قتل کیا ہے۔ اس نے کہا نہیں صرف یہ بتا دیجئے کہ میرا نام کیا ہے؟ آپ نے فرمایا عبد الصلیب۔ حالانکہ تیرا نام بھی عبد اللہ ہونا چاہئے تھا۔ یہ صلیب کا بندہ کیا مطلب؟ انسان خدا کا بندہ ہوتا ہے نہ کہ صلیب کا بندہ؟

یہ سننا تھا کہ راہب پریشان ہو گیا اور اس ہمہ گیر علم کے مقابلہ میں کوئی بات بن نہ پڑی۔ سوائے اس کے کہ کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو جاتا۔ چنانچہ اس نے بے ساختہ کہا کہ فرزند رسولؐ مجھے کلمہ پڑھوا دیجئے اور مسلمان بنا دیجئے۔ جس مذہب میں ایسے ایسے صاحبان علم و فضل ہوں اس سے بہتر مذہب کون ہو سکتا ہے۔

دیکھا آپ نے اسلام کی تبلیغ کس طرح ہو رہی ہے۔ یہاں "بزور شمشیر" اسلام نہیں ہے۔ یہاں صرف علم ہے، اخلاق ہے، کردار ہے۔ اور یہ اعلان ہے کہ خدا کا نمائندہ علم و کردار کا حامل ہوتا ہے اور دنیا کا نمائندہ تیر و تلوار کا۔ اب تمھیں اختیار ہے چاہے کردار کے سایہ میں کلمہ پڑھو یا تلوار کے سایہ

میں ـــــ صلوات

اربابِ کرم! امام موسیٰ بن جعفر علیہ السلام نے اس واقعہ میں بے شمار مسائل کی طرف اشارہ کر دیا ہے اور راہب کے جواب کے ساتھ امت اسلامیہ کو بھی ہوشیار کر دیا ہے۔ کہ صحیح امتی وہی ہے جو اپنے رسولؐ کے بارے میں معلومات رکھتا ہو۔ واقعی کلمہ گو وہی ہے جو خدا کا بندہ ہو رسول کا بندہ نہیں اور اگر نام میں بھی یہ احتیاط برقرار رہے تو زیادہ بہتر ہے۔ رسول کا بندہ کہنا حرام اس لئے نہیں ہے کہ ہمارے رسولؐ میں اور حضرت عیسیٰ میں فرق ہے۔ وہاں لوگ عیسیٰ کو خدا ہی کا شریک اور ابن اللہ کہتے تھے۔ اس لئے عبدالمسیح میں شرک کا اندیشہ تھا۔ یہاں کوئی مسلمان پیغمبرؐ کو خدا نہیں مانتا اس لئے شرک کا کوئی سوال نہیں ہے۔ بلکہ اسلام اور روشن ہو جاتا ہے کہ انسان اس کا غلام ہے۔ جو حقیقتاً عبداللہ ہے۔ اور بظاہر محمدؐ ابن عبداللہ ہے ـــــ صلوات

حضرت عیسیٰ کے مسئلہ نے اس بات کو بھی واضح کر دیا کہ اللہ نے نبی کی خلقت سے دن کو بھی بابرکت بنا دیا ہے اور اس جگہ کو بھی جہاں نبی نے قدم رکھے تھے تاکہ مسلمانوں کو ہوش آجائے کہ نبوت کے قدم زمان و مکان کو بابرکت بنا دیا کرتے ہیں۔ اب اگر مریمؑ کا لال زمین و زمان کو بابرکت بنا سکتا ہے تو زہراؑ کے لال کی کیا منزلت ہوگی۔ وہاں فرات کا پانی بابرکت ہو گیا یہاں خاک شفا ہو گئی ـــــ وہاں دریا مبارک ہو گیا یہاں زمینِ صحرا کربلائے معلیٰ بن گئی ـــــ صلوات

اور پھر ایک منزل وہ آئی کہ فرات پر بھی زہراؑ کے لال ہی کا قبضہ ہو گیا۔ اور عظمت نے آواز دی۔ دنیا میں آکر زمین کو برکت دینا فرزند مریمؑ کا

کا کام تھا اور دنیا سے جا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بلندی دے دینا ابن زہراؑ کا کام ہے ـــــ اور کیوں نہ ہو ابن زہراؑ اور ابن مریمؑ میں بڑا فرق ہے۔ دنیا اس فرق کو نہیں پہچانتی۔ یہ فرق تو اسی دن کھلے گا جب دونوں فرزند ایک نقطہ پر جمع ہوں گے۔ اور ابن مریمؑ کی جماعت ہوگی اور ابن زہراؑ کی امامت ہوگی تب معلوم ہوگا کہ آسمان پر بلند ہو جانا بڑا شرف ہے یا زمین کو عرش معلیٰ بنا دینا بڑا شرف ہے۔ صلوات

تذکرہ آگیا ہے تو ایک علمی مکالمہ اور سن لیجئے جس میں مخاطب کوئی عیسائی یا یہودی نہیں ہے۔ بلکہ امت اسلامیہ کا ایک امام ہے اور امام بھی کیسا جسے امام اعظم کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کے پاس جو کچھ ہے سب اسی در کا صدقہ ہے۔ لیکن خدا برا کرے طمع دنیا کا۔ جب حکومت نے سر پر ہاتھ رکھ دیا تو ذہن ہی منقلب ہو گیا۔ اور اب یہ خیال پیدا ہو گیا کہ امت میں مجھ سے بڑا کوئی عالم نہیں ہے اور امت کا کیا ذکر ہے خود پیغمبر اسلامؐ کے ارشادات پر بھی اعتراضات فرما دیئے اور یہ فرما دیا کہ یہ حکم پیغمبرؐ صحیح نہیں ہے۔ واقعی حکم یوں ہونا چاہئے تھا ـــــ اس لئے کہ میرے قیاس کا تقاضا یہی ہے اور اسلام اب قرآن و سنت سے طے نہ ہوگا بلکہ سرکاری قیاس سے طے ہوگا۔ خیر۔ واقعہ یہ ہوا کہ ایک مرتبہ آپ نے امام جعفر صادقؑ سے شکایت کی کہ آپ کے فرزند موسیٰ بن جعفرؑ ایسی جگہ پر نماز پڑھ رہے تھے جہاں لوگ برابر سامنے سے گذر رہے تھے اور اس طرح خشوع و خضوع میں فرق آجاتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اس کا جواب انہیں سے حاصل کیجئے گا۔ اتنے میں امام موسیٰ بن جعفرؑ آگئے۔ آپ نے فرمایا فرزند! انہیں تمہاری نماز پر اعتراض ہے اور یہ کہتے ہیں کہ تم ایسی جگہ پر نماز پڑھ رہے تھے کہ جہاں تک

سامنے سے گذر رہے تھے اور اس طرح خضوع وخشوع میں فرق آجاتا ہے۔
آپ نے فرمایا بابا جان ان سے فرما دیجئے کہ میرا خدا مجھ سے اتنا قریب ہے کہ میرے اور اس کے درمیان سے کوئی گذر ہی نہیں سکتا۔ اور جب درمیان سے گذر نہیں سکتا تو خضوع میں فرق آنے کا کیا سوال ہے۔ (مناقب)
یہ سننا تھا کہ امام جعفر صادقؑ نے بڑھ کر گلے سے لگا لیا۔ فرمایا شاباش فرزند شاباش۔ خاندان رسالت کے بچے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ صلوات
اس واقعہ سے وہ ایک مستقل مسئلہ بھی حل ہو گیا جو آج تک امت اسلامیہ میں زیر بحث ہے اور مسلمان اس نماز کو بیکار سمجھتے ہیں جس میں کوئی نمازی کے سامنے سے گذر جائے۔ یہ اور بات ہے کہ یہ قابلیت دور دراز ملکوں ہی میں نظر آتی ہے۔ مکہ معظمہ میں خانۂ کعبہ کے گرد کوئی اس مسئلہ پر عمل نہیں کرتا اور ہر ایک کی نماز صحیح ہو جاتی ہے۔ بس خانۂ کعبہ سے جدا ہوئے اور نئے نئے مسئلے یاد آنے لگے۔ امام موسیٰ بن جعفرؑ نے واضح فرما دیا کہ تمہارے خلوص اور ہمارے خلوص میں فرق ہے۔ تمہارا خلوص آدمی کے گذر جانے سے مجروح ہو جاتا ہے۔ اور ہمارا خلوص تیر کے نکل جانے پر بھی مجروح نہیں ہوتا — رکوع میں انگوٹھی بھی دے دیتے ہیں تو ہماری شان میں آیت ولایت ہی نازل ہوتی ہے۔ یہ اپنے اپنے خلوص اور اپنے اپنے مقدر کی بات ہوتی ہے۔ کسی کا خدا دور ہوتا ہے کسی کا خدا رگ گردن سے زیادہ قریب جس کا جیسا خدا ہوتا ہے اس کا ویسا ہی عمل ہوتا ہے — صلوات
تم نے ابھی ہمارے عمل کا فلسفہ ہی نہیں پہچانا۔ احکام بیکھ کے عمل کرنا تمہارا کام ہے اور احکام کی حقیقت و حکمت پہچان کے عمل کرنا ہمارا کام ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ہشام بن الحکم نے فرزند رسولؐ سے سوال کیا کہ یہ نماز کے شروع میں سات

تکبیریں کیوں مستحب ہیں؟ یہ رکوع میں "سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمِ وَبِحَمْدِہٖ" کیوں کہا جاتا ہے؟ یہ سجدہ میں ذکر سجدہ بدل کیوں جاتا ہے۔ اور وہاں "سبحان ربی الاعلیٰ وبحمدہٖ" کیوں کہا جاتا ہے۔
سوال کا انداز ہی بتا رہا ہے کہ تخت و تاج پر قبضہ ہے لیکن شریعت اسلامی کی خبر نہیں ہے۔ اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ یہ بنیاد تو روز اول سے پڑ گئی تھی کہ تخت و تاج لینا ہے تو شریعت کا ساتھ چھوڑنا پڑے گا۔ اور شریعت کو سنبھالنا ہے تو تخت و تاج سے دست بردار ہونا پڑے گا۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ تخت و تاج پر قبضہ کر لو مسائل تو حل ہو ہی سکتے تھے۔ گویا حکومتوں کو بھی اعتماد تھا کہ اللہ اپنی حجت سے زمانے کو خالی نہ رکھے گا۔ اور حجت خدا مسائل بیان کرنے سے گریز نہ کرے گا تو اپنے لئے زندگی بھی سلامت رہے گی اور جنت بھی ہاتھ سے نہ جانے پائے گی۔
آپ نے فرمایا کہ جب حضور سرور کائناتؐ معراج کی رات آسمانوں کی طرف چلے تو جیسے جیسے آگے بڑھتے گئے آنکھوں کے سامنے سے پردے اٹھتے گئے۔ ایک منزل آئی جہاں ایک پردہ ہٹا آپ نے فرمایا اللہ اکبر۔ اور آگے بڑھے دوسرا پردہ ہٹا آپ نے فرمایا اللہ اکبر۔ اور آگے بڑھے تیسرا پردہ ہٹا۔ آپ نے فرمایا اللہ اکبر — غرض اسی طرح آگے بڑھتے رہے اور حجابات نگاہوں سے اٹھتے گئے۔ اور ہر حجاب کے اٹھنے پر ایک تکبیر کی صدا آتی رہی۔ یہاں تک کہ ساتوں آسمانوں کی منزلیں طے ہو گئیں اور سارے حجابات نگاہوں کے سامنے سے اٹھ گئے۔ تو عظمت الٰہی کے احساس نے حضورؐ کو جھکا دیا اور حضورؐ نے جھک کر آواز دی "سبحان ربی العظیم وبحمدہٖ" — یہ کہنا تھا کہ بلندی کا ایک اور عالم نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ جو کسی کے تصور میں بھی نہیں آ سکتا تھا۔ اور اب آپ کا یہ عالم تھا کہ خدا کی پناہ۔ ہر طرف عظمت و جلالت

کا منظر نگاہوں میں جلوۂ ربوبیت۔ قدس کی فضا۔ خدائے قدوس کا جلوہ۔ یہ دیکھ کر بے ساختہ آپ سجدہ میں گر پڑے۔ اور آواز دی "سبحان ربی الاعلیٰ وبحمدہٖ"۔ نماز اسی معراج کی یادگار ہے۔ اور اس کے اعمال اسی معراج کا پرتو ہیں۔ یہی تو وجہ ہے کہ جب مومن خلوص و توجہ کے ساتھ نماز ادا کر لیتا ہے تو آواز آتی ہے جا میں نے تیری نماز کو بھی معراج بنا دیا۔ صلوات

ظاہر ہے کہ جو شریعت کے ان اسرار و رموز سے باخبر ہوگا۔ اس کی نماز و عبادت کا عالم ہی کچھ اور ہوگا۔ دنیا یہ سوچتی ہوگی کہ ہم نے قید خانہ میں تنہا ڈال دیا اور وہ یہ سوچتا ہوگا کہ یہی تو عبدیت کی معراج کی منزل ہے۔ جہاں کوئی ترحیل بھی ساتھ نہیں ہے اور بندہ ہے جو معبود کی بارگاہ میں سر نیاز خم کئے ہوئے مناجات کر رہا ہے۔ خدا جانتا ہے دنیا جس قید خانہ کو زندان سمجھ کر خوش ہو رہی تھی امامؑ اس قید خانہ کو عبدیت کی معراج سمجھ کر مطمئن تھے۔ صبح سے ظہر تک اور ظہر سے مغرب تک مسلسل سجدے اور ہر سجدے میں مسلسل دعائیں۔ دنیا حیران ہے کہ کسی طرح بندگی سے عاجز آجائیں اور یہاں یہ عالم ہے کہ ہر مصیبت پر ایک نیا سجدۂ شکر۔ آخر وہ منزل آئی جب حکومت نے بھی یہ طے کر لیا کہ انھیں سجدوں سے نہیں روکا جا سکتا۔ اور سجدوں کی کشش انھیں نہیں روک سکتی بہتر یہی ہے کہ دنیا کو یہ باور کرا دیا جائے کہ یہ سجدے اور یہ بندگی صرف مجبوری کا سودا ہیں ورنہ دنیا مل جائے تو نہ سجدہ رہ جائے گا نہ بندگی۔ یہ طے کر کے ایک دن ملک کی ایک حسین و جمیل عورت کو قید خانہ میں بھیج دیا گیا۔ مقصد یہ ہے کہ امام موسیٰ کاظمؑ کو عبادت خدا سے روک دے۔ اور ہم دنیا کو یہ سمجھا سکیں کہ ساری عبادت نمائش و ریاکاری ہے اور اس کا خلوص سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

یہ بھی اسلام کا نمائندہ ہے جس کی ساری مہم یہ ہے کہ اللہ کے بندوں

کو عبادت سے روک دے۔ سجدہ گذاروں کے سجدوں میں خلل پیدا کر دے۔ اب بھی اگر دنیا کو ہوش نہ آیا تو کب آئے گا کہ اسلام کا وارث اور بندگی پروردگار سے مخالفت یہی تو فرق ہے اہل حکومت اور اہل امامت میں۔ سجدہ کرنا امامت والوں کا کام ہے اور سجدہ سے روکنا حکومت والوں کا کام ہے۔ اب یہ آدم آکر فیصلہ کریں گے کہ ان میں کون سا عمل معصومؑ عمل ہے اور کون سا کردار شیطانی کردار ہے۔ صلوات

عورت قید خانہ میں گئی۔ دروازہ بند کیا گیا۔ قفل لگایا گیا اور ارباب دولت اس بات کے منتظر رہے کہ اب کوئی آواز آئے گی اور عبادت کا سارا راز کھل جائے گا۔ میں کہتا ہوں انتظار کس بات کا ہے۔ کیا کسی اقدام ہی کی ضرورت ہے۔ آخر حکومت ہی کی فرستادہ تو ہے۔ ایک شور مچا دے گی اور سارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ لیکن کیا کہنا رعب و جلال امامت کا کہ عورت کھڑی لرز رہی ہے اور نہ ٹوکنے کی ہمت پڑتی ہے نہ شور مچانے کی۔ منتظر ہے کہ سجدہ سے سر اٹھائیں تو عرض مدعا کرے اور آپ کا سجدہ ہے کہ تمام ہی نہیں ہوتا۔ عورت کھڑے کھڑے تھک گئی تو بیٹھ گئی اور دیکھنے لگی کہ واقعاً ان کی عبادت کا کیا عالم ہے اور یہ سجدہ اس قدر طولانی کیوں ہو رہا ہے۔ ایک مرتبہ دیکھا کہ امامؑ کی زبان پر تسبیح پروردگار ہے اور فضا میں کچھ آوازیں گونج رہی ہیں۔ سر اٹھایا تو کیا دیکھا کہ آسمان کے دریچے کھلے ہوئے ہیں۔ جنت کے نظارے نگاہوں کے سامنے ہیں اور "لبیک لبیک عبدی" کی صدائیں آرہی ہیں۔ یہ دیکھنا تھا کہ عورت سے ضبط نہ ہو سکا اور بے ساختہ سجدے میں گر پڑی۔ ادھر امامؑ کا سجدہ اور ادھر کنیز کا سجدہ۔ وہ خدا کا نمائندہ اور یہ حکومت کی نمائندہ۔ رات تمام ہو گئی لیکن نہ ان کا سر اٹھا نہ اس کا سر اٹھا

صبح ہوئی حکومت میں کھلبلی مچ گئی۔ آخر عورت کو کیا ہوگیا ہے کہ کوئی آواز بھی نہیں دیتی ـــــ شاید دونوں میں ساز باز ہوگئی اور امامؑ نے اسے اپنا بنالیا۔ یہ سوچ کر ارباب دولت زندان کے دروازے تک آئے اور بڑی تمکنت کے ساتھ زندان میں داخل ہوئے۔ اب جو قیدخانہ میں قدم رکھا تو عجب منظر دیکھا کہ دو اللہ کے بندے ہیں اور دونوں محو سجدہ ہیں۔ کوئی اور ہوتا تو بدنیت عورت کا سجدہ دیکھ کر خوش ہوتا۔ لیکن سجدہ سے کیے تعلق ہے وہاں تو ساری اسکیم ہی فیل ہوگئی۔ عاجز آکر عورت کو اٹھایا اور کھینچتے ہوئے باہر لائے۔ یہ کیا طریقہ ہے تجھے کس کام کے لئے بھیجا گیا تھا اور تو نے کیا کیا۔ اس نے کہا امیر خدا جانتا ہے جو لذت عبادت میں اس بندۂ خدا کے ساتھ ملی ہے وہ زندگی میں کبھی نصیب نہ ہوئی۔ میں قیدخانہ میں اسی ارادہ سے گئی اور منتظر رہی کہ یہ سجدہ سے سر اٹھائیں تو اپنا مدعا بیان کردوں لیکن انھوں نے سر نہ اٹھایا اور میں نے یہ منظر دیکھا کہ آسمان سے لبیک لبیک کی آوازیں آرہی ہیں تو مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے بھی سر سجدۂ معبود میں رکھ دیا۔

ارباب کرم! یہ ہے زور امامت کہ قیدخانہ کے فضائل دربار میں بیان ہورہے ہیں۔ لوگ تعجب کرتے ہیں کہ آج فضائل اہلبیتؑ کی حدیثیں غیروں کی کتابوں میں کس طرح پائی جاتی ہیں۔ اور انھیں دشمنوں نے فنا کیوں نہیں کردیا۔ لیکن عزیزان محترم یہ قدرت کا انتظام ہے کہ ایسے حالات پیدا کردئے جائیں کہ امامؑ قیدخانہ میں رہیں اور فضائل دربار میں بیان ہوتے رہیں۔ حکومت نے اپنا نمائندہ نہ بھیجا ہوتا تو اہل دربار کو امامؑ کی عبادت کا حال کیسے معلوم ہوتا۔ قدرت نے بھی آواز دی قیدخانہ میں

ڈال دینا تمھارا کام ہے اور تمھارے نمائندہ سے کلمہ پڑھوالینا ہمارا کام ہے ـــــ صلوات

بس آخری لفظ اور سن لیجئے اور بیان تمام۔ تاریخ میں ایک بندۂ خدا کا واقعہ اور بھی ملتا ہے۔ جس کا سابقہ ایک حسین وجمیل عورت سے پڑا تھا۔ قرآن مجید نے اس واقعہ کو بھی محفوظ کیا ہے۔ یہ جناب یوسف اور زلیخا کا واقعہ ہے۔ جہاں زلیخا سے سابقہ پڑا اور دامن یوسفؑ محفوظ رہا ـــ عصمت پر کوئی دھبہ نہ آسکا۔ لیکن ارباب کرم! اتنا فرق ضرور ہے کہ یوسفؑ نے اپنا دامن بچالیا لیکن زلیخا کو اپنا ہم خیال نہیں بناسکے۔ اور امام موسیٰ بن جعفرؑ نے حکومت کی نمائندہ کو اپنا ہم خیال بھی بنالیا۔ تو اب مجھے کہنے دیجئے کہ جو اپنا دامن بچالے اسے عصمت نبوت کہتے ہیں اور جو دشمنوں کو بھی اپنے سانچے میں ڈھال لے اسے عصمت امامت کہتے ہیں۔ صلوات

امام علی رضا علیہ السلام

اسم مبارک	علی
لقب	رضا۔ ضامن
کنیت	ابوالحسن
والد ماجد	امام موسیٰ کاظمؑ
والدۂ ماجدہ	نجمہ
ولادت	۱۱ر ذیقعدہ ۱۵۳ھ (جمعہ) مدینہ منورہ
شہادت	۲۳ر ذیقعدہ ۲۰۳ھ طوس
عمر مبارک	پچاس سال
زوجہ	جناب سبیکہ
اولاد	امام محمد تقیؑ
قبر مطہر	مشہد مقدس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی اشرف الانبیاء والمرسلین خاتم النبیین سیدنا ومولانا ابی القاسم محمد وآلہ الطیبین الطاہرین ولعنۃ اللہ علی اعدائہم اجمعین اما بعد فقد قال اللہ الحکیم فی کتابہ الکریم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ان علینا للھدیٰ وان لنا للآخرۃ والاولیٰ

مالک کائنات کا ارشاد ہے "بیشک ہدایت کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے اور دنیا وآخرت کا اختیار ہمارے ہاتھوں میں ہے"۔

آیت کریمہ میں مالک کائنات نے صاف صاف واضح کر دیا ہے کہ دنیا میں کسی انسان کو ہدایت کا انتظام کرنے کا حق نہیں ہے۔ یہ کام ہمارا ہے اور ہمیں کو انجام دینا ہے اور ہم نے ہر دور میں انجام دیا ہے۔ آدم سے لے کر آج تک کوئی دور ایسا نہیں گذرا جب ہم نے ہدایت کا انتظام نہ کیا ہو۔ اور ایک نہ ایک ہادی اور راہنما نہ معین کیا ہو۔ حیرت کی بات ہے کہ ہمارے اتنے مسلسل انتظام کے باوجود اور ایک لاکھ چوبیس ہزار تجربات کے بعد بھی امت اسلامیہ نے ہمارے اوپر اعتماد نہ کیا تو اب اس کا رسول اور امام پر کیا اعتماد ہوگا۔ وہ قرآن اور کعبہ پر کیا ایمان لائے گی۔ یاد رکھو جس نے ہمارے مقابلہ میں اپنی ہدایت کا انتظام کیا وہ نہ ہمارا رہا نہ ہمارے رسولؐ کا۔ نہ کعبہ کا رہا نہ قرآن کا نہ اس کے کلمہ کی کوئی قیمت ہے نہ شہادت کی۔ ہماری نظر میں مسلمان وہی ہے جو ہمارے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دے اور ہم جسے راہنما بنائیں اس کے

سامنے سر تسلیم خم کرتا جائے۔ ہم اپنی وحدانیت کا اعلان کریں تو "لا الہ الا اللہ" کہے۔ ہم اپنے رسولؐ کو ہادی و راہنما بنائیں تو "محمدؐ رسول اللہ" کہے۔ ہم میدان غدیر میں علیؑ کی ولایت کا اعلان کرائیں تو "علیؑ ولی اللہ" کہے ـــــ صلوات

اس کے بغیر نہ کسی کا ایمان مکمل ہو سکتا ہے نہ دین۔ اور ہم نے تو اپنے رسولؐ سے صاف کہدیا تھا کہ اگر آپ نے یہ اعلان نہ کیا تو گویا رسالت کا کوئی کام انجام نہیں دیا۔ تو جب اس مسئلہ میں اپنے حبیب کو معاف نہیں کر سکتا تو کسی امتی کو کیسے معاف کیا جا سکتا ہے۔ یاد رکھو رسولؐ اعلان نہ کرتے تو رسالت بیکار ہو جاتی اور تم ایمان نہ لاؤ گے تو تمھارا ایمان بیکار ہو جائے گا۔

اسی عظیم نکتہ کی طرف نیشاپور کے بازار میں امام علی بن موسیٰ الرضاؑ نے اشارہ کیا تھا۔ جب آپ کی سواری نیشاپور سے گذر رہی تھی اور لوگوں کو معلوم ہوا کہ فرزند رسولؐ کی سواری گذر رہی ہے۔ ہزارہا افراد سر راہ آکر کھڑے ہو گئے۔ اور اشتیاق زیارت میں بےچین تھے۔ حضرت ایک عماری کے اندر تشریف فرما تھے۔ مجمع بے قراری سے شور مچا رہا تھا۔ فرزند رسولؐ عماری کا پردہ اٹھائیے۔ ہمیں اپنے جمال مبارک کی زیارت کرائیے۔ زمانہ گذر گیا کہ ہم نے جمال رسالت کی زیارت نہیں کی۔ ایک مرتبہ عماری کا پردہ اٹھا۔ امامؑ نے روئے مبارک باہر نکالا۔ مجمع نے زیارت کی۔ کمال بے قراری سے شور گریہ بلند ہوا۔ ۲۴ ہزار قلمدان لکھنے کے لئے اکٹھا ہو گئے۔ فرزند رسولؐ کوئی حدیث بیان فرمائیے۔ اپنے جد کا کوئی پیغام سنائیے۔ جمال رسالت تو دیکھ چکے اب لہجۂ رسالت کا اشتیاق ہے۔ فرزند رسولؐ نے بیان کا آغاز کیا ـــــ

مجھ سے میرے پدر بزرگوار موسیٰؑ بن جعفرؑ نے ان سے ان کے پدر بزرگوار جعفرؑ بن محمدؑ نے۔ ان سے ان کے پدر بزرگوار محمدؑ بن علیؑ نے۔ ان سے ان کے پدر بزرگوار علیؑ بن الحسینؑ نے۔ ان سے ان کے پدر بزرگوار حسینؑ بن علیؑ نے ان سے ان کے برادر نامدار حسنؑ مجتبیٰ نے۔ ان سے ان کے پدر بزرگوار علیؑ بن ابی طالبؑ نے۔ ان سے ان کے ابن عم محمد مصطفےٰؐ نے ان سے ان کے امین وحی جبریل نے بیان کیا ہے کہ پروردگار عالم نے قلم قدرت سے لوح حکمت پر یہ لکھ دیا ہے کہ کلمہ "لا الہ الا اللہ" میرا قلعہ ہے جو اس قلعہ میں داخل ہو گیا وہ میرے عذاب سے محفوظ ہو گیا ـــــ حدیث بیان ہوئی محمل کا پردہ گرا دادیوں نے لکھا۔ علماء نے محفوظ کیا۔ سواری آگے بڑھی۔ ایک مرتبہ پردہ محمل پھر اٹھا۔ آواز آئی "وَلٰكِنْ بِشُرُوْطِهَا وَشُرُوْطِهَا" لیکن یاد رکھو کہ اس عذاب سے محفوظ رہنے کے لئے شرائط بھی ہیں۔ "وَاَنَا مِنْ شُرُوْطِهَا" اور اس کی شرطوں میں سے ایک میں بھی ہوں۔ یہ کہہ کر محمل کا پردہ گرا دیا اور سواری آگے بڑھ گئی۔ محدثین نے کلام بلاغت نظام کو محفوظ کیا۔ اور امامؑ نے بنیاد مذہب کو واضح کر دیا ـــــ اسلام میں کلمۂ توحید بھی بیکار ہے۔ اگر شرائط توحید پورے نہ ہوں اور امامت کا اقرار نہ کیا جائے۔ وہ خدا خدا نہیں ہے جو اپنے بندوں کی ہدایت کا انتظام نہ کرے اور وہ بندہ بندہ نہیں ہے جو خدائی انتظام پر ایمان نہ لائے۔ صلوات

واقعہ مشہور و معروف ہے اور تمام تاریخوں نے نقل کیا ہے۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مجمع کو اس قدر زیارت کا اشتیاق کیوں تھا ـــ مامون جیسا بادشاہ موجود ہے۔ ہارون جیسا بادشاہ کل گذر چکا ہے۔ امین جیسا سلطان نگاہوں کے سامنے آچکا ہے۔ پھر یہ اشتیاق زیارت کیوں ہے۔

کیا ان زیارتوں سے قوم کی تسکین نہیں ہوئی جو آج ایک چہرہ کی زیارت کا اشتیاق ہے اور اس ایک چہرہ کی زیارت سے کیا مل جائے گا۔ سلاطین کو دیکھیں گے تو انعام ملے گا۔ ایک بوریہ نشین کو دیکھا یا نہ دیکھا۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ لیکن مجمع کا اشتیاق بتا رہا ہے کہ سلاطین کو دیکھتے دیکھتے قوم عاجز آچکی ہے اور اب دل میں یہ تمنا ہے کہ کبھی تو اس کا جمال مبارک بھی دیکھ لیں جس کا صبح و شام کلمہ پڑھتے ہیں اور ہر اذان و نماز میں نام لیتے ہیں۔ قوم کو معلوم ہے کہ جمال رسالت کی زیارت سلاطین کے چہروں سے نہیں ہو سکتی۔ یہ شرف امامت ہی کے وسیلہ سے مل سکتا ہے۔ کاش دنیا نے یہی اندازہ کر لیا ہوتا کہ رسالت امامت سے ملتی ہے ریاست سے نہیں۔ صلوات۔

زیارت کے بعد حدیث کا اشتیاق بھی واضح کر رہا ہے کہ قوم لہجۂ پیغمبرؐ کے لئے بے قرار ہے۔ اور کتنی بے چین ہے کہ ایک کلمہ "گویا" پیغمبرؐ کی زبان سے سن لیں اور اسی کو سندِ آخرت بنا لیں۔ امام علی رضاؑ نے بھی حدیث سنا کر بتا دیا کہ ہم موقع پا کر اپنے فضائل کا اعلان نہیں کرتے۔ بلکہ حقیقت مذہب ہی کا اعلان کرتے ہیں۔ ہمارا وجود اپنے لئے نہیں ہے۔ ہم خدا کے لئے پیدا ہوئے ہیں اور اسی کے لئے جی رہے ہیں۔ صلوات

عزیزانِ گرامی! کیا مسلمانوں میں حدیثوں کی کمی تھی۔ کیا محدثین سب مر چکے تھے۔ کیا احادیث کے ذخیرے موجود نہ تھے۔ مامون تو خود ہی بڑا علم دوست اور ہنر پرور آدمی تھا۔ اس کے دربار میں علماء و فضلاء کا مجمع رہتا تھا۔ پھر فرزند رسولؐ سے حدیث کی فرمائش کیوں اور اس کے لئے اس قدر بے قراری کیوں؟ مجمع کا اندازہ ہی بتا رہا ہے کہ دنیائے اسلام

کو یہ احساس ہے کہ حدیث اور ہے اور جو حدیث فرزند رسولؐ کی زبان سے بیان ہو وہ اور ہے۔ صلوات

حدیث سننے والوں نے بھی اپنے حافظہ پر اعتماد نہیں کیا۔ بلکہ ۲۴ ہزار قلمدان اکٹھا کئے کہ حدیث لکھ لی جائے اور ایسا نہ ہو کہ جمال مبارک کی محویت میں کوئی بات ذہن سے نکل جائے۔ میں کہوں گا یہ قدرت کا انتظام تھا یا مشیت کا انتقام کہ فرزند رسولؐ سے حدیث سننے کے لئے اور اسے لکھنے کے لئے ۲۴ ہزار قلمدان جمع ہو گئے ہیں اور کل جب خود رسول اعظمؐ حدیث بیان کرنا چاہتے تھے تو ایک قلم دوات بھی میسّر نہ ہو سکا تھا۔ قدرت نے واضح کر دیا کہ تم ایک قلم دوات سے منع کر دو گے تو ہمیں کہ ہم ۲۴ ہزار قلم دوات اکٹھا نہ کر دیں اور فرزند رسولؐ نے حدیث بیان کر کے اعلان کر دیا کہ اہل دنیا اب بتاؤ فتح کس کی ہے۔ رسالت نے امت کے سامنے سر جھکایا یا امت نے امامت کے سامنے سر جھکا دیا۔ صلوات

اس مقام پر ایک نکتہ اور بھی قابل توجہ ہے کہ مجمع نے امامؑ سے حدیث سنانے کا مطالبہ کیا تھا۔ سند نہیں دریافت کی تھی۔ آپ براہ راست حدیث بیان فرما دیتے۔ جسے اعتماد کرنا ہوتا وہ خود ہی کر لیتا۔ اس قدر تفصیل کی کیا ضرورت تھی۔ لیکن امامؑ نے حدیث کے ساتھ اس کی مکمل سند بھی بیان فرما دی اور شاید یہ اشارہ رہا ہو کہ اگر براہ راست حدیث بیان کر دیتا تو امت کو یہ غلط فہمی ہو جاتی کہ کسی محدث سے سن لیا ہوگا اور امت کے کسی عالم سے علم حاصل کر لیا ہوگا۔ ضرورت ہے کہ دنیا پہچان لے کہ آلِ محمدؐ تمہارے علم کے محتاج نہیں ہیں۔ ان کا علم تمہارا عطیہ نہیں ہے۔ یہ عطیۂ پروردگار ہے

جو انھیں براہ راست عطا ہوتا ہے۔ صلوات

دوسری بات یہ بھی ہے کہ امامؑ نے یہ بھی واضح کر دیا کہ پیغمبر اسلامؐ سے حدیث کے سلسلے دو ہیں۔ ایک سلسلہ وہ ہے جو امت کے پاس ہے۔ اور اس میں سوائے غیر معصوم راویوں کے کوئی نہیں ہے۔ ہر راوی غیر معصوم، ہر سند غیر معصوم، ہر سلسلہ غیر معصوم۔ اور ایک سلسلہ ہمارے پاس ہے جس میں ہر فرد معصوم۔ ہر کڑی معصوم۔ امامت ہے تو وہ بھی معصوم۔ رسالت ہے تو وہ بھی معصوم اور ملکوتیت ہے تو وہ بھی معصوم۔ اب امت کو اختیار ہے چاہے اپنا دین غیر معصوم سلسلے سے حاصل کرے یا معصوم سلسلے پر اعتماد کرے۔ اتنا یاد رکھے کہ غیر معصوم سلسلہ میں خطا کا امکان ہے اور معصوم سلسلہ میں اس کا کوئی امکان نہیں ہے۔ صلوات۔

اللہ رے بلاغت امامت۔ ایک منزل پر سارے مسائل اسلام حل کر دیے اور ایک لمحہ میں امت کی ہدایت کا مکمل انتظام کر دیا اور ساتھ ہی ساتھ اس نظام ہدایت کی طرف بھی اشارہ کر دیا جو پروردگار کا قائم کیا ہوا تھا۔ امت ہوشیار ہو جائے کہ میں نے لوح و قلم سے لے کر اپنی ذات تک اتنے نام اسی لئے گنوائے ہیں کہ دنیا سمجھ لے کہ پروردگار نے جو ہدایت کا انتظام کیا ہے اس میں سرکار دو عالمؐ سے اب تک کتنے ہادی اور راہنما گذر چکے ہیں اور قدرت نے کس دور میں کسے راہنما بنایا ہے۔ "بشرطھا و شروطھا" کی لفظیں بھی اسی نکتہ کی طرف اشارہ کر رہی ہیں کہ ایک شرط تو میں ہوں اور سارے شرائط کو سمجھنا چاہو تو یہ پورا سلسلہ موجود ہے۔ اس سلسلہ کو چھوڑ دیا تو کلمہ "لا الٰہ الا اللہ" بھی بیکار

ہو جائے گا۔ اور اقرار توحید بھی کسی کام نہ آئے گا۔ صلوات

ارباب کرم! مجمع کے بے پناہ اشتیاق سے ایک بات اور بھی واضح ہو گئی کہ پروردگار نے ہر علیؑ کو ایسا ترجمان رسالت بنایا ہے کہ جب علیؑ مجمع میں آجاتا ہے تو قوم کا عالم ہی کچھ اور ہو جاتا ہے اور ذہنوں کے اضطراب کی کیفیت ہی کچھ اور ہو جاتی ہے۔ آپ پوری تاریخ پڑھ ڈالیں ہر منزل پر آپ کو یہی انداز نظر آئے گا۔ علیؑ ابن ابی طالب ہوں گے تو وہاں بھی وہی عالم ہوگا کہ نماز تمام ہوتے ہی انس پکار اٹھیں گے۔ یا علیؑ آپ نے رسول اللہؐ کی نماز یاد دلا دی اور علیؑ ابن الحسینؑ ہوں گے تو وہاں بھی وہی عالم ہوگا۔ یزید کا پورا دربار آواز دے گا۔ امیر اجازت دیدے ہم نے مدت سے بنی ہاشم کا لہجہ نہیں سنا اور علیؑ ابن موسیٰ الرضاؑ ہوں گے تو یہاں بھی یہی عالم ہوگا کہ ۲۴ ہزار قلمدان ایک حدیث لکھنے کے لئے جمع ہو جائیں گے۔ تو اب کہنا پڑے گا کہ قدرت نے نام ہی چن کر رکھا ہے۔ اور جسے علی بنا دیا ہے اسے ہر حال میں علی ہی رکھا ہے۔ اپنوں میں رہا تو علیؑ غیروں میں رہا تو علیؑ اور رسولؐ کے ہاتھوں پر آیا تو علیؑ۔ صلوات

گذارش یہ کر رہا تھا کہ مالک کائنات نے اپنا نظام ہدایت معین کرکے یہ واضح کر دیا کہ جو میرے نظام پر ایمان نہ لائے وہ میرا بندہ نہیں ہے۔ میں صرف اس بات پر راضی نہیں کہ انسان میرا کلمہ پڑھ کر میرے سامنے سر تسلیم خم کر دے۔ میرا منشا یہ ہے کہ جسے جسے میں نے ہادی اور راہنما بنایا ہے اس کی بارگاہ میں بھی سر نیاز جھکایا جائے اور اپنے عمل سے واضح کر دیا جائے کہ میں واقعاً بندۂ پروردگار ہوں۔ اور اس کے احکام کی اطاعت کرتا ہوں۔ مجھے صرف اپنا سجدہ پسند ہوتا تو میں ابلیس کو مردود بارگاہ کیوں بناتا۔

اس نے میرا کیا قصور کیا تھا۔ میرا سجدہ تو کر ہی رہا تھا۔ مجھے تو خدا مان ہی رہا تھا۔ میرے سامنے تو سر تسلیم خم ہی کئے ہوئے تھا۔ مجھ سے آخر تک خالق و مالک کہہ کر گفتگو کی تھی۔ میں نے اسے اسی لئے مردود بارگاہ بنایا کہ اس نے مجھے مانا میرے ہادی کو نہیں مانا۔ میرے اوپر ایمان لایا میرے راہنما پر ایمان نہیں لایا اور میں کسی ایسے انسان کو انسان ماننے کے لئے تیار نہیں جو مجھ پر ایمان لائے اور میرے ہادی پر ایمان نہ لائے میں نے کل بھی ایک کو شیطان بنا دیا تھا۔ اور آج بھی جو بغاوت کرے گا اسے " اُولٰئِكَ حِزْبُ الشَّيْطَان " کا خطاب دیدوں گا ۔

صلوات ۔

عزیزان گرامی ! یہ نمائندگانِ پروردگار کا ایک امتیاز ہے کہ انھیں مالک کائنات نے اتنا کامل و اکمل بنایا ہے کہ دنیا نے چاروناچار ان کی بارگاہ میں سر جھکایا ہے اور جب کچھ بن نہ پڑا تو مجبور ہو کر انھیں کی بارگاہ میں سر جھکایا ہے۔ کیا تاریخ اس حقیقت سے انکار کر دے گی کہ مرسل اعظمؐ کے بعد یکسر نظر انداز ہو جانے والے علیؑ کی بارگاہ میں ۲۵ سال کے بعد مسلمان آئے اور یہ گذارش کرتے آئے کہ یا علیؑ بیعت لے لیجئے۔ اب ہمارے پاس کوئی قائد یا راہنما نہیں ہے۔ مشکلیں بہت ہیں مشکل کشا کوئی نہیں ہے۔ مولائے کائنات نے بیعت تو لے لی لیکن ایک سوال رہتی دنیا تک کے لئے چھوڑ دیا — " تم اتنا تو بتا دو کہ کل مجھ میں کیا عیب تھا جو آج نہیں رہ گیا یا کل مجھ کیا کمی تھی جو آج پوری ہو گئی کہ کل تم نے میری بیعت نہیں کی تھی اور بیعت کے لئے کیوں حاضر ہوئے ہو؟" مولائے کائنات کے سوال نے واضح کر دیا کہ دنیا اللہ والوں سے روگردانی

کرتی ہے لیکن اللہ والے مڑ کر نہیں دیکھتے تو پھر سر جھکا کر چوکھٹ پر آ جاتی ہے۔ یہی منظر مولائے کائنات کی زندگی میں دیکھا اور یہی منظر امام علیؑ رضا کی زندگی میں دیکھا۔ اسی لئے تو کہنا پڑا کہ جب مرتضیٰ خدا کے سامنے بندے سر جھکا دیتے ہیں تو شان امامت اور نمایاں ہو جاتی ہے۔ پہلے علیؑ کے سامنے سر جھکایا تو اسے علیؑ مرتضیٰ کہا گیا اور تیسرے علیؑ کے سامنے سر جھکایا تو اسے علیؑ رضا کہا گیا — صلوات

امام علیؑ رضا کی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو مولائے کائنات کی طرح پوری حیات خدمت دین و مذہب اور حفاظت قوم و ملت میں مصروف نظر آئے گی — یہ امتیاز ہر امامؑ کی زندگی کا رہا ہے۔ لیکن امامؑ رضا کو ایک خصوصیت یہ حاصل ہوئی ہے کہ انھیں چند روز کے لئے تخت و تاج پر بھی قبضہ ملا ہے۔ اور امامت نے ولی عہدی کا کلمہ بھی پڑھا ہے۔ ولی عہدی کی داستان پر بحث کرنے کا یہ وقت نہیں ہے۔ صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ گھر میں رہے تو علیؑ کی زندگی اور تخت حکومت کے قریب پہنچ گئے تو علیؑ کی زندگی۔ نہ کل سادگی میں فرق آیا تھا نہ آج سادگی میں فرق آیا۔ کتنی پاکیزہ زندگی کہ " ذی قعدہ ۱۵۳ھ کو مدینہ کی سرزمین پر قدم رکھا تو پہلا کام یہ کیا کہ دونوں کہنیاں ٹیک کر سر سجدۂ معبود میں رکھ دیا۔ اور آواز دی اہل دنیا پہچان لو۔ اللہ والوں کا مقصد حیات بندگی پروردگار ہوتا ہے اور وہ زندہ بھی رہتے ہیں تو صرف عبادت پروردگار کے لئے میرا آغاز عبادت پروردگار سے ہے۔ میرا انجام عبادت پروردگار پر ہوگا۔ میری حیات کا مقصد ہی عبادت پروردگار ہے۔ میں آیا تو سجدہ کرتا ہوا۔ جاؤں گا تو سجدہ کرتا ہوا۔ کیا تم نے پہلے علیؑ کی زندگی نہیں دیکھی کہ

خاکِ کعبہ پر قدم رکھا تو سجدہ اور مسجد کو فہ میں مصلیٰ پر آئے تو سجدہ ـــ صلوات

زندگی اس شان سے گذری کہ محاضرات امام راغب میں یہ اعتراف نظر آیا کہ کسی خاندان میں فضائل و کمالات یوں سات پشت تک نہیں چلے۔ جس شان سے خاندان علیؑ بن ابیطالبؑ میں یہ کمالات زندہ و تابندہ رہے۔ علیؑ کو دیکھا تو وہی انداز، حسن مجتبیٰؑ کو دیکھا تو وہی انداز حسینؑ بن علیؑ کو دیکھا تو وہی انداز۔ علیؑ ابن الحسینؑ کو دیکھا تو وہی انداز محمدؑ بن علیؑ کو دیکھا تو وہی انداز۔ جعفرؑ بن محمدؑ کو دیکھا تو وہی انداز۔ موسیٰ بن جعفرؑ کو دیکھا تو وہی انداز اور علیؑ بن موسیٰ الرضا کو دیکھا تو وہی انداز اور میں تو کہوں گا کہ دنیا کی نگاہیں یہیں پر ٹھہر گئیں۔ ورنہ یہ نظر آگے بڑھ جاتی تو اگلی پشتوں میں بھی یہی انداز نظر آتا اور آخری منزل پر تو سارے کمالات یوں یکجا نظر آتے کہ نام بھی محمد اور کنیت بھی ابوالقاسم۔ اب خطبہ پڑھنے والا چاہے اول پر درود پڑھے چاہے آخر پر۔ یہاں اول و آخر کا کوئی فرق نہیں ہے۔ سب محمدؑ ہیں اور سب علیؑ ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ سب کے یہاں "برائے نام" فرق رہا ہے۔ یہاں تو برائے نام بھی فرق نہیں ہے ـــ صلوات

امام احمد بن حنبل نے اس زریں سلسلہ کو دیکھنے کے بعد کہا تھا کہ امام علیؑ رضا نے نیشاپور میں وہ زریں سلسلہ بیان کیا ہے کہ اگر یہ سلسلہ کسی دیوانے پر دم کر دیا جائے تو وہ عاقل ہو جائے گا۔

ارباب نظر دیکھا آپ نے دنیا اہلبیتؑ کے کمالات کو پہچانے یا نہ پہچانے امام حنبل پہچانتے ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ یہ سلسلہ دیوانوں کو عاقل بنا سکتا ہے

اب آپ سوچیں کہ جس کے نام میں یہ اثر ہو اس کے کمالات میں کیا اثر ہوگا۔ اور پھر یہ سوچیں کہ جو ایسے باکمال سلسلہ کے مورث اعلیٰ ہی پر دماغ کے بہکنے کا الزام لگائے وہ کتنا بڑا دیوانہ ہوگا کہ جب اسے ذات رسولؐ ہوشمند نہ بنا سکے تو نام رسولؐ کیا بنائے گا۔ اور جس پر نام رسولؐ کا اثر نہ ہوگا اس پر آلِ رسولؐ کا کیا اثر ہوگا۔ صلوات

امامؑ رضا کی زندگی کے چند چھوٹے چھوٹے واقعات کا نقل کرنا ضروری ہے تاکہ امین و مامون کے علم و فضل اور علم و اخلاق کا ڈھنڈورا پیٹنے والے مورخین بھی دیکھیں کہ حکومت کے اخلاق کو امامت کے اخلاق سے کیا نسبت ہے اور دونوں کے کردار میں کتنا نمایاں فرق ہے۔

تمہیدی طور پر یہ بات ذہن میں محفوظ رکھیں کہ کبھی کبھی عوام کے اعتراضات بھی حالات زمانہ کی ترجمانی کر دیا کرتے ہیں۔ سلاطین کو عیش و عشرت کی زندگی میں دیکھنے والا انسان اگر کسی کو فقر و فاقہ میں دیکھے گا تو ضرور اعتراض کرے گا کہ یہ کیسا سلطان اور کیسا بادشاہ ہے اور نبوت کو بوریہ نشین دیکھنے کے بعد تخت و تاج پر نظر ڈالنے والا انسان ضرور یہ سوال کرے گا کہ یہ کیسا وارث رسولؐ ہے جس کے کردار کا رسولؐ سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ تاریخ کے بے شمار مسائل اسی پس منظر میں حل کئے جا سکتے ہیں۔ اور اعتراضات کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ زمانہ کتنا منقلب ہو گیا تھا اور لوگ کس طرح کی زندگی کے عادی ہو گئے تھے ابھی آپ کے سامنے عرض کیا گیا کہ امام رضا علیہ السلام سے حدیث کا مطالبہ بتا رہا ہے کہ قوم لہجۂ رسولؐ سے کس قدر دور ہو گئی ہے اور انس کی للکار بتا رہی ہے کہ رسولؐ اکرم کے بعد نماز کی شکل کس قدر بدل گئی تھی ـــ

اسی روشنی میں امام رضاؑ کی زندگی کے چند واقعات کا تجزیہ کرنا ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ سلاطین دنیا نے امت کا مزاج کس قدر بگاڑ دیا تھا اور امامت نے اس مزاج کی اصلاح میں کس قدر زحمتیں برداشت کی ہیں۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ امام علیہ السلام اپنے غلاموں کے ساتھ بیٹھے ہوئے کھانا نوش فرما رہے تھے۔ ایک مرد بلخی یہ دیکھ کر حیران ہو گیا کہ کہاں امام اور کہاں غلام۔ یہ کون سی زندگی ہے اور یہ کون سا طریقہ ہے بھلا اس طرح کہیں امامت چل سکتی ہے۔ آگے بڑھا عرض کرتا ہے فرزند رسولؐ! کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ آپ ان کے کھانے کا انتظام الگ کر دیا کریں؟ آپ نے فرمایا بھائی تو نے اتنا بھی نہیں سوچا کہ ہم سب کا خدا ایک ہے۔ سب کے باپ آدم ہیں اور سب کی ماں حوا ہیں۔ فضیلت تقویٰ اور پرہیزگاری سے ہے۔ غلامی اور آزادی سے نہیں ہے —— تجھے یہ نہیں سوچنا چاہئے کہ کون غلام ہے اور کون آزاد۔ دیکھنا چاہئے کہ کس کا عمل کیسا ہے اور کس کا تقویٰ کس منزل پر ہے۔

میں کہوں گا قربان جائیے اس بندہ نوازی کے۔ یہی تو راز تھا کہ جس کو اس گھر کی غلامی مل گئی اس نے کبھی آزادی پسند نہیں کی۔

اسلام کے نظام غلامی پر اعتراض کرنے والے دیکھیں کیا دنیا میں کہیں آزاد افراد کے ساتھ بھی یہ برتاؤ کیا جاتا ہے۔ کیا کسی قوم کا راہنما یہ حوصلہ رکھتا ہے کہ اپنے سے کمتر طبقہ کے آزاد لوگوں کو اپنے دسترخوان کا شریک بنا سکے۔ نہیں ہرگز نہیں —— اور جب کسی میں یہ حوصلہ نہیں ہے تو ماننا پڑے گا کہ خدائی نمائندہ اور ہوتا ہے اور دنیا کا سلطان اور —— اسلام کی بدنامی دنیا کے سلاطین کی طرف سے آئی ہے۔ الٰہی نمائندوں کی طرف

سے نہیں۔

ایک موقع پر ایک شخص نے کہہ دیا کہ آپ کا کیا کہنا آپ تو آباء و اجداد کے اعتبار سے ساری کائنات سے افضل ہیں۔ آپ کی تیوریوں پر بل آ گئے۔ فرمایا بیشک ہم آباء و اجداد کے اعتبار سے ساری دنیا سے افضل ہیں لیکن یاد رکھ کہ ہمارے آباء و اجداد کی فضیلت اپنے آباء و اجداد کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ ان کی ساری فضیلت ان کے تقویٰ اور عمل سے ہے۔ اور نسل و نسب کے اعتبار سے تو میں اس حبشی غلام پر بھی فخر نہیں کرتا جو میرے سامنے بیٹھا ہوا ہے۔

امامؑ نے واضح کر دیا کہ ہماری آبائی شرافت بزرگوں کے اعمال و کردار کی بنا پر ہے۔ خبردار انھیں کردار سے عاری صرف بنی ہاشم نہ سمجھ لینا ہم اسی امتیاز کو مٹانے کے لئے آئے ہیں کہ نسلی تفریق کو شرافت کی بنیاد نہ بنایا جائے۔ اور ان تمام افراد کو اسلام کی قیادت سے الگ کر دیا جائے جو صرف اس لئے حکومت و ریاست پر قبضہ کرنا چاہتے تھے کہ کسی بڑے باپ کے بیٹے ہیں۔ اسلام میں بڑے باپ یا بڑے بیٹے کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ اسلام کردار چاہتا ہے اور مجھے کردار کے اعتبار سے یہ فخر حاصل ہے کہ جو کردار میرے آباء و اجداد کا تھا وہ تاریخ میں کسی خاندان کا نہیں رہا ہے۔ ہمیں کردار ہی نے سربلند بنایا ہے اور ہمارا کردار ہی ہے جس نے دنیا کی پیشانی کو ہماری بارگاہ میں جھکا دیا ہے۔ آج اگر یہ کردار نہ ہوتا تو سلاطین دنیا ہمیں زندہ نہ رہنے دیتے۔ یہ ہمارے کردار ہی کا اثر ہے کہ خون کے پیاسے بھی ہیں اور چوکھٹ پر حاضری بھی دیتے ہیں۔ قتل کے منصوبے بھی بناتے ہیں اور دامادی کے لئے انتخاب بھی کرتے ہیں۔ صلوات

امامت کے کردار کی روشنی میں ریاست کا مزاج بھی دیکھتے چلیں۔

۹ ذی الحجہ کی تاریخ تھی امامؑ نے اپنے گھر کا سارا اثاثہ راہ خدا میں قربان کر دیا تاکہ آنے والے دن میں غربا و فقراء کے گھر میں بھی عید ہو سکے اور انھیں بھی غذا و لباس نصیب ہو سکے۔ فضل بن سہل جو مامون کا وزیر مملکت تھا اور مدتوں سے ریاست کا مزاج دیکھ رہا تھا۔ بلکہ اسی مزاج میں رنگ گیا تھا ایک مرتبہ گھبرا کر کہتا ہے کہ یہ تو کوئی اچھا طریقہ نہیں ہے کہ انسان سارا سامان لٹا دے اور خود خسارہ میں رہے۔ آپ نے فرمایا بھائی تجھے خسارہ اور فائدہ کا اندازہ نہیں ہے۔ یہ تیرا خیال ہے کہ جو ہاتھ سے نکل جاتا ہے وہ خسارہ ہے۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو خزانۂ پروردگار میں جمع ہو جاتا ہے وہی فائدہ ہے۔ خسارہ نقصان کو کہتے ہیں اور خزانہ میں محفوظ ہو جانے والے کو خسارہ نہیں کہتے ــــ صلوات

آپ نے دیکھا کہ ریاست کے مزاج نے فضل کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔ اور امامت کے کردار نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ ریاست سے بیزاری کا یہ انداز ہے کہ وضو کرنے کے لئے تشریف فرما ہوئے ایک شخص نے لوٹا اٹھایا اور چاہا کہ پانی ڈال دے۔ فرمایا یہ کیا؟ عرض کی آپ وضو فرما رہے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کے ثواب میں شریک ہو جاؤں۔ آپ نے فرمایا خبردار۔ تجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ وضو کوئی کاروبار دنیا نہیں ہے یہ عبادت پروردگار ہے اور عبادت میں کسی کو شریک نہیں بنایا جا سکتا۔ یہاں اخلاص عمل شرط ہے۔ اور خلوص کے بغیر کوئی عمل نہیں ہو سکتا۔ یہ ہے امامت اور ریاست کا فرق۔ ریاست عبادات میں بھی ریاست کی شان دکھلانا چاہتی ہے اور امامت حکومت کو حکومت سمجھتی ہے اور عبادت

کو عبادت۔ اب جسے عبادت اور حکومت کا فرق ہی معلوم نہ ہو وہ اسلام کی نمائندگی کیا کرے گا۔ صلوات۔

حالات سے اندازہ کریں کہ ریاستوں نے قوم کے مزاج کو روح اسلام سے کس قدر دور کر دیا تھا۔ اور زندگی سے بندگی تک ہر مرحلہ پر کس طرح شان ریاست کا اظہار ہو رہا تھا اور یہاں غلاموں کو بھی تاکید تھی کہ اگر میں

مزدوری ہے۔ اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ حکومت کا مزاج یہ ہے کہ ہر حال میں ہمارا احترام کیا جائے اور امامت کا مزاج یہ ہے جو جس احترام کے لائق ہے اس کا اتنا ہی احترام کیا جائے۔ صلوات

مرتبہ ایک شخص ایک مزدور کو طے کئے بغیر لے آیا۔ آپ نے پوچھا اس کی اجرت کیا ہے؟ اس نے کہا کچھ طے نہیں کیا۔ یہ بھی ریاست کا ایک مزاج تھا کہ مزدوروں سے کام لے لیا جائے اور اس کے بعد جو چاہے دیدیا جائے۔ کس کی مجال ہے کہ حکومت کی صوابدید پر اعتراض کر سکے۔ امامؑ نے اپنے غلام کو ڈانٹ کر واضح کر دیا کہ حکومت کا مطلب کسی کی قوت و طاقت پر بلا سبب قبضہ کر لینا اور ساری ملت کو اپنا بندۂ بے دام سمجھ لینا نہیں ہے۔ حکومت الٰہیہ وہ ہے جو قوم کے حقوق کا تحفظ کر سکے۔ حقوق کو پامال کرنے والی حکومت الٰہی حکومت نہیں ہو سکتی۔

آپ نے فرمایا کہ مزدوری طے کئے بغیر مزدور سے کوئی کام نہیں لینا چاہئے۔ اس کا ایک دنیاوی فائدہ بھی ہے کہ اگر تم نے اجرت طے نہیں کی تو جس قدر بھی دیدو گے مزدور یہی سمجھے گا کہ کم دیا ہے اور اگر مزدوری طے کر لی ہے تو ایک درہم بھی اضافہ کر دوگے تو وہ خوش ہو جائے گا اور

دعائیں دے گا ــــ!

دنیائے معاشیات اس نکتہ پر غور کرے کہ امام نے تمام مزدور کے مسائل کو کس طـــرح حل فرمایا ہے اور دنیا پر واضح کر دیا ہے کہ صاحب اقتدار و ثروت کو اپنے اقتدار و ثروت سے غلط فائدہ اٹھانے کا حق نہیں ہے۔ آج دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے کہ مزدور کی رائے کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اور صاحبانِ دولت جس طرح چاہتے ہیں ان کے ساتھ معاملہ کرتے ہیں۔ امامت کے کردار نے واضح کر دیا کہ مزدور بھی دوسرے افراد کی طرح رائے رکھتا ہے۔ اور جب تک اس کی رائے نہ معلوم کرلی جائے اس سے کام لینے کا حق نہیں ہے۔ اور میں تو یہ عرض کروں گا کہ یہ امامت ہی کا کام ہے ورنہ وہ امت مزدور کی کیا قدر کرے گی جس نے رسولؐ سے کام لے کر ان کو اجرت نہیں دی ہے۔ مزدور کی قدر تو وہی جانتا ہے جو اجرت دینے کا مزاج رکھتا ہے۔ اور جو اجرت ہی نہیں دینا جانتا وہ کیا جانے کہ مزدور کی قدر و قیمت کیا ہے۔ یا واضح لفظوں میں یوں کہا جائے کہ جو محبت اہلبیتؑ کی قدر و قیمت جانتا ہے وہی اجرت کی قدر و قیمت جانتا ہے۔ اور جو محبت اہلبیتؑ کی قدر و قیمت نہیں جانتا وہ اجرت کی اہمیت بھی نہیں جانتا۔ صلوات

ظاہر ہے کہ جو امام علیہ السلام دنیا کے حالات و مسائل پر اتنی گہری نگاہ رکھتا ہے اور یہ نہیں چاہتا کہ روئے زمین کے کسی باشندہ کا حق مارا جائے وہ اپنے چاہنے والوں کو کس طرح نظر انداز کر سکتا ہے۔ چنانچہ قدم قدم پر انہیں بھی ہدایت دی اور سمجھایا کہ دیکھو اس دنیا میں اس طرح زندگی گذاری جاتی ہے اور یہ کردار اختیار کیا جاتا ہے۔

ایک مرتبہ آپ خرمے نوش فرما رہے تھے۔ کسی نے کہا فرزند رسولؐ! آپ خرمے کو بہت دوست رکھتے ہیں۔ فرمایا کیسے دوست نہ رکھوں اسے رسول اکرمؐ مولائے کائناتؑ اور ائمۂ طاہرینؑ نے پسند فرمایا ہے۔ اب یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ حضرات محبت کریں اور میں نہ کروں۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ ہم شراب کو دوست نہیں رکھتے۔ اس لئے کہ وہ آگ کی مخلوق ہے۔ ایسی مخلوق کی محبت ہمارے دشمنوں کو زیب دیتی ہے۔ خرمہ پسند کرنا ہمارے شیعوں کا کام ہے اور شراب کو دوست رکھنا ہمارے دشمنوں کا کردار۔

کتنے حسین انداز سے دونوں مسائل کی طرف اشارہ کر دیا کہ خرمہ کی فضیلت بھی بیان ہو گئی اور شراب کی خباثت اور رذالت کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا۔

خرمہ کا ذکر آ گیا ہے تو آپ ہی کے ایک اور واقعہ کی طرف اشارہ کر دوں۔ ایک شخص نے مرسلِ اعظمؐ کو خواب میں دیکھا کہ مسجد میں تشریف فرما ہیں اور آپ کے سامنے خرمے کا ایک طبق رکھا ہے۔ اس نے بڑھ کر عرض کی یا رسول اللہؐ کچھ مجھے بھی عنایت فرمایئے۔ آپ نے ایک مٹھی خرمے دیدیئے۔ اس نے شمار کیا تو اٹھارہ تھے۔ آنکھ کھل گئی تو کافی دیر تک غور کرتا رہا کہ اس خواب کا مطلب کیا ہو سکتا ہے۔ مرسل اعظمؐ کے بدلے خواب میں کوئی نہیں آسکتا اور حضورؐ آئے تو ۱۸ ہی خرمے کیوں عنایت فرمائے۔ شاید میری زندگی میں ۱۸ دن اور باقی ہیں یہ کہہ کر یادِ موت کی طرف متوجہ ہو گیا۔

ان کل ایسے مسلمان پیدا ہوتے تھے کہ انہیں مبارک مواقع پر بھی موت یاد آتی تھی۔ آج تو اللہ کا فضل ہے۔ آج کوئی مسلمان ایسا خواب دیکھے تو انشاء اللہ یہی تعبیر دے گا کہ حضورؐ تشریف لائے ہیں تو ۱۸ لاکھ۔ ۱۸ کروڑ ضرور دے جائیں گے۔ اس سے کم پر معاملہ نہیں ہو سکتا۔ بھلا سرکار کے قدم

آئیں اور اس سے کم برکت ہو یہ کیسے ممکن ہے۔

بہرحال وقت گذرتا رہا۔ چند دنوں کے بعد یہ خبر مشہور ہوئی کہ فرزند رسولؐ امام علی رضاؑ مدینہ سے مرو تشریف لے جا رہے ہیں اور اپنے شہر کی مسجد میں تشریف فرما ہیں۔ یہ دوڑ کر حضرت کی خدمت میں گیا۔ اس سے بہتر موقع تعبیر خواب کا نہیں ہو سکتا تھا۔ اپنے جد کے خواب کو فرزند سے بہتر کون بیان کر سکتا ہے۔ اب جو مسجد میں آیا تو کیا دیکھا کہ حضرت محراب میں تشریف فرما ہیں اور بالکل اسی طرح تشریف فرما ہیں جس طرح رسول اللہؐ کو خواب میں دیکھا تھا۔ سامنے ایک خرمہ کا طبق بھی رکھا ہے۔ آگے بڑھا اور عرض کی فرزند رسولؐ! کچھ مجھے بھی عنایت فرمائیں۔ آپ نے ایک مٹھی خرمے عنایت کر دیئے۔ اب جو اس نے شمار کیے تو اٹھارہ تھے۔ سخت حیرت ہوئی کہ جیسا خواب دیکھا تھا ویسی ہی تعبیر ملی۔ عرض کرتا ہے۔ فرزند رسولؐ کچھ اور عنایت فرمایئے۔ آپ نے فرمایا اگر رسول اللہؐ نے خواب میں زیادہ دیئے ہوتے تو میں بھی زیادہ دے دیتا۔ لیکن جب رسول اللہؐ نے اتنے ہی دیئے ہیں تو میں زیادہ کیسے دے سکتا ہوں۔ صلوات

یہ ہے امامت کا کردار نبوت کے کردار سے کتنا ملتا جلتا کردار ہے۔ دنیا بیداری میں مشابہت کی کوشش کرتی ہے اور نہیں کر پاتی۔ انداز میں فرق ہو جاتا ہے۔ اور یہاں خواب میں یہ عالم ہے کہ جو رسول اللہؐ نے کیا وہی فرزند نے کیا۔

واقعہ پر غور کریں تو اور بہت سے مسائل حل ہوتے نظر آتے ہیں۔ ایک پریشان انسان کو خواب کی تعبیر مل گئی۔ ایک زائر امامؑ کو بہترین خرمے مل گئے اور میں تو کہوں گا کہ زائر امامؑ تجھے اپنے خواب پر ناز کرنا چاہیئے کہ اب جو تعبیر

خواب ملی تو ہم خرما اور ہم ثواب ـــــ اور شاید اس مثل کا اس سے بہتر کوئی مصداق کبھی نہ ہو سکے گا۔ صلوات

دوسری طرف امامؑ نے یہ بھی واضح کر دیا کہ ہمارا علم اتنا وسیع ہے کہ تم جو کچھ خواب میں دیکھتے ہو وہ بھی ہمارے علم میں رہتا ہے۔ ایک طرف وہ دنیا کے نمائندے ہیں جنھیں بیداری کی بھی خبر نہیں ہے۔ اور ایک طرف وہ الٰہی نمائندے ہیں جو خواب تک کی اطلاع رکھتے ہیں۔ انصاف سے بتائیں کہ رب العالمین اپنا نمائندہ بنانا چاہے تو کسے بنائے گا۔ اور امت کو صحیح ہدایت دے گا تو کون دے گا۔ صلوات

فرزند رسولؐ نے یہ بھی واضح کر دیا کہ ہمارے اور مرسل اعظمؐ کے کردار میں کوئی فرق نہیں ہے۔ جو انھوں نے کیا وہ ہم نے کیا اور جو انہوں نے نہیں کیا وہ ہم نے بھی نہیں کیا اور یاد رکھو عمل و کردار کی منزل تو بہت بلند ہے۔ ہمارے یہاں تو ہاتھوں میں بھی اتنی یکسانیت ہے کہ جتنے خرمے انکی مٹھی میں آئے تھے اتنے ہی خرمے میری مٹھی میں آئے۔ دیکھا تم نے اتحاد عمل و کردار۔ اتحاد حیات و صفات اور کیوں نہ ہوتا بشری ہاتھ ہوتا تو سانچے میں فرق آجاتا۔ جب دونوں ہاتھ یداللہ ہیں تو جو ایک کا انداز ہوگا وہی دوسرے کا انداز ہوگا۔ اور ارباب کرم یاد رکھیں جب امامت اور رسالت کے ہاتھوں میں اتنا اتحاد ہے تو ناممکن ہے کہ جس کی بیعت رسول اللہ نہ کریں اس کی بیعت کوئی امامؑ کر لے۔ بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ امامت سے بیعت کا مطالبہ درحقیقت رسالت سے بیعت کا مطالبہ ہے اور یہ کسی طرح اسلام کی دلیل نہیں بن سکتا۔

ـــــ صلوات

واقعہ سے ایک بات یہ بھی واضح ہو گئی کہ خواب دیکھنے والے نے

تعبیر لی تو امام وقت سے یعنی اسے رسولؐ کا عطیہ ملا تو امام وقت کے ہاتھوں سے اور امام وقت نے بھی اس سے زیادہ نہیں دیا۔ جتنا رسول اکرمؐ نے عنایت فرمایا تھا گویا امام نے واضح کر دیا کہ ہم میں اور ہمارے جد میں اتنا اتحاد ہے کہ جو ان سے ملے گا وہ ہم سے ملے گا اور جو ان سے نہ ملے گا وہ ہم سے بھی نہ ملے گا۔ اب نہ کوئی انھیں چھوڑ کر ہم سے کچھ پا سکتا ہے اور نہ ہمیں چھوڑ کر ان سے کچھ پا سکتا ہے۔ صلوات

تاریخ کائنات میں ایسا اتحاد دیکھنے میں نہیں آیا اور نہ آسکتا ہے امام راغب نے سچ کہا ہے کہ اس طرح سات پشتوں تک کمال و کردار میں یکسانیت برقرار رہ جائے۔ یہ سوائے خاندان علیؑ ابن ابیطالبؑ کے کہیں نہیں دیکھا گیا ہے۔

اتحاد کردار کی گفتگو آگئی ہے تو خاتمہ کلام میں ایک نکتہ کی طرف اور اشارہ کر دیا جائے۔ ماہ رمضان میں امام رضاؑ علیہ السلام کے دست مبارک پر بیعت ہوئی اور مامون رشید نے آپ کو اپنا ولی عہد مملکت بنایا۔ سارے ملک میں شہرہ تھا کہ فرزند رسولؐ ولی عہد ہو گئے ہیں۔ بنی عباس جلے بھنے جا رہے تھے کہ مدتوں کی ریاضت خاک میں مل رہی ہے۔ مومنین مخلصین خوشی سے پھولے نہیں سماتے تھے کہ اب امامؑ کو منظر عام پر آنے کا موقع ملے گا۔ اور ان سے کچھ دین و شریعت کے مسائل معلوم کریں گے یوں ہی وقت گذرتا رہا کہ عید کا دن آگیا۔ بادشاہ وقت نے پیغام بھیجا کہ آج عید کی نماز آپ پڑھائیں گے تاکہ دنیا دیکھ لے کہ ہم نے آپ کو ولی عہد بنا دیا ہے۔ آپ نے بادشاہ کی درخواست کو منظور کر لیا اور جب نماز کا وقت آیا تو آپ پورے اہتمام و انتظام کے ساتھ بیت الشرف سے برآمد ہوئے۔ عمامۂ رسولؐ سر پر جلالت

علوی چہرہ سے نمایاں۔ حسنی اخلاق۔ حسینی صبر۔ عابدی انداز، باقری وجاہت، صادقی عظمت، موسوی ہیبت لئے ہوئے۔ اُدھر حکومت نے بھی فرمان جاری کر دیا ہے کہ عمائد مملکت پورے اہتمام کے ساتھ امامؑ کو عیدگاہ کی طرف لے جائیں۔ دولت سرا کے دروازہ پر حکومت کے نمائندوں کا ہجوم ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۳۵ھ کا زمانہ پلٹ آیا ہے۔ اور مسلمان علیؑ کی ڈیوڑھی پر بیعت کرنے کے لئے آئے ہیں۔ بیت الشرف سے برآمد ہوئے۔ رسولؐ اکرم کا انداز، مولائے کائنات کے تیور، مسلمانوں کا مجمع۔ اراکین سلطنت کا انتظام۔ نعرۂ تکبیر کی آوازیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر پر امامؑ کی تکبیر۔ مجمع کی تکرار۔ مسلمانوں کا اشتیاق۔ انداز رسالت دیکھ کر بے ساختہ گریہ۔ فضل بن سہل نے یہ عالم دیکھا تو فوراً اطلاع دی کہ بادشاہ سلامت! آپ کہاں بیٹھے ہیں۔ علیؑ بن موسیٰ الرضاؑ نے نماز پڑھا دی تو حکومت کا نقشہ ہی بدل جائے گا۔ ذرا مسلمانوں کا ہیجان تو دیکھئے۔ ایک قیامت کبریٰ برپا ہے۔ گریہ و بکا کی آوازیں بلند ہیں۔ تکبیر کے نعرے گونج رہے ہیں —— مامون نے فوراً پیغام بھیجا کہ حضور زحمت نہ کریں میں خود ہی نماز پڑھا دوں گا۔ آپ کو تکلیف ہوگی۔ امام علیہ السلام واپس چلے آئے۔

کوئی دوسرا انسان ہوتا تو حالات کو سازگار دیکھ کر انقلاب کا نعرہ لگا دیتا لیکن یہ امامؑ ہی کا کردار تھا کہ اپنے عمل کی اہمیت ظاہر کر دی اور واپس چلے آئے اور واضح کر دیا کہ مامون دیکھ لے سروں پر حکومت کرنا آسان ہے۔ دلوں پر حکومت کرنا مشکل ہے۔ یہ صرف آل محمدؐ کا حصہ ہے۔ قید خانہ میں بھی رہیں تو دلوں پر قبضہ رہے گا دنیا نے بھی اندازہ کر لیا کہ رسولؐ کا انداز آل رسولؐ کے سوا کہیں اور نہیں مل سکتا۔ اور میں تو سمجھتا ہوں کہ علیؑ کی تاریخ

دہرا دی گئی ۔ رسولؐ کے بعد علیؑ نے نماز پڑھائی تھی تو امت نے آواز دی تھی کہ رسولؐ کا انداز یاد آگیا۔ اور دو سو برس کے بعد فرزند رسولؐ علیؑ بن موسیٰ الرضاؑ بیت الشرف سے برآمد ہوئے تو دنیا نے پکار کر کہا رسولؐ کے وارث وارث یہ ہیں۔ حکومت لینا آسان ہے رسالت کا کردار لینا مشکل ہے اور یہ کام صرف علیؑ کا ہے وہ علی الرضاؑ ہوں یا علی مرتضیٰؑ ہوں ـــــ صلوات

امام محمد تقی علیہ السلام

اسم مبارک	محمد
لقب	تقی ۔ جواد
کنیت	ابو جعفر
والد ماجد	امام علی الرضاؑ
والدۂ ماجدہ	جناب سبیکہ
ولادت	۱۰ رجب المرجب ۱۹۵ھ (جمعہ) مدینہ منورہ
شہادت	۲۹ ذیقعدہ ۲۲۰ھ سہ شنبہ
عمر مبارک	۲۵ سال
قبر مطہر	کاظمین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ اشرف الانبیاء والمرسلین وخاتم النبیین سیدنا ومولانا ابی القاسم محمد و آلہ الطیبین الطاہرین ولعنۃ اللہ علیٰ اعدائہم اجمعین۔

امابعد فقد قال اللہ الحکیم فی کتابہ الکریم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

إِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدَىٰ وَإِنَّ لَنَا لَلْآخِرَةَ وَالْأُولَىٰ

بیشک ہدایت کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے اور دنیا و آخرت کا اختیار ہمارے ہاتھوں میں ہے۔

مالک کائنات کا یہ ارشاد گرامی اشارہ کر رہا ہے کہ اس نے ہر دور ہر زمانہ میں انسانیت کی ہدایت و رہنمائی کے لئے انتظامات کئے ہیں۔ اور کوئی دور ایسا نہیں چھوڑا کہ جب ہدایت لینے والے رہے ہوں اور ہدایت دینے والا نہ رہا ہو۔ اس کا انتظام ہدایت اتنا پختہ اور مکمل رہا ہے کہ جس طرح بھی انسان راہ راست پر آنے کے لئے تیار ہوا ہے۔ اس نے اسی طرح کا انتظام کیا ہے۔ اگر کمالات و فضائل دیکھ کر ایمان لانے والا ہوا تو انبیاء و مرسلین کو کمالات و فضائل کا مرکز بنا دیا۔ اور اگر معجزات و آیات کے ذریعہ ایمان لانے والا ہوا تو اولیاء الٰہی کے ہاتھوں پر معجزات ظاہر کر دیئے اس کا منشاء یہ تھا کہ انسان صراط مستقیم سے بھٹکنے نہ پائے اور کسی نہ کسی طرح راہ ہدایت پر آجائے۔ اب یہ انسان کی بدنصیبی ہے کہ وہ خدائی انتظام سے فائدہ نہ اٹھائے ورنہ قدرت نے اپنے انتظام میں کوئی نقص اور کوئی کوتاہی نہیں رکھی ہے ـــــــ اور یہ تاریخی حقیقت ہے کہ ہر دور میں ایسے بدنصیب افراد پیدا ہوتے رہے ہیں جنھوں نے خدائی انتظام سے کوئی

فائدہ نہیں اٹھایا اور بدبختی کی زندگی گذارتے رہے۔ قابیل کون تھا؟ جناب آدم ہی کا بیٹا تھا۔ لیکن ایسا بدنصیب کہ باپ کی ہدایت سے فائدہ نہ اٹھا سکا اور بالآخر قاتل بن کر ملعون ہو گیا۔

کنعان کون تھا؟ جناب نوح کا فرزند ہی تو تھا۔ لیکن نتیجہ کیا ہوا۔ باپ کی ہدایت سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ اور بالآخر غرق ہو گیا ـــــــ نالائق بھی کیسا کہ باپ آواز دے رہا ہے کہ سفینہ پر آجا۔ سفینہ کے علاوہ کوئی نجات دینے والا نہیں ہے اور وہ کہہ رہا ہے کہ مجھے پہاڑ بچائے گا۔ سفینہ کی ضرورت نہیں ہے۔ نہ جانے کیا بدبختی تھی کہ سفینہ کو چھوڑ کر یاد بھی آیا تو پہاڑ ہی یاد آیا اور نبی خدا نے واضح کر دیا کہ جس نے سفینہ کو چھوڑا اسے پہاڑ بھی نہیں بچا سکتا۔ اور ایسا ڈوبے گا کہ پہاڑ کو بھی لے ڈوبے گا۔

بات فقط نوح کے بیٹے اور پہاڑ کی نہیں ہے۔ یہ قدرت کا اشارہ ہے کہ ہمارے وسیلہ نجات کو چھوڑا اور تباہی آئی۔ ہلاکت سے بچنا ہے تو اس وسیلہ کو اختیار کرو جو ہم نے معین کیا ہے۔ ورنہ ہمارے والے کو چھوڑ کر نبی کا بیٹا بھی نہیں بچ سکا تو نبی کا کلمہ گو کیا بچ سکے گا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان نے ہر دور میں الٰہی ہدایت کا انکار کیا ہے اور اپنے ہاتھوں اپنے کو ہلاکت میں ڈالا ہے۔

جناب نوح اور جناب لوط کی زوجہ کون تھیں۔ دو نبیوں کی بیویاں ان سے زیادہ حسین ماحول ہدایت کا کس کے لئے ہو سکتا ہے لیکن شوہر پر اعتماد نہ کیا۔ خیانت کی اور نتیجہ یہ ہوا کہ تباہ ہو گئیں۔ اور ایسی تباہ ہوئیں کہ قرآن مجید نے بھی اعلان کر دیا کہ انھیں زوجیت سے کوئی فائدہ نہیں پہونچا ـــــــ نبی کی زوجہ ہیں لیکن خدائی انتظام سے انکار کر دیا تو ہلاکت کے

سوا کچھ ہاتھ نہیں آیا۔ مسئلہ نبی کے بیٹے یا نبی کی زوجہ ہونے کا نہیں ہے۔ مسئلہ انتظام ہدایت کا ہے۔ ہدایت الٰہی پر ایمان لے آئے تو غیر بھی نجات کے حقدار ہو گئے۔ اور ہدایت الٰہی سے الگ ہو گئے تو اپنے بھی غرق کر دینے کے قابل ہو گئے۔

جناب نوحؑ و جناب لوطؑ کے بعد بھی بے شمار مثالیں ملیں گی۔ جہاں اہل دنیا نے خدائی ہدایت سے فائدہ نہیں اٹھایا۔

قارون کون تھا، جناب موسیٰؑ کا عزیز ہی تو تھا۔ لیکن نتیجہ کیا ہوا بالآخر زمین میں دھنس گیا۔

برادران یوسف کون تھے، جناب یعقوبؑ کے فرزند ہی تو تھے لیکن نتیجہ کیا ہوا، نمائندہ پروردگار سے انحراف کیا اور تباہی کے گھاٹ اتر گئے۔ یہ تو نبی خدا کا کرم تھا کہ انھوں نے خطا معاف کر دی ورنہ تباہ ہونے میں کوئی کسر نہ تھی۔ اور یہ قدرت کا اعلان آج بھی ہے کہ ہمارے نظام سے انکار کر دیا ہے تو مایوس نہ ہونا توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ اب بھی ہمارے ہادیوں کے قدموں میں آجاؤ۔ ہم معاف کرنے کے لئے تیار ہیں۔ پیغمبر اکرمؐ سے خطاب کر کے یہی تو کہا گیا تھا کہ اگر خطاکار انسان ہم نے توبہ کرنا چاہے اور آپ کو ذریعہ بنائے تو ہم بھی توبہ قبول کرنے کے لئے تیار ہیں۔

نظریہ دیکھنا ہو تو نبیؐ کے دربار میں آؤ اور عمل دیکھنا ہو تو حسینؑ کی بارگاہ میں آؤ۔ حُر نے واضح کر دیا کہ کسی کو توبہ کرنا آتا ہو یا نہ آتا ہو حسینؑ والوں کو آتا ہے۔ اور امام حسینؑ نے واضح کر دیا کہ کسی کو وسیلہ کی قدر ہو یا نہ ہو حر کو وسیلہ کی قدر ہے۔ اسی لئے تو میں نے جہنم کے راستے پر چلنے والے کو جنت کی طرف کھینچ لیا۔ اور لعنت و ملامت کی راہ میں چلنے والے کو عصمت کے سلام کا

حقدار بنا دیا۔

عزیزانِ محترم! گذارش یہ ہے کہ ہر دور میں ہدایت الٰہی سے انحراف کرنے والے پیدا ہوتے رہے اور طرح طرح سے انحراف کرتے رہے۔ آیات و معجزات فضائل و کمالات میں کوئی نقص نہیں پایا تو معجزہ ہی کو نقص قرار دیدیا۔۔۔ معجزہ پر جادو کے الزام کے کیا معنی ہیں۔ انسان یہی تو بتانا چاہتا ہے کہ ہمیں ان کے کردار میں نقص نہیں ملا۔ ان کے کمالات ہماری دسترس سے بالاتر تھے۔ ان کے فضائل ہماری سمجھ سے اونچے تھے۔ ہمارے لئے ایک ہی راستہ تھا کہ ہم فضیلت ہی کو نقص قرار دیدیں۔ اور معجزہ ہی کو جادو کا نام دیدیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے اس کی مثال خود آپ کو تاریخ اسلام میں بھی مل جائے گی۔ سرکار دو عالمؐ چاند کے ٹکڑے کر رہے ہیں۔ اور کفار جادو کہہ رہے ہیں۔ آپ تھوڑے سے کھانے سے ساری قوم کو سیر و سیراب کر رہے ہیں۔ اور قوم جادوگر بتا رہی ہے۔ اور اب جو یہ سلسلہ کفر سے اسلام تک آیا تو نوبت یہ آگئی کہ قرآن حالت رکوع میں زکوٰۃ دینے کی مدح کر رہا ہے۔ اور مسلمان رکوع کے صحیح ہونے کی بحث کر رہے ہیں۔ اللہ سورۂ دہر نازل کر رہا ہے۔ اور یہاں یہ بحث ہو رہی ہے کہ فاقے کر کے راہ خدا میں روٹیاں دینا صحیح ہے یا نہیں ۔۔۔ ادھر سے نجویٰ کی آیت نازل ہو کر خیرات کی مدح کر رہی ہے۔ ادھر یہ بحث ہو رہی ہے کہ علیؑ نے جلدی کر کے دوسروں کو عمل کرنے کا موقع نہیں دیا۔ اور حکم آیت کو منسوخ کرا دیا ۔۔۔ پوچھئے کس نے جناب کو منع کیا تھا۔ آپ ہی نے پہلے عمل کر لیا ہوتا اور علیؑ محروم رہ جاتے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہاں عمل کس کو کرنا ہے۔ یہاں تو صرف اعتراض سے غرض ہے اور اس کا سلسلہ جاری رکھنا ہے۔ قدرت

نے بھی کہہ دیا کہ تم اعتراض کرتے جاؤ ہم فضیلتیں دیتے جائیں گے۔ تم نقص نکالتے جاؤ ہم آیتیں نازل کرتے جائیں گے ——— ہم نے بھی کہا کہ خدا کا شکر ہے کہ اہل دنیا نے اعتراض تو کیے کم از کم اتنا تو فائدہ ہوا کہ آیتوں نے نازل ہو کر دنیا والوں کی حیثیت بھی واضح کر دی اور آل محمدؐ کے کمال پر روشنی بھی ڈال دی ورنہ یہ فضائل پردۂ راز ہی میں رہ جاتے۔

یاد رکھو جو صرف عیب نکالنے والے ہوتے ہیں وہ دنیا دار ہوتے ہیں اور جن کی شان میں آیتیں نازل ہوتی ہیں۔ وہ اللہ والے ہوتے ہیں۔

ہنر کو عیب اور کمال کو نقص بنانے کا سلسلہ یہاں تک پہونچا کہ جب جناب عیسیٰؑ کی ولادت ہوئی تو قوم نے ان کے نسب ہی پر اعتراض کر دیا۔ قدرت نے اپنے کرم خاص سے انھیں بغیر باپ کے پیدا کر کے روح اللہ اور کلمۃ اللہ بنایا تھا اور یہاں روح اللہ ہونا ہی غضب ہو گیا ——— اور طرح طرح کی بحثیں شروع ہو گئیں۔ مریم تمھارے ماں باپ میں کسی کا کردار خراب نہیں تھا۔ آخر یہ بغیر شوہر کا بچہ کیسا؟ مریم نے بھی طے کر لیا کہ جواب جاہلاں باشد خموشی۔ فرمادیا میں نے روزہ کی نذر کر لی ہے میں بات نہیں کر سکتی۔ جو کچھ پوچھنا ہو اس گہوارے کے بچے سے پوچھو۔ قوم حیرت میں پڑ گئی۔ بھلا گہوارے کے بچے سے کیسے گفتگو کی جائے۔ ایک مرتبہ گہوارے سے آواز آئی میں اللہ کا بندہ ہوں۔ مجھے کتاب دی گئی ہے اور نبی بنایا گیا ہے۔ مجھے نماز اور زکوٰۃ کی وصیت کی گئی ہے مجھ سے ماں کے ساتھ نیک برتاؤ کرنے کے لئے کہا گیا ہے۔ میں کوئی ظالم وجابر اور بدنصیب نہیں ہوں۔

عیسیٰؑ نے کلام کر کے بتا دیا کہ اللہ والے بچپن ہی سے صاحب کمالات

ہوتے ہیں۔ ان کے کمالات سن و سال کے پابند نہیں ہوتے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی واضح کر دیا کہ دنیا والوں کا مزاج یہ ہے کہ جب پروردگار کسی کو کوئی ایسا کمال دیتا ہے جو ان کے بس میں نہیں ہوتا تو یہ کمال کا اعتراف کرنے کے بجائے کمال ہی کو نقص سمجھنے لگتے ہیں۔

تاریخ اسلام کا عظیم ترین واقعہ جس کی کائنات میں کوئی نظیر نہیں ہے اور نہ دوسری امتوں میں اس کی مثال پیدا ہوئی ہے۔ مولائے کائنات کی خانۂ کعبہ میں ولادت ہے مگر خدا بُرے کرے عداوت اور تعصب کا کہ اسے بھی فضیلت کے بجائے منقصت اور عیب کا رخ دینے کی کوشش کی گئی۔ کس قدر شرم کی بات ہے کہ مالک کائنات اپنے گھر میں جگہ دے اور اس کے بندے اس فضیلت کو عیب شمار کریں۔ کہا یہ گیا کہ فاطمہؑ بنت اسد رسم عرب کے مطابق بتوں سے دعا کرنے آئی تھیں۔ اتفاق سے حضرت علیؑ کی ولادت ہو گئی۔ یہ کوئی فضیلت کی بات نہیں ہے۔ یہ تو انتہائی عیب کی بات ہے کہ وحدہٗ لاشریک کے ہوتے ہوئے انسان بتوں سے دعا مانگے۔

——— میں کہوں گا کہ ان بحثوں کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ تو بعد کا مسئلہ ہے کہ دعا کس سے کی گئی اور دعا کے الفاظ کیا ہیں۔ اس کا فیصلہ تو وہ کریں گے جو تاریخ و حدیث پر نظر رکھتے ہیں۔ اور حقائق سے باخبر ہیں۔ ایسے جاہل ان باتوں کا فیصلہ نہیں کر سکتے۔ ان سے تو صرف اتنا ہی کہنا ہے کہ اگر دعا بتوں سے کی گئی تھی تو دیوارِ کعبہ میں در کس نے بنایا تھا؟ در کو دوبارہ بند کس نے کیا تھا؟ قفلِ در کو کھلنے سے روک کس نے دیا تھا؟ تین دن کے بعد دوبارہ دیوار کو شق کس نے کیا تھا؟ تین دن تک جناب فاطمہ بنت اسد کے لئے رزق کس نے فراہم کیا تھا؟ ولادت کے سارے انتظامات

کس نے کئے تھے۔ کیا یہ سب کام بھی بتوں نے ہی انجام دیئے تھے۔ اگر بتوں نے انجام دیئے تھے اور ان میں اتنی طاقت ہے تو یہ اسلام آپ کو مبارک ہو جو فضیلت علیؑ کا اقرار نہ کر سکے اور بتوں کے اقتدار و اختیار کا اقرار کرے اور میں سمجھتا ہوں کہ ان بیچاروں کو یہی سوچنا بھی چاہیئے۔ اس لئے کہ جن لوگوں نے مدتوں بت پرستی کی ہے وہ بت شکن کے کمالات کیا جانیں اور اگر یہ کام بتوں کا نہیں ہے تو وہ کون ہے جو بتوں کے بندوں کے لئے ایسا انتظام کرتا ہے۔ اور اپنے بندوں کے لئے کچھ نہیں کرتا۔ ماننا پڑے گا کہ کوئی عظیم طاقت ہے جس نے بنت اسد کو بلایا تھا۔ اسی نے دیوار کعبہ میں در بنایا تھا۔ اسی نے مہمان کیا تھا۔ اسی نے رزق کا انتظام کیا تھا۔ اسی نے ولادت کی مشکل آسان کی تھی اسی نے علیؑ کو مولود کعبہ بنایا تھا۔ اسی نے اپنے اس بندے کو ساری کائنات سے بالاتر فضیلت کا مالک بنایا تھا۔ دنیا قبول کرے یا نہ کرے رب العالمین نے علیؑ کو شرف دے دیا اور شرف دے کر یہ واضح کر دیا کہ اب علیؑ سے اختلاف، علیؑ سے اختلاف نہیں ہے بلکہ مجھ سے اختلاف ہے۔ اور یاد رکھو دشمن علیؑ کو تو تم مسلمان کہہ سکتے ہو لیکن میرے دشمن کو مسلمان نہیں کہہ سکتے۔

ارباب کرم اس مقام پر ایک بات اور کہنے کو جی چاہتا ہے کہ جناب فاطمہؑ بنت اسد پر یہ اعتراض صرف اس لئے پیدا کر دیا گیا کہ خانہ کعبہ میں بت موجود تھے۔ یہ کعبہ بیک وقت خانہ خدا بھی تھا اور بت خانہ بھی ——— ورنہ اگر بت نہ ہوتے تو اس اعتراض کی گنجائش بھی نہ ہو سکتی کہ دشمن کو یہ موقع بتوں کی موجودگی سے مل گیا ہے تو اب مجھے کہنا ہے کہ اگر کہیں یہ بت باقی رہ جاتے تو آج یہ

اعتراض عالمگیر ہو جاتا اور ہر مسلمان کی نماز، ہر مسلمان کا سجدہ مشکوک ہو جاتا کہ اس نے خدا کے گھر کا سجدہ کیا ہے یا بت خانہ کا۔ معبود حقیقی کے سامنے سر جھکایا ہے یا اصنام باطل کے سامنے۔ یہ تو اس آنے والے کا احسان ہے کہ اس نے خانہ کعبہ میں قدم رکھ کر اسے بتوں سے پاک کر دیا اور تمام مسلمانوں کے سجدوں کو شرک سے بچا لیا۔ تو اب مجھے کہنے دیجئے کہ جب تک اسلام میں نمازیں ہوتی رہیں گی۔ جب تک مسلمانوں کے سجدے ہوتے رہیں گے علیؑ کا یہ احسان سلامت رہے گا کہ علیؑ نے اللہ کے گھر کو بتوں سے پاک کر کے تمام مسلمانوں کے سجدوں کی آبرو بچالی۔ دنیا نے چاہا تھا کہ بنت اسد پر شرک کا الزام لگائے۔ قدرت نے یہ انتظام کیا کہ ہر سجدہ کو بنت اسد کا ممنون کرم بنا دیا۔ اب آپ کو اختیار ہے چاہے اسے علیؑ کا احسان کہیں یا بنت اسد کے فرزند کا احسان کہیں یا ابوطالب کے لال کا احسان کہیں کہ اس نے سجدہ کو سجدہ بنایا ہے۔ نماز کو نماز بنایا ہے۔ قربانی کو قربانی بنایا ہے اور ایمان کو ایمان بنایا ہے۔ صلوات

مالک کائنات نے ہر دور میں انتظام ہدایت کیا ہے اور دنیا والوں نے ہر دور میں اس انتظام کی مخالفت کی ہے۔ اور اللہ والوں کے کمال کو نقص کا رنگ دینا چاہا ہے۔ اسی لئے تو قرآن حکیم نے روز اول ہی ہدایت کی شان بیان کر دی تھی کہ میں بھی خدا کی طرف سے ہدایت کے لئے آیا ہوں لیکن یاد رکھو مجھ سے ہر شخص کو فائدہ نہیں ہو سکتا "وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِينَ" ہم نے اس قرآن کو شفا و رحمت بنا کر نازل کیا ہے۔ صاحبان ایمان کے لئے یعنی یہ قرآن شفا بھی ہے اور رحمت بھی ہے لیکن صرف ان افراد کے لئے جو صاحبان ایمان ہیں ہے ایسا

کو اس قرآن سے کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔

دوسری منزل پر اعلان ہوتا ہے "هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ" یہ قرآن ہدایت ہے ان صاحبان تقوی کے لئے جو غیب پر ایمان رکھنے والے ہیں۔ یعنی قرآن ہدایت و رہنمائی ہے۔ مگر صرف ان لوگوں کے لئے جو صاحبان تقوی ہیں اور غیب پر ایمان رکھنے والے ہیں۔

قدرت نے واضح کر دیا کہ ہم نے ہر دور میں ہدایت کا انتظام کیا ہے لیکن ہماری ہدایت سے وہی افراد فائدہ اٹھاتے ہیں جو صاحبان ایمان ہوتے ہیں۔ صاحبان تقوی ہوتے ہیں۔ صاحبان کردار ہوتے ہیں۔ غیب پر ایمان رکھنے والے ہوتے ہیں۔ ظاہر کے جلووں میں گم نہیں ہو جاتے ہیں بلکہ ظاہر کے پردے ہٹا کر غیب کے جلوے دیکھ لیا کرتے ہیں۔ ان کا اعتماد ظاہری نگاہوں پر نہیں ہوتا بلکہ دل کی نگاہوں سے دیکھا کرتے ہیں۔ وہ ظاہری نگاہوں سے نابینا بھی ہوتے ہیں تو دل کی نگاہ سے "ابو البصیر" ہوتے ہیں۔

مولائے کائنات نے اسی نکتہ کی طرف اشارہ کیا تھا۔ جب ذعلب یمانی نے پوچھا یا علیؑ آپ نے اس خدا کو دیکھا ہے جس کی بندگی کرتے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا یہ کیسے ممکن ہے کہ میں اس خدا کی بندگی کروں جس کو دیکھا نہ ہو لیکن یاد رکھو کہ وہ نگاہوں کے مشاہدہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ وہ ایمان کے حقائق سے دیکھا جاتا ہے۔ اب جس کے پاس حقیقت ایمان ہے وہ اسے دیکھ سکتا ہے اور جس کے پاس یہ حقیقت نہیں ہے اسے اس کا جلوہ میسر نہیں ہو سکتا۔

اور کہئے تو عرض کروں کہ جب حقیقت ایمان کا حامل اس کے جلووں کو دیکھ سکتا؟

تو جو بقول پیغمبرؐ کل ایمان ہوگا اس کے دیدار کا کیا عالم ہوگا۔ اور اس کی نگاہوں میں جلوہ ربوبیت کس حد تک سمایا ہوگا۔ اسی جلوہ گری کا نتیجہ تھا کہ پیر سے تیر نکل گیا۔ اور خبر نہ ہوئی۔ انسان جلوہ ربوبیت میں گم ہو جاتا ہے تو اپنی خبر کہاں ہوتی ہے۔

عزیزان گرامی! یہ قرآن ہدایت الٰہیہ ہے لیکن صرف صاحبان ایمان اور صاحبان تقوی کے لئے پیغمبرؐ بھی ہدایت مجسم ہیں لیکن صرف صاحبان ایمان اور صاحبان کردار کے لئے۔ راستہ سب کو بتائیں گے۔ دعوت سب کو دیں گے لیکن راستہ پر وہی آئیں گے جن کا ایمان سلامت ہوگا۔ جن کا کردار پاکیزہ ہوگا کیا آپ کو یاد نہیں ہے کہ روز اول دعوت ذو العشیرہ میں دعوت پورے خاندان کو دی گئی تھی لیکن ایمان لانے والا اور تصدیق کرنے والا صرف ایک ہی تھا اور اسی ایک نے واضح کر دیا تھا کہ میں وہاں ہوں جہاں کوئی نہیں ہے۔ میرا پہنچنا وہاں ہے جہاں کوئی بڑھا ہی نہیں ہے۔ میں نے اتنا پہچان لیا ہے جتنا کسی اور نے نہیں پہچانا۔ اور میں وہ معرفت لے کر آیا ہوں جو دنیا میں کسی کو میسر نہیں ہے یہ سب یہاں والے ہیں اور میں وہاں والا ہوں۔

اور جب ہدایت الٰہی سے فائدہ اٹھانا اور اس کے سہارے منزل مقصود تک پہنچ جانا تقوی اور ایمان پر موقوف ہے تو جسے اللہ ہدایت کا ذریعہ بنائے گا۔ جس کے حوالے اپنے نظام ہدایت و رہبری کا کام کرے گا خود اس کا ایمان و تقوی کس منزل پر ہوگا۔ اور اس کے کردار کا کیا عالم ہوگا۔ کون اندازہ کر سکتا ہے۔ روایات نے ایک ہلکا سا خاکہ بیان کیا ہے کہ جسے امت اسلامیہ میں نظام ہدایت کی پہلی کڑی قرار دیا گیا تھا اس کے بارے میں پیغمبرؐ اسلام نے اعلان کیا تھا۔ یا علیؑ تیری محبت ایمان و تقوی ہے۔ اور

تیری عداوت کفر و نفاق ہے۔ گویا یہ واضح کر دیا کہ ہدایت لینے والا صاحب ایمان و تقویٰ ہوتا ہے۔ اور ہدایت دینے والا اس کردار کا حامل ہوتا ہے جس کی کی محبت ہی ایمان اور تقویٰ بن جاتی ہے۔ اور دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ ہدایت لینے والا صاحب ایمان ہوتا ہے اور ہدایت دینے والا کل ایمان ہوتا ہے۔ ہدایت لینے والا صاحب تقویٰ اور متقی ہوتا ہے اور ہدایت دینے والا امام المتقین ہوتا ہے۔ صلوات

یہی اہتمام قدرت تھا کہ اس نے جب بھی کوئی ہادی و راہنما بنایا تو اسے زیور تقویٰ سے آراستہ کر کے بھیجا اور اتنا بلند کردار بنا دیا کہ دنیا کو اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ تقویٰ کیا ہے اور تقویٰ کے معنی کیا ہوتے ہیں یہ خود ایک تفصیلی بحث ہے۔ جس کا اس وقت محل نہیں ہے۔ صرف ایک لفظ میں سن لیجئے۔ تقویٰ کے معنی ہیں حفاظت، بچاؤ، تحفظ۔ اب جو انسان اپنے کو معصیت پروردگار اور آتش جہنم سے بچائے گا وہی متقی اور پرہیزگار کہا جائے گا۔ اور جو اپنے کو ان باتوں سے نہ بچا سکے گا وہ غیر متقی اور غیر پرہیزگار کہا جائے گا اور اس منزل میں انسانوں کی منزلیں الگ الگ ہوں گی۔ ایسے افراد بھی ہوں گے جو اپنے کو عذاب الہی سے بچا لیں گے لیکن دوسروں کو نہ بچا سکیں گے۔ اور ایسے بھی ہوں گے جو ایک عالم کو بچانے والے ہوں گے۔ جو اپنی ذات کو بچائے گا وہ متقی کہا جائے گا۔ اور جو سارے چاہنے والوں کو بچائے گا وہ امام المتقین کہا جائے گا۔ جو کسی کے نقش قدم پر چل کر معصیت الہی سے بچ جائے گا وہ متقی کہا جائے گا اور جس کے نقش قدم معصیت سے بچانے کی ضمانت ہوں گے وہ امام المتقین ہوگا۔

اب وہ کون ہوگا یہ آپ تلاش کیجئے۔ میں ایک معیار بتائے دیتا

ہوں۔ نقش قدم پر چلنے والا وہی ہوگا جس کے قدم میں لغزش کی گنجائش ہوگی اور نقش قدم اسی کے ضمانت کردار ہوں گے جس کے قدم میں لغزش کی گنجائش نہ ہوگی۔ فرق پہچاننا ہو تو یوں پہچان لیجئے کہ جو غیر معصوم ہوگا وہ متقی ہوگا اور جو معصوم ہوگا وہ امام المتقین ہوگا۔ اسی لئے تو اللہ والوں نے ہمیشہ دعا کی ہے وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِينَ إِمَامًا پروردگار ہمیں متقین کا امام بنا دے۔ متقی بنانا دوسروں کا کام ہے۔ امام المتقین بننا "عباد الرحمٰن" کا کام ہے۔

تاریخ امامت میں بے شمار واقعات ملتے ہیں۔ جن سے امام المتقین کے کردار کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن میں آپ کے سامنے صرف ایک ہی واقعہ پیش کرتا ہوں اور واقعہ بھی اس ہستی کا ہے جس کے تقویٰ کو ساری دنیا نے تسلیم کیا ہے۔ اور اس حد تک تسلیم کیا ہے کہ نام ہی محمد تقیؑ پڑ گیا ہے۔ بچپنے کا زمانہ ہے۔ باپ کا انتقال ہو چکا ہے ولی عہدی کا دور ختم ہو چکا ہے۔ حاکم وقت مامون نے مدینہ سے طلب کیا ہے۔ بغداد تک تشریف لے آئے ہیں۔ تقریباً سات برس کی عمر ہے۔ ایک دن راستہ میں کھڑے ہوئے ہیں۔ لڑکے کھیل رہے ہیں۔ آپ بھی اہل دنیا کے مشاغل کا تماشا کر رہے ہیں ایک مرتبہ مامون کی سواری کی خبر ہوئی سارے بچے راستہ چھوڑ کر بھاگ گئے آپ اپنی جگہ پر کھڑے رہے اور کیوں نہ کھڑے رہتے کسی فرار کے فرزند ہوتے تو فرار کر جاتے۔ یہ حیدر کرارؑ کے لال ہیں۔ یہاں فرار کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔ صلوات۔

مامون گھوڑے سے اتر پڑا۔ یہ کون بچہ ہے۔ سارے بچے راستہ چھوڑ کر ہٹ گئے یہ کیوں نہیں ہٹا۔ آپ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ فرمایا کہ

میرے بھاگنے کی تین ہی وجہیں ہو سکتی ہیں۔ میری سمجھ میں کوئی وجہ نہیں آئی اب تو ہی بتا دے کہ مجھے کس وجہ سے بھاگ جانا چاہیے تھا۔ مامون نے کہا یہ کیا۔ یہ تین وجہیں کیسی؟ آپ نے فرمایا کہ یا میں گنہگار ہوتا تو تیرے خوف سے بھاگ جاتا۔ یا تجھے ظالم سمجھتا تو ظلم کے اندیشہ سے فرار کر جاتا۔ یا راستہ اتنا تنگ ہوتا کہ تجھے زحمت ہوتی تو میں راستہ چھوڑ دیتا لیکن نہ راستہ تنگ ہے نہ میں خطاوار ہوں۔ اب اگر تو اپنے کو ظالم سمجھتا ہے تو راستہ چھوڑ دیتا ہوں۔ مامون خاموش ہو گیا۔ اور سواری کو آگے بڑھا دیا۔ سمجھ گیا کہ یہ کوئی عام بچہ نہیں ہے۔ یہ کسی خاص گھرانے کا بچہ ہے اور بہت ممکن ہے کہ پہچان بھی لیا ہو۔ جیسا کہ بعض روایات میں ہے کہ حضرت نے اپنا تعارف کرا دیا تھا۔ لیکن کمال کی منزل میں اس کا اظہار مناسب نہیں تھا۔ آگے بڑھا۔ ایک منزل پر پہونچ کر اپنے باز کو شکار کے لئے چھوڑا۔ باز اڑا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک مچھلی اپنے منھ میں دبا کر لے آیا اور مامون کے حوالے کر دی۔ مامون نے مچھلی کو مٹھی میں چھپایا اور پلٹ کر آیا۔ دیکھا پھر بچہ اپنے مقام پر کھڑا ہے۔ مامون نے کہا تم پھر کھڑے ہو اور تم نے راستہ نہیں چھوڑا۔ آپ نے فرمایا کہ آپ نے میرے سوالات کا جواب کہاں دیا کہ میں راستہ چھوڑ دیتا۔ مامون نے کہا کہ اچھا اگر ایسی باتیں کرتے ہو تو ذرا یہ تو بتاؤ کہ میری مٹھی میں کیا ہے؟ حضرت نے فرمایا کہ میرے آبار و اجداد نے جبرئیل کے حوالے سے پروردگار کی طرف سے نقل کیا ہے کہ اللہ نے زمین و آسمان کے درمیان دریا پیدا کئے ہیں۔ دریاؤں میں مچھلیاں پیدا کی ہیں۔ روئے زمین پر کچھ لوگوں کو اقتدار دیا ہے وہ شکار کا شوق کرتے ہیں اور جب ان کا باز شکاری مچھلیاں [1] شکار کر کے لے آتا ہے تو اپنی مٹھی میں

چھپا کر خاندان رسالت کا امتحان لیتے ہیں۔ (مناقب)

یہ سننا تھا کہ مامون نے گود میں اٹھا لیا۔ شاباش۔ شاباش۔ ایسا جواب خاندان رسالت کے علاوہ کوئی نہیں دے سکتا۔ دل چاہتا ہے کہ عرض کروں مولا! یہ طول و تفصیل کی کیا ضرورت ہے۔ مامون نے تو صرف اتنا ہی پوچھا تھا کہ میری مٹھی میں کیا ہے؟ آپ نے فرما دیا ہوتا کہ مچھلی ہے! اب اس کی کیا ضرورت ہے کہ زمین و آسمان کے درمیان دریا ہیں۔ دریاؤں میں مچھلیاں ہیں۔ زمین پر بادشاہ ہیں۔ بادشاہوں میں شکار کا شوق ہے۔ ان کے پاس باز ہیں۔ وہ بازوں کو چھوڑتے ہیں۔ وہ مچھلیوں کو شکار کرتے ہیں اور بادشاہ خاندان رسالت کا امتحان لیتے ہیں۔ عجب نہیں حضرت فرمائیں۔ تجھے نہیں معلوم کبھی کبھی مصلحت یہی ہوتی ہے کہ جواب میں طول دیا جائے۔ کیا تجھے نہیں معلوم کہ کوہ طور پر جناب موسیٰؑ سے اتنا ہی سوال ہوا تھا کہ موسیٰ تمھارے ہاتھ میں کیا ہے اور موسیٰ نے عصا کی پوری تاریخ بیان کر دی۔ یہ تو اللہ والے ہی جانتے ہیں کہ کہاں جواب مختصر ہوتا ہے اور کہاں طول دیا جاتا ہے۔ میں عرض کروں گا کہ مولا یہاں کیا مصلحت ہے کہ آپ نے اس قدر طول دے دیا۔ فرمائیں گے۔ تجھے نہیں معلوم۔ میں نے صرف اتنا کہہ دیا ہوتا کہ مچھلی ہے تو میرے علم کا تو اندازہ ہو جاتا لیکن وسعت علم کا اندازہ نہ ہوتا میں یہ بتانا چاہتا تھا کہ ہم آل محمدؐ بچپنے ہی سے زمین و آسمان کا علم رکھتے ہیں اور یہ بھی بتا دینا چاہتا تھا کہ بات کا معلوم ہونا اور ہے اور بات کی اصل کا معلوم ہونا اور ہے۔ ہم بات بھی جانتے ہیں اور بات کی اصل بھی جانتے ہیں۔ اب

---

[1] مناقب کی روایات میں سانپ کا ذکر ہے۔

جسے شوق ہو وہ ہم سے اپنی اصل کے بارے میں سوال کر کے دیکھے۔ جب ہم حیوانات کی اصل بتا دیتے ہیں تو انسانوں کی اصل کو ہم سے بہتر کون سمجھے گا۔ صلوات

امامؑ نے در پردہ یہ بھی واضح کر دیا کہ سلاطین وقت کا شوق کیا ہوتا ہے۔ اور امامؑ وقت کا کردار کیا ہوتا ہے۔ شکار کھیلنا سلاطین کا کام ہے اور زمین و آسمان کے رموز بتانا امام کا کام ہے۔ اب یہ تمھیں فیصلہ کرنا ہے کہ دین کا ذمہ دار شکاریوں کو مانو گے یا کائنات کا علم رکھنے والوں کو تسلیم کرو گے۔ صلوات

عزیزان محترم! جواب میں حضرت موسیٰؑ کا انداز تو دیکھ لیا۔ اب کمال یہ حضرت عیسیٰؑ کا انداز بھی دیکھ لیجیے۔ امام رضا علیہ السلام کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ دشمنوں نے طعنہ دینا شروع کر دیا کہ یہ ابتر ہیں۔ ان کے کوئی اولاد نہیں ہے۔ امامؑ فرماتے رہے کہ عنقریب پروردگار مجھے فرزند عنایت کرے گا لیکن حاسدوں کو نہ ماننا تھا نہیں مانا۔ اور اس سازش میں فقط اغیار ہی نہیں اہل خاندان بھی شریک ہو گئے۔ اور مقصد یہ تھا کہ یہ دنیا سے اٹھ جائیں تو ساری املاک و جاگیر ہمیں مل جائے۔ ادھر ۱۰ رجب ۱۹۵ھ کو جناب سبیکہ کے بطن اقدس سے امام محمد تقیؑ کی ولادت ہوئی۔ ولادت کی شان بھی عجیب و غریب تھی کہ امام رضاؑ نے جناب حکیمہ کو روک لیا کہ آج میرے گھر ایک فرزند آنے والا ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ آثار تو ایسے نہیں ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ توقف فرمائیے۔ وہ ٹھہر گئیں۔ تھوڑی رات گذری تھی کہ جناب سبیکہ جنھیں خیزران بھی کہتے ہیں، ان کو حجرہ میں لے گئیں۔ آثار نمودار ہوئے چراغ گل ہو گیا۔ فرزند کی ولادت ہوئی سارا حجرہ منور ہو گیا۔ میں نے غسل مولود دے کر فرزند

کو امام رضاؑ کے حوالے کر دیا۔ حضرت نے سر و سینہ کو بوسہ دیا۔ دو دن آنکھیں بند رہیں۔ تیسرے دن آنکھ کھولی تو زبان پر فقرہ تھا "اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ" میں نے سخت تعجب کیا۔ فرمایا کیوں تعجب نہ کرو۔ یہ حجت خدا ہے اور حجت خدا کا یہی انداز ہوتا ہے۔

اللہ اکبر! کیا عظمت و جلالت ہے۔ آئے تو سارے عالم کو منور کر دیا اور آنکھ کھولی تو زبان پر کلمہ شہادتین جاری کیا۔

نہ آثار نہ علامات لیکن اہتمام پروردگار تھا۔ اور قدرت آواز دے رہی تھی کہ یاد رکھو ہم جب اپنے نمائندہ کو بھیجتے ہیں تو اس کا انتظام بھی جداگانہ ہی کرتے ہیں۔ آثار سے پتہ نہ چلا۔ حجرہ منور اور روشن ہو گیا۔ چراغ خود بخود گل ہو گیا۔ دو دن آنکھیں نہ کھولیں۔ تیسرے دن آنکھ کھولی تو کلمہ پڑھتے ہوئے۔ اب اندازہ کیجیے کہ آٹھ پشتیں گذر چکی ہیں۔ لیکن ابھی اول کا انداز بدلا نہیں ہے۔ جو انداز پہلے کا تھا وہی انداز نویں کا ہے۔ جو اہتمام روز اول تھا وہی اہتمام آج بھی ہے ـــ صلوات

قلب امامت مطمئن ہے کہ وارث آ گیا ذہن سبیکہ مطمئن ہے کہ نور نظر آ گیا۔ حکیمہ مسرور ہیں کہ راحت جان آ گیا۔ لیکن حریفوں میں کھلبلی ہے کہ قیامت آ گئی۔ جو انداز کل علیؑ کی آمد پر بتوں کا ہوا تھا وہی آج انسانوں کا ہے۔ ہم تو انھیں ابتر کہتے تھے۔ یہ بیٹا کہاں سے آ گیا۔ ہم تو انھیں لاولد سمجھتے تھے یہ وارث کہاں سے آ گیا۔ قدرت نے آواز دی کہ تم نے تو میرے پیغمبرؐ کو بھی ابتر ہی کہا تھا۔ پھر کیا ہوا ہم نے بیٹی دی یا نہیں ـــ اور بیٹی دی تو ایسی بیٹی دی کہ ساری کائنات پر اس کی نسل چھا گئی۔ اور مصداق ابتر حامل کوثر ہو گیا۔

اب اس مقام پر ایک لفظ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ کل کفار نے نبی کو ابتر کہا تھا اور آج مسلمانوں نے امام علی رضاؑ کو ابتر کہا۔ قدرت نے دونوں جگہوں پر یہ اہتمام کیا کہ نبی کی نسل کو عالمگیر بنا دیا۔ اور امام رضاؑ کی نسل کو سادات میں سب سے زیادہ قرار دے دیا کہ آج روئے زمین پر جتنے رضوی سادات پائے جاتے ہیں شائد اتنے سادات کسی اور امام کی نسل سے نہ ہوں گے اور یہ بھی قدرت کا ایک اہتمام تھا کہ تم جتنا مٹانا چاہو گے ہم اتنا ہی زندہ و پائندہ رکھیں گے اور ایک مناسبت اور سامنے آگئی کہ نبی کو ابتر کہا گیا تو اللہ نے نسل زہراؑ کو نسل پیغمبرؐ بنا دیا اور امام رضاؑ کو ابتر کہا گیا تو مالک نے اولاد امام محمد تقیؑ کو "ابن الرضا" بنا دیا۔ تاریخ گواہ ہے کہ ایک مدت تک امام محمد تقیؑ اور امام علی نقیؑ کی نسل کو ابن الرضا کہہ کر یاد کیا جاتا تھا اور یہ قدرت کا انتظام تھا کہ تو ساری دنیا کو اولاد رضاؑ سے بھر دیا جائے اور دشمن کو اندازہ ہو جائے کہ ہمارے مٹانے سے کچھ نہیں ہوتا۔ وہ جسے باقی رکھنا چاہے گا اسے بہر حال باقی رکھے گا۔ صلوات

قدرت نے اپنا انتظام کر دیا لیکن حاسدوں کا سلسلہ تمام نہیں ہوا اور یہ کہنا شروع کر دیا کہ ہم انھیں وارث رضاؑ نہیں سمجھتے۔ حضرت نے موقع پا کر مجمع اصحاب میں محمد بن علی سے کہا کہ ذرا بچّہ کی قمیص تو اتار دو انہوں نے بڑھ کر قمیص اتار دی۔ اب جو دیکھا تو کیا دیکھا کہ پشت پر مہر امامت کا نشان موجود ہے۔ آپ نے فرمایا کہ میرے آباؤ اجداد کی بھی یہی شان رہی ہے۔ رسولؐ کی پشت پر مہر رسالت تھی اور امام کی پشت مہر امامت ہوتی ہے۔

ایک شخص نے موقع پا کر ایک مرتبہ امام رضاؑ سے کہا کہ اگر خدا نخواستہ آپ دنیا سے اٹھ جائیں تو آپ کے بعد دین کا ذمہ دار کون ہوگا۔ آپ نے فرمایا کہ

میرا فرزند محمد تقیؑ۔ پوچھنے والے نے کہا کہ حضور ان کی عمر تو فقط تین برس کی ہے تین برس کا بچہ امت کی ذمہ داری کیسے سنبھالے گا۔ آپ نے فرمایا کہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ تم لوگوں کو قرآن کی خبر بھی نہیں ہے۔ تین دن کے عیسیٰ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اللہ نے مجھے کتاب دی ہے اور نبی بنایا ہے اور تین سال کا امام یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے امام بنایا گیا ہے۔ کس قدر حیرت کی بات ہے یہ حجت خدا ہے اور حجت خدا اپنے کمالات میں سن و سال کا محتاج نہیں ہوتا ــــ صلوات

غرض زندگی یوں ہی چلتی رہی اور جب آپ کی عمر شریف ۷ برس کی ہوئی تو امام رضاؑ کا انتقال ہو گیا۔ اب تو لوگوں کو اور بھی موقع مل گیا کہ آپ کی امامت پر طرح طرح کے اعتراضات کریں۔ کل فقط ایک اعتراض تھا کہ بچہ کیسے امامت سنبھالے گا۔ آج یہ واقعہ پیش آچکا ہے کہ سات برس کی عمر ہے اور ساری امامت کی ذمہ داریاں ہیں۔ کوئی ماننے کے لئے تیار نہیں ہے اور مانیں تو کیسے مانیں ایک پورا فرقہ وجود میں آچکا ہے جو خود امام رضاؑ کو امام نہیں مانتا تھا اور امام موسیٰ کاظمؑ کے بعد سلسلہ کو موقوف کر دینا چاہتا تھا تو اب یہ فرقہ امام محمد تقیؑ کو کیسے تسلیم کرے گا۔ سیاسی اعتبار سے بھی حالات ناسازگار تھے۔ اور سیاست وقت نے یہ منصوبہ بنا رکھا تھا کہ سادات میں آپس میں پھوٹ پڑ جائے اور ان میں اتحاد و یکجہتی قائم نہ رہنے پائے۔ اسی سیاست کی پیداوار یہ فرقہ تھا جس کی قیادت بعضؒ سادات کرامؒ ہی کر رہے تھے اور انھیں کا منشاء تھا کہ امام رضاؑ کی شخصیت مسلم نہ ہونے پائے۔ اُدھر یہ شخصیت اتنی مسلم ہو گئی کہ حکومت میں ولی عہدی کا منصب مل گیا۔ خاندان کا جو عالم ہونا چاہیئے تھا وہی ہوا۔ لیکن آپ نے اپنے طرز عمل میں کوئی فرق نہیں آنے دیا۔

اور ہمارا برتاؤ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ جب سادات کی کوئی "بغاوت" ناکام ہو گئی اور مامون نے قیدی سردار کو امام رضاؑ کے حوالے کر دیا تو آپ نے سفارش کر کے چھوڑ دیا ——— ایک مرتبہ بعض لوگوں نے اعتراض بھی کیا کہ فرزند رسولؐ! ان لوگوں کا برتاؤ یہ ہے اور آپ حضرت کا طرز عمل یہ ہے؟ فرمایا کہ وہ ان کا کردار ہے یہ ہمارا کردار ہے۔ وہ اپنے فریضہ سے غافل ہو جائیں تو میں اپنے فرض سے غافل نہیں ہو سکتا۔ اسی کشمکش میں زندگی چلتی رہی لیکن جب حضرت کا انتقال ہو گیا تو حریفوں کو کھل کر مخالفت کرنے کا موقع مل گیا۔ ایک مرتبہ حضرت کی زندگی میں امام محمد تقیؑ کی ولدیت ہی سے انکار کر دیا تھا اور بالکل وہی حالات سامنے آ گئے جو جناب عیسیٰ کے لیے پیش آئے تھے۔ وہاں باپ نہیں تھا تو وہاں باپ نہیں تھا تو یہ مصیبت سامنے آئی تھی۔ یہاں باپ موجود ہے لیکن یہ تہمت لگائی جا رہی ہے۔ قدرت نے کہا کہ تو بھی تمہیں اسی طرح ذلیل کروں جس طرح عیسیٰ پر تہمت لگانے والے یہودی ذلیل ہوئے تھے۔ چنانچہ لوگوں نے یہ درخواست کی کہ قیافہ شناسوں سے دریافت کیا جائے۔ مجمع میں بچہ کو رکھا گیا۔ قیافہ شناسوں کو طلب کیا گیا۔ امام رضاؑ ایک معمولی لباس میں آئے کہ شخصیت معلوم نہ ہو سکے۔ لیکن جیسے ہی قیافہ شناسوں نے دیکھا گھبرا کر آواز دی یہ اسی آنے والے کا فرزند ہے۔ دونوں کا انداز ایک ہے رفتار ایک ہے۔ کردار ایک ہے۔ میں کہوں گا افسوس قیافہ شناسوں نے پہچان لیا۔ خاندان والوں نے نہ پہچانا۔ سچ ہے معرفت کسی کی میراث نہیں ہوتی۔ وہ سلمانؓ کو حاصل ہو جاتی ہے۔ اور ابولہب کو حاصل نہیں ہوتی اور غیر کو اپنا بنا لیتی ہے۔ اور اپنے کو بزم سے اٹھا دیتی ہے۔ صلوات

دنیا نے پہچاننے سے انکار کر کے یہ چاہا تھا کہ امامت کا مرتبہ گھٹا دیں۔ امامت نے آواز دی۔ تمہارے نہ پہچاننے سے میرا نقصان نہیں ہے۔ تمہارا ہی

نقصان ہے۔ میرے جد نے تو پہلے ہی فرما دیا تھا کہ جو اپنے زمانہ کے امام کو نہ پہچانے وہ جاہلیت کی موت مرتا ہے۔ یاد رکھو کہ علیؑ کو دنیا نے نہ پہچانا تو علیؑ کا کیا نقصان ہوا حسن مجتبیٰؑ کو شام کی حکومت نے نہیں پہچانا تو حسن مجتبیٰؑ کا کیا نقصان ہوا۔ امام حسینؑ کو یزید نے نہیں پہچانا تو ان کا کیا نقصان ہوا۔ امام زین العابدینؑ کو ہشام نے نہیں پہچانا تو ان کا کیا نقصان ہوا۔ امام محمد باقرؑ کو عبدالملک نے نہیں پہچانا تو ان کا کیا نقصان ہوا۔ امام جعفر صادقؑ کو وقت کے اماموں نے نہیں پہچانا تو ان کا کیا نقصان ہوا۔ امام موسیٰ کاظمؑ کو ہارون نے نہیں پہچانا تو ان کا کیا نقصان ہوا۔ اور مجھے بھی تم لوگوں نے نہیں پہچانا تو میرا کیا نقصان ہوا؟ بس یہ یاد رکھنا کہ دو سلسلے الگ الگ ہیں۔ اب تم فیصلہ کر لو کہ تمہارا رشتہ کس سلسلے سے ہے اور میرا رشتہ کس سلسلے سے ہے میں تو اپنے جد کا ایک ہی اعلان جانتا ہوں کہ جو وقت کے امام کو نہ پہچانے گا وہ جاہلیت کی موت مرے گا۔ میری فضیلت کے بارے میں نہ سوچو اپنی موت کے بارے میں سوچو۔ صلوات

وقت گذرتا رہا اور شک کرنے والے شک کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک دن یہ طے ہو گیا کہ حضرت کا امتحان لیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ ان میں امامت کی صلاحیت ہے یا نہیں۔

یہ بھی قدرت کا ایک انتظام تھا کہ حریفوں پر حجت تمام ہو جائے اور کوئی یہ نہ کہنے پائے کہ ان میں امامت کی صلاحیت نہیں ہے۔ اور میں تو اس تحریک سے خوش ہوں کہ انسان آزما کے۔ امتحان کر کے ایمان لے آئے۔ بس اتنا ضرور چاہتا ہوں کہ یہ طریقہ ہر ایک کے ساتھ برتا جائے اور جو سوالات کا جواب نہ دے سکے اسے تخت حکومت سے اتار دیا جائے لیکن افسوس کہ تاریخ اسلام میں ایسا نہیں ہوا اور مسلمان ماننے پر آیا تو ہر جاہل کو راہنما مان لیا۔ اور نہ ماننے پر آیا تو باب مدینۃ العلم

کو بھی امام نہیں مانتا۔ تاریخ اسلام کے لئے کس قدر شرم کی بات ہے کہ اعتراف جہالت کرنے والے امام ہو جائیں اور "سلونی قبل ان تفقدونی" کا دعویٰ کرنے والا امام نہ ہو سکے۔ صلوات

خیر۔ اس وقت یہ بحث نہیں ہے۔ عرض صرف یہ کرنا ہے کہ لوگوں نے امتحان کا ارادہ کیا۔ مجلس امتحان آراستہ ہوئی۔ بے شمار افراد اکٹھا ہوئے اور چاروں طرف سے سوالات کی بوچھار شروع ہو گئی۔ امام کی کمسنی۔ مجمع کی کثرت سوالات کا ہنگامہ۔ مگر اللہ رے علم امامت کہ کوئی سوال تشنۂ جواب نہ رہ گیا۔ اور کسی ایک کو یہ کہنے کا موقع نہ ملا کہ میرے سوال کا جواب نہیں ہو سکا۔ بلکہ روایات سے تو یہاں تک اندازہ ہوتا ہے کہ اگر کسی کو سوال کرنا نہ آیا تو خود ہی سوال بتایا اور خود ہی جواب دیا۔ اور اگر کوئی اپنے سوال کو بھول گیا تو سوال بھی بتا دیا اور جواب بھی بتا دیا ـــــ آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ یہ محفل کتنی دیر گرم رہی اور یہ سلسلہ کب تک جاری رہا۔ کتنے سوالات کئے گئے اور امام نے کس طرح جوابات دیئے۔ روایت کہتی ہے کہ تقریباً تین دن تک یہ سلسلہ جاری رہا لوگ سوال تراشتے رہے پوچھتے رہے اور فرزند رسولؐ جواب دیتے رہے۔ سوالات تو تاریخ میں محفوظ نہ رہ سکے لیکن اتنا ضرور ملتا ہے کہ تقریباً ۳۰ ہزار سوالات کئے گئے اور آپ نے سب کے جوابات دیدیئے۔

اے کاش یہ سوالات و جوابات محفوظ رہ جاتے تو آج امت کے پاس علم کا ایک بڑا ذخیرہ ہوتا۔ مگر افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا۔ اور کس طرح ہوتا استفادہ کی غرض سے پوچھا گیا ہوتا تو اسے محفوظ بھی کیا جاتا۔ وہاں تو خالی مذاق کرنا تھا۔ عاجز کرنا تھا۔ امتحان لینا تھا۔ کسی طرح غلط ثابت کر دینا تھا مگر کیا کہنا جلالت امامت کا کہ کسی منزل پر خاموش نہیں ہوئے۔ اور جواب دیتے

رہے اور یہ واضح کر دیا کہ محمدؐ محمدؐ ہی ہوتا ہے وہ پہلا ہو یا تیسرا۔ یہاں اول و اوسط میں کوئی فرق نہیں ہے۔ صلوات

واقعہ تمام ہو گیا۔ اب خاتمہ کلام میں امام محمد تقیؑ کا ہی ایک بیان سن لیجئے جس سے اندازہ ہوگا کہ جس کے نظریات اتنے بلند ہوتے ہیں اس کا کردار کتنا بلند ہوتا ہے۔ اہل دنیا آرائش دنیا پر جان دینے والے۔ زیبائش دنیا پر مرنے والے کیا جانیں کہ تقویٰ کیا ہے اور کردار کی شان کیا ہوتی ہے۔ انسانیت کا وقار کیا ہے۔ اور آدمیت کو زینت کن چیزوں سے ملا کرتی ہے فرزند رسولؐ فرماتے ہیں کہ یاد رکھو اگر زندگی کو زینت دینا ہے تو مجھ سے پوچھو میں تمھیں بتاؤں گا کہ کس چیز کی زینت کس چیز سے ہوتی ہے۔ اور انسانیت کا کمال کس طرح حاصل ہوتا ہے ـــــ یاد رکھو فقیری کی زینت ہے عفت۔ مالداری کی زینت ہے شکر۔ بلا کی زینت ہے صبر۔ حسب کی زینت ہے انکساری۔ کلام کی زینت ہے فصاحت۔ ایمان کی زینت ہے عدالت۔ عبادت کی زینت ہے سکون قلب۔ روایت کی زینت ہے حافظہ۔ علم کی زینت ہے تواضع۔ عقل کی زینت ہے ادب۔ حلم کی زینت ہے کشادہ دلی۔ زہد کی زینت ہے ایثار۔ نفس کی زینت ہے ریاضت۔ خوف خدا کی زینت ہے گریۂ طویل۔ قناعت کی زینت ہے غذائے قلیل۔ نیکی کی زینت ہے ترک احسان۔ نماز کی زینت ہے توجہ نفس اور ان کو سمیٹ لیا جائے تو یوں کہا جائے کہ انسانیت کی زینت ہے اسلام۔ اسلام کی زینت ہے ایمان ایمان کی زینت ہے تقویٰ۔ تقویٰ کی زینت ہے عصمت اور عصمت کی زینت ہے کردار معصوم۔ عصمت بے رونق ہے۔ اگر معصوم کا کردار نہ ہو اور تقویٰ بے رونق ہے اگر کوئی محمد تقیؑ نہ ہو۔ عبادت کی زینت علی ابن الحسینؑ سے ہے اور تقویٰ کی زینت محمد بن علیؑ سے ہے۔ صلوات

امام علی نقی علیہ السلام

اسم مبارک	علیؑ
لقب	نقی، ہادی
کنیت	ابوالحسن ثالث
والد ماجد	امام محمد تقیؑ
والدۂ ماجدہ	جناب سمانہ
ولادت	۵ رجب ۲۱۴ھ جمعہ مدینہ منورہ
شہادت	۳ رجب ۲۵۴ھ شنبہ سامرہ
عمر مبارک	۴۰ سال
قبر مطہر	سامرہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین خاتم النبیین سیدنا ومولانا ابی القاسم محمد وآلہ الطیبین الطاہرین ولعنۃ اللہ علی اعدائہم اجمعین۔

امابعد فقد قال اللہ الحکیم فی کتابہ الکریم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِنَّ عَلَیْنَا لَلْهُدٰی وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَۃَ وَالْاُوْلٰی

ارشاد جناب رب العزت ہوتا ہے کہ بیشک ہدایت کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے اور دنیا وآخرت کا اختیار ہمارے ہاتھوں میں ہے۔

اس ارشاد نے صاف واضح کر دیا کہ مالک کائنات نے تاریخ کے ہر موڑ پر انسانی ہدایت کا انتظام کیا ہے اور کوئی دور ایسا نہیں چھوڑا جب ہدایت لینے والے موجود ہوں اور کوئی ہدایت دینے والا نہ ہو بلکہ ایسا دور آیا ہے جب صرف ہدایت دینے والا تھا اور ہدایت لینے والا کوئی نہ تھا۔ حضرت آدمؑ ہادی و رہنما بن کر آئے اور عالم انسانیت میں کوئی نہ تھا۔ قدرت اعلان کر رہی تھی کہ دیکھو ہمارا نظام ہدایت اس قدر پختہ ہے کہ ہم نے ایک لمحۂ تاریخ بھی بغیر ہادی و رہنما کے نہیں چھوڑا۔ ابھی ہدایت لینے والے نہیں لیکن میں نے ہادی و رہنما بنا دیا ہے تاکہ انسان کو یہ شکایت نہ ہو کہ ہم تھے اور ہماری ہدایت کرنے والا کوئی نہ تھا۔ انسان کی فطرت شکایت کرنا ہے انسان کا مزاج فریاد کرنا ہے۔ اسے کام کرنا کچھ نہیں ہے۔ فریاد کرنا زیادہ ہے۔ کیسی عجیب مخلوق ہے یہ انسان کہ جب ہم نے آدمؑ کو خلیفۃ اللہ بنا کر پیدا کر دیا تو اسے یہ اعتراض ہے کہ جب کائنات بشریت میں کوئی نہ تھا تو خلیفہ و ہادی کی ضرورت کیا تھی۔ اور جب اسے پیدا کر کے راہنماؤں کا

سلسلہ جاری رکھا تو اسے یہ شکایت ہے کہ ہمارے اشرف المخلوقات ہوتے ہوئے ہمارے لئے کسی ہادی و رہنما کی کیا ضرورت ہے آخر رہنما بھی تو ہمارا جیسا ہی ایک بشر ہوتا ہے۔ اگر وہ راہنمائی کر سکتا ہے تو ہم کیوں نہیں کر سکتے اگر وہ کسی راہنما کا محتاج نہیں ہے تو ہم کیوں ہیں۔ بشر بشر کو ایک جیسا ہونا چاہئے۔ انسان انسان کو ایک انداز کا ہونا چاہئے۔ اس کا کیا مطلب ہے کہ ایک راہنما ہو جائے اور دوسرا راہ رو۔ ایک ہادی ہو جائے اور دوسرا راہ گیر قدرت نے آواز دی انسان! تو نے ہمارے نظام کو نہیں پہچانا۔ ہم نے یہ سارا کام تیرے ہی فائدے کے لئے کیا ہے۔ اور تجھے ہی زحمتوں سے بچانے کے لئے اپنے اولیاء کو زحمتوں میں مبتلا کیا ہے۔ ورنہ انھیں کیا غرض تھی۔ وہ عرش کی مخلوق تھے عرش پر رہتے۔ عالم انوار کے رہنے والے تھے عالم انوار میں رہتے۔ یہ تیری ہدایت کا خیال تھا کہ انھوں نے عرش اعظم کی منزل کو چھوڑ دیا۔ اور فرش خاکی پر آگئے ـــــ اور یہ تیری ناقدری ہے کہ تو نے ان کے وجود ہی کو محل اعتراض بنا دیا اور ان کے مقابلہ میں پورا نظام ریاست قائم کر لیا کاش تو نے یہ سوچا ہوتا کہ نظام ہدایت اور ہے نظام ریاست اور۔ قانون شریعت ہدایت کے زیر سایہ چل سکتا ہے ریاست کے زیر سایہ نہیں۔ مگر تو نے یہ سب کہاں سوچا۔ تیرا کام تو فقط اعتراض کرنا اور رکاوٹیں پیدا کرنا تھا لیکن یاد رکھ کہ جس طرح ہم نے راہنماؤں کو پیدائشی طور پر یہ کمال دیا ہے کہ ان کی ولادت کا انداز دوسرے انسانوں سے الگ رکھا ہے اور ان سے وقت ولادت ہی سجدہ کرا دیا ہے۔ انھیں عصمت کے لباس سے آراستہ کیا ہے۔ ان کی فطرت میں علم و فضل کے جوہر بھر دیئے ہیں۔ ان کے کردار کو طہارت و تقویٰ کے خمیر سے تیار کیا ہے ـــــ اسی طرح ان کے دل و دماغ اور ذہن

و نظر میں اتنا حوصلہ دے دیا ہے کہ وہ کسی منزل پر اپنے فریضہ سے غافل نہیں رہ سکتے۔ دنیا لاکھ ناشکری کرے۔ ہزار رکاوٹیں پیدا کرے لیکن وہ اپنے فریضہ سے غافل نہ ہوں گے۔ اور جس حال میں رہیں گے تبلیغ دین کرتے رہیں گے۔ اور اپنے فریضہ تبلیغ پر عمل کرتے رہیں گے زیر خنجر رہیں یا بالائے دار ـــــ قید خانہ میں رہیں یا نظربند۔ فرض ہدایت جاری رہے گا۔ اور اس شان سے جاری رہے گا کہ حکومتیں ان کی زندگی کو بھی برداشت نہ کر سکیں گی اور انہیں یہ احساس ہوگا کہ اگر یہ زندہ رہ گئے تو ہماری زندگی مشکل ہو جائے گی۔ تخت و تاج کو سنبھالنا تو بہت آسان ہے لیکن اسلام کے نام پر چلنے والی حکومت کا شریعت و احکام کے بغیر چلانا مشکل ہے۔ یہ ایک کشمکش تھی جس میں حکومتیں مبتلا رہیں۔ ایک آزمائش تھی جس سے ریاستوں کو گذرنا پڑا اور بالآخر زہر دینے کے علاوہ کسی کو کچھ سجھائی نہ دیا۔ قدرت نے بھی آواز دی کہ اگر تیرا یہی کردار ہے تو تو زہر دیتا جا ہم راہنما بھیجے جائیں گے۔ اگر تو پوری زندگی بھی قید خانہ میں رکھے گا تو ہمارا راہنما تبلیغ ہی کرے گا۔ یوسف نے قید خانہ میں توحید کا سبق سکھایا۔ امام موسیٰؑ بن جعفرؑ نے قید خانہ بغداد میں حکومت کی نمائندہ عورت کو سجدہ کرایا۔ اللہ والوں کی زندگی اسی طرح گذرتی رہی کہ اپنے کردار کی پاکیزگی بھی سلامت رہی اور قوم کی ہدایت کا فریضہ بھی جاری رہا۔ نہ حالات نے ان کے کردار پر اثر ڈالا کہ وہ راہ سے بے راہ ہو جائیں اور نہ زمانہ ان کی راہ روک سکا کہ وہ اپنے فرائض سے غافل ہو جائیں۔ وہ جس دور میں رہے کردار کے اعتبار سے قابل تعریف اور محمدؐ رہے اور جس زمانہ میں رہے عظمت و رفعت کے اعتبار سے بلند اور علیؑ رہے۔ ان کے وقار و امتیاز کا یہ عالم تھا کہ زمانہ نے ان کے کردار کی پاکیزگی کو دیکھا تو تقی کہدیا اور ان کے

فرضِ ہدایت کو دیکھا تو ہادی کہہ دیا۔ ہمارے دسویں امام کے یہی مشہور دو لقب ہیں۔ جن میں ایک شخصیت کا پتہ دیتا ہے اور ایک کردار کا اور کیوں نہ ہو اللہ والے شخصیت میں بھی علیؑ ہوتے ہیں اور کردار میں بھی علیؑ ہوتے ہیں۔

آپ کی ولادت مامون عباسی کے دور میں ۵ رجب ۲۱۲ھ کو ہوئی والدہ گرامی کا نام سمانہ خاتون تھا جو اپنے دور کی نہایت درجہ پاکیزہ صفات اور بلند کردار خاتون تھیں۔ اور قدرت نے انھیں ایک امام کی زوجیت کا شرف دے کر دوسرے امام کی والدہ بنا دیا۔ سچ ہے کہ اللہ کسی کے عمل کو ضائع نہیں کرتا۔ اور ہر ایک کو اس کے کردار کی جزا ملتی ہے۔ یہ جناب سمانہ کے کردار کی جزا تھی کہ قدرت نے انھیں امام علیؑ نقی کی والدہ گرامی ہونے کا شرف دے دیا ورنہ کہاں عجم کی خاتون اور کہاں ہاشمی شہزادہ۔ یہ مالک کائنات کا کرم تھا کہ اس نے انھیں اتنا بڑا مرتبہ دے دیا کہ اور دنیا کو متوجہ کر دیا کہ دیکھو عرب و عجم کی تفریق کوئی شے نہیں ہے۔ ہم عظمت دینا چاہتے ہیں تو ایک عجم خاتون کو بھی نورِ امامت کا حامل بنا دیتے ہیں اور نا اہل پاتے ہیں تو عرب کو بھی اس شرف سے محروم رکھتے ہیں تمھیں معلوم ہے کہ ہمارے نمائندوں کے گھر عجمی خواتین بھی آئیں اور عرب خواتین بھی لیکن یہ ہمارا نظام تھا کہ عجم خواتین کو ہم نے مادرِ عصمت بنا دیا اور عرب خواتین تڑپتی رہیں اور ساری زندگی میں ایک فرزند کی ماں نہ ہو سکیں۔

شاید اسی نکتہ کی طرف مرسلِ اعظمؐ نے اشارہ فرمایا تھا جب آپ جناب خدیجہ کے انتقال کے بعد مسلسل ان کا تذکرہ کر رہے تھے اور برابر انھیں یاد کرتے تھے: ورایک خاتون نے ٹوک دیا تھا کہ اب مرنے کے بعد تذکرہ سے کیا فائدہ۔ مردہ

بیوی کا تذکرہ وہ کرتا ہے جسے دوسری بیوی نصیب نہیں ہوتی۔ لیکن جسے بہتر سے بہتر زوجہ میسر ہو گئی ہو وہ مرنے والی زوجہ کا ذکر کر رہا ہے۔ یہ مناسب نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا سچ ہے لیکن تم نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ خدیجہ اور تم سب میں بڑا فرق ہے۔ خدیجہ اس وقت ایمان لے آئیں جب کوئی ایمان لانے والا نہ تھا۔ خدیجہ نے اس وقت میری تصدیق کی جب کوئی تصدیق کرنے والا نہ تھا۔ خدیجہ نے اس وقت مالی ہمدردی کی جب میں غربت کے دور سے گذر رہا تھا۔ اور خدیجہ نے اس وقت مجھے صاحب اولاد بنایا جب لوگ ابتر کے طعنے دے رہے تھے یعنی خدیجہ کی آغوش نے مجھے ابتر کے طعنہ سے بچایا اور کوئی تو اتنا بھی نہیں کر سکا۔

یہ قدرت کا کرم ہے کہ کس کو کیا عطا کرے۔ عرب کی عورتوں نے بائیکاٹ کر دیا تو اللہ نے خدیجہ کو زہراؑ جیسی دختر دے کر ان کی نسل کو قیامت تک کے لئے قائم کر دیا اور دنیا نے عجم کو نگاہوں سے گرا دیا تو قدرت نے انکی آغوش کو مرکزِ امامت بنا دیا۔

امامت و ہدایت ایک ایسا منصب ہے جو سن و سال۔ عمر و قد۔ حالات و کیفیات کا تابع نہیں ہے۔ امامؑ اپنی صلاحیتیں اپنے ہمراہ لے کر آتا ہے۔ اور جس وقت ذمہ داری سپرد کی جاتی ہے۔ اپنے فرائض پر عمل شروع کر دیتا ہے۔ چنانچہ امام علی نقیؑ کی عمر شریف تقریباً ۶-۷ برس کی تھی۔ جب امام محمد تقیؑ کا انتقال ہوا۔ لیکن امامت و شریعت کی ذمہ داریوں کو اس کمال کے ساتھ سنبھالا کہ دنیا کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور کیوں نہ ہوتا باپ تھا تو وہ بھی کمسنی میں علم کے جوہر دکھا چکا تھا۔ اور دادا تھا تو وہ بھی باب مدینۃ العلم تھا اور جب ساری نسل مرکز کمالات تھی تو عمر و سن کا سوال ہی کیا پیدا ہوتا ہے۔

حکومتوں کا دباؤ قیامت کا تھا۔ اذیتوں کا سلسلہ برابر قائم تھا۔ لیکن

امامؑ کا فرض ہدایت ادا ہو رہا تھا۔ مدینہ کا ماحول۔ علماء کا مرکز۔ مسجدِ پیغمبرؐ جیسی جگہ اور امام علی نقی علیہ السلام کے مواعظ۔ دیکھنے کا منظر تھا۔ اور سننے کے مسائل مگر افسوس کہ زمانہ نے قدر نہ کی اور جو کچھ سنا اسے ہوا میں اڑا دیا۔ بیانات کا ایک بڑا مختصر حصہ ہے جو تاریخ کے اوراق میں دبا رہ گیا۔ ورنہ شاید اسے بھی محو کر دیا جاتا۔ ایسے ایسے اہم سوالات جن کے جوابات کی آج کے دور کو ضرورت ہے لیکن ان میں سے بعض کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے۔

ابو ہاشم جعفری کہتے ہیں کہ میں حضرت کی خدمت میں حاضر تھا۔ ایک شخص نے آکر آپ سے ہندوستانی زبان میں گفتگو شروع کی۔ آپ برابر باتیں سنتے جاتے تھے اور جواب دیتے جاتے تھے۔ مجھے سخت ہوئی کہ حضرت اس کی زبان میں کیسے گفتگو فرما رہے ہیں۔ جب وہ چلا گیا تو میں نے عرض کی فرزند رسولؐ، میں نے عجب منظر دیکھا ہے آپ اس سے اسی کی زبان میں گفتگو کر رہے تھے۔ حالانکہ آپ کا اس زبان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

فرمایا۔ ابو ہاشم میں امامؑ ہوں اور امامؑ ہر زبان سے واقف ہوتا ہے۔ ہر زبان سے واقف نہ ہوگا تو ہر قوم کی ہدایت کیسے کرے گا۔ وہ اور ہیں جو جہالت کے زور پر امام ہو جاتے ہیں۔ اسلام کی امامت آدمؑ کے دور سے علم و کمالات کے ساتھ چل رہی ہے۔

یہ کہہ کر فرمایا ابو ہاشم! ذرا ایک کنکری تو اٹھاؤ۔ ابو ہاشم نے کنکری اٹھا کر حضرت کے دست اقدس پر رکھی۔ آپ نے اسے دہن اقدس میں رکھا اور جب لعاب دہن سے تر ہو گئی تو فرمایا۔ ابو ہاشم! اسے اب اپنے دہن میں رکھ لو ابو ہاشم کہتے ہیں کہ میں نے تعمیل ارشاد کی اور اب جو کنکری کو اپنے دہن میں رکھا تو ایسا محسوس ہوا کہ میں ستر زبانوں کا ماہر ہو گیا ہوں اور ہندوستانی تو

ایسی کہ نہ پوچھئے۔ (منتہی الآمال)۔ کہئے تو عرض کروں کہ جس کے لعاب دہن میں یہ تاثیر ہو اس کے علم کا کیا عالم ہوگا۔ اور لعاب دہن تقریباً جسم کا فاضل حصہ ہوتا ہے جو اکثر جدا کر دیا جاتا ہے۔ جب اس میں یہ اثر ہے تو خون میں کیا اثر ہوگا جسے رسول اللہؐ نے خود اپنا خون قرار دیا ہے۔ اور دوسری لفظوں میں یہ کہا جائے کہ دنیا لعاب دہن کے ذریعہ قرآن کے ورق کھولتی ہے۔ امامؑ نے لعاب دہن کے ذریعہ علوم کے دروازے کھول دیئے اور دنیا پر واضح کر دیا کہ ہم جب اس قدر عنایت کر سکتے ہیں تو ہمارے پاس کس قدر ذخیرہ ہوگا۔ ہمارے در پر آؤ تو سہی پھر دیکھو کیا کیا ملتا ہے۔ زندہ آؤ گے تو علوم و کمالات دیدیں گے اور مر جاؤ گے تو موت کو شہادت بنا دیں گے۔

فتح بن خاقان جو وزیر مملکت کے عہدہ پر فائز تھا۔ امام علی نقیؑ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے۔ عرض کرتا ہے فرزند رسولؐ! ذرا توحید کے معنی تو بیان فرمایئے۔ آپ نے فرمایا وہ خدا ایسا ہے کہ نہ اس کا کوئی جزو ہے نہ شریک۔ نہ مخلوقات سے قریب ہے نہ بعید۔ سب کو اس نے پیدا کیا ہے۔ اس کو کسی نے نہیں پیدا کیا۔ ہر شے کا جاننے والا ہے اور ہر چیز کا دیکھنے والا ہے۔ اس کا کوئی مثل و نظیر ممکن نہیں ہے۔ وہ واحد و یکتا ہے

فتح کہتا ہے سرکار یہ شان تو بندہ میں بھی پائی جاتی ہے۔ بندے بھی یکتا ہوتے ہیں۔ بندے بھی بے مثل و بے نظیر ہوتے ہیں تو خدا میں کیا خاص بات ہے؟

فرمایا فتح یاد رکھو بندوں کا ایک ہونا اور ہے اور خدا کی وحدانیت اور ہے۔ بندہ ایک ہو کے بھی ہزاروں اجزاء سے مرکب ہوتا ہے۔ اس میں خون بھی ہے اور گوشت بھی۔ ہڈی بھی ہے اور چمڑا بھی۔ یہ سب ہے کہ ایک ہے۔ اس

کی وحدت ہی ہزاروں کثرتوں کا مجموعہ ہے۔ اس کا بے مثل ہونا بھی اسی طرح کا ہے کہ ہزار امثال کے ہوتے ہوئے بھی بے مثل کہا جاتا ہے۔ لیکن خدا کی وحدت و یکتائی اس سے بالکل مختلف ہے۔ اس کا نہ کوئی جز ہے نہ شریک۔ وہ نہ مرکب ہے نہ جزو مرکب۔ اس کی شان ہی انوکھی اور اس کا انداز ہی نرالا ہے۔

فتح عرض کرتے ہیں۔ فرزند رسولؐ! یہ لطیف کے کیا معنی ہیں اور خدا کے لطیف و خبیر ہونے کا کیا مطلب ہے؟

فرماتے ہیں فتح یاد رکھو اس نے لطیف ترین اور نازک ترین مخلوقات کو بھی پیدا کیا ہے تو اس سے زیادہ لطیف کون ہوگا۔ ذرا اس کی مخلوقات پر تو نظر ڈالو۔ کیسی نازک گھاس، کیسے نازک پھول، کیسی نازک پتیاں۔ کیسی نازک پتیوں میں رگیں۔ چھوٹی چھوٹی چیونٹیاں۔ چیونٹیوں کے واسطے روزی۔ ہر مخلوق کا ایک مقصد۔ ہر مخلوق کی ایک ذمہ داری۔ سب میں بچے جوان نر مادہ ماں باپ، جوڑے اور جفت۔ سب کے لئے حفاظت کا الگ انتظام۔ سب کے لئے غذا کا الگ نظام سب کے الگ الگ حرکات۔ سب کی الگ الگ بولیاں۔ دریاؤں میں مچھلیاں۔ مچھلیوں کے اقسام۔ ہر ایک کی الگ بناوٹ ہر ایک کی جداگانہ صنعت ـــــ کیا یہ سب اس بات کی دلیل نہیں ہیں کہ بنانے والا لطیف و خبیر ہے۔ ایسا لطیف کہ نزاکتوں کا انبار لگا دیا ہے۔ اور ایسا خبیر کہ کوئی چیز نگاہوں سے غائب نہیں ہے۔

بات تمام ہوگئی لیکن جی چاہتا ہے کہ عرض کروں فرزند رسولؐ! اس خالق کی یکتائی اور بے نیازی میں شک نہیں ہو سکتا۔ اس کے لطیف و خبیر ہونے میں شبہ کرنا کفر ہے۔ لیکن فرزند رسولؐ! آپ کتنے لطیف و خبیر ہیں کہ ان تمام نزاکتوں پر نگاہ رکھے ہوئے ہیں اور ان تمام باریکیوں کی مکمل اطلاع

رکھتے ہیں۔ جہاں سیکڑوں سال میں علم دنیا نہیں پہونچتا وہاں آپ کی نگاہ لمحوں میں کام کرتی ہے۔ عجب نہیں آپ فرمائیں کہ تجھے نہیں معلوم میں نمائندۂ پروردگار ہوں اور خدائے لطیف و خبیر کسی جاہل کو اپنا نمائندہ نہیں بنا سکتا وہ جب کسی کو اپنا نمائندہ اور جانشین بناتا ہے تو اسی قسم کے کمالات دے کر بھیجتا ہے جس قسم کے کمالات کا خود حامل ہے وہ ایسا باکمال بنا دیتا ہے کہ بندہ بندگی کرنے کے بعد بھی "خدا نما" نظر آتا ہے۔ اور کبھی کبھی خدائی کے جلوے اس قدر نمایاں ہو جاتے ہیں کہ بندہ پر خدا کا دھوکہ ہو جاتا ہے۔

فتح بن خاقان نے سوال کرکے یہ بھی واضح کر دیا کہ اہل دنیا دیکھ لو دھوکہ میں نہ رہنا میں وزیر مملکت ہوں۔ متوکل کے جملہ امور کا مالک ہوں۔ صبح و شام کی نشست و برخواست ہے۔ لیکن یہ مسائل حضرت علی نقیؑ سے دریافت کرتا ہوں۔ متوکل سے نہیں تاکہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ تخت و تاج کا مالک متوکل ضرور ہے۔ لیکن علم و کمال کی وراثت فرزند رسولؐ کے پاس ہے۔ اور یاد رکھو جو متوکل توحید کے معنی نہیں بتا سکتا اسے خدائے وحدہٗ لاشریک کا نمائندہ کس طرح تسلیم کیا جا سکتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ فتح بن خاقان رہے متوکل کے دربار میں۔ لیکن عقیدت فرزند رسولؐ سے وابستہ کئے رہے۔ اور یہ جانتے رہے کہ علم ان کے پاس ہے۔ دین ان کے پاس ہے شریعت ان کے پاس ہے۔ نجات ان کے قبضہ میں ہے۔ متوکل کے پاس تخت حکومت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اور وہ بھی جتنے دن ہے اتنے دن ہے۔ ظلم کا سلسلہ دائمی نہیں ہوتا۔ وہ ایک دن بہرحال فنا ہو جاتا ہے۔ بقا مظلومیت کے لئے ہے۔ کمال کے لئے ہے۔ جوہر کے لئے ہے اور اس کا مخزن و مرکز اہلبیتؑ رسولؐ کے سوا کوئی نہیں ہے۔

فتح بن خاقان کا ذکر ہے۔ یہ تو امام کا ایک عقیدتمند تھا۔ اکثر اوقات ایسا ہوا ہے کہ حکومت نے بڑے بڑے صاحبان علم تلاش کئے ہیں اور انھیں حضرت کے سامنے پیش کیا ہے تاکہ وہ امامؑ سے سوال کریں۔ اور جب امامؑ جواب نہ دے سکیں تو انکی رسوائی ہو۔ نہ جانے کس قدر دلچسپی ہے اہل دنیا کو آل رسولؐ کی ذلت و رسوائی سے اور کس قدر جاہل ہے یہ دنیا کہ ہزاروں بار کے تجربوں کے بعد بھی ہوش نہیں آتا کہ ان کے پاس کمالات کے خزانے ہیں۔ انھیں کوئی رسوا نہیں کرسکتا۔ ان کے رسوا کرنے والے ہمیشہ ذلیل ہوتے رہے ہیں۔ لیکن ایک طرف نشۂ حکومت اور دوسری طرف نشۂ شراب۔ جب بھائی کو بھائی اور بیٹے کو باپ پر رحم نہیں آتا اور قتل و خون کا سلسلہ جاری ہے تو امامؑ کی عزت و آبرو سے کیسے ہمدردی ہو سکتی ہے۔

قدرت نے بھی کہا کہ ہاں ہاں تم سوال کرو۔ تم دربار میں بلاؤ۔ تم امتحان لو تو سہی کہ ہم تمھارے ہی ذریعہ ان کے کمالات کا اعلان کریں اور تمھارے ہی دربار میں ان کے فضائل کا کلمہ پڑھوائیں۔ چنانچہ ایک علیؑ کو آزما چکے ہو اور سر دربار اعتراف کر چکے ہو کہ علیؑ نہ ہوتے تو ہلاکت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اب ایک علیؑ کو اور آزما لو تو سہی دوبارہ وہی کلمہ پڑھنا پڑے اور اقرار کرنا پڑے کہ یہ نہ ہوتے تو حکومت غرق فنا ہو چکی ہوتی۔

متوکل کے دور میں ابن سکیت ایک بہت بڑا عالم تھا۔ اسے اپنے علم پر ناز تھا اور متوکل کو بھی اس پر اعتماد تھا۔ ایک مرتبہ ابن سکیت سے کہنے لگا کہ ذرا علی نقیؑ کا امتحان لو اور ان سے ایسے سوال کرو کہ یہ جواب نہ دے سکیں۔ ابن سکیت نے کہا یہ کون سی بڑی بات ہے۔ اور اپنی دانست میں بہا لیا ئی سوالات لے کر حضرت کے سامنے آ گیا۔ ذرا یہ تو فرمایئے کہ اللہ نے ہر نبی کو الگ الگ معجزہ

کیوں دیا۔ جناب موسیٰ کو عصا دیا۔ جناب عیسیٰ کو مردوں کو زندہ کرنے اور مریضوں کو شفایاب بنانے کی طاقت دی۔ پیغمبر اسلامؐ کو قرآن اور تلوار دی ایسا کیوں ہوا جب سب اسی ایک خدا کے نمائندے تھے اور سب کو خدا ہی نے بھیجا تھا تو معجزات میں اختلاف کیوں ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تمہیں معجزہ کی حقیقت ہی نہیں معلوم ہے۔ معجزہ حالات کے تحت دیا جاتا ہے تاکہ اس دور کے لوگ اس کی قدر کو پہچانیں اور یہ سمجھیں کہ صاحب اعجاز مافوق بشر طاقت رکھتا ہے۔ جناب موسیٰ کے دور میں جادو کا زور تھا۔ اللہ نے انھیں عصا دیدیا۔ جناب عیسیٰ کے دور میں طب کا زور تھا اللہ نے انھیں مسیحائی دیدی۔ حضور سرور کائناتؐ کے دور میں فصاحت و بلاغت اور شجاعت کا زور تھا اللہ نے انھیں قرآن اور تلوار دیدی۔

ابن سکیت نے کہا کہ اچھا آج جب کوئی صاحب اعجاز نہیں ہے تو لوگوں پر خدا کی حجت کیا ہے؟ آپ نے فرمایا عقل ــــ اس نے کہا عقل تو کل بھی موجود تھی۔ آپ نے فرمایا کہ بیشک لیکن کل سچ اور جھوٹ میں امتیاز نہیں قائم ہوا تھا اب امتیاز قائم ہو چکا ہے اور معیار مقرر ہو چکے ہیں۔ اب حق و باطل کی تفریق میں کوئی زحمت نہیں ہے اور عقل بآسانی یہ کام کرسکتی ہے۔ یہ سننا تھا کہ سکیت نے سکوت اختیار کر لیا اور ابن اکثم بول پڑا کہ مناظرہ ابن سکیت کے بس کا کام نہیں ہے۔ اب میں سوالات کروں گا چنانچہ سوالات کی ایک فہرست پیش کر دی۔ حضرت نے ابن سکیت کو جوابات لکھوانا شروع کر دیئے۔

سوالات کا سلسلہ یہ تھا کہ ابن اکثم نے کہا اچھا یہ تو بتایئے کہ جناب سلیمانؑ کے دربار میں "الذی عندہ علم من الکتاب" کون تھا؟ آپ نے فرمایا کہ

آصف بن برخیا۔ اس نے کہا کہ جب حضرت سلیمان کو معلوم تھا کہ یہ کام آصف کر سکتے ہیں اور تخت بلقیس کو وہی لا سکتے ہیں تو یہ کیوں کہا کہ تم میں کون ہے جو چشم زدن میں تخت بلقیس کو لے آئے اور کیا حضرت سلیمان کو خود وہ علم نہیں تھا جو آصف کے پاس تھا کہ ان سے مدد لی ؟ آپ نے فرمایا کہ یہ انداز اختیار نہ کیا ہوتا تو آصف کا کمال اور ان کی انفرادیت کا اندازہ نہ ہوتا اور ان کے وصی رسول ہونے کا اعلان نہ ہو سکتا۔ قدرت نے چاہا کہ دنیا پر واضح کر دے کہ نبی کا وصی ایسا باکمال ہوتا ہے۔

ابن اکثم نے کہا اچھا یہ تو فرمائیے کہ حضرت یعقوبؑ نے حضرت یوسفؑ کو سجدہ کیوں کیا تھا۔ کیا کسی باپ کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنے بیٹے کو سجدہ کرے۔

اور کیا خدا کے علاوہ کوئی اور بھی قابل سجدہ ہے ؟ آپ نے فرمایا کہ یوسف کا سجدہ اسی طرح تھا جس طرح ملائکہ نے حضرت آدم کو سجدہ کیا تھا کہ اصل سجدہ حکم خدا کا تھا۔ آدم کو صرف ذریعہ بنایا گیا تھا۔ جناب یعقوب نے بھی یوسف کے زندہ مل جانے پر سجدہ شکر کیا تھا۔ اور سجدۂ شکر خدا کے لئے ہوتا ہے۔ بندے کے لئے نہیں۔

ابن اکثم سوال کرتے کرتے آخر اس منزل پر آیا کہ جس درخت سے جناب آدمؑ کو روکا گیا تھا وہ کون سا درخت تھا۔ آپ نے فرمایا کہ وہ شجرۂ حسد تھا۔ اللہ اولاد آدم کو حسد سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ اس لئے آدم کو منع کیا تھا۔ (مناقب)

امامؑ نے جواب کے ساتھ بے شمار مسائل حل فرمادیئے اور ابن اکثم یا متوکل کو خبر بھی نہیں ہوئی۔ آپ نے یہ بھی واضح فرمادیا کہ جب تک صاحب منصب صاحب اعجاز نہ ہوگا۔ منصب ثابت نہیں ہوگا۔ اور یہ بھی واضح کر دیا کہ صاحب اعجاز کو

اپنے دور کے تمام افراد سے بالاتر ہونا چاہیئے۔ جو دور کے کسی ایک آدمی سے کمتر ہو وہ صاحب منصب نہیں ہو سکتا۔ اس مسئلہ کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ عقل کے ہوتے ہوئے حق و باطل میں امتیاز نہ کرنا انسانیت کے خلاف ہے اور یہ مسئلہ بھی واضح کر دیا کہ اگر سلیمان کا وصی اتنا صاحب علم و کمال ہو سکتا ہے تو رسول اکرمؐ کے وصی کو کیا ہونا چاہیئے ـــــ اور گفتگو تمام کرتے کرتے یہ بھی اشارہ کر دیا کہ اللہ اولاد آدمؑ کو حسد سے بچانا چاہتا تھا۔ لیکن اولاد آدمؑ نے اپنی آدمیت کھو دی اور بالآخر حسد میں مبتلا ہو گئی۔ جس کا زندہ ثبوت یہ ہے کہ تجھ جیسا جاہل اور متوکل جیسا بدکردار بھی میرے مقابلہ میں آتا ہے اور آل محمدؐ کے کمالات کو سلب کرنا چاہتا ہے۔ قدرت نے روز اول ہی اعلان کر دیا تھا کہ حسد کرنے والو ! تمہیں جلنا ہے تو خوب جلو ہم نے آل ابراہیم کو کتاب بھی دی ہے۔ اور حکمت بھی اور انھیں ملک عظیم بھی عنایت کر دیا ہے۔

ابن اکثم کا ذکر نہیں ہے۔ کبھی کبھی حکومت وقت کو بھی شوق ہوا ہے کہ امامت کا امتحان لے اور امتحان لیا بھی ہے۔ لیکن نتیجہ میں ذلت و رسوائی کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہوا اور قدرت نے ثابت کر دیا کہ جسے ہم عزت دینا چاہتے ہیں اسے کوئی ذلیل نہیں کر سکتا۔ تم مسائل دریافت کرو تاکہ ہمارے نمائندہ کے کمالات سامنے آئیں اور ہم تمھیں ایسے مشکلات میں گرفتار کریں کہ تم مسائل دریافت کرنے پر مجبور ہو جاؤ۔ چنانچہ تاریخ کا مشہور و معروف واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ متوکل کو زہر دیا گیا۔ اور وہ زندگی سے مایوس ہو گیا تو اس نے نذر کی کہ اگر میں صحتیاب ہو گیا تو راہ خدا میں مال کثیر خیرات کروں گا۔ اتفاق سے اس کی موت مقدر نہیں تھی اور وہ بچ گیا۔ اب مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ مال کثیر سے مراد کیا ہے۔ علماء کو جمع کیا گیا۔ مسئلہ دریافت کیا گیا۔ ہر ایک

نے اپنی رائے کے مطابق تعبیر کرنا شروع کردی۔ کسی کے یہاں ہزار کثیر ہے۔ کسی کے یہاں لاکھ کثیر ہے۔ کسی کے یہاں پورا خزانہ کثیر ہے۔ کوئی اپنی حیثیت کے مطابق سوچ رہا ہے۔ کوئی متوکل کے حیثیت کے مطابق غور کر رہا ہے۔ مسئلہ کا کوئی حل نہیں نکلتا۔ سب پریشان ہیں۔ بالآخر متوکل نے امام علی نقیؑ سے دریافت کرایا۔ آپ نے فرمایا کہ ۸۰ درہم راہ خدا میں خرچ کردے۔ متوکل نے پوچھا کہ دلیل کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ پروردگار نے قرآن مجید میں "کثیر مقامات" پر پیغمبرؐ کی نصرت کا تذکرہ کیا ہے اور وہ کثیر مقامات ۸۰ مقابلے تھے جہاں پروردگار نے اپنے حبیب کی نصرت کی ہے۔ لہٰذا قرآن کی زبان میں کثیر کا اطلاق ۸۰ پر ہوتا ہے۔ (مناقب)

متوکل پھڑک اٹھا، اور علماء بھڑک اٹھے کہ انھوں نے مسئلہ کو حل کر دیا اور ہم حل نہ کر سکے۔ میں کہوں گا کہ اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ یہ تاریخ کا پرانا دستور رہا ہے کہ جب ارباب دولت مسئلہ کو حل نہ کر سکے تو کسی علیؑ ہی نے مسئلہ کو حل کیا ہے۔ "مشکل کشا علیؑ کا نام ہے امت کا نہیں۔"

دوسری منزل پر ایسا ہی واقعہ پھر پیش آیا کہ ایک عیسائی مرد نے ایک مسلمان عورت سے زنا کیا اور جب گرفتار کر کے حد جاری کرنے کے لئے لایا گیا تو فوراً کلمہ پڑھ لیا۔ متوکل حیران ہو گیا کہ اب کیا کیا جائے۔ یحییٰ بن اکثم نے فتویٰ دے دیا کہ اسلام کے بعد حد جاری نہیں ہو سکتی۔ متوکل نے امام علی نقیؑ سے دریافت کیا۔ آپ نے فرمایا۔ حد جاری کر دی جائے۔ علماء نے کہا کہ یہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے جواز کی دلیل کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ پروردگار عالم نے واضح لفظوں میں اعلان کیا ہے کہ جب مشرکین نے ہمارے عذاب کو دیکھا تو کہنے لگے کہ ہم اللہ پر ایمان لے آئے اور ہم مشرک نہیں ہیں۔ لیکن یہ کہنا ان کے حق میں مفید نہیں ہوا اور عذاب کے آنے کے بعد توبہ بے کار ہے۔ جب حد کا فیصلہ ہو چکا تو

اسلام لانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ لوگ مبہوت ہو گئے اور امامؑ کا فیصلہ نافذ ہو گیا۔ (مناقب)

تاریخ میں ایک دو مواقع نہیں ہیں۔ بیشمار مواقع ہیں جہاں امامت کے علم و کمال نے یہ واضح کر دیا ہے کہ اہل دنیا اور ہوتے ہیں اور اہل اللہ اور ——— دنیا والے جہالت سے کر تخت و تاج پر قبضہ کرتے ہیں اور اللہ والے تخت و تاج کو ٹھوکر مار کر علم و کمال کو اپنی میراث بناتے ہیں۔

آخری منزل پر دو ایک اور واقعات کی طرف اشارہ کر دیا جائے تاکہ بات مکمل ہو جائے۔ واثق باللہ نے اپنے دور کے علماء کو جمع کیا اور ایک عجیب و غریب سوال کیا۔ بتاؤ کہ جب حضرت آدمؑ نے پہلا حج کیا تھا تو ان کا سر کس نے مونڈا تھا۔ علماء حیران رہ گئے۔ ابھی یہی نہیں معلوم ہے کہ حضرت آدمؑ نے حج کیا بھی تھا یا نہیں۔ اور اگر کیا تھا تو سر منڈایا تھا یا نہیں۔ اور اگر منڈایا تھا تو دوسرے سے مدد لی تھی یا خود ہی مونڈ لیا تھا۔ کون بتائے۔ سب تو آدمؑ کی اولاد ہیں۔ کسے خبر کہ حضرت آدمؑ نے کیا کیا تھا۔ کوئی ہوتا تو بتاتا۔ اور ہوتا کیسے کیا بیٹا باپ سے پہلے ہو سکتا تھا۔ لیکن جب فرزند رسولؐ امام علی نقیؑ سے دریافت کیا گیا تو آپ نے فوراً فیصلہ کر دیا کہ جبریل امین نے جنت سے سامان لا کر بال کاٹے تھے اور علماء ششدر رہ گئے۔ (   ) میں کہوں گا فرزند رسولؐ! آپ کو کیسے معلوم ہو گیا۔ آپ بھی تو اولاد آدمؑ ہیں۔ آپ نے کہاں سے دیکھ لیا کہ جبریل امین جنت سے سامان لے کر آ رہے ہیں اور حضرت آدمؑ کے بال کاٹ رہے ہیں؟ آپ فرمائیں گے تم نے غور نہیں کیا۔ مجھ میں اور باقی امت میں یہی فرق ہے کہ امت آدمؑ کے بعد پیدا ہوئی ہے اسے آدم کے حالات کی اطلاع نہیں ہے اور میری خلقت آدمؑ سے ہزاروں سال پہلے ہوئی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ آدمؑ پر کیا گذری۔ ہم نے عالم انوار

سے سارے مناظر دیکھے ہیں۔ ہم شریک نور رسالت ہیں۔ ہمیں حالات کی خبر نہ ہوگی تو کسے ہوگی؟ کتنا فرق ہے ان لوگوں میں جو آدمؑ سے ہزاروں سال بعد پیدا ہوئے ہیں اور ان لوگوں میں جن سے آدمؑ ہزاروں سال بعد پیدا ہوئے۔ اور کیا قیامت ہے کہ پہلے خلق ہونے والے عصمت نواز ہیں اور بعد کو پیدا ہونے والے گناہ ثابت کریں۔ کیسی سعادتمند یہ اولاد آدمؑ ہے جو اس بات پر تلی ہوئی ہے کہ جنت میں آدمؑ کا گناہ ثابت کر دیا جائے اور اپنے بابا آدمؑ کو جنت سے نکلوا دیا جائے۔

میں کہوں گا۔ سن لو! آدمؑ کو جنت سے نکلوانے سے پہلے یہ سوچ لو کہ جب جنت میں رہنے والے آدمؑ ہی جنت میں نہ رہ سکے تو تم باہر رہ کر کس طرح جاؤ گے۔ کیا تمہارا کردار آدمؑ سے کچھ زیادہ پاکیزہ ہے اور کیا تم بھی کوئی خلیفۃ اللہ ہو اور اگر نہیں ہو تو سوچو کہ جب باپ ہی کا قبضہ نہ رہ سکا تو بیٹے کا قبضہ کہاں سے آجائے گا۔ اور ہم سے یہ تقاضا نہ کرنا اس لئے کہ ہم آدمؑ کے رشتے سے جنت میں جانے والے نہیں ہیں۔ ہمارا رشتہ معنوی ہے۔ مادی رشتہ پر ناز کر کے کیا کریں جس پر سکونت سے زیادہ کوئی حق نہیں مل سکتا۔ کیوں نہ وہ رشتہ قائم کریں جہاں جنت کا سارا اختیار دیدیا جاتا ہے۔ اور راہ خدا میں روٹیاں دیکر جنت خرید لی جاتی ہے۔ باشندوں کو دوسروں کو دے جانے کا حق نہیں ہوتا۔ خریدار کو مال کا پورا اختیار ہوتا ہے۔ شاید اسی لئے پیغمبر اسلامؐ نے اہلبیتؑ اور جنت کا رشتہ بیان کیا تو بالکل جداگانہ انداز سے بیان کیا۔ علیؑ کو دیکھا تو قسیم جنت و نار کہدیا۔ زہراؑ کو دیکھا تو خاتون جنت کہدیا شہزادوں کو دیکھا تو "سیدا شباب اہل الجنۃ" کہدیا۔ غرض پوری جنت پر انہیں کا قبضہ ہے۔ اب جسے جنت میں جانا ہو وہ ان کی ڈیوڑھی پر آئے۔ ان سے الگ ہوگیا تو جنت کا کوئی سوال نہیں ہے۔ اور غیر کا کیا ذکر ہے خود آدمؑ بھی دوبارہ نہ جا سکتے اگر انہیں کو وسیلہ نہ بناتے۔ اب کتنی بدبخت ہے وہ اولاد آدمؑ جو باپ کے

جادہ سے منحرف ہو جائے اور وسیلہ ہی کا انکار کر دے۔ کاش اس دنیا کو اتنا ہوش آ گیا ہوتا کہ جب بغیر وسیلہ کے آدمؑ جنت میں نہ جا سکے تو تم کیا جاؤ گے۔ ہاں ایک بات ضرور ہے کہ جہنم کے لئے وسیلہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے لئے اپنے اعمال ہی کافی ہیں۔ اب ممکن ہے کہ بعض افراد نے اسی لئے وسیلہ کا انکار کیا ہو کہ ہم وہاں جائیں گے جہاں دوسرے کا احسان ہی نہ لینا پڑے۔ یعنی جہنم میں جانا گوارا ہے اہلبیتؑ کا واسطہ دینا گوارا نہیں ہے۔

اور کہئے تو اس مقام پر ایک اور بات عرض کر دوں کہ جب ساری امت علیؑ اور اولاد علیؑ کے وسیلے سے جنت میں جائے گی تو میں اس کے اختیار و اقتدار کے بارے میں کیا کروں جو خود علیؑ کے وجود کا ظاہری وسیلہ ہے۔ میرا دل تو کہتا ہے کہ ابو طالبؑ کو یہ ناز کرنے کا حق ہے کہ ساری دنیا کے لئے وسیلہ علیؑ ہے اور علیؑ کے وجود کے لئے وسیلہ میں ہوں۔

اب امت کو اختیار ہے چاہے مجھے مسلمان کہے یا کافر۔ جنتی کہے یا جہنمی لیکن یہ سوچ لے کہ اگر میں جنت میں نہ گیا تو پھر کسی کے جانے کا امکان نہیں ہے جو بیٹا اپنے باپ کو جنت میں نہ لے جا سکے وہ کسی اور کو کیا لے جائے گا۔ دنیا والو! آدمؑ سے رشتہ پہلے توڑ لیا ہے اب علیؑ سے بھی رشتہ توڑ لو پھر دیکھو جنت میں کس طرح جانا ہوتا ہے اور جنت کو چھوڑ کر کہاں جانا ہوتا ہے۔

امام علی نقیؑ کا ذکر کرتے ہوئے ایک واقعہ کا تذکرہ کر دینا ضروری ہے کہ جب امت نے یہ دیکھا کہ جنت دکوثر علیؑ کے قبضہ میں ہے۔ اور آخرت پر انہیں کا اختیار ہے تو مولائے کائنات سے بھی رشتے جوڑنے لگے۔ یہ دنیا کا قدیم مزاج ہے کہ جب کوئی فائدہ نظر آتا ہے تو فوراً رشتے شروع ہو جاتے ہیں۔ اور سیاسی دنیا میں یہ بارہا آپ دیکھ چکے ہیں کبھی نبیؐ سے رشتہ جوڑا گیا۔ کبھی

امام سے رشتہ جوڑا گیا اور جب غرض نکل گئی تو انجام بھی سامنے آگیا۔ انھیں
مصنوعی رشتوں کا زور اس حد تک بڑھا کہ ایک عورت نے زینب بنت علیؑ
ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ اب اس سے بڑا رشتہ اور کیا ہو سکتا ہے اور اس سے
زیادہ مستحکم وسیلہ نجات کیا ہو سکتا ہے۔ لوگ برابر سمجھا رہے ہیں لیکن وہ
ماننے کے لئے تیار نہیں ہے اور اپنے کو زینب بنت علیؑ سمجھ رہی ہے۔ متوکل نے
عاجز آکر امام علی نقیؑ کو بلایا اور کہا کہ یہ آپ کے گھر کا مسئلہ ہے۔ اسے آپ
ہی حل کر سکتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ یہ تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اللہ نے بنی ہاشم
کا گوشت جانوروں پر حرام قرار دیا ہے۔ اسے درندوں کے درمیان ڈال دے
اگر اپنے دعویٰ میں سچی ہوگی تو زندہ بچ جائے گی ورنہ مسئلہ ہی ختم ہو جائے گا۔
عورت نے یہ فیصلہ سنا تو فوراً توبہ کر لی کہ میں نے غلط دعویٰ کیا تھا اور میں بنی ہاشم
میں نہیں ہوں۔

امام عالی مقام نے مقدمہ کا فیصلہ کر دیا اور بنی ہاشم کے شرف کا بھی اعلان
کر دیا۔ گویا آواز دے رہے تھے کہ متوکل تیری اور میری خلقت میں فرق ہے تیرے
اور میرے وجود میں فرق ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ تو مجھ سے مقابلہ کرنا چاہتا ہے۔
مالک کائنات نے میرے گوشت و پوست کو درندوں پر حرام کیا ہے۔ تیرے گوشت
و پوست کو حرام نہیں کیا ہے۔ یہاں ہمارے جسم جانوروں پر حرام ہیں۔ وہاں
آتش دوزخ پر حرام ہیں۔ تیرا نہ یہاں کوئی بچانے والا ہے نہ وہاں
کوئی ٹھکانا ہے۔

اور اے متوکل یاد رکھ غلط دعویٰ کو غلط ثابت کرنے والے بھی ہمیں ہیں۔
ہم جب چاہتے ہیں تو ایک لمحہ میں ساری حقیقت کھول کر رکھ دیتے ہیں۔ یہ ہمارا کرم
ہے کہ ہم دشمن کی بھی عزت بچا لیتے ہیں ورنہ ایک لمحہ میں ساری حقیقت کھل

جائے ---- یہ سب کچھ ہو گیا۔ لیکن حاسدوں سے یہ کمال بھی نہ دیکھا جا سکا اور
کسی نے بڑھ کر کہا امیر یہ بہترین موقع ہے علی نقیؑ کو ختم کر دینے کا۔ یہ خود بھی تو
اپنے کو بنی ہاشم میں کہتے ہیں۔ انھیں کو جانوروں کے درمیان بھیج دے قصہ
ہی ختم ہو جائے گا۔ متوکل نے کہا بات تو مناسب ہے۔ اور کہنے لگا فرزند رسولؐ
آپ بھی تو بنی ہاشم میں ہیں۔ ذرا ان جانوروں کے درمیان چلے جایئے تاکہ لوگوں
کو آپ کے فیصلہ کا یقین آجائے۔ آپ نے فرمایا۔ بیشک۔ یہ کہہ کر درندوں کی طرف
بڑھے۔ متوکل اپنے ساتھیوں کے ساتھ اوپر سے منظر دیکھ رہا تھا۔ جیسے ہی آپ
جانوروں کے درمیان پہونچے کیا دیکھا کہ ایک ایک جانور آکر سر قدموں پر رکھ
دیتا ہے اور حضرت سر پر دست شفقت پھیر رہے ہیں۔ (مناقب) متوکل یہ دیکھ
کر بے ہوش ہو گیا۔ اور سارے ارکان دولت کے ہوش و حواس اڑ گئے۔ یہ کیا
انقلاب آگیا۔ یہ جانور کس طرح اطاعت کر رہے ہیں۔ اور جانور آواز دے
رہے ہیں کہ انسانو! ہم سے درس معرفت لو۔ ہم جانور ہو کر امامؑ وقت کو پہچانتے ہیں
اور تم انسان ہو کر نہیں پہچانتے۔ شرم کی بات ہے تمہارے پاس جانوروں جیسی
عقل بھی نہیں ہے۔ کاش تم نے بھی اس کے قدموں میں سر جھکا دیا ہوتا۔ کاش
تم بھی اس کی اطاعت قبول کر لیتے۔ اور یاد رکھو تم اسے اذیت نہیں پہونچا سکتے
یہ وارث موسیٰؑ ہے اسے دریا ڈبو نہیں سکتا۔ یہ وارث ابراہیمؑ ہے اسے آگ جلا
نہیں سکتی۔ یہ وارث عیسیٰؑ ہے اسے سولی پر چڑھایا نہیں جا سکتا۔ یہ وارث محمدؐ ہے
اس پر کوئی جادو چل نہیں سکتا۔ یہ وارث علیؑ ہے اسے کوئی زیر نہیں کر سکتا۔ یہ خلیفۃ اللہ
ہے اسے کوئی فنا نہیں کر سکتا۔ مٹانے والے مٹ جائیں گے اور خلیفۃ اللہ زندہ اور
قائم رہے گا۔

سلسلۂ بیان تمام ہو رہا ہے تو ایک فقرہ اور سن لیجئے تاکہ امامؑ کا ایک

کمال اور منظر عام پر آ جائے۔ جو کمالات کے بیان کے لئے ایک عمر درکار ہے۔ امام کے دور میں ایک شخص تھا یونس نقاش جس کا کام تھا نگینوں پر نام کندہ کرنا۔ وہ حضرت کے عقیدتمندوں میں تھا۔ ایک مرتبہ حاکم وقت موسیٰ نے ایک نگینہ دیا اس پر کچھ نقش کر دیا جائے۔ اتفاق سے نقش کرنے میں نگینہ ٹوٹ گیا۔ یونس نے طے کر لیا کہ اب زندگی کی خیر نہیں ہے۔ وہ ڈر کر حضرت کی خدمت میں آیا اور عرض کی فرزند رسولؐ! میری وصیت سن لیجئے۔ آپ نے فرمایا خیر تو ہے۔ اس نے کہا مجھ سے غلطی ہو گئی ہے اور اب میرا قتل ضروری ہو گیا ہے۔ چاہتا ہوں کہ مرنے سے پہلے بچوں کے بارے میں کچھ وصیت کر دوں۔ آپ نے فرمایا گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ کل جب طلب کیا جائے تو میرا نام بتا دینا۔ اس نے عرض کی مولا حاکم بہت جلاد ہے۔ آپ نے فرمایا تو میرا نام بتا دینا۔ امامؑ کا حکم تھا خاموش ہو گیا۔ لیکن دل دھڑکتا رہا۔ دیکھئے اب کیا حشر ہوتا ہے کیسے قتل کیا جاتا ہوں کیسے سولی پر چڑھایا جاتا ہوں کیا انجام ہوتا ہے کہ اچانک حاکم کا نمائندہ آ گیا۔ یونس نے دیکھا اور دم نکل گیا۔ دوڑ کر حضرت کے پاس آیا۔ حضور بلانے والا آ گیا ہے۔ فرمایا کوئی بات نہیں ہے دربار تک چلے جاؤ۔ امامؑ کا حکم تھا خاموش واپس چلا گیا اور دربار میں حاضر ہو گیا حاکم نے دیکھتے ہی کہا کہ اگر تم نے اب تک نقش نہ کیا ہو تو نہ کرنا۔ میرے بچوں میں اختلاف ہو گیا ہے۔ اور میں چاہتا ہوں کہ نگینے کے دو حصے کر کے دونوں کے نام نقش کرا دوں۔ یہ سننا تھا کہ یونس کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ واہ رے میرے امامؑ تیرے قربان۔ کیا سکون و اطمینان کا نسخہ بتایا ہے۔ فوراً عرض کیا ہاں ہاں ہو جائے گا۔ کل ہی انشاءاللہ دونوں نقش آپ کو مل جائیں گے۔ یہ کہہ کر دربار سے واپس آئے۔ اور شکر پروردگار بجالائے (منتہی الآمال) دل نے آواز دی امام امام ہوتا ہے اور حاکم حاکم ہوتا ہے۔ حکومت لاکھ قہر و غضب کا مظاہرہ کرے اگر امامت بچانا چاہے تو کوئی روک نہیں سکتا اور کیوں نہ ہوتا۔ یہ تو دنیا کا دربار ہے جو رب العالمین کے دربار میں عذاب آخرت سے بچا سکتا ہے اس کی نظر میں عتاب شاہی کی کیا قیمت ہے۔ قربان جائیے اس امامؑ پر جو شدت مصائب میں بھی چاہنے والوں پر نگاہ رکھتا ہے اور ان کو بچانے کی فکر میں رہتا ہے۔ یہاں مصائب دنیا سے بچاتا ہے اور وہاں ہول محشر اور عذاب جہنم سے بچائے گا۔ صلوات

امام حسن عسکری علیہ السلام

اسم مبارک	حسنؑ
لقب	عسکری۔ زکی
کنیت	ابو محمد
والد ماجد	امام علی نقیؑ
والدۂ ماجدہ	جناب سوسن
ولادت	۱۰ ربیع الثانی ۲۳۲ھ جمعہ مدینہ منورہ
شہادت	۸ ربیع الاول ۲۶۰ھ
عمر مبارک	۲۸ سال
قبر مطہر	سامرہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید الانبیاء والمرسلین خاتم النبیین سیدنا ومولانا ابی القاسم محمد وآلہ الطیبین الطاہرین ولعنۃ اللہ علیٰ اعدائھم اجمعین اما بعد فقد قال اللہ الحکیم فی کتابہ الکریم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِنَّ عَلَیْنَا لَلْهُدٰى وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى

مالک کائنات کا ارشاد ہے "بیشک ہدایت کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے اور دنیا و آخرت کا اختیار ہمارے ہاتھوں میں ہے۔"

ہمارے اختیارات کے ہوتے ہوئے کسی کو حق نہیں ہے کہ وہ ہدایت کا کوئی انتظام کرے۔ ہم نے اپنے نظام میں اور کوئی نقص و عیب نہیں چھوڑا اور جب ہمارے نظام میں کوئی نقص نہیں ہے تو بندوں کو کیا حق پہونچتا ہے کہ وہ کامل نظام کے ہوتے ہوئے کسی ناقص نظام کا بندوبست کریں اور اور نظام ہدایت ایسے افراد کے ہاتھوں میں دیدیں جو خود ہی گمراہ ہوں اور دین و مذہب کو تباہ و برباد کردینے میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھیں۔

تاریخ اسلام گواہ ہے کہ دنیا والوں نے جب بھی ہادی اور راہنما بنایا تو اس سے فساد کے علاوہ کوئی خیر دیکھنے میں نہیں آیا ظاہری طور سے چند روزہ رونق ضرور دکھائی دی لیکن اندرونی طور پر مذہب اتنا کھوکھلا ہوگیا کہ اس میں خواہشات نفس کے علاوہ کچھ نہ رہ گیا۔ انتہا یہ ہے کہ بندگی بھی خواہشات نفس کی ممنون کرم ہوگئی اور کسی نے شوق بندگی میں صبح کی چار رکعت نماز پڑھادی۔ کسی نے جوش عبادت میں بدھ ہی کے دن جمعہ کی نماز پڑھادی۔ کسی نے رات رات بھر کے لئے مستقل نماز ایجاد کردی

کسی نے نئے قسم کا روزہ نکال دیا۔ کسی نے جدید انداز کا حج ایجاد کر دیا اور اس میں سے طواف نساء غائب کر دیا۔ غرض جسے جتنا موقع ملا اس نے مذہب کے نام پر اتنا ہی مذہب کو تباہ کیا۔ اور بندگی کے بھروسہ پر نظام بندگی کو اتنا ہی غارت کیا۔

علمائے اسلام کے حوصلے اس قدر بلند ہوگئے کہ فتووں میں ایک نیا رخ پیدا ہوگیا۔ "یہ رسول اللہ نے کہا ہے اور یہ میں کہہ رہا ہوں"۔ "یہ رسول اللہ کی سنت و سیرت ہے اور یہ میرا فرمان وارشاد ہے"۔ "یہ قرآن مجید کا بیان ہے اور یہ میری مصلحت ہے"۔ "یہ رب العالمین کا حکم ہے اور یہ میرا خیال ہے"۔ خیال و وہم وظنون کا سلسلہ اس حد تک پہونچا کہ سارا دین نیا دین بن گیا اور سارا اسلام جدت طرازیوں کی نذر ہوگیا۔ اور جب روٹی توڑنے والے علماء کا یہ حال تھا تو صاحبان دربار و بارگاہ سلاطین کا کیا عالم ہوگا۔ ان کا تو ہر عمل دین و مذہب بنے گا۔ اور ان کے تو ہر اشارے پر دین و آئین میں نئی نئی تبدیلیاں ہوں گی۔

آپ اسلام کی تاریخ پڑھیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ خدائی نظام کے مقابلہ میں اپنا نظام چلانے والوں نے دین خدا کو کس کس طرح تباہ و برباد کیا ہے۔ اور علماء و سلاطین نے مل کر آئین مذہب کو کس کس طرح غارت کیا ہے۔ کوئی حرام حرام نہ رہ گیا۔ اور کوئی حلال حلال نہ رہ گیا۔ کسی نے شراب کو حلال کہا۔ کسی نے سود کو جائز کیا۔ کسی نے سوتیلی ماں سے نکاح کو مباح کیا۔ کسی نے اپنی بیٹی کی عفت پر ہاتھ صاف کیا۔ کسی نے جوئے کی حلیت کی فتویٰ دیا۔ کسی نے بندر نچانے کو عبادت بنایا۔ کسی نے توہین علماء کو شعار بنایا اور مشترکہ طور پر سب نے اللہ والوں کے مٹانے

کو عظیم عبادت کا درجہ دیدیا۔ بادشاہ وقت اور قاضی دربار ہر فریضہ سے غافل ہو سکتا ہے لیکن اس فریضے سے غافل نہیں ہو سکتا۔ قدرت نے بھی طے کر لیا کہ تم ستاتے جاؤ ہم بناتے جائیں گے۔ اور ایک دن آئے گا جب تم بھی اس کی چوکھٹ پر سجدہ کرتے ہوئے نظر آؤ گے۔ ہم نے اپنے نمائندوں کو تخت و تاج نہیں دیا لیکن وہ جوہر علم و صداقت دیا ہے کہ جب مذہب پر کوئی وقت پڑے گا اور اقتدار کی چولیں ہلتی ہوئی نظر آئیں گی تو تم اسی کی چوکھٹ پر سجدہ کرتے ہوئے دکھائی دو گے۔ تاریخ میں ایک دو واقعات نہیں ہیں۔ بیشمار واقعات ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ سلاطین دنیا نے مذہب کے نام پر اپنا نظام قائم تو کر لیا لیکن جب کوئی مشکل آن پڑی تو سوائے اللہ والوں کی چوکھٹ پر جبیں سائی کے کچھ بن نہ پڑی۔ کیا تاریخ اس حقیقت کو جھلا دے گی کہ اسحاق کندی نے اسی اصلاحی ذوق کا سہارا لے کر الفاظ قرآن کے نئے نئے معانی تراش کر ایک پوری کتاب تیار کر دی اور اس کا موضوع یہ قرار دیا کہ قرآن مجید کے بیانات میں بے حد تضاد ہے۔ وہ ایک مقام پر کچھ کہتا ہے اور دوسرے مقام پر کچھ کہتا ہے۔ کہیں دو مقامات پر بیانات میں اتحاد اور یک رنگی نہیں ہے اور ہونا بھی نہیں چاہیئے۔ جب ۲۳ برس میں مسلسل نازل ہوا ہے تو کسے یاد رہتا ہے کہ ۲۲ برس پہلے کیا کہا تھا اور اب کیا کہہ رہا ہوں۔ جو جس وقت سمجھ میں آیا بیان کر دیا۔ اور جس آیت کی جس وقت مصلحت دکھائی دی نازل کر دی۔ کون دیکھتا ہے کہ صحیح کیا ہے غلط کیا ہے۔ سب تو ماننے والے اور ایمان لانے والے ہیں۔ انھیں کہاں ہوش ہے کہ صحیح اور غلط پر نگاہ کریں۔ اور یہ دیکھیں کہ بیانات میں تضاد اور اختلاف ہے۔

جس قرآن کا یہ دعویٰ تھا کہ اگر یہ قرآن غیر خدا کی طرف سے ہوتا تو اس میں اختلاف کثیر ہوتا۔ اسی قرآن میں اختلاف نکال لیا گیا اور حکومت وقت تماشا دیکھتی رہی۔ علماء حیران رہے۔ عوام گمراہ ہوتے رہے۔ عزتِ قرآن خطرہ میں پڑی ہے۔ آبروئے اسلام جاتی رہی۔ صداقت الٰہی پر حرف آتا رہا۔ لیکن حکومت تماشائی بنی رہی۔ کرے بھی تو کیا کرے۔ کس کے پاس اتنا علم ہے کہ اسحاق کا جواب دے سکے اور کس میں اتنا حوصلہ ہے کہ اس کے مقابلے میں آسکے۔ اب وہ دور بھی نہیں رہا جب تازیانوں سے لوگ چپ کر دیئے جاتے تھے۔ اب بھی یہ کام ہوتا اگر اسحاق فضائل اہلبیتؑ میں کوئی آیت یا حدیث بیان کرتا۔ لیکن اس نے تو عظمت قرآن پر حملہ کیا ہے۔ اسے سزا دینے کی کیا ضرورت ہے۔ جب ولید قرآن کو پارہ پارہ کر کے اور اس پر مشق تیر اندازی کر کے "خلیفۃ المسلمین" ہو سکتا ہے تو کسی دوسرے خلیفہ کو کیا غرض ہے کہ وہ عزتِ قرآن کا تحفظ کرے۔ یہ حسبنا کتاب اللہ والے ہیں "اِنِّیْ تَارِكٌ فِیْكُمُ الثَّقَلَیْنِ" والے نہیں ہیں۔

بالآخر جب فرزند رسولؐ امام حسن عسکریؑ نے دیکھا کہ اب اسلام کی آبرو مٹنا چاہتی ہے تو کندی کے ایک شاگرد سے فرمایا کہ تم اپنے استاد کو اس حماقت سے کیوں نہیں روکتے۔ اس نے کہا فرزند رسولؐ! وہ ہم سے کہیں زیادہ قابل و فاضل ہیں۔ ہم ان سے کیا منہ لگ سکتے ہیں اور ہماری کیا مجال ہے کہ ہم ان سے بحث کریں۔ کبھی کبھی یہ قابلیت بھی وبال جان بن جاتی ہے اور زیادہ قابل ہونے کا خیال بھی انسان کو گمراہ کر دیتا ہے اور سچ بھی ہے۔ زیادہ کھانے والا اگر ہضم نہ کر سکے تو کالرا ہو جاتا ہے۔ زیادہ کھا لینا کوئی ہنر نہیں ہے اس کو ہضم کر لینا ہنر ہے۔ اور دور حاضر میں ہضم کر لینا کوئی کام نہیں ہے۔ اصل کھا جانا

ہی قابلیت کی دلیل ہے۔

خیر۔ حضرت نے فرمایا کہ اچھا تم اس سے ایک سوال کر سکتے ہو۔ اس نے کہا بیشک یہ تو ہمارا کام ہی ہے۔ ہم برابر سوال کرتے رہتے ہیں اور وہ جواب دیتے رہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اب اس کتاب کا ذکر آئے تو اتنا پوچھ لینا کہ آپ نے آیات کے جو معنی نکال کر تضاد و اختلاف ثابت کیا ہے۔ وہ معنی آپ کے ذہن کی ایجاد ہیں یا خدا نے آپ سے بتائے ہیں۔ اگر آپ کے ذہن کی ایجاد ہیں تو خدا کو یہ کہنے کا حق ہے کہ میرے کلام کے معنی نکالنے کا حق آپ کو کہاں سے ملا ہے اور آپ کو کس نے مجاز کیا ہے کہ جس آیت کے جو معنی چاہیں نکال لیں اور اگر یہ معانی خدا نے بتلائے ہیں تو اس سے آپ سے کب ملاقات ہوئی ہے۔ آپ پر کون سا فرشتہ نازل ہوا ہے۔ جس نے آپ سے یہ معانی بیان کئے ہیں۔

شاگرد تیار ہو کر اسحاق کی خدمت میں حاضر ہوا۔ کہنے لگا استاد ایک بات سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ یہ جو آپ نے قرآن حکیم میں تضاد ثابت کیا ہے وہ آپ کے اپنے نکالے ہوئے معانی میں ہے۔ تو اس کی ذمہ داری خدا پر کیا ہے۔ اور اگر خدا کے بیان کئے ہوئے معانی میں ہے تو اس نے آپ سے کب بیان کیا ہے۔ یہ سننا تھا کہ کندی کے ہوش اڑ گئے۔ کہا یہ بتاؤ کہ یہ خیال تمہارے ذہن میں کہاں سے آیا۔ شاگرد نے کہا کہ سوچتے سوچتے ایک بات ذہن میں آگئی۔ سوچا کہ آپ سے پوچھ لوں۔ اس نے کہا نا ممکن ہے۔ جو بات تمہارے استاد کے ذہن میں نہیں آئی وہ تمہارے ذہن میں کہاں سے آسکتی ہے۔ یہ بتاؤ کہ یہ بات کس نے سکھائی ہے۔ اس نے کہا کہ مجھ سے حضرت حسن عسکری نے بیان کیا ہے۔ یہ سننا تھا کہ کندی اچھل پڑا کہنے لگا بیشک مسائل اہلبیت کرام

کے علاوہ کوئی نہیں بیان کر سکتا۔

کندی نے اوراق جلا دیئے۔ کتاب فنا ہو گئی۔ عزت قرآن رہ گئی صداقت الٰہی پر حرف نہیں آسکا۔ لیکن ضمناً امام حسن عسکری نے یہ مسئلہ بھی حل کر دیا کہ قرآن کے دو طرح کے معانی ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ معانی ہیں جو لوگ الفاظ سے نکال لیا کرتے ہیں اور ایک وہ معانی ہیں جنھیں خدا نے بیان کرنا چاہا ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان کو اپنے معانی بیان کرنے کا حق ہے۔ خدا کے معانی بیان کرنے کا حق نہیں ہے اور قرآن خدا کا کلام ہے۔ انسان کا کلام نہیں ہے۔ ایسی حالت میں کسی شخص کو اس وقت تک قرآن کے بارے میں بولنے کا حق نہیں ہے جب تک خدا اسے معانی و مطالب نہ بتلائے اور ایسا امت اسلامیہ میں کوئی نہیں ہے۔ لہٰذا اگر قرآن کے واقعی معانی و مطالب لینا ہیں تو اس دروازہ پر آنا پڑے گا جہاں حقائق کا مخزن ہے۔ مطالب کا مرکز ہے مفاہیم کا مصدر ہے۔ اقدار کا منبع ہے اور جہاں کا بچہ بچہ آواز دے رہا ہے آؤ ہم مراد خدا بیان کریں گے۔ ہم وہ ہیں جن کے سینوں میں آیات بینات کو ذخیرہ کیا گیا ہے۔ ہم وہ ہیں جنھیں پیغمبر اسلام نے ہمسر قرآن بنا کر چھوڑا ہے ہم وہ ہیں جن کے گھر میں قرآن نازل ہوا ہے ہم وہ ہیں جن کی چوکھٹ پر جبریل نے دربانی کی ہے۔ قرآن ہمارے پاس ملے گا۔ حسبنا کتاب اللہ والوں کے پاس نہیں ملے گا۔

عزیزان گرامی! آپ نے محسوس کیا کہ علماء اسلام اتنی سامنے کی بات کیوں نہ بتا سکے۔ اور دین خدا کی نمائندگی کے دعویدار اس بات کا جواب کیوں نہیں دے سکے؟ بات یہ ہے کہ وہاں یہ امتیاز ہی نہیں ہے کہ خدا کا مفہوم کیا ہے اور امت کے معانی کیا ہیں۔ جواب ممکن ہوتا اگر امت کو احساس ہوتا اور

الٰہی مفاہیم کو امت کے معانی سے الگ کیا جاتا لیکن وہاں اس امر کی گنجائش کہاں۔
اس امر کی گنجائش ہوتی تو روز اول مولائے کائنات کا قرآن واپس کیوں کر دیا جاتا۔ کیا علیؑ الگ سے کوئی قرآن بنا کر لائے تھے۔ کیا اس کی آیتیں یہ آیتیں نہیں تھیں۔ کیا اس کے سورے یہ سورے نہیں تھے۔ کیا اس کے بیانات یہ بیانات نہیں تھے۔ کیا معاذ اللہ وہ ان کا کوئی خانہ ساز کلام تھا۔ نہیں۔ کچھ نہیں تھا۔ فقط قرآن تھا اور یہی قرآن تھا۔ یہی سورے تھے یہی آیتیں تھیں فرق صرف یہ تھا کہ علیؑ نے ناسخ و منسوخ۔ عام و خاص۔ محکم و متشابہ۔ تفسیر و تاویل سب معین کر دیا تھا۔ اور حکومت کو یہی خطرہ تھا کہ اگر ان کا قرآن لے لیا گیا تو اپنی تفسیر کا راستہ بند ہو جائے گا۔ اور ہمیں اپنی تفسیر کے بھروسے ہی زندگی چلانا ہے بہتر یہ ہے کہ روز اول ہی اس سلسلہ کو روک دیا جائے۔ اور قیامت تک کے لئے راحت حاصل کر لی جائے۔ مولائے کائنات نے بھی قرآن کو یہ کہہ کر واپس لے لیا کہ پیغمبرؐ نے مجھے ثقلین کی فرد بنایا ہے۔ میری ذمہ داری ہے کہ تمہیں قرآن کے معانی سمجھا دوں۔ میں نے اپنا فریضہ ادا کر دیا۔ اب اگر تمہیں گمراہ ہی ہونا ہے اور امت کو تباہ ہی کرنا ہے تو مجھے کوئی جھگڑا بھی نہیں کرنا ہے۔ میری خاموشی سے کم سے کم اتنا فائدہ تو ہوگا کہ الفاظ قرآن تمہارے پاس رہ جائیں گے۔ ورنہ تمہارا کیا بھروسہ تم الفاظ بھی بدل ڈالو اور ان میں بھی ترمیم کر دو۔ یاد رکھو اگر یہ الفاظ بھی تمہارے پاس رہ گئے تو میرا کام چلتا رہے گا۔ بلکہ بہتر طور پر چلے گا۔ کل میرے فضائل بیان ہوتے تو تم کہہ دیتے کہ علیؑ کا قرآن تھا علیؑ کے فضائل آگئے ـــــ اب تو یہ کہنے کا موقع نہیں ہے۔ اب تو قرآن تمہارا ہو گیا۔ تمہارے نام کا مصحف ہے۔ تمہارے گھر کی کتاب ہے تمہارا اپنا پایا ہوا مال ہے۔ لیکن اب میری حکومت دیکھو کہ ہے تمہارا لیکن آیت تطہیر

میری ہی ہے۔ آیت مباہلہ میری ہی ہے۔ سورہ دہر میرا ہی ہے۔ آیت ولایت میری ہی ہے۔ آیت مودت میری ہی ہے اور یاد رکھو کہ تم نے بھی چوتھائی مانا ہے تو ایک چوتھائی قرآن میرے ہی فضائل میں ہے اور تین چوتھائی میرے دشمنوں کے نقائص و عیوب کے بیان میں ہے۔

ارباب نظر! یہ ہیں وہ صاحبان علم و کمال جنھیں اللہ نے اپنی طرف سے ہادی و رہنما بنایا ہے۔ اور ان کے علم و کمال کی ذمہ داری بھی خود ہی لی ہے۔ ان کے کمالات میں کوئی نقص نکل آئے تو اس کی ذمہ داری ان پر نہ ہوگی بلکہ اس مالک پر ہوگی جس نے انھیں عالم انسانیت کے لئے ہادی اور راہنما بنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ہر فضیلت کامل اور ان کا ہر کمال مکمل ہوتا ہے۔ یہی امام حسن عسکریؑ جن کا تذکرہ کر رہا تھا اگر آپ ان کے کمالات کا جائزہ لیں گے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ اس دور کا کیا ذکر ہے کسی دور میں ایسا صاحب علم و کمال نہیں پیدا ہوا۔ دین کے مسائل ہوں یا قرآن کے آیات۔ اس شان سے حل کیا ہے کہ اول و آخر میں کوئی فرق ہی نہیں محسوس ہوتا۔ جو انداز کل پہلے محمدؐ کا تھا وہی انداز آج اس محمدؐ کا بھی ہے۔ قوم کی مشکل کشائی۔ دین کی رہبری۔ اسلام کی حفاظت۔ قرآن کی تفسیر اور اس پر شدت مصائب۔ ۱۰ ربیع الثانی ۲۳۲ھ کو مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔ باپ امام علی نقیؑ اور مادر گرامی جناب سوسن جیسی پاک سیرت اور پاک طینت خاتون۔ چھ برس وطن میں رہے۔ اس کے بعد پدر بزرگوار کے ہمراہ سامرہ آگئے۔ ساری زندگی سامرہ میں گذر گئی۔ سامرہ کا آنا بھی اپنے اختیار میں نہیں تھا۔ اس کے لئے صرف اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ آپ کی ولادت باسعادت مدینہ منورہ میں اور متوکل عباسی کے زمانے میں ہوئی تھی۔ متوکل سے جس قدر مصائب کی توقع کی جا سکتی ہے اسے ذہن میں رکھنے کے بعد سوچیں کہ امامؑ کا آغاز حیات ہی کس قدر مشکلات میں گھرا ہوا تھا۔

متوکل کی فکر تو یہ تھی کہ حضرت زندہ ہی نہ رہنے پائیں۔ لیکن جسے خدا زندہ رکھنا چاہے اسے کوئی فنا نہیں کر سکتا اور جسے وہ عزت دینا چاہے اسے کوئی ذلیل نہیں کر سکتا۔ تفصیلی حالات کا محل نہیں ہے۔ صرف علم قرآن و تفسیر اور حل مشکلات کے بارے میں چند واقعات کی طرف اشارہ کر دینا کافی ہے تاکہ دنیا کو یہ اندازہ ہو جائے کہ اللہ والے شدت مصائب میں بھی اپنے فریضہ کو کس طرح ادا کرتے ہیں۔ متوکل اور متوکل کے بعد جتنے عباسی سلاطین گذرے ہیں سب کو امام حسن عسکریؑ سے خصوصی عداوت تھی اور کسی نے آپ کو اذیت پہونچانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ آپ کے ساتھ ایک خصوصیت یہ تھی کہ آپ پیغمبر اسلامؐ کے گیارھویں وارث تھے۔ اور ہر شخص کو یہ معلوم تھا کہ بارہواں وارث آپ ہی کے صلب سے پیدا ہونے والا ہے۔ لہٰذا ہر شخص کو فکر تھی کہ کسی طرح آپ کی زندگی کا خاتمہ کر دیا جائے تاکہ وہ آخری وارث عالم وجود میں نہ آنے پائے۔ یہ فکر کیوں تھی۔ اس کا اندازہ تاریخ کے واقعات سے کیا جا سکتا ہے۔

فرعون کو ساری فکر تھی کہ موسیٰ دنیا میں نہ آنے پائیں اور کسی طرح وجود سے پہلے ہی فنا ہو جائیں۔ ستر ہزار بچے قتل کر دیے گئے۔ ماؤں پر پہرے بٹھا دیے گئے۔ بچے شکم مادر میں قتل کر دیے گئے کہ موسیٰ دنیا میں نہ آنے پائیں۔ لیکن جب قدرت نے چاہا تو نہ فقط یہ کہ دنیا میں آئے بلکہ قصر فرعون میں آئے اور وہیں رہے۔ وہیں پلے۔ وہیں بڑھے تاکہ دنیا پہچان لے کہ جب ہم بچانا چاہتے ہیں تو کوئی فرعون بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

موسیٰؑ سے اتنی شدید عداوت کیوں تھی۔ وہ تو عالم وجود میں بھی نہیں آئے تھے انھوں نے تو کسی کا کچھ بگاڑا بھی نہیں تھا پھر اتنی شدید دشمنی کیوں؟ بات یہ ہے کہ فرعون کو معلوم ہو گیا تھا کہ تیری حکومت میں ایک بچہ

پیدا ہونے والا ہے۔ جو تیرے تخت و تاج کو تباہ و برباد کر دے گا۔ فرعون کو اس خبر نے اس قدر دہشت زدہ کر دیا تھا کہ راتوں کی نیند حرام ہو گئی تھی اور اسے صرف یہی فکر تھی کہ مملکت میں کوئی بچہ پیدا نہ ہونے پائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ وہی بچہ نکل آئے جو تخت و تاج کو تباہ کرنے والا ہے ـــ فرعون پر کوئی وحی نازل نہیں ہوئی تھی۔ کسی فرشتے نے اس سے یہ نہیں کہا تھا۔ صرف ایک کاہن کی اطلاع تھی جس پر اس قدر پریشان تھا ـــ تو سلاطین اسلام کے پاس تو پیغمبر اسلامؐ کی خبر تھی کہ بارھواں وارث دنیا سے ظلم و جور کو مٹا دے گا۔ اور دنیا کو عدل و انصاف سے بھر دے گا۔ انھیں کیسے نیند آ سکتی تھی۔ انھیں تو ہر آن یہی فکر تھی کہ اگر وہ آ گیا تو تخت و تاج کی خیر نہیں ہے۔ وہ آ گیا تو یہ ظالمانہ نظام تباہ و برباد ہو جائے گا۔ لیکن قدرت کا انتظام تھا کہ اس نے امام حسن عسکریؑ کو محفوظ رکھا اور یہاں تک محفوظ رکھا کہ نبیؐ کا آخری وارث آ گیا اور آ کر آواز دی کہ دنیا والو تاریخ کو تاریخ سے ملاؤ۔ فرعون نے موسیٰ کے لیے تباہی و بربادی کا مقدمہ بنایا تھا اور تم نے میرے لئے تباہی و بربادی کا انتظام کیا ہے۔ جد نے سچ اعلان کیا تھا کہ میں اپنے دور کا موسیٰ ہوں اور علیؑ اپنے وقت کے ہارون ـــ پھر میرے بزرگوں کا یہ اعلان بھی ہے کہ میرا اوّل بھی محمدؐ ہے اور آخر بھی محمدؐ ہے۔ اور ہمارے کل کے کل محمدؐ ہیں۔ اب تم نے پہچانا۔ ہم سب محمد ہیں اور محمد اپنے وقت کے موسیٰ تھے۔ یعنی میں اپنے دور کا موسیٰؑ ہوں اور تم اپنے دور کے فرعون ہو۔ اب تم اندازہ کر لو کہ تمھارا مذہب کیا ہے اور میرا مذہب کیا ہے۔

امام حسن عسکریؑ کے دینی خدمات میں بے شمار باتوں کے علاوہ خود ایک تفسیر بھی ہے جو تفسیر امام حسن عسکریؑ کے نام سے مشہور ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تفسیر

آپ کے دست مبارک کی تصنیف نہیں ہے۔ اسے آپ کے شاگردوں نے مرتب کیا ہے اور غیر معصوم کی ترتیب و تدوین میں غلطی کے امکانات ہو سکتے ہیں۔ لیکن اتنا تو بہر حال معلوم ہے کہ آپ نے تفسیر کے بارے میں اتنے بجھ بیانات ارشاد فرمائے ہیں کہ ایک کتاب مرتب ہو گئی۔ اب یہ کتاب وہی ہے یا دوسری۔ اس کی ساری روایتیں امامؑ ہی کی ہیں یا اس میں کچھ کمی اور زیادتی بھی ہے یہ الگ ایک مسئلہ ہے۔ اس کے بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس وقت تو صرف یہ عرض کرنا ہے کہ آپ نے بقدر کتاب آیات قرآن کی تفسیر بیان فرمائی تھی۔ اور یہ بھی کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہمارے ہر امامؑ نے بے شمار آیات کی تفسیر بیان کی ہے۔ اب یہ حالات کا فرق ہے کہ کسی کے نام سے مکمل تفسیر مرتب نہ ہو سکی اور امام عسکریؑ کے نام سے کتاب مرتب ہو گئی۔ شاید اس کی ایک مصلحت یہ بھی رہی ہو کہ اب تک ائمہ کا سلسلہ جاری تھا۔ برابر بیانات سامنے آ رہے تھے۔ اس لئے ترتیب و تدوین کی اتنی شدید ضرورت محسوس نہیں کی گئی لیکن اب غیبت کا دور آنے والا تھا۔ اس لئے چاہنے والوں نے ایک کتاب مرتب کر لی تاکہ دنیا کو معلوم رہے کہ علیؑ منظر عام پر آئے تو تفسیر قرآن کا کام کیا اور حسن عسکریؑ خانہ نشین رہے تو تفسیر قرآن ہی کا کام کرتے رہے۔

ایک شخص امام کی خدمت میں آکر عرض کرتا ہے کہ فرزند رسولؐ! آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ شریعت اسلام نے لڑکے کا دہرا حصّہ رکھا ہے اور لڑکی کا اکہرا جبکہ لڑکی صنف نازک ہے اور صنف نازک کو زیادہ حقوق ملنے چاہئیں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ طاقتور مرد کو دہرا حصّہ دے دیا جائے اور کمزور عورت کو صرف ایک ہی حصّہ دیا جائے۔ آپ نے فرمایا کہ افسوس تو نے میراث کی تقسیم کو دیکھا۔ دونوں کے حالات کو نہیں دیکھا۔ یاد رکھ اسلام نے حقوق کو فرائض سے الگ نہیں رکھا

اس کا نظام حقوق فرائض کے تحت چلتا ہے۔ وہ جب کسی کو حق دیتا ہے تو اس کے ذمہ فرض بھی رکھتا ہے اور جب کسی کے ذمہ فریضہ عائد کرتا ہے تو اسے حق بھی دیتا ہے۔ اسلام میں مردوں کے فرائض عورتوں سے کہیں زیادہ ہیں۔ مردوں پر جہاد واجب ہے عورتوں پر جہاد واجب نہیں ہے۔ مردوں کیلئے نفقہ فراہم کرنا واجب ہے۔ عورتوں کے لئے کسب معاش واجب نہیں ہے۔ مردوں پر پورے ایک گھر کی ذمہ داری ہے عورتوں پر بالکل نہیں ہے۔ لہذا ظاہر ہے کہ جس کے فرائض زیادہ ہوں گے اس کے حقوق بھی زیادہ ہوں گے۔

دوسری لفظوں میں یوں عرض کیا جائے کہ راوی نے دونوں کے حالات دیکھے ہیں۔ دونوں کا مستقبل نہیں دیکھا۔ مستقبل میں یہ لڑکی کسی کی زوجہ اور ماں بننے والی ہے جس کی تمام تر ذمہ داری شوہر اور اولاد پر ہو گی ـــــ اور یہ لڑکا کسی کا شوہر اور باپ بننے والا ہے جس پر زوجہ کی بھی ذمہ داری ہو گی۔ اور اولاد کی بھی ـــــ اور کھلی ہوئی بات ہے کہ جس پر دوسروں کی ذمہ داری ہو گی اس کا خرچ زیادہ ہو گا۔ اور جس کی اپنی بھی ذمہ داری دوسرے کے سر ہو گی اس کا بار کچھ نہ ہو گا اور اسلام بار دیکھ کر ہمدردی کرتا ہے۔ جسے زیادہ زیر بار لاتا ہے اسے زیادہ حقوق دیتا ہے اور جسے کم ذمہ دار بناتا ہے اسے کم حق بھی دیتا ہے۔

ایک شخص حضرت کو خط لکھتا ہے کہ جب آپ کا فرزند ظہور کرے گا تو کس طرح حکومت کرے گا اور نظام حکومت کیا ہو گا۔ آپ نے تحریر فرمایا کہ اس کے دور میں علم امامت سے فیصلہ ہو گا اور شہادت و گواہی کی ضرورت نہ ہو گی۔ وہ دونوں کے حالات سے باخبر ہو گا اور اسی اطلاع پر فیصلہ بھی کرے گا ـــــ اور حسن بن ظریف تم نے ایک مسئلہ فراموش کر دیا۔ تمہیں

یہ بھی پوچھنا چاہیے تھا کہ بخار کا علاج کیا ہے تو یاد رکھو کہ "یٰنَارُ كُونِي بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ" کی آیت لکھ کر مریض کے گلے میں ڈال دو۔ بخار خود بخود اتر جائیگا۔ حسن کہتے ہیں کہ میں نے حضرت کے نسخہ پر عمل کیا۔ اور شفا ہوئی اور ایمان پر بھی جلا ہو گئی کہ میں سوال لکھنا بھول گیا تھا لیکن حضرت نے جواب دے دیا۔

کیوں نہ ہو دنیا والے سوال کرنے کے محتاج ہوتے ہیں۔ اللہ والے بے مانگے عطا کر دیا کرتے ہیں۔ سوال کا محتاج وہ ہوتا ہے جو حال دل سے باخبر نہیں ہوتا اور جو دل کے راز دل سے باخبر ہوتا ہے اسے سوال کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

روایت سے ایک مسئلہ اور بھی حل ہو گیا کہ حضرت امام عصرؑ اپنے ذاتی علم سے فیصلہ کریں گے اور شہادت و گواہی کی ضرورت نہ ہو گی۔ گویا امامؑ اشارہ فرما رہے ہیں کہ کل اسی نظام شہادت کا سہارا لے کر میری جدہ ماجدہ کے دعویٰ کو رد کر دیا گیا تھا اور یہ بہانہ تراش لیا تھا کہ نظام شہادت مکمل نہیں ہے تو اب وارث زہراؑ آ رہا ہے۔ کل تم نے اپنے علم پر فیصلہ کیا تھا۔ آج وہ اپنے علم پر فیصلہ کرے گا۔ کل تم نے باغ دنیا سے محروم کر دیا تھا۔ آج وہ تمہیں باغ جنت سے محروم کر دے گا۔

محمد عیاش کہتے ہیں کہ ایک دن کچھ لوگ بیٹھے ہوئے امام حسن عسکریؑ کے فضائل بیان کر رہے تھے۔ محفل میں ایک دشمن اہلبیتؑ بھی موجود تھا۔ اس نے کہا کہ آپ لوگ اس قدر فضائل بیان کر رہے ہیں میں تو جب جانوں کہ میں ایک سادے کاغذ پر خالی قلم سے بغیر روشنی کے مسئلہ لکھ دوں اور وہ جواب دیدیں۔ لوگوں نے کہا ضرور۔ ابھی تو ضیا دانے دام میں آیا ہے۔ اس نے مسئلہ لکھ کر لفافہ میں بند کر دیا اور حضرت کے پاس بھیج دیا۔ اب جو جواب آیا تو مسئلہ کا حل بھی لکھا ہوا تھا اور پوچھنے والے کا نام مع ولدیت بھی لکھا ہوا تھا۔ وہ شخص دم بخود رہ گیا اور فوراً مذہب حق قبول کر لیا۔

مجھے نہیں معلوم کہ اس نے کیا سوال کیا تھا اور امامؑ نے کیا جواب دیا تھا۔ لیکن میرا یقین کہتا ہے کہ امامؑ نے ولدیت صحیح لکھی تھی ورنہ ولدیت میں فرق ہوتا تو کبھی ایمان نہ لاتا۔ پیغمبر اسلامؐ نے محب اہلبیتؑ کی ایک یہ علامت بھی بتائی ہے کہ اگر نسب سلامت نہ ہوتا تو کبھی راہ محبت پر نہ آتا۔ اور جہاں تھا وہیں رہ جاتا۔ یہ آجانا علامت ہے کہ خمیر میں محبت کی گنجائش تھی اور حالات نے روک رکھا تھا۔

ابو حمزہ کہتے ہیں کہ میں حضرت کی خدمت میں حاضر تھا اور آپ کے پاس مختلف ملکوں اور نسلوں کے غلام حاضر تھے۔ آپ سب سے انہیں کی زبان میں گفتگو کر رہے تھے۔ مجھے سخت تعجب ہوا کہ یہ مدینہ میں پیدا ہوئے ہیں۔ کہیں باہر کا سفر بھی نہیں کیا اور اس طرح بے تکان ہر شخص کی زبان میں گفتگو کر رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا ابو حمزہ تعجب نہ کرو میں حجت خدا ہوں اور اللہ اپنی حجت کو ساری کائنات کا علم عطا کرتا ہے۔

دنیا کا نمائندہ اور ہوتا ہے اور قدرت کا نمائندہ اور۔ جو مسائل میں عاجز رہ جائے وہ دنیا والوں کا نمائندہ ہے اور جو دل کے حالات دیکھ کر مسائل حل کر دے وہ قدرت کا نمائندہ ہے۔

مجھے حیرت ہے کہ ان واقعات کو دیکھنے کے بعد بھی مسلمان اس بات کا عقیدہ رکھتا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ اپنی ناواقفیت کی بنا پر مختلف زبانوں کے ترجمانوں کے محتاج تھے۔ جس کا وصی ایسا ہو اس کا نبی کیسا ہو گا؟ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ لوگوں نے وصی ہی ایسے اختیار کئے ہیں جو نبی کو جاہل ثابت کر سکتے ہیں۔ نبی کے علم کا اعلان نہیں کر سکتے۔

تذکرہ مسلسل ہے تو دو ایک واقعات کی طرف اور اشارہ کر دیا جائے۔ جن سے حضرت کے فضل و کمال کا مکمل طور سے اندازہ ہو سکتا ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ شدت عداوت کے باوجود حکومتیں مجبور تھیں کہ امامت سے

سامنے دستِ سوال پھیلائیں۔ چنانچہ مشہور و معروف واقعہ ہے کہ ملک میں قحط پڑا ہوا تھا۔ خلقتِ خدا پریشان تھی۔ دعاؤں پر دعائیں ہو رہی تھیں اور دور دور تک پانی کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ ایک مرتبہ ایک شخصِ نصرانی اٹھا اور اس نے کہا کہ اس مشکل کو میں حل کر سکتا ہوں میں ابھی چاہوں تو پانی برسنا شروع ہو جائے۔ یہ کہہ کر مجمع عام میں آیا اور جیسے ہی دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے ابر گھر کر آ گیا اور بارش کے آثار نمودار ہو گئے۔ قوم میں ہنگامہ ہو گیا۔ حکومت وقت کو خبر دی گئی کہ ایک عیسائی نے ایسا دعویٰ کیا ہے اور اس کی دعا میں یہ اثر ہے۔ مسلمانوں میں کسی ایک کی دعا میں یہ اثر نہیں ہے۔ ایسا نہ ہو کہ لوگ مذہب عیسائی کو حق مان لیں اور اسلام سے منحرف ہو جائیں۔

غیروں کا کیا ذکر۔ خود حکومت کے بھی ہوش اڑ گئے۔ کرامت کو نہ مانے تو جواب کیا دے اور مان لے تو اسلام کہاں رہے گا۔ علماء کو طلب کیا گیا۔ فقہاء سے دریافت کیا گیا۔ لیکن ہر طرف سناٹا۔ کوئی جواب نہیں ملتا اور عیسائی کا یہ عالم ہے کہ اکڑتا ہی چلا جا رہا ہے۔ کیوں نہ ہو جو فاتح ہوتا ہے وہ اکڑتا ہے۔ کل مرحب بھی اکڑ رہا تھا۔ عمرو بن عبدود بھی اکڑ رہا تھا۔ باطل جب باطل کے سامنے آتا ہے تو اکڑتا ہی ہے۔ وہ تو جب حق سے مقابلہ ہو جاتا ہے تو فنا ہو جاتا ہے۔ لیکن یہاں حق کہاں رکھا ہے یہاں تو ہر طرف باطل ہی باطل کا دور دورہ ہے۔ عیسائی کا دماغ چوتھے آسمان پر ہے اور حکومت کی روح فنا ہوئی جا رہی ہے۔ اسلام کی تباہی کا خطرہ نہیں ہے۔ سارا خطرہ یہ ہے کہ اسلام نہ رہ گیا تو اسلام کے نام پر یہ تخت و تاج کس طرح رہ جائے گا۔ اور قوم ہاتھ سے نکل گئی تو حکومت کس پر کریں گے بالآخر عاجز ہو کر امام حسن عسکریؑ کو طلب کیا گیا۔ اپنے جد کی نبوت کو بچائیے۔ دین خطرہ میں ہے اسلام جا رہا ہے۔

میں کہوں گا آپ حاکمِ اسلام ہیں۔ وارثِ رسولؐ ہیں۔ مسندِ پیغمبرؐ پر جلوہ گر ہیں۔ آپ ہی بچائیے۔ تباہ نہ ہونے پائے۔ لیکن یہاں تو در پردہ اقرار ہے کہ ہم حکومت والے ہیں ہدایت والے نہیں ہیں۔ ہمارا کام حکومت چلانا ہے شریعت چلانا نہیں ہے۔ یا دوسری لفظوں میں یہ کہا جائے کہ فرزند رسولؐ دین پر وقت پڑا ہے جلدی بچائیے۔ آپ نہ آئیں گے تو ہم بھی ہلاک ہو جائیں گے۔

فرزند رسولؐ تشریف لائے نصرانی کو بلایا۔ کہا ذرا آبادی سے باہر چل وہ آبادی کے باہر آیا۔ آپ نے فرمایا تیری کرامت کیا ہے۔ اس نے کہا کہ میں دعا کرتا ہوں تو بارش ہو جاتی ہے۔ آپ نے فرمایا ذرا دعا تو کر۔ اس نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ جیسے ہی ہاتھ اٹھائے ابر گھر کر آ گیا۔ آپ نے ایک شخص سے فرمایا کہ اس کی انگلیوں کے درمیان جو چیز چھپی ہوئی ہے اسے نکال لے۔ اس نے بڑھ کر وہ چیز کھینچ لی۔ آیا ہوا ابر واپس ہو گیا۔ مجمع متحیر رہ گیا۔ یہ کیا ہوا۔ وہ دعا کہاں گئی۔ وہ اثر کہاں گیا۔ نصرانی بھی منہ دیکھتا رہ گیا۔ بالآخر معتمد نے کہا فرزند رسولؐ یہ کیا ہوا۔ آپ نے فرمایا اس کو کسی قبر سے کسی ولی خدا کی ہڈی مل گئی ہے اور اس ہڈی کا یہ احترام ہے کہ جب زیرِ آسمان آ جائے گی ابر گھر کر آ جائے گا۔ اور رحمت کو جوش آ جائے گا۔ میں نے وہ ہڈی واپس لے لی ہے اور سارا زور ختم ہو گیا ہے۔

یہ بھی امامت ہی کا علم تھا کہ ہڈی کا بھی پتہ لگا لیا۔ اور اس کا اثر بھی بتا دیا ورنہ عالمِ اسلام میں کوئی اس حقیقت کا جاننے والا بھی نہ تھا۔ اور میں تو کہتا ہوں کہ کاش اب بھی عالمِ اسلام کو ہوش آ جاتا کہ ایک غیر معلوم ولی کی ہڈی میں اتنا اثر ہے کہ زمین سے آسمان تک انقلاب آ جاتا ہے۔ جب کہ اس کو دفن ہوئے زمانہ گذر چکا ہے تو پھر خاتم النبیینؐ کے گوشت و پوست کا کیا اثر ہوگا

ان حالات کو دیکھنے کے بعد بھی بے شرم مسلمان کہتے ہیں کہ نبی بھی ہم جیسا ہوتا ہے۔
آپ ہی جیسا تھا تو آپ ہی نے پانی برسایا ہوتا۔ آپ تو جیتے جی وہ نہ کر سکے جو ایک ولی کی بوسیدہ ہڈی نے کر دیا۔ اور اب تو قدرت کا انتقام بھی منزل اعلیٰ تک پہنچ چکا ہے کہ جس دیار سے "ہم جیسے" کا نعرہ بلند ہوا تھا وہیں چند بزرگان ملت کی لاشیں قبروں سے نکال لی گئی ہیں۔ اور صحیح و سالم نکلیں ہیں قدرت نے آواز دی بے غیرت مسلمانو! ہوش میں آجاؤ۔ عبداللہ رسولؐ نہیں ہیں۔ اصحابؓ نہیں ہیں اور ہم نے ان کی لاشوں کو یہ امتیاز دے دیا ہے کہ سیکڑوں سال کے بعد بھی صحیح و سلامت موجود ہیں۔ اس کے بعد بھی کہتے ہو کہ نبی قبر میں مٹی کا ڈھیر ہو گیا ہے۔ اب اس کی کیا حیثیت ہے اب اس کے احترام کی کیا ضرورت ہے۔ اب اس کے لئے قیام کی کیا ضرورت ہے۔ اب اس کے ذریعہ دعائیں کیوں مانگی جاتی ہیں۔ کاش اب بھی مسلمانوں کو ہوش آجاتا۔ لیکن اس کی امید نہیں ہے اس لئے کہ جب نبی کی زندگی میں چاند کے ٹکڑے اور علیؑ کی حیات میں ردِ شمس کو دیکھ کر ایمان نہیں لائے تو اب کیا ایمان لائیں گے ———— ایمان لانے والے غیب پر بھی ایمان لا کر سلمان و اویس بن جاتے ہیں۔ اور نہ ماننے والے جلوے دیکھ کر بھی ابولہب و ابوجہل ہی رہ جاتے ہیں۔

روایت کہتی ہے کہ اس کے بعد فرزند رسولؐ نے مصلیٰ بچھایا اور دو رکعت نماز ادا کرنے کے بعد دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ ہاتھوں کا اٹھنا تھا کہ ابر آنے لگا۔ لوگ پریشان ہوئے۔ آپ نے فرمایا اس کا تم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ فلاں شہر میں برسے گا۔ پھر ایک ابر اٹھا آپ نے فرمایا یہ فلاں شہر کا ہے۔ پھر ایک ابر اٹھا۔ آپ نے فرمایا یہ فلاں مقام کے لئے ہے۔ آخر میں ایک عظیم

ابر نمودار ہوا۔ آپ نے فرمایا اب تم لوگ فوراً اپنے گھروں کو چلے جاؤ۔ یہ ابر تمہارے دیس پر برسنے والا ہے۔ مجمع تیزی سے گھروں کی طرف روانہ ہوا۔
ابر گھر کر آیا اور ایسی بارش ہوئی کہ سارا علاقہ جل تھل ہو گیا۔ دعا کا اثر بھی سامنے آگیا اور قحط بھی دور ہو گیا۔

دل چاہتا ہے عرض کروں فرزند رسولؐ موقع غنیمت تھا دعا کرتے۔ ابر ابر آتا لوگ آپ کی عظمت کے قائل ہو جاتے۔ یہ مصلیٰ بچھانے کی کیا ضرورت تھی نماز ادا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا آپ کی دعا میں اثر نہیں ہے۔ کیا آپ کو قدرت نے اختیار نہیں دیا ہے۔ فرمائیں گے بیشک مجھے اختیار ہے۔ میری دعا میں اثر ہے۔ لیکن یاد رکھو ہمارے کمالات اپنی ذات کے لئے نہیں ہیں۔ اپنے پروردگار کے لئے ہیں۔ ہم جو جس کی امانت ہے اسی کی راہ میں صرف کرتے ہیں۔ ہم نے صرف دعا کی ہوتی تو ہمارا کمال ظاہر ہوتا۔ نماز قائم کی تو معبود کی عظمت سامنے آگئی۔ اور نماز کا شرف بھی ظاہر ہو گیا۔ اور یاد رکھو کہ ہمارا طریقہ یہ رہا ہے کہ ہم نے جب بھی کسی غیر معمولی کمال کا مظاہرہ کیا ہے تو نماز ضرور پڑھی ہے تاکہ بندے ہمارے کمال کو دیکھ کر ہمیں خدا نہ کہہ دیں۔ تم نے نہیں دیکھا کہ میرے جد نے سورج بھی پلٹایا تھا تو نماز ہی کے لئے تاکہ دنیا پہچان لے کہ ہمارے کمال کا آغاز بھی بندگی سے ہوتا ہے اور انجام بھی بندگی پر ہوتا ہے۔ ہم بندگی سے ہٹ کر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھاتے۔

بیان کا سلسلہ آخری منزل تک آگیا ہے اور فضائل و کمالات کا سلسلہ ابھی ابتدائی منزلوں میں ہے۔ کس کی مجال ہے جو اس بحر ناپیدا کنار کے کمالات کا احاطہ کر سکے اور کس میں طاقت ہے جو اس کے جملہ فضائل و مناقب کا تذکرہ کر سکے۔ اس وقت صرف ایک نکتہ کی طرف اشارہ کر دینا ہے اور بس۔ پیغمبرؐ کے اس گیارھویں وارث کو حسن عسکریؑ

کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ حسن نام ہے اور عسکری لقب۔ کنیت ابو محمد ہے جس کی وجہ معلوم ہے۔ حسن نام کے بارے میں بھی کسی تحقیق کی ضرورت نہیں ہے۔ اہلبیتؑ کے گھرانے میں یہ نام ہوتا ہے۔ لہذا آج بھی اور قدرت نے تو اس نام کو اپنے خزانہ خاص میں محفوظ رکھا تھا کہ فرزند حضرت زہراؑ سے پہلے عرب میں کسی کا یہ نام نہیں تھا۔ اور نہ کوئی حسنؑ نام کا تھا نہ حسینؑ نام کا۔ یہ دونوں نام خزانۂ قدرت میں محفوظ تھے اور کیوں نہ ہوتا جب ذات منفرد تھی تو نام بھی بے مثال ہونا چاہیے تھا۔ جب ذات کا کوئی جواب نہیں تھا تو نام کا بھی کوئی پتہ نہ ہونا چاہیے تھا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اس لفظ عسکری کا کیا مطلب ہے اور یہ حضرت کے نام کے ساتھ کیوں استعمال ہوتا ہے۔ علماء اسلام نے دو وجہیں بیان کی ہیں ایک وجہ تو یہ ہے کہ حضرت جس محلہ میں رہتے تھے اس کا نام عسکر تھا اس لئے آپ کے اسم گرامی کے ساتھ عسکری کا لفظ استعمال ہونے لگا اور ایک یہ ہے کہ متوکل یا واثق کے دور میں جب بادشاہ نے امام علی نقیؑ کو اپنے لشکر کا معائنہ کرایا تھا اور حضرت نے بلندی پر جانے کے بعد ایک مرتبہ اشارہ کیا تھا کہ اچھا اب ہمارے لشکر کو بھی دیکھ لے اور اس نے سر اٹھا کر دیکھا تھا تو ساری فضا میں زمین سے آسمان تک فوج ہی فوج نظر آ رہی تھی۔ چونکہ حضرتؑ نے اپنے عسکر کا مشاہدہ کرایا تھا۔ اور آپ کا لشکر زمین سے آسمان تک پھیلا ہوا تھا اس لئے آپ کو عسکری کہا جانے لگا۔ جو امام علی نقیؑ اور امام حسن عسکریؑ کا مشترک لقب ہو گیا۔ سامرہ میں دونوں معصومین کو عسکریین سے یاد کیا جاتا ہے۔ جو اس بات کی علامت ہے کہ وہ بھی عسکری ہیں اور یہ بھی عسکری ہیں۔ وہ بھی اسی محلے کے رہنے والے ہیں اور یہ بھی اسی محلہ کے رہنے والے ہیں۔ ان کے پاس بھی وہی آسمانی طاقت اور فضائی لشکر ہے اور ان کے پاس بھی وہی آسمانی طاقت اور فضائی لشکر ہے۔ لیکن جب دونوں معصومین میں صرف امام حسن عسکریؑ ہی کو اس لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

اور آپ ہی کی شہرت عسکری کے نام سے ہے تو ایک لفظ کہنے کو جی چاہتا ہے ۔ کہ شاید مصلحت الٰہی یہی رہی ہو کہ آپ ہی کا نام عسکری کے لقب کے ساتھ مشہور ہو تا کہ دنیا دیکھ لے کہ تاریخ عصمت میں دو حسن گذرے ہیں ایک امام حسنؑ مجتبیٰ اور ایک امام حسن عسکریؑ۔ ان کے علاوہ تمام معصومین۔ محمدؐ ہیں۔ علیؑ ہیں۔ جعفرؑ ہیں۔ موسیٰؑ ہیں۔ حسینؑ ہیں۔ لیکن حسنؑ نہیں ہیں۔ حسن صرف دو ہی ہیں اور دونوں میں بظاہر فرق یہ ہے کہ ایک نے حکومت وقت سے صلح کر لی تو دنیا نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اقتدار سے مرعوب ہو گئے۔ تخت و تاج سے خوفزدہ ہو گئے شاہی رعب و جلال کا مقابلہ نہ کر سکے اور بالآخر سپر انداختہ ہو گئے۔ اور دوسرے نے شدت مصائب کے باوجود حکومت کا مقابلہ کیا تو قدرت نے چاہا کہ اس امام کو عسکری کے لقب سے شہرت دی جائے تا کہ دنیا کو اندازہ ہو جائے کہ جب آخری حسنؑ ان مصائب میں گھر کر حکومت سے مرعوب نہیں ہوتا تو پہلا حسن کس طرح مرعوب ہو جائے گا۔ حسنؑ کے نام تم یہ نہ سمجھنا کہ تم جو چاہو گے کر دو گے وہ خاموش ہی رہے گا۔ کل کی مصلحت اور تھی اور آج کی مصلحت اور ہے۔ اور اس حسنؑ کا لال اٹھے گا تو ظلم کا تختہ الٹ کر عدل و انصاف کا راج قائم کر دے گا۔ تب دنیا کو اندازہ ہو گا کہ الٰہی انقلاب سے پہلے ایک حسنؑ کو خاموش رہنا پڑتا ہے۔ کل پہلا حسنؑ خاموش تھا تو انقلاب کربلا سامنے آیا تھا۔ آج دوسرا حسنؑ خاموش ہے تو یہ علامت ہے کہ ایک عظیم انقلاب آنے والا ہے۔ جس میں کربلا کا انتقام بھی ہو جائے گا اور نظام ظلم کی دھجیاں بھی اڑ جائیں گی۔ تب دنیا کو اندازہ ہو گا کہ حسنؑ کا سکوت کتنا قیامت خیز ہوتا ہے اور اس سکوت کے پیچھے کتنا بڑا انقلاب پوشیدہ ہوتا ہے۔ صلوات

امام مہدی آخر الزماںؑ

اسم مبارک	م ۔ ح ۔ م ۔ د
لقب	قائم حجت ۔ مہدی ۔ منتظر ۔ صاحب الامر
کنیت	ابوالقاسم
والد ماجد	امام حسن عسکریؑ
والدہ ماجدہ	جناب نرجس خاتون
ولادت	۱۵ شعبان ۲۵۶ھ (سامرہ)
غیبت صغریٰ	۲۶۰ھ تا ۳۲۹ھ
غیبت کبریٰ	۳۲۹ھ الی ماشاءاللہ
مکان غیبت	سرداب سامرہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ اشرف الانبیاء والمرسلین خاتم النبیین سیدنا ومولانا ابی القاسم محمد و آلہ الطیبین الطاہرین ولعنۃ اللہ علیٰ اعدائھم اجمعین اما بعد فقد قال اللہ الحکیم فی کتابہ الکریم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِنَّ عَلَیْنَا لَلْهُدٰی وَ اِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰی۔

مالک کائنات کا ارشاد ہے "بیشک ہدایت کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے اور دنیا و آخرت کا اختیار ہمارے ہاتھوں میں ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ مالک کائنات نے ہر دور میں ہدایت کا انتظام کیا ہے اور اتنا مکمل انتظام کیا ہے کہ ہدایت لینے والوں کا فقدان تھا۔ لیکن ہدایت دینے والا آدمؑ کی شکل میں موجود تھا۔ اولاد آدم بعد میں آئی ہے۔ اور آدمؑ خلیفۃ اللہ بنکر پہلے آئے ہیں اور آدمؑ بھی بشر بعد میں بنے ہیں خلیفۃ اللہ پہلے بنے ہیں۔ بشریت کے اعلان سے پہلے یہ اعلان ہوگیا تھا کہ میں روئے زمین پر ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ یہی وجہ تھی کہ ملائکہ کو بھی یہ خیال پیدا ہوگیا تھا کہ شاید ہمیں کو خلیفہ بنا دیا جائے گا اور ہمیں کو یہ عظیم منصب دیدیا جائے گا۔ ہم سے بڑا اہل کون ہوگا۔ ہم تسبیح کرنے والے، تقدیس کرنے والے، سجدہ کرنے والے، عبادت کرنے والے، صاحب کردار اور معصوم ہیں اور ہمارے علاوہ جو مخلوق روئے زمین پہ ہے وہ نہایت درجہ ذلیل۔ پست، بدکردار، سفاک، خونریز، بدعمل اور بدسرشت ہے۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم جیسے معصومین کے ہوتے ہوئے ایسے پست کرداروں کو نمائندہ بنا دیا جائے۔ لیکن ایک مرتبہ اعلان ہوا۔ "میں مٹی سے ایک بشر بنانے والا ہوں اور جب اس کا پیکر تیار ہو جائے اور اس میں روح پھونک دی جائے تو تم سب سجدہ میں گر پڑنا۔"

ملائکہ کی نظر میں ایک عجیب بات آئی۔ اب تک ہم سمجھے تھے کہ یہی مخلوق جو روئے زمین پہ پائی

جاتی ہے۔ اسی میں سے کوئی خلیفۃ اللہ ہوگا۔ اس لئے ہم نے بھی اپنا نام پیش کر دیا تھا اور یہ عرض کر دیا تھا کہ ہم وہ دیگران سے تو ہمیں بہتر ہیں۔ لیکن جب اس نے کہہ دیا کہ تم وہ نہیں جانتے جو میں جانتا ہوں تو ہم خاموش بھی ہو گئے۔ اس کی مصلحت وہی جانتا ہے۔

اب مصلحت سامنے آئی کہ خلیفۃ اللہ ان میں سے نہیں ہوگا۔ جن کا کردار شروع سے خراب ہو اور بعد میں ٹھیک ہو جائے۔ بلکہ خلیفۃ اللہ ایسا کوئی ہوگا جو آغاز ہی سے اتنا بلند مرتبہ ہوگا کہ ملک معصوم سے سجدہ کرا دیا جائے۔ چنانچہ ملائکہ معصومین نے مصلحت کو پہچانا اور سر سجدہ میں رکھ دیا۔ ابلیس یہی سوچتا رہا کہ جیسے یہ ویسے وہ۔ آدم ہی میں کون سی خاص بات پائی جاتی ہے جو روئے زمین پر ہیں وہ تو بدکردار ہیں ہی۔ یہ نیا جو پیدا ہو رہا ہے یہ بھی مٹی سے بن رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ خاک کی پستی اس کے ساتھ بھی رہے گی۔ میں آتش مزاج ہو کر اس کے سامنے سر جھکا دوں۔ یہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔ مجھے بزم قدس سے نکلنا گوارا ہے۔ ذلیل ہونا گوارا ہے۔ لعنت کا طوق گوارا ہے لیکن یہ گوارا نہیں ہے کہ میں بلند ہو کر پست کے سامنے سر جھکاؤں۔

واقعہ کے تفصیل کی ضرورت نہیں ہے لیکن روز اول ہی جو چند مسائل واضح ہو گئے ہیں انہیں کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ خدائی رہنما پیدا ہو کر راہنما نہیں بنتا بلکہ راہنما بن کر پیدا ہوتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اللہ والا اتنا بلند ہوتا ہے کہ اسے معصوم فرشتہ بھی سجدہ کرتا ہے۔ اور اس کی عظمت کے سامنے تسبیح و تقدیس بھی کام نہیں آتی۔

تیسری بات یہ ہے کہ ملائکہ نے حکم خدا پر اعتماد کیا تو سجدہ کر کے معصوم رہے اور ابلیس نے جیسا ویسا کہنا شروع کر دیا۔ تو محفل قدس سے نکال دینے کے قابل ہو گیا اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ابلیس کو اس کی آتش مزاجی نے تباہ کیا ہے۔ دین خدا میں تباہی کا سنگ بنیاد آتش مزاجی ہی نے رکھا ہے۔ اب جہاں جہاں یہ مزاج ہوگا وہیں سر جھکانے

سے انکار ہوگا اور وہیں دربار سے نکلنے کا حکم ہوگا۔ تاریخ میں تلاش کیجئے راز خود ہی کھل جائے گا کس کے مزاج میں آتش مزاجی تھی، کس نے تراب کے بجائے ابوتراب کے سامنے سر جھکانے سے انکار کیا۔ کون محفل قدس سے نکالا گیا۔ جب یہ سب باتیں معلوم ہو جائیں گی تو یہ معلوم کرنا بھی آسان ہو جائے گا کہ انسان کسے کہتے ہیں اور شیطان کیسا ہوتا ہے۔ "من الجنۃ" کسے کہتے ہیں اور "والناس" کون ہے۔

قدرت نے روز اول آدمؑ کو خلیفۃ اللہ بنا کر پیدا کر کے واضح کر دیا کہ الٰہی نمائندگی کے لئے دو باتوں کا ہونا بے حد ضروری ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ خلیفۃ اللہ پیدائشی صاحب منصب ہوتا ہے۔ اس کے منصب میں سن و سال، عمر و قامت کی قید نہیں ہوتی۔ وہ سارے ملائکہ سے افضل ہوتا ہے اور اس وقت بھی رہتا ہے جب کوئی ہدایت لینے والا نہ ہو تو جب ابتدائی منزل میں دنیا راہنما کے بغیر نہیں رہ سکی تو آخری منزل میں یہ کیسے ممکن ہے کہ دنیا رہے اور کوئی راہنما نہ رہے۔

آج دنیا کی ساری قوموں سے یہ سوال ہوگا کہ تمہارا راہنما کہاں ہے اور تمہارے پاس دین الٰہی ہے تو دین کا نمائندہ کون ہے۔ ساری قومیں خاموش رہیں گی۔ سب کے پاس خود ساختہ نظام کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ یہ ایک اثنا عشری فرقہ ہے جسے یہ کہنے کا حق ہے کہ ہمارے پاس خدا کا دین بھی ہے اور خدا کا نمائندہ بھی ہے۔ جس طرح ہزار انقلابات کے بعد اس نے دین کو بچا رکھا ہے۔ اسی طرح ہادی اور راہنما کو بھی محفوظ کر کے رکھا ہے۔ کائنات نہ آغاز میں حجت خدا سے خالی تھی نہ انجام میں خالی ہوگی۔ آغاز میں ملائکہ کو سر جھکانے کا حکم دیا گیا تھا اور انجام میں ساکن فلک نبی کو جماعت پڑھنے کا حکم دیا جائے گا۔

قدرت نے ہر دور میں انتظام کیا اور اس اہتمام سے انتظام کیا کہ جیسی ضرورت پڑی ویسا ہی ہادی بھیجا۔ اور جس شان کے کمال کی ضرورت پڑی اسی انداز کا کمال دے کر بھیجا۔ دنیا نے طوفان بدتمیزی اٹھایا تو نوحؑ کو طوفان کا توڑ دے کر بھیج دیا۔ نمرودیت نے فساد

کی آگ بھڑکائی تو خلیل کو بَرداً وسلاماً کا اعجاز کر بھیجدیا۔ فرعونیت نے جادوگری دکھائی تو موسیٰ کو ضربِ کلیمی عنایت کردی۔ یہودیت نے طب و حکمت کا زور دکھایا تو ابن مریم کو مسیحا بنادیا۔ غرض کہ جب جیسی ضرورت پڑی ویسا ہی ہادی وہ اپنا بھیجدیا اور اسی انداز کا کمال دیدیا۔ خود مرسل اعظمؐ کے دور میں فصاحت و بلاغت اور شجاعت و بہادری کا دور دورہ تھا تو پیغمبرؐ کو دوہرے معجزات عنایت کردیئے۔ فصاحت و بلاغت کا زور توڑنے کے لئے قرآن مجید دیدیا۔ اور شجاعت و بہادری کی کاٹ کرنے کے لئے ذوالفقار دیدی۔ زبان سے قرآن کی آیتیں پڑھی جائیں گی اور ذوالفقار سے باطل کے حملوں کی کاٹ کی جائے گی اور یہ سب اس اہتمام سے ہوگا کہ قرآن کی ترجمانی کے لئے سورہ اسے دیا جائے گا، جو لسان اللہ ہوگا۔ اور باطل کے دفاع کے لئے ذوالفقار اسے عنایت کی جائے گی۔ جو ید اللہ ہوگا۔

رسالت کے بعد امامت کے بارے میں بھی یہی نظام رکھا گیا کہ جیسا زمانہ رہا ویسا کمال کا زور رہا۔ امامؑ نے ویسا ہی اعجاز دکھلایا اور اسی انداز سے دنیا کو راہ راست پر لانے کی کوشش کی۔ معجزات کی فہرست بہت طولانی ہے۔ کس میں ہمت ہے جو ایک فرصت میں سارے تفصیلات بیان کرسکے۔ صرف یہ عرض کرنا ہے کہ زمانہ کے بدلتے ہوئے حالات اور دنیا کی ترقی کو دیکھتے ہوئے مالک کائنات نے اپنے نمائندوں کو ایسے کمالات عنایت کیے کہ کسی دور میں ان کی کاٹ نہ ہوسکے۔ اور کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ ہمارے سامنے کوئی ایسی دلیل نہ تھی جس سے ہم انھیں امام تسلیم کرسکتے اور کائنات سے مافوق سمجھتے۔ اور جب یہ سلسلہ ہر دور میں قائم رہا ہے تو دنیا مجھے سوچ کر بتائے کہ اب جو قدرت کا آخری نمائندہ آئے گا اس کے پاس کتنے معجزات ہوں گے۔ اور کس انداز کی طاقت ہوگی۔ اب تو دنیا ترقی کی آخری منزل پر ہے اور کوئی کمال ایسا نہیں ہے جو بظاہر باقی رہ گیا ہو۔ تیز رفتاری کا یہ عالم ہے کہ لمحات میں آسمانوں کی سیر ہورہی ہے۔ برقی قوت کی یہ کیفیت ہے کہ ساری دنیا منور ہورہی ہے۔ کہربائی طاقت اور جوہری توانائی کا یہ انداز ہے کہ چشم زدن میں سارا عالم تہ و بالا ہوسکتا ہے۔ ایسے حالات میں

جو الٰہی نمائندہ آئے گا وہ کتنی طاقتیں لے کر آئے گا اور کیسے کیسے کمالات اپنے ساتھ لائے گا۔ اس کا اندازہ وہی افراد کرسکتے ہیں جنہوں نے انبیاء اور ائمہ کے معجزات کا جائزہ لیا ہے اور خود معجزہ کا فلسفہ سمجھا ہے۔ شاید اسی لئے روایت نے بیان کیا ہے کہ وہ آخری حجت ظہور کرے گا تو انگشت مبارک میں خاتم سلیمانؑ ہوگی۔ دست مبارک میں عصائے موسیٰؑ ہوگا۔ پشت اقدس پر مہر امامت ہوگی۔ روئے انور پر یوسفی خال ہوگا۔ لبوں پر محمدی نطق ہوگا۔ نفس میں مسیحائی دم ہوگا۔ دل میں فاطمی صبر ہوگا۔ ہاتھ میں حیدری ذوالفقار ہوگی اور کردار میں گیارہ اماموں کا جلال و جمال ہوگا۔ کعبہ کی دیوار سے ٹیک لگائے ہوئے "جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ" کا نعرہ بلند کرتے ہوئے انتقام خون ناحق کا جذبہ دل میں لئے ہوئے اس شان سے آئے گا کہ قدرت پکار اٹھے گی۔ دیکھو میرا نمائندہ ایسا ہوتا ہے۔ میری دی ہوئی طاقت ایسی ہوتی ہے۔ تم وسائل و ذرائع سے اپنی آواز پہنچاتے ہو یہ بلا وسیلہ ساری کائنات کو آواز سنا دے گا۔ تم آلات کے ذریعہ سفر کی منزلیں طے کرتے ہو۔ اس کے چاہنے والے آواز پر کھنچ کر اس کی خدمت میں پہونچ جائیں گے۔ تم جوہری توانائی سے دنیا کو مٹا رہے ہو یہ ذوالفقار حیدری سے کائنات کی اصلاح کرے گا۔ بگاڑنے والے لاکھ ہوں گے اور بنانے والا ایک۔ فساد پھیلانے والے کروڑ ہوں گے اور اصلاح کرنے والا ایک۔ لیکن وہ ایک اتنا طاقتور ہوگا کہ ظلم و جور سے بھری ہوئی دنیا کو اکیلا عدل و انصاف سے بھر دے گا۔ اس کی طاقت کا اندازہ کرنا ہے تو یوں اندازہ کرو کہ جب ساری جوہری توانائی اور ایٹمی طاقت ظلم و جور پر صرف ہوجائے گی تو ایک ذوالفقار حیدری دنیا کو عدل و انصاف سے بھر دے گی۔ ظلم عدل سے بدل جائے گا۔ بدکرداری کردار میں تبدیل

ہو جائے گی۔ کفر ایمان کا راستہ اختیار کرے گا۔ شرک توحید میں بدل جائیگا۔ نفاق اخلاص کے سانچہ میں ڈھل جائے گا۔ جبریل امینؑ جاء الحق کا کلمہ پڑھیں گے۔ میکائیلؑ حرز بازو بنیں گے۔ مرسل اعظمؐ دعائیں دیں گے۔ زہراؑ بڑھ کر بلائیں لیں گی۔ دین خدا قربان ہوگا۔ کعبہ عظمتوں کا طواف کرے گا۔ قرآن قصیدہ پڑھے گا۔ قدرت ایفاءِ وعدہ پر ناز کرے گی دنیا عدل و انصاف پر فخر کرے گی اور آدمیت آواز دے گی۔ فرشتو! کل تم نے نہیں پہچانا تھا آج پہچان لو۔ بشریت کا کام فساد کرنا نہیں ہے۔ بشریت کا منصب ساری کائنات کے فساد کو لمحوں میں اصلاح میں تبدیل کر دینا ہے۔ یہ وہ ہے جس پر آدمیت ناز کرتی ہے۔ یہ وہ ہے جس پر خلقت قربان ہے۔ یہ وہ ہے جس پر کلمیت صدقے ہے۔ یہ وہ ہے جس کی سیرت اطاعت گذار ہے۔ یہ وہ ہے جو وارث علم احمد مختارؐ ہے۔ یہ وہ ہے جو حامل زور حیدر کرارؑ ہے۔ یہ وہ ہے جو فرزند قسیم جنت و نار ہے۔ یہ وہ جو خلق حسنؑ اور صبر حسینؑ کی یادگار ہے اور مختصر یہ ہے کہ لال حسینؑ کا ہے لیکن صاحب ذوالفقار ہے۔ صلوات!

ہدایت کے دو طریقے ہیں راستہ دکھانا اور منزل تک پہنچا دینا۔

قدرت نے ہر دور میں ہدایت کا انتظام کیا ہے لیکن عام طور پر نظام ہدایت راستہ دکھانے تک ہی محدود رہا اور انبیاء و مرسلین نے قوم کو نیک و بد کی ہدایت دیدی منزل کا پتہ بتا دیا۔ اب اس کے بعد قوم کو اختیار ہے کہ وہ راہ راست پر آئے یا نہ آئے۔ جناب نوحؑ نے ۹۵۰ برس راستہ دکھایا لیکن صرف چند آدمی براہ راست پر آئے۔ جناب ابراہیمؑ نے مدتوں زحمتیں برداشت کیں لیکن کثریت بت پرست ہی رہ گئی۔ جناب موسیٰؑ مصائب کا سامنا کرتے رہے لیکن قوم گوسالہ پرست ہی رہ گئی۔ جناب عیسیٰؑ نے دنیا چھوڑ دی لیکن قوم راہ راست

پر نہ آسکی۔ اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ معاذ اللہ انبیاء نے کوئی کوتاہی کی ہے یا ان کے پیغام میں کوئی نقص تھا۔ نہیں۔ نہیں انھوں نے پیغام پہونچایا۔ اور پوری دلچسپی سے پہونچایا۔ یہ قوم کی بدنصیبی تھی کہ اس نے اس پیغام کو قبول نہیں کیا اور اپنی گمراہی پر قائم رہی۔ انبیاء کا فریضہ ادا ہو گیا۔ ان کے ذمہ صرف پیغام پہونچانا تھا، انھوں نے پیغام پہونچا دیا اور اپنا فرض ادا کر دیا۔ اسی لئے ہر آنے والے نے صاف لفظوں میں کہہ دیا میرا کام صرف پیغام پہونچانا ہے اور میرا اجر اللہ پر ہے۔ منزل تک لے جانا میرا کام تھا: اجر مانگنے کا مجھے حق ہے۔ جس نے مجھے فریضہ سپرد کیا ہے وہ میرے اجر کا ذمہ دار ہے۔ میں نے اپنے فریضہ کو ادا کر دیا۔ لیکن جب مرسل اعظمؐ کا دور آیا تو انداز بدل گیا یہاں اعلان ہوتا ہے کہ ہم نے اپنے رسولؐ کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تاکہ وہ دین کو تمام ادیان پر غالب بنائے اور اس کی برتری ثابت کرے چاہے مشرکین کتنے ہی ناراض کیوں نہ ہوں اور انھیں یہ بات کتنی ہی بری کیوں نہ معلوم ہو۔ آیت کا انداز ہی بتا رہا ہے کہ مرسل اعظمؐ کی ذمہ داری دوسرے انبیاء سے زیادہ ہے اور آپ کا فرض دیگر انبیاء سے بالاتر ہے۔ انبیاء کا کام پیغام پہونچانا تھا اور بس لیکن آپ کو اس دین کو غالب بھی بنانا ہے اور سارے ادیان سے بالاتر بھی ثابت کرنا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا مرسل اعظمؐ کے دور میں ایسا ہو گیا۔ اور کیا حضورؐ نے دین الٰہی کو سارے ادیان پر غالب بنا دیا ہے؟ اگر ایسا ہے تو آج دین اسلام کے علاوہ دوسرے ادیان کیوں نظر آرہے ہیں۔ اور صرف نظر ہی نہیں آرہے ہیں بلکہ عملی طور سے دین اسلام پر غالب بھی ہیں۔ اسلام اپنے نظریات و قوانین سے یکتہ فرد ہے۔ اس کے اصول و قواعد ناقابل تشکیک فرد ہیں لیکن عملی اعتبار سے سارے ادیان اس سے بالاتر نظر آرہے ہیں تو کیا اسلام کے غلبہ کے

یہی معنی ہیں کہ وہ اپنے اصول و قوانین میں سب سے بالاتر رہے اگر ایسا ہے تو رسول کا کوئی کام ہی نہیں تھا۔ جس خدا نے بنایا تھا اس نے روز اول سے بنایا ہی بالاتر تھا تو اس میں رسول کا کیا کام ہے۔ وہ نہ واضع قوانین ہے اور نہ اسے قوانین میں دخل دینے کا کوئی حق ہے۔ اس کا کام تو صرف قوانین کو پہونچا دینا ہے اور اس پر عمل کرا دینا ہے۔ چاہے قوانین بالاتر ہوں یا پست تر۔ بلندی اور پستی قانون کے بنانے والے کے ہاتھ میں ہے۔ اس سے رسول کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ تو پھر رسولؐ سے کیوں کہا گیا کہ اس دین کو غالب بنانا ہے۔ آیت کا انداز ہی بتا رہا ہے کہ قدرت اپنے دین کو عملی طور پر غالب بنانا چاہتی ہے اور یہ کام حیات پیغمبر اسلامؐ میں نہیں ہو سکا اور سچی بات تو یہ ہے کہ آج تک نہیں ہو سکا لیکن سوال یہ ہے کہ اگر کام مکمل نہیں ہوا تو رسولؐ کو اجرت مانگنے کا کون سا حق تھا۔ اور انھوں نے قوم سے محبتِ قربیٰ کا سوال کیوں کیا؟ انھیں بھی چاہئے تھا کہ دوسرے انبیاء کی طرح پیغام پہنچا کر چلے جاتے اور اپنا اجر پروردگار سے لے لیتے۔ قوم سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ اجرت مانگنا دلیل ہے کہ کام تمام ہو گیا اور دین اسلام کا سارے ادیان پر غالب نہ آنا دلیل ہے کہ ابھی مقصد مکمل نہیں ہوا تو آخر ماجرا کیا ہے اور یہ کیسا نظام ہے کہ کام مکمل نہیں ہوا اور اجرت کا مطالبہ کر لیا۔ یاد رکھئے اگر سلسلۂ امامت کو نبوت سے الگ کر دیا جائے تو مسئلہ قیامت تک حل نہ ہوگا اور رسول اکرمؐ پر دو الزامات بہر حال باقی رہیں گے۔ ایک یہ الزام رہے گا کہ کام پورا نہیں کیا اور دوسرا یہ الزام بھی رہے گا کہ کام مکمل کئے بغیر اجرت کا مطالبہ کر دیا۔ شاید قدرت نے اسی مطالبہ کی طرف اشارہ کیا تھا کہ اے پیغمبرؐ! اگر تم نے یہ کام نہیں کیا تو گویا رسالت کا حق ہی ادا نہیں کیا اور پیغام الٰہی کو پہونچایا ہی نہیں ——— غدیر کے میدان میں قدرت کے تیور بتا رہے ہیں کہ کارِ رسالت کی تکمیل امامت پر موقوف ہے اور امامت کے

بغیر رسالت کا کام بھی نامکمل رہ جاتا ہے ——— تو جس دم پیغمبر اسلامؐ نے امامت کا اعلان کر دیا تو گویا اپنے فرض کو ادا کر دیا اور یہ واضح کر دیا کہ اگر میری زندگی میں دین اسلام سارے ادیان پر غالب نہیں آیا۔ تو اس کو میری تبلیغ کا نقص نہ کہنا۔ میرا کام ابھی تمام نہیں ہوا ہے۔ میرا کام امامت کے خاتمہ کے ساتھ تمام ہوگا۔ اب اگر امامت کی آخری منزل پر بھی دین اسلام غالب نہ آئے تو میرا کام نامکمل ہے اور میری رسالت بے کار ہے لیکن اگر امامت کے تمام ہوتے ہوتے یہ کام تمام ہو جائے اور دین اسلام تمام ادیان پر غالب آجائے تو اسے میرا ہی کمال سمجھنا اور اس تبلیغ کو میری تبلیغ سمجھنا۔ شاید محبت اہلبیتؑ کو اجر رسالت قرار دینے کا مقصد یہی تھا کہ رسالت کے کاروبار کو اہلبیت سے ملا کر دیکھنا انھیں آپس میں ایک دوسرے سے جدا نہ کرنا ورنہ رسالت کا مقصد کبھی سمجھ میں نہ آئے گا۔ اور جب دونوں کو آپس میں ملا دوگے تو راز کھل جائے گا کہ رسالت کے مقاصد کی انتہا کہاں ہے اور کارِ رسالت کس طرح مکمل ہوتا ہے۔ اب اگر امامت کی آخری منزل میں دین الٰہی سارے ادیان پر غالب آجائے تو اسے بھی رسالت ہی کا کارِ نمایاں قرار دینا۔ شاید اسی لئے پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا تھا کہ ہمارا آخری وارث صورت میں، سیرت میں، رفتار میں، گفتار میں میری شبیہ ہوگا۔ اس کی کنیت بھی میری کنیت ہوگی۔ اور اس کا نام بھی میرا نام ہوگا۔ مجھ میں اور اس میں "برائے نام" بھی فرق نہ ہوگا۔

ارباب نظر! قدرت نے اسی حقیقت کو واضح کرنے کے لئے دین الٰہی کے غلبہ کو رسالت کا فرض قرار دیا تھا تاکہ دنیا رسالت و امامت کے رشتے کو پہچان لے اور اسے اندازہ ہو جائے کہ رسالت کا کام امامت کا کام ہے اور امامت کا کام رسالت کا کام ہے۔ "حُسَيْنٌ مِنِّي وَأَنَا مِنْ حُسَيْنٍ" بے مقصد نہیں ہے۔ اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ جو رسولؐ نے کیا وہ حسینؑ کا مقصد ہے اور جو حسینؑ نے کیا

وہ رسول کا کارنامہ ہے۔

رسالت وامامت کے اس اتحاد نے اسلام کے بے شمار عقدے حل کر دیئے ہیں اور قدرت کے نظام ہدایت کو مکمل کر دیا ہے۔ قدرت گویا آواز دے رہی ہے کہ ہم نے آغاز میں پہلے محمدؐ کو بھیجا تھا اور انجام میں آخری محمدؑ کو بھیجیں گے۔ آغاز میں ۵۰۰ برس کی فترت کے بعد بھیجا تھا انجام میں ہزار سال کی غیبت کے بعد بھیجیں گے۔ آغاز میں تصدیق کے لئے بنت اسد کے لال کو ساتھ کر دیا تھا اور انجام میں تائید کے لئے مریم کے لال کو ساتھ کر دیں گے آغاز کی بندگی میں علیؑ شریک جماعت تھے اور انجام کی جماعت میں عیسیٰ شریک جماعت ہوں گے۔ آغاز کی نماز نے نصیریوں کی آنکھ کھول دی تھی انجام کی نماز نصاریٰ کی آنکھ کھول دیگی۔ علیؑ خدا ہوتے تو کعبہ میں پیدا نہ ہوتے اور عیسیٰؑ خدا ہوتے تو شریک جماعت نہ ہوتے۔

قدرت نے جسے بھیجا کمال دے کے بھیجا اور جتنے عظیم مقصد کے لئے بھیجا اتنا ہی عظیم کمال دیکر بھیجا۔ اور جب بھیجا تو آغاز ہی سے صاحب کمال بنا کر بھیجا۔ ابتدا میں آدمؑ کو پیدا کیا تو ساری کائنات کی مٹی جمع کر کے جوہر نکال کر پیکر آدم بنایا اور انتہا میں قائمؑ کو بھیجا تو عرب و عجم کا سارا جمال اکٹھا کر کے جوہر خاتم تیار کیا۔

واقعہ مشہور ہے کہ جب قیصر روم کی پوتی ملیکہ قیدیوں کے لباس میں بغداد تک آئی اور اس کی خرید و فروخت کا مسئلہ شروع ہوا تو امام علی نقیؑ نے ایک شخص کو ایک سو بیس دینار دے کر سامرے سے بغداد بھیجا کہ کل جب قیدیوں کی خرید و فروخت کا وقت آئے تو تم بھی چلے جانا اور ایک ان علامات کی قیدی خاتون ہوگی انھیں خرید لینا اور ایک سو بیس دینار قیمت کے طور پر

پر دیدینا۔ بشیر بن سلیمان رقم لے کر پہونچا تو کیا دیکھا کہ قیدیوں کی خرید و فروخت کا کام جاری ہے اور درمیان میں ایک قیدی ہے جو کسی کے ہاتھ فروخت ہونا نہیں چاہتی اور ہر ایک کو اپنے سے دور رکھتی ہے۔ مالک پریشان ہے کہ کس طرح فروخت کرے۔ بشیر آگے بڑھا اور آگے بڑھ کر کہنے لگا کہ اس قیدی کو میرے ہاتھ فروخت کر دو۔ میں ایک خط بھی لے کر آیا ہوں۔ رومی زبان میں لکھا ہوا حضرتؑ کا خط اس قیدی کو دیا۔ اس نے آنکھوں سے لگایا اور کہا بس مجھے اسی کے ہاتھ فروخت ہونا ہے۔ اس نے ۱۲۰ دینار مالک کے حوالے کئے اور قیدی کو لے کر چل دیا۔ سر راہ اس سے پوچھا کہ تم کون ہو اور کیوں اس طرح آئی ہو کہ امام علی نقیؑ نے تمہاری خریداری کے لئے مجھے سامرہ سے بغداد بھیجا ہے۔ اس نے کہا کہ ملیکہ قیصر روم کی پوتی ہوں۔ میں نے خواب میں دیکھا تھا کہ پیغمبر اسلامؐ اور حضرت عیسیٰؑ تشریف لائے ہیں اور پیغمبرؐ حضرت عیسیٰ سے میرے بارے میں گفتگو کر رہے ہیں اور اپنے فرزند کے لئے میرا پیغام دے رہے ہیں۔ حضرت عیسیٰ نے اس پیغام کو قبول کر لیا اور میں نے بھی اپنی رضامندی ظاہر کر دیا۔ اس کے بعد جب میں بیدار ہوئی تو میری عجیب کیفیت تھی۔ میں سخت حیرت میں تھی کہ ان بزرگوار تک کیسے پہنچوں گی جن کے ساتھ میرا رشتہ ہوا ہے۔ صدمہ میں بیمار ہوئی ہزار علاج ہوا لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ بالآخر میں نے اپنے دادا سے کہا کہ میری صحت کا ایک ہی طریقہ ہے کہ مسلمان قیدیوں کو آزاد کر دے۔ اس نے سب کو آزاد کر دیا اور میں نے بھی صحت کا اظہار کر دیا۔ اس کے بعد میں نے جناب مریمؑ اور جناب فاطمہؑ کو خواب میں دیکھا اور اپنی پریشانی بیان کی۔ آپ نے مجھے کلمہ پڑھوایا اور گلے سے لگا لیا۔ پھر آپ بشارت دے کر تشریف لے گئیں۔ اور میں نے خواب

میں امام حسن عسکریؑ کو دیکھا۔ میں نے عرض کی۔ سرکار میں آپ کی خدمت میں کس طرح پہونچوں گی۔ کہاں آپ اور کہاں میں؟ آپ کے جد نے پیغام کیوں دیا۔ آپ کی جدہ ماجدہ نے مبارکباد کیوں دی۔ آپ نے فرمایا کہ جب تمھارا دادا مسلمانوں سے مقابلہ کے لیے لشکر بھیجے گا تو تم بھی لباس بدل کر کنیزوں میں شامل ہو جانا اور جب لشکر سے الگ ہو کر قیدی بننا تو اپنا نام نرجس بتانا تاکہ لوگ کنیز سمجھ کر گرفتار کرلیں اور فروخت کردیں۔ میں تمھارے آنے کا انتظام کردوں گا۔ چند روز کے بعد ایسا ہی ہوا اور میں گرفتار ہوگئی اور آج تمھارے ہاتھ فروخت ہو رہی ہوں۔ بشیر نے کہا جب آپ قیصر روم کی پوتی ہیں تو عربی کیسے بولتی ہیں۔

انھوں نے فرمایا کہ میرے دادا نے مجھے بہت سی زبانیں سکھائی ہیں اور ان میں عربی کی بھی تعلیم دی ہے۔ بشیر انھیں لئے ہوئے امام علی نقیؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے فرمایا کہ آج اللہ نے دین اسلام کی عزت اور دین نصاریٰ کی ذلت کا اظہار کردیا اور یاد رکھو کہ اللہ تم کو ایک ایسا فرزند عطا کرے گا جو ساری کائنات کو ظلم و جور کے بدلے عدل و انصاف سے بھر دے گا۔ میں نے تمھارا عقد حسن عسکریؑ سے کردیا ہے جس طرح کہ خواب میں میرے جد نے رشتہ کیا تھا۔ جناب نرجس جناب حکیمہ خاتون کی خدمت میں آگئیں۔ اور انھوں نے ان کی تعلیم و تربیت کا کام شروع کردیا۔ لیکن ذرا قدرت کا انتظام تو دیکھیے کہ کہاں قیصر روم اور کہاں امام علی نقیؑ۔ قدرت نے عجیب و غریب اہتمام کرکے وصی عیسیٰ کی نواسی کو وصی رسولؐ کے پوتے تک پہونچا دیا۔ اور اب یہ رشتہ اتنا استوار ہوا کہ قیامت تک کے لیے قائم ہوگیا۔

۱۵ شعبان ۲۵۵ھ ہجری کو امام علی نقیؑ کی خوشخبری پوری ہوئی۔ اور اللہ نے نرجس خاتون کی آغوش میں وہ نور الٰہی دیدیا جس سے سارا عالم انسانیت منور ہونے والا تھا۔ قدرت نے اس آخری حجت کے سلسلے میں ہر بات انوکھی ہی رکھی ــــ باپ کا

عقد ہوا تو عالم بالا میں ــــ ماں کی آمد ہوئی تو نئی شان سے اور اب ولادت ہوئی اس انداز سے کہ شب ولادت آگئی۔ اور جب جناب حکیمہ سے کہا جاتا ہے پھوپھی جان آج کی شب آپ یہیں قیام فرمائیں۔ اللہ مجھے ایک حجت عطا کرنے والا ہے تو فرماتی ہیں کہ بیٹا نرجس کے یہاں تو ایسے آثار نہیں ہیں!

فرمایا پھوپھی جان لیکن قدرت کا منشا یہی ہے کہ اس فرزند کی ولادت اسی انداز سے ہوگی۔ جناب حکیمہ ٹھہر گئیں۔ رات تمام ہوتے ہوتے ایک مرتبہ آثار ولادت ظاہر ہوئے۔ اور صبح صادق کے وقت ایک امامؑ صادق اس دنیائے انسانیت میں آگیا۔ ولادت کا انداز جناب موسیٰؑ سے ملتا جلتا ہے۔ ادھر فرعون فکرمند تھا کہ موسیٰؑ پیدا نہ ہونے پائے لیکن فرعون کے علی الرغم قدرت نے موسیٰ کو پیدا کردیا اور ساری دنیا کی کوشش کے باوجود اپنی آخری حجت کو دنیا میں بھیج دیا۔ آئے تو اس شان سے آئے کہ سر سجدہ خالق میں رکھدیا۔ زبان پر کلمۂ شہادتین جاری کیا۔ داہنے ہاتھ پر "جاء الحق وزھق الباطل" کا نقش کندہ تھا چہرے سے جلالت کے آثار نمایاں تھے۔ جناب حکیمہ امام حسن عسکریؑ کے پاس لے آئیں۔ آپ نے سینے سے لگایا۔ فرمایا فرزند کچھ پڑھو۔ فرزند نے کلمۂ شہادتین زبان پر جاری کیا۔ آپ نے فرمایا اب انھیں لے جائیے اور ماں کو دیدیجیے۔ پھر سات دن کے بعد تشریف لائیے گا۔ جناب حکیمہ سات دن کے بعد آئیں تو بچہ کو تلاوت کرتے ہوئے پایا۔ چند روز کے بعد جب پھر آئیں تو بچہ کو نہ پایا۔ سخت پریشان ہوئیں۔ پوچھا نرجس! میرا فرزند کہاں ہے۔ عرض کی حفظ خداوندی میں ہے۔ قدرت نے اس کی حفاظت کا انتظام الگ سے کردیا ہے۔ ایک طائر سفید آسمان کی طرف لے گیا ہے اور وہیں پرورش ہو رہی ہے۔ ۴۰ روز کے بعد بچہ واپس آیا اور اب جو جناب حکیمہ نے دیکھا تو بچہ دو برس کا معلوم ہو رہا تھا

امام حسن عسکریؑ سے فرمایا فرزند تمھارا بچہ بہت بڑا ہو گیا ہے۔ عرض کی ابھی بچہ ہی تو ہے۔ فرمایا یہ قدرت کا انتظام ہے۔ ہم اہلبیت کی پرورش اسی انداز سے ہوتی ہے اور ان کا قیاس دنیا کے دوسرے افراد پر نہیں ہو سکتا۔ ولادت کی شان نئی تربیت کا انداز نیا اور جب ہر مرحلہ میں ایک اعجازی شان نظر آرہی ہے تو جب اپنے فرض امامت کو ادا کرنے کے لئے اٹھے گا تو اس وقت بھی نرالا ہی انداز ہوگا اور جب ساری دنیا ظلم و جور سے بھری ہوگی تو لمحوں میں ظلم و جور کو فنا کر کے عدل و انصاف سے بھر دے گا۔

چار برس تک فرزند باپ کے ساتھ رہا۔ ۲۶۰ھ میں امام حسن عسکریؑ کا انتقال ہو گیا۔ تو غیبت کا آغاز ہو گیا۔ دنیا درپے آزار تھی۔ سلسلہ امامت کو مٹانے کی فکر تھی اور قدرت کا مقصد تھا کہ یہ سلسلہ قیام قیامت تک قائم رہے۔ چنانچہ اس نے غیبت کا حکم دیدیا۔ آغاز کار میں جان کا خطرہ تھا تو ہجرت کام آئی اور انجام کار میں زندگی کو خطرہ پیدا ہوا تو غیبت کام آئی۔ نہ ہجرت میں رسولؐ کے وجود سے انکار ممکن تھا۔ نہ غیبت میں امام کے وجود سے انکار ممکن ہے۔ وہاں بھی رسول جا رہے تھے اور کسی نے نہ دیکھا، یہاں بھی امام موجود ہے اور کوئی دیکھنے والا نہیں ہے۔ وہاں بھی مصلحت الٰہی کام کر رہی تھی یہاں بھی مشیت الٰہی کام کر رہی ہے۔ ایک جھلک سب نے دیکھی تھی جب باپ کی نماز جنازہ کے لئے آئے تھے، ورنہ اکثریت تو وجود ہی سے بے خبر تھی۔ اور جو لوگ باخبر تھے وہ بھی اعلان کرنے سے مجبور تھے۔ اس کے بعد غیبت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ زمانہ کے حالات پر نگاہ رکھتے ہوئے اپنے نائب مقرر کر دیئے تاکہ لوگ ان کے ذریعہ مسائل دریافت کرتے رہیں اور تبلیغ دین کا سلسلہ جاری رہے۔ حالات باپ کے دور ہی سے ناموافق ہو گئے تھے۔ چنانچہ امام حسن عسکری نے بھی اپنا نائب مقرر کر دیا تھا جس کے پاس لوگ

خمس و زکوٰۃ کی رقمیں جمع کرتے تھے اور وہ خفیہ طور پر امام علیہ السلام تک پہونچا دیا کرتے تھے۔ حکومت کی نگرانی اس قدر سخت تھی کہ عثمان بن سعید کے لئے یہ کام بہت مشکل تھا اور ہر آن خطرہ تھا کہ اگر حکومت نے شیعوں کی آمد و رفت دیکھ لی تو قتل میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھے گی۔ چنانچہ انھوں نے نہایت ہوشیاری و ذہانت سے تیل کی دوکان کھول لی اور محبان اہلبیت اسی بہانے دوکان پر آنے لگے۔ کوشش یہ کرتے تھے کہ کسی وقت اجتماع نہ ہونے پائے اور حکومت کو حتی الامکان خبر بھی نہ ہونے پائے۔

امام حسن عسکریؑ کی شہادت کے بعد امام عصرؑ نے ان کے اس عہدہ کو برقرار رکھا اور وہ برابر امام کی خدمت میں رقمیں بھیجتے رہے۔ اور آپ کے اشاروں پر صرف کرتے رہے۔ مسائل کے جوابات بھی آپ ہی کے ذریعہ آتے جاتے تھے۔ بعض اوقات جناب حکیمہ خاتون بھی نیابت کے فرائض انجام دیتی تھیں جعفر عثمان بن سعید کے انتقال کے بعد یہ عہدہ ان کے فرزند محمد بن عثمان بن سعید عمری کو ملا اور انھوں نے باحسن وجوہ اس فریضہ کو انجام دیا اور امام و عوام کے درمیان واسطہ بنے رہے۔ ان کی وفات کا وقت قریب آیا تو حضرت نے یہ کام جناب حسین بن روح کے حوالے کر دیا۔ جن کے وسیلہ سے آج تک عریضے امام کی خدمت میں پیش کئے جاتے ہیں۔ حسین بن روح کے بعد یہ منصب جناب علی بن محمد سمری کو ملا اور انھوں نے اس فریضہ کو انجام دیا۔ لیکن جب ان کی وفات کا وقت قریب آیا تو حضرت نے فرمایا کہ اب تم کسی کو جانشین نہ بنانا۔ اب غیبت کبریٰ کا دور شروع ہو رہا ہے اور ہم سے کوئی باقاعدہ طور پر ملاقات نہ کر سکے گا۔ یہ دور صاحبان ایمان کے لئے بے حد آزمائش اور امتحان کا دور ہوگا لوگوں کے دل سخت ہو جائیں گے اور زمین ظلم و جور سے بھر جائے گی۔ ہمارا ظہور خروج

سفیانی اور صیحۂ آسمانی کے بعد ہوگا۔ اس کے پہلے کوئی ہمیں نہ دیکھ سکے گا۔

یہ کہہ کر پردۂ غیب میں تشریف لے گئے اور آج تک وہ غیبت کا سلسلہ باقی ہے۔ سنہ ۲۶۰ھ سے غیبت صغریٰ کا سلسلہ شروع ہوا اور سنہ ۳۲۹ھ سے علی بن محمد سمری کے انتقال سے غیبت کبریٰ کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اس دور میں قوم کو کن حالات سے گذرنا پڑا۔ اس کے تذکرہ کی ضرورت نہیں ہے۔ تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ ظالمین نے محبانِ اہلبیتؑ کو کس قدر ستایا۔ کتنے افراد تہ تیغ کئے گئے۔ کتنا خون ناحق بہایا گیا۔ کتنے قتل عام ہوئے۔ کس کس طرح حکومتوں نے پامال کیا۔ لیکن کیا کہنا جذبۂ ایمانی کا کہ اس میں کوئی کمی نہیں آئی اور وہ اسی شان سے باقی رہا۔ بلکہ اذیتوں نے اور نکھار پیدا کر دیا۔ اور سونا جتنا تپتا گیا اور کھرا ہوتا گیا۔ وہ قوم بنی اسرائیل تھی جس کا نبی چالیس دن کے لئے نگاہوں سے غائب ہوگیا۔ تو گوسالہ پرستی کرنے لگی اور صراطِ مستقیم سے ہٹ گئی۔ یہ محبانِ اہلبیتؑ ہیں کہ گیارہ سو برس سے امامؑ پردۂ غیب میں ہے اور ایمان میں ذرہ برابر کمی نہیں ہوئی بلکہ جتنے طعنے دیئے گئے اتنا ہی ایمان اور پختہ ہوتا گیا۔ صاحب غیبت خود بہتر جانتا ہے کہ قوم کو کس کس طرح ستایا گیا۔ جسمانی صدمے ایک طرف اور روحانی صدمے دوسری جانب۔

آپ سوچ سکتے ہیں کہ کسی قوم پر اس سے بڑا ظلم کیا ہو سکتا ہے کہ اس کے امامؑ کے وجود ہی سے انکار کر دیا جائے اور امام کی غیبت ہی کی طعنے دیئے جائیں۔ کوئی کہتا ہے کہ نہیں ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ ہیں تو فائدہ کیا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ اتنے دن سے کیسے زندہ ہیں۔ کوئی کہتا ہے ہیں تو کہاں ہیں۔ کوئی کہتا ہے ان کا کام کیا ہے اور کیا کر رہے ہیں۔ اپنے فریضہ کو کیوں نہیں ادا کرتے۔ قوم کی ہدایت کیوں نہیں کرتے۔ غرض جتنے منھ ہیں اتنی ہی زبانیں ہیں ــــ

مگر اللہ رے جذبۂ عقیدت کہ اس میں ذرہ برابر فرق نہیں آتا اور ہر سال نیمہ شعبان کو عریضہ ڈال کر دنیا کی قوموں کو متوجہ کرتے ہیں کہ دیکھو ہمارا ایمان کیا ہے۔ ہمارا یقین کیا ہے۔ ہم شدت مصائب میں بھی لاوارث نہیں ہیں۔ ہمارا وارث موجود ہے۔ تم اپنی فکر کرو۔ جس کا کوئی والی و وارث نہیں ہے ــــ ہم سے یہ نہ کہو کہ غائب ہیں تو بے فیض ہیں۔ بے اثر ہیں۔ بے فائدہ ہیں بے کار ہیں۔ اس لئے کہ ہم نے تو مذہب ہی شروع کیا ہے غیب سے۔ ہم نے مذہب کی بنیاد تین چیزوں پر رکھی ہے۔ ایک خدا ہے ایک رسولؐ ہے اور ایک قیامت ہے۔ خدا وہ غائب ہے جسے نہ دیکھا ہے نہ دیکھیں گے۔ رسولؐ وہ غائب ہے جسے کبھی لوگوں نے دیکھا تھا لیکن اب نہ دیکھیں گے۔ قیامت وہ غائب ہے جسے اب تک نہیں دیکھا لیکن کبھی دیکھیں گے۔ یعنی ہمارے ہر بنیادی عقیدہ میں غیبت شامل ہے۔ کوئی بالکل غائب ہے۔ کسی کے ظہور کے امکانات ہیں لیکن ہمارے ایمان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ہم خدائے غائب کو بھی مانتے ہیں اور اس کے علاوہ دنیا میں ہزاروں لوگ غائب ہیں جن کو مانتے ہیں۔ عقل غائب ہے لیکن مانتے ہیں۔ فضا میں ہوا غائب ہے لیکن مانتے ہیں۔ ابر میں آفتاب غائب ہوتا ہے لیکن مانتے ہیں۔ پھول میں خوشبو غائب ہے لیکن مانتے ہیں۔ تار میں بجلی غائب ہے لیکن مانتے ہیں۔ اور یہ اس لئے مانتے ہیں کہ یہ سب خود غائب ہیں لیکن ان کے اثرات موجود ہیں۔ تو اگر اثرات کے ذریعہ اتنی چیزوں کا اقرار کیا جا سکتا ہے تو بقائے کائنات سے امامؑ کے وجود کا یقین کیوں نہیں کیا جا سکتا جس کے بارے میں پیغمبرؐ نے صاف لفظوں میں واضح کر دیا ہے کہ اگر حجّت خدا نہ رہے تو زمین دھنس جائے اور کائنات تباہ و برباد ہو جائے۔

بقائے کائنات خود وجود امامؑ کی دلیل ہے۔ یا دوسری لفظوں میں یوں کہا جائے کہ وجود کائنات وجود خدا کی دلیل ہے اور بقائے کائنات وجود امامؑ کی دلیل ہے۔ خدا نہ ہوتا تو یہ کائنات نہ ہوتی اور امامؑ نہ ہوتا تو یہ کائنات فنا ہو جاتی۔ خدا نے اسی نور اقدس کے طفیل میں بنایا تھا اور اسی کے لئے باقی رکھا ہے۔ یہ آسمان اسی کے لئے ہے یہ زمین اسی کے لئے ہے۔ یہ کواکب و افلاک اسی کے لئے ہیں۔ اور جب سب اسی کے لئے ہیں تو جب تک وہ رہے گا رہیں گے۔ اور جب وہ نہ رہ جائے گا تو کچھ نہ رہ جائے گا۔

تو عزیزان محترم! غیبت اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے غیبت کا منکر نہ خدا کا قائل ہے نہ رسولؐ کا۔ نہ معاد کا قائل ہے نہ قیامت کا۔ اور ایسے شخص کو مسلمان نہیں کہا جا سکتا۔ غیبت امامؑ تو ان تمام غیبتوں سے بہتر ہے اور آخری لفظوں میں یوں کہیں کہ خدا وہ ہے جسے نہ دیکھا ہے نہ دیکھیں گے۔ قیامت وہ ہے جسے نہیں دیکھا لیکن دیکھیں گے۔ رسولؐ وہ ہے جسے کبھی دیکھا ہے اور پھر دنیا میں نہ دیکھیں گے۔ لیکن امام تو وہ ہے جسے کل بھی دیکھا ہے اور کل بھی دیکھیں گے۔ تو جب ایسے غائبات پر ایمان ممکن ہے تو ایسے غیب پر ایمان کیوں نہیں ممکن ہے۔ اب آپ سمجھے کہ امامت کو اصول دین میں کیوں رکھا گیا ہے۔ امامت وہ عقیدہ ہے کہ اگر یہ نہیں ہے تو توحید و رسالت و قیامت بھی نہیں ہے۔ شاید اسی لئے پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا تھا کہ جو امامؑ کی معرفت کے بغیر مر جائے وہ کفر کی موت مرتا ہے۔ نہ توحید کام آتی ہے نہ عدالت، نہ رسالت کام آتی ہے نہ قیامت۔ نہ قرآن کام آتا ہے نہ کعبہ۔ سب کا دار و مدار اقرار امامت پر ہے۔ اور اقرار امامت ہے تو سب کچھ سلامت ہے اور اقرار امامت نہیں تو قیامت ہی قیامت

ہے — صلوات!

والحمد للہ رب العالمین

إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا

باسمہ سبحانہ

حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

اسم مبارک	:	احمدؐ، محمدؐ،
لقب	:	مصطفےٰ، بشیر، نذیر، وغیرہ،
کنیت	:	ابوالقاسم،
والد ماجد	:	جناب عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم،
والدہ ماجدہ	:	جناب آمنہ بنت وہب بن عبد مناف،
ولادت	:	١٧ ربیع الاول سنہ عام الفیل جمعہ شعب ابی طالب،
بادشاہ وقت	:	نوشیرواں عادل،
ازواج	:	تیرہ ١٣ (جناب خدیجہ، جناب ام سلمہ وغیرہ،
اولاد	:	جناب سیدہ، قاسم، طیب، طاہر، ابراہیم،
شہادت	:	٢٨ صفر ١١ھ بروز دوشنبہ، مدینہ منورہ،
عمر شریف	:	٦٣ سال،

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین خاتم النبیین سیدنا و مولانا ابی القاسم محمد وآلہ الطیبین الطاہرین ولعنۃ اللہ علی اعدائہم اجمعین اما بعد فقد قال اللہ الحکیم فی کتابہ الکریم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ان علینا للہدیٰ وان لنا للآخرۃ والاولیٰ

ارشاد جناب رب العزت ہوتا ہے کہ بے شک ہدایت کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے اور دنیا و آخرت کا اختیار ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ ہم نے ہر دور میں ہدایت کا انتظام کیا ہے اور تاریخ کے ہر موڑ پر راہنماؤں کا ایک سلسلہ قائم کر دیا ہے تاکہ انسان یہ نہ کہہ سکے کہ ہمارا ہدایت کا انتظام نہیں ہوا اور ہم راہ راست پر نہیں آسکے۔ ہم نے آدمؑ جیسا مسجود ملائکہ بھیجا۔ ہم نے نوحؑ جیسا طوفان آشنا بندہ معین کیا۔ ہم نے ابراہیمؑ جیسا بت شکن مبعوث کیا۔ ہم نے موسیٰؑ جیسا تموج شکن راہنما بھیجا۔ ہم نے عیسیٰؑ جیسا مسیحا پیدا کیا اور پھر آخری منزل پر ایک عرش نشین بندہ کو فرش زمین پر اتار دیا کہ نظم ہدایت مکمل رہے اور اس میں کوئی خلل نہ پڑنے پائے۔ ہم نے اپنے محبوب کی جدائی برداشت کر لی، لیکن انسانیت کی تباہی برداشت نہیں کی۔ ہم نے صاحب عرش کو فرش نشین بنا دیا لیکن بادیہ نشینوں کا بھٹکنا گوارہ نہیں کیا۔ یہ ہمارا کرم تھا کہ ہم نے رسولؐ بھیجا اور یہ ہمارے رسولؐ کا ظرف تھا کہ اس نے دنیا کی ہدایت کی خاطر عرش کا ماحول چھوڑنا گوارا کیا اور یہ تمہارا انداز زندگی ہے کہ تمہیں اس کا کلمہ پڑھنا بھی گوارا نہیں ہے۔

دنیائے انسانیت عدل وانصاف سے کام لیتی تو اسے اندازہ ہوتا

کہ ایک کلمہ کی کیا حقیقت ہے۔ ساری زندگی حضور سرورِ کائنات کی اطاعت و فرمانبرداری کرنے کے بعد بھی ان کے حقوق سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ انھوں نے ہمارے لئے منزلِ معراجِ عرشِ الٰہی کو چھوڑا ہے اور ہم نے ان کی اطاعت کے طفیل معراج حاصل کی ہے۔ وہ معراج میں بھی گئے تو امت کیلئے تحفۂ نماز لے کر واپس آئے اور ہم مصلّٰی پر بھی گئے تو منزلِ معراج کی تمنا ہی لے کر گئے۔ صلوات؛

دنیا میں کون ہے جو سرکارِ دو عالمؐ کے احسانات کا بدلہ ادا کر سکے اور آپکی بے پناہ محبتوں کا صلہ دے سکے۔ آپکی بعثت کو خود خدائے کریم نے احسان قرار دیا ہے اور آپکی آمد کو خود رب العالمین نے نزولِ رحمت سے تعبیر کیا ہے اور آپکی زندگی کو آپکے خون کے پیاسوں نے بھی بلند و بالا تسلیم کیا ہے۔ آپ پتھر کھاتے رہے لیکن صداقت کا کلمہ پڑھواتے رہے۔ کانٹوں پر چلتے رہے لیکن امانت و دیانت کے خارزار کو گلستان بناتے رہے۔ آج جبکہ انھیں سرورِ دو عالمؐ کا تذکرہ کرنا ہے۔ اور انھیں کی سیرتِ مبارکہ پر ہلکی سی روشنی ڈالنا ہے۔ مکمل تذکرہ تو کسی انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ کسی کی سیرت میں ایک پہلو ہوتا ہے تو اس کی وضاحت آسان ہو جاتی ہے اور کسی کی زندگی میں ایک کمال ہوتا ہے تو اس کی تفصیل ممکن ہو جاتی ہے لیکن جس کی زندگی سراپا کمال ہو، اور جس کا کردار سراپا اعجاز ہو اس کے کمالات پر کون روشنی ڈال سکتا ہے۔ اور اس کے فضائل کون بیان کر سکتا ہے۔ اس کی توصیف کے لئے اللہ کا لہجہ درکار ہے۔ قرآن کی زبان لازم ہے۔ اعجاز کا انداز ضروری ہے روح الامین کا ترنم لازم ہے، ملائکۂ کائنات کا ظرف درکار ہے۔ اسلام کی روح لازم ہے اور ایمان کی حیات درکار ہے۔

کوثر کی روانی ہو تو اس کی سخاوت کا بیان کیا جائے۔ جنت کی نکہت ہو تو اس کے پسینہ کی توصیف کی جائے۔ سلسبیل کا تموج ہو تو اس کے خرام ناز کا تذکرہ کیا جائے۔ جبرئیل کا لہجہ ہو تو اس کے اندازِ تکلم پر روشنی ڈالی جائے اور علیؑ کا انداز ہو تو اس کے جوش و جلال کا نقشہ کھینچا جائے اور دنیا کے کسی انسان میں یہ باتیں ممکن نہیں ہیں۔ اس لئے اس کی توصیف بھی ممکن نہیں ہے۔ یہ مالکِ کائنات کا کرم تھا کہ اس نے توصیف کے کچھ اسباب فراہم کر دیئے اور آواز دی کہ اے میرے بندے! اگر میرے حبیب کا کردار سمجھنا ہے۔ میرے نبی کی زندگی کا نقشہ کھینچنا ہے، میرے محبوب کے کمالات کا اندازہ کرنا ہے تو قرآن کا انداز لے لے علیؑ کا کردار لے لے، حسنؑ کا اخلاق لے لے، حسینؑ کا صبر و استقلال لے لے۔ سجادؑ کی عبادت لے لے۔ باقرؑ کا علم لے لے، صادقؑ کی صداقت لے لے۔ کاظمؑ کا حلم لے لے۔ رضاؑ کی شانِ تسلیم لے لے، تقیؑ کا تقویٰ لے لے، نقیؑ کی پاکیزہ زندگی لے لے، عسکریؑ کا جلال لے لے، اور صاحبؑ کا اندازِ ہدایت لے لے۔ صلوات،

جب یہ اسباب فراہم ہو جائیں گے تو میرے حبیب کی توصیف ممکن ہو جائیگی اور جب یہ آئینے سامنے لگ جائیں گے تو میرے حبیب کا کردار نظر آنے لگے گا۔ میں نے یہ آئینہ خانہ اسی لئے بنایا ہے کہ ہر دور میں میرے پیغمبر کی تصویر دیکھی جا سکے اور ہر زمانہ میں میرے حبیب کے کردار کا نقشہ نظر آ سکے۔ میرا انتظام اتنا دائمی اور ابدی ہے کہ خود میرے حبیب کو کہنا پڑا کہ میرا آخری وارث میرا ہم مقصد بھی ہوگا اور ہم نام بھی، ہم صورت بھی ہوگا اور ہم سیرت بھی، ہم شکل بھی ہوگا اور ہم رتبہ بھی۔ اس کا نور میرا نور ہوگا اور اس کا ظہور میرا ظہور ہوگا۔ اس کی رفتار میری رفتار ہوگی اور اس کی گفتار میری گفتار ہوگی۔ اس کا کردار میرا کردار ہوگا اور اس کا انداز میرا انداز ہوگا، اس کا لہجہ میرا لہجہ ہوگا اور اس کا تکلم میرا تکلم، اس کی حیات میری حیات ہوگی اور

حلیہ ہے کہ اس کا نام میرا نام ہوگا اور اس کی کنیت میری کنیت یعنی اس کے اور میرے انداز میں برائے نام بھی فرق نہ ہوگا۔ صلوات،

ایسے حبیب کی ایسی پاکیزہ سیرت پر روشنی ڈالنا کسی عام انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ اور یہیں بعض مسلمانوں کا یہ الزام بسر و چشم قبول ہے کہ ہم پیغمبر اسلامؐ کو کما حقہ نہیں پہچانا اور ہمیں سرکار کی مکمل معرفت حاصل نہیں ہو سکی۔ ہم اس اعتراف میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے۔ اور نہ اس اعلان میں کوئی توہین سمجھتے ہیں۔ ہمیں تو اس بات کا اعتراف ہے کہ ہم نے سرکار کا مکمل عرفان نہیں حاصل کیا۔ ہم نور ہوتے تو نور کی حقیقت کو سمجھتے، ہم پیغمبر ہوتے تو پیغمبری کی صحیح عظمت سے آشنا ہوتے۔ ہمیں مرکز وحی بنایا گیا ہوتا تو ہم وحی کی کیفیت کا اندازہ کرتے، ہم پر قرآن نازل ہوتا تو ہم حقیقت قرآن سے باخبر ہوتے۔ ہمیں اگر ختم نبوت دیا جاتا تو ہم ختم نبوت کی منزل سے روشناس ہوتے۔ اور جب ایسا کچھ نہیں ہے تو ہمارا کمال کمال یہی ہے کہ ہم اپنی عاجزی کا اقرار کرلیں اور یہ اعلان کردیں کہ سرکار ہم نے آپکو اتنا ہی پہچانا ہے کہ آپ ہمارے ذہنوں سے بالاتر ہیں۔ ہمارے دماغوں سے بلند تر ہیں۔ ہماری فکر سے ماوراء ہیں۔ ہماری نظر سے دور ہیں۔ اور ایسا کیوں نہ ہوتا جب ہم آپ کے وصی کو نہ پہچان سکے اور اس نے اعلان کردیا کہ ہمارا طائر فکر میری بلندیوں تک نہیں پہنچ سکتا تو ہم آپکو کیا پہچانیں گے۔ صلوات،

سیرت و کردار کو سمجھنے کے لئے چند باتوں کا سمجھنا بے حد ضروری ہوتا ہے اور ان کے بغیر سیرت کا تجزیہ نامکمل ہو جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ صاحب کردار نے اپنے بزرگوں سے کیا لیا ہے اور اپنے بعد والوں کو کیا دیا ہے اس کے بعد یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ اس نے اپنے سماج اور معاشرہ سے کیا لیا ہے۔

اور اپنے سماج اور معاشرہ کو کیا دیا ہے۔ اور پھر اس کے ذاتی اوصاف و کمالات کا جائزہ لیتے ہوئے یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ ان صفات و کمالات سے دنیا کو کیا حاصل ہوا اور اس کے فضائل اس کی ذات تک محدود رہے یا اس سے دوسروں کو بھی فیض حاصل ہوا۔۔۔۔ اس نے صرف اپنے لئے زندگی گزاری ہے یا اپنے سماج کو بھی کچھ دیا ہے اور اس کی بھی کوئی خدمت کی ہے اور ان سب باتوں کے ساتھ اس بات کا لحاظ بھی ضروری ہوتا ہے کہ اس نے جس ماحول میں کام کیا ہے اور جن حالات میں زندگی گزاری ہے وہ حالات کیا تھے اور وہ ماحول کیسا تھا۔ دنیا اس کی آواز پر لبیک کہنے کو تیار تھی یا اسے فنا کے گھاٹ اتارنے پر آمادہ تھی۔ سماج کا ذہن اس کے پیغام کے لئے ہموار تھا یا اسے ستانے کے لئے تیار تھا۔ حالات کے دباؤ میں آکر اس نے اپنی روش میں کوئی تبدیلی کی ہے یا اپنے موقف پر برابر قائم رہا ہے۔

سرور کائنات کی حیات طیبہ کا جائزہ لینے کے لئے انھیں امور کا تجزیہ ضروری ہے لیکن ظاہر ہے کہ مختصر سے وقت میں اتنی طویل داستان نہیں چھیڑی جاسکتی اور تھوڑے سے وقفہ میں عالم انوار سے لیکر صبح محشر تک کے کمالات کا نقشہ نہیں کھینچا جاسکتا۔ وہ ذہن کہاں سے آئے جو عالم انوار کی تصویر کھینچ سکے۔ وہ ظرف کہاں سے پیدا ہو جو صبح محشر کی منظر کشی کرسکے۔ وہ علم کہاں سے آئے جو حضورؐ کے کمالات کا احاطہ کرسکے اور وہ فکر کہاں سے پیدا ہو جس میں سرکارؐ کا کردار سما سکے۔ جب یہ شرف انبیاء و مرسلین کو نہیں مل سکا تو ہمیں اور آپکو کہاں سے ملے گا۔ اور اس منزل کمال پر روح الامین عاجز رہے ہیں تو ہم اور آپ کہاں تک پرواز کرسکیں گے۔ چند لمحوں میں صرف ایک خاکہ کھینچ دینا چاہتا ہوں اور بات کو کسی ایک منزل تک پہنچا دینا چاہتا ہوں۔

جہاں تک سرکارِ دو عالم کی نسبی شرافت و عظمت کا تعلق ہے، دنیا جانتی ہے کہ آپ نسلِ ابراہیمؑ اور ذریتِ اسمٰعیلؑ میں تھے۔ آپ کو میراث میں جذبۂ قربانی اور حوصلۂ ایثار ملا تھا۔ جنابِ ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کے بعد آپ کے جملہ آباء و اجداد طیبین و طاہرین اور اللہ کے پرستار تھے۔ آپ کے کسی بزرگ نے بتوں کے سامنے سر نہیں جھکایا اور باطل کو سجدہ نہیں کیا۔ سب اس دعائے ابراہیمؑ کا ثمرہ بن کر دنیا میں آئے کہ پروردگار۔ مجھے اور میری ذریت کو بت پرستی سے محفوظ رکھنا۔ آپ کے بزرگوں میں جناب قصی بن کلاب جیسا سردارِ قریش۔ جناب عبدِ مناف جیسا ذمہ دارِ حرم، جناب ہاشم جیسا سخی و نیک دل۔ جناب عبد المطلب جیسا صاحبِ ایمان و کردار، جناب عبداللہ جیسا ذبیح اللہ، جناب آمنہ جیسی پاکیزہ سیرت خاتون اور جناب ابوطالب جیسا جانباز اور شیر دل چچا تھا۔ بزرگوں سے ترکہ میں شرافت و نجابت، سیادت و قیادت، سخاوت و عدالت، ایمان و کردار، تقویٰ و طہارت، قربانی و ایثار، ہمت و عزم، صبر و استقلال کے سوا کچھ نہیں ملا۔ اور ایک انسان کی کردار سازی کے لئے یہ ترکہ بہت کافی ہوتا ہے۔ چہ جائیکہ وہ الٰہی منصب دار بھی ہو۔ جہاں نہ کسی کی تعلیم کی ضرورت ہوتی ہے، نہ تربیت کی، وہ نہ کسی کی آغوش کا محتاج ہوتا ہے، نہ ماحول کا۔ اس کی تعلیم صرف درسگاہِ رب العزت میں ہوتی ہے اور اس کی تربیت صرف دستِ قدرت سے انجام پاتی ہے اور ایسے حالات میں کردار کی عظمت کا اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ صلوات،

آپ نے اپنے بعد والوں کو کیا دیا؟ اس کے لئے بھی کسی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف آسانی یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ نے اپنے بعد

کے لئے وہ نسل چھوڑی ہے جس کا ایک ایک فرد بے نظیر اور ایک ایک شخصیت لاجواب ہے۔ بیٹی ہے تو باپ کے لئے قابلِ تعظیم۔ پروردۂ آغوش بھائی ہے تو نصیری کا خدا۔ نواسے ہیں تو اسلام کی عزت و آبرو۔ ذریت ہے تو دین و ایمان کی محافظ۔ اور آخری فرزند ہے تو عیسیٰ بن مریم کا امام۔ صلوات،

یہ صحیح ہے کہ ان میں ہر فرد تعلیم و تربیت سے بے نیاز ہے اور سب بارگاہِ رب العالمین کے تعلیم یافتہ ہیں لیکن میرے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ عالمِ معنی میں اولیاء کے کمالات میں نبوت بہرحال واسطہ ہوتی ہے۔ اور وہی تک کوئی مرتبہ نبوت کی نیابت ہی میں پہنچتا ہے۔ اس لئے اللہ نے جو کچھ بھی عطا کیا ہے اور جب بھی عطا کیا ہے نبی کو واسطہ ضرور بنایا ہے تاکہ شانِ نیابت و جانشینی محفوظ رہے اور دنیا دھوکہ نہ کھا جائے اور اسی لئے مولائے کائنات فرمایا کرتے تھے کہ مجھے رسول اللہ نے ہزار باب تعلیم کئے ہیں اور میں نے ہر باب سے ہزار باب نکالے ہیں ورنہ ظاہر ہے کہ جو اتنا صاحبِ صلاحیت ہو کہ ایک ایک باب سے ہزار ہزار باب نکال سکے وہ کسی کی تعلیم کا محتاج کیا ہوگا علیؑ چاہتے تھے کہ دنیا پر یہ واضح ہو جائے کہ میں وصیِ رسولؐ ہوں اور وصی کا کمال نبی کے واسطے سے آتا ہے۔ مجھے پیغمبر نے دنیا میں تعلیم نہیں دی ہے لیکن میرا کمال انہیں کے واسطے سے ملا ہے۔ صلوات،

مرسلِ اعظمؐ کو اپنے سماج سے کیا ملا؟ یہ داستان بڑی دردناک ہے آپ جس سماج میں مبعوث ہوئے وہ اتنا پست اور ذلیل تھا کہ دنیا کی کوئی برائی ایسی نہیں تھی جو اس سماج میں موجود نہ ہو۔ ذہنی اعتبار سے اتنے پست تھے اپنے ہاتھوں کے تراشے ہوئے پتھروں کو خدا سمجھتے تھے اور اس سے بالاتر

قباحت یہ کہ صبح کو حلوے کے خدا بناتے تھے اور شام کو بھوک لگنے پر انہیں کو کھا جاتے تھے۔ آپ خود سوچیں کہ جو قوم اپنے خدا کو معاف نہ کر سکتی ہو اور اسی کو ہضم کر جاتی ہو وہ دوسرے خدا کے بندوں کو کیوں کر معاف کر سکتی ہے۔

اخلاقی اعتبار سے اتنے ذلیل کہ زنا عام، بدکاری شرف، عیاشی طرۂ امتیاز، نہ کوئی عزت نہ کوئی احترام، نہ کوئی شرافت نہ کوئی نجابت، چوری، ڈکیتی، رہزنی، شراب خوری، سود، جوا اور ایسی تمام برائیوں کے سرتاپا عادی تھے۔

خیالات اتنے غلیظ کہ بیٹیوں کو زندہ دفن کر دینا شرف، عزیزوں کا خون بہا دینا شجاعت، قبائل کو تہ تیغ کر دینا ہمت، قوموں میں فساد کرا دینا عزت اور انسانیت کا خون بہا دینا باعث امتیاز و انفرادیت تھا۔

ایسی قوم کے لئے کیا دشوار تھا کہ اگر کوئی ان کے اپنے مذہب کے خلاف آواز بلند کرے اور اپنے خود ساختہ خداؤں کو باطل قرار دے تو اس کی راہ میں کانٹے بچھائیں، اس پر پتھروں کی بوچھار کریں، اس کی زندگی کے درپے ہو جائیں اور اس کی پوری نسل کو تباہ و برباد کر دیں، لیکن کیا کہنا اس کریم النفس انسان کا اور کیا کہنا اس رحیم و کریم پیغمبرؐ کا کہ اس نے سماج سے اتنے مظالم دیکھنے کے باوجود مقابلہ کرنا کیسا کبھی بددعا بھی نہیں کی، پتھر مارنے والوں کو دعائیں دیں، کانٹے بچھانے والوں کو گلے لگایا، جان کے دشمنوں کو زندگی کا پیغام دیا، اخلاق کے مارے ہوئے افراد کو باکردار بنایا، شرابیوں کو عقل و ہوش کا سبق سکھایا، بدکرداروں کو نیک کردار بنایا، جواریوں کو اکل حلال کا سلیقہ بتایا، سود خوروں کو ایثار کا سبق دیا، بیٹیوں کو زندہ دفن کرنے والوں کو بیٹیوں کی تعظیم بتائی، بھائیوں کے قاتلوں کو مواخات کا سبق

دیا، قبائل کے دشمنوں کو محبت کا خوگر بنایا، رہزنوں کو راہ ہدایت دکھائی اور ڈاکوؤں کو جہاد راہ خدا کا راستہ دکھایا، غربت و پریشانی کا ذکر نہیں ہے، اس نے ہر حال میں قوم کے حال پر رحم کیا۔ وطن سے نکالا گیا لیکن فاتحانہ انداز سے داخلہ کے وقت بھی انتقام نہیں لیا بلکہ امان ہی دی اور آزاد ہی کیا معلوم ہوتا ہے کہ آمنہ کا لال امن کا پیغام ہی لے کر آیا تھا اور عبداللہ کا فرزند عبدیت کے نام پر آزادی کا درس ہی دینے والا تھا۔ صلوات۔

ہم نے اپنے سماج کو کیا دیا۔؟ اس کا اندازہ اس دن ہوا جب مکہ فتح ہوا، اور آپ نے دشمنوں سے سوال کیا کہ بتاؤ تم مجھ سے کیا امید رکھتے ہو؟ اور سب نے بیک زبان کہا کہ جو ایک کریم ابن کریم سے امید رکھی جا سکتی ہے۔ مرسل اعظم نے عام معافی اور امن و امان کا اعلان کر کے بتا دیا کہ صلح و آشتی کے ماحول میں کردار کا اقرار لینا بہت آسان ہے اور شدید خونریز جنگوں کے بعد کرم کا کلمہ پڑھوا لینا بہت مشکل ہے۔ میرے کردار کے آغاز و انجام کو ملا کر دیکھو تو میری زندگی کا راز سمجھ میں آجائے گا، میں نے ابتدائی زندگی ایسی گزاری کہ مجھے کچھ نہ سمجھنے والوں نے بھی صادق و امین سمجھا اور آخری زندگی اس شان سے گزاری کہ میرا مقابلہ کرنے والے بھی مجھے کریم ابن کریم ہی کہہ رہے ہیں، صلوات،

لیکن اس مقام پر یہ یاد رکھنے گا کہ سرکار کی معافی کا تعلق سرکاری جرائم ہی سے ہوتا ہے، عوام کے مجرموں کو معاف کرنے کا حق سرکار کو نہیں ہے، ورنہ یہ ظالموں سے ہمدردی اور کمزوروں کے حق میں ایک نیا ظلم ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ حق العباد کو پروردگار بھی معاف نہیں کرتا۔ اب جو لوگ اسلامی انقلاب پر اعتراض کرتے ہیں انہیں اس نکتہ پر بھی نگاہ رکھنا چاہیئے۔

اور اسلامی قانون کو برطانوی قانون کے معیار پر نہیں پرکھنا چاہیئے۔ اسلام ایک مستقل قانون ہے برطانیہ کا تابع نہیں ہے اور نہ اس میں عوامی جرائم میں مراحم خسروانہ کی کوئی گنجائش ہے۔!

عزیزانِ محترم! ابھی اس موقع پر ایک منظر اور یاد آگیا جب صفین کے میدان میں علیؑ کے لشکر نے شام کے لشکر کو شکست دے کر دریا پہ قبضہ کر لیا اور شام کے قبضہ کو ہٹا دیا تو لشکر علیؑ کو پیاس سے مارنے والوں کے لشکر میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ اب علیؑ ہم سے انتقام لیں گے اور ہم پیاس سے تباہ ہو جائیں گے۔ شدہ شدہ یہ فریاد حاکم شام معاویہ بن ابی سفیان تک پہنچی۔ اس نے آواز دی کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ علیؑ بڑے کریم ہیں، تم پانی کا مطالبہ کرو وہ کبھی پانی بند نہ کریں گے۔

عزیزانِ گرامی! منظر کو منظر سے ملا کر دیکھ لیجئے کردار کی عظمت کا اندازہ ہو جائیگا۔ کل نبیؐ تھے اور معاویہ کا باپ ابوسفیان تھا، اور آج علیؑ ہیں اور ابوسفیان کا بیٹا معاویہ ہے۔ کل باپ نے نبیؐ کے کرم کا اقرار کیا تھا اور آج بیٹا علیؑ کے کرم کا اعتراف کر رہا ہے۔ پہچانا آپ نے کون کس کا وارث ہے۔ اور کس کے پاس کس کی سیرت ہے۔ شام تک ابوسفیان کا انداز پہنچا ہر اور علیؑ تک محمد مصطفٰےؐ کا کردار آیا ہے۔ صلوات!

نبی اکرمؐ کی سیرت گواہ ہے کہ آپ نے اپنے سماج کو دیا ہی ہے اس سے کچھ لیا نہیں۔ سماج سے لیا ہوتا تو بت پرست ہوتے، شراب خوار ہوتے، قمار بازی فرماتے، سود کے عادی ہوتے، قاتل وسفاک ہوتے، اور معاشرہ کی برائیوں کے حصہ دار ہوتے، لیکن آپ کی زندگی میں ان باتوں کا تصور تک نہیں ہے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ آپ نے سماج سے کچھ لیا نہیں ہے۔ بلکہ اسے کچھ دیا ہی ہے اور اتنا عطا کیا ہے کہ شراب خواروں کو متقی بنا دیا ہے۔ قمار بازوں کو کریم بنا دیا ہے۔ سود خواروں کو غنی بنا دیا ہے۔ قاتلوں کو شہید بنا دیا ہے۔ خونریزوں کو مجاہد بنا دیا ہے۔ پتھروں کے پجاریوں کو وحدہٗ لاشریک کا بندہ بنا دیا ہے۔

حد یہ ہے کہ عرب کے امتیازی کمال فصاحت و بلاغت اور زبان دانی سے بھی آپ نے کچھ لیا نہیں اور اس میدان میں بھی انھیں کچھ دیا ہی ہے۔ ان سے ادب لیا ہوتا تو انھیں کے انداز میں گفتگو کرتے اور ساری فصاحت و بلاغت اونٹ، گھوڑا، تلوار، شراب اور عورت کی نذر ہو جاتی، لیکن انھیں دیا اور اتنا دیا کہ اونٹ، گھوڑے، شراب، عورت اور تلوار کے پرستاروں کو توحید، عدالت، نبوت، امامت، قیامت، جنت و جہنم، زمین و آسمان، معاش و معاد کے جیسے اہم موضوعات دے دیئے اور عورتوں کے ظاہری حسن اور معشوق کے کھنڈرات کا ماتم کرنے والوں کو الحمدللہ کہنے کا سلیقہ سکھا دیا۔

تاریخ عرب گواہ ہے کہ حضور اکرمؐ بھی سماج کے پروردہ اور معاشرہ کے پابند ہوتے تو عرب میں سبع معلقات ہوتے قرآن حکیم نہ ہوتا۔ مسحور کن خطابت و شاعری ہوتی معجز نما کلام نہ ہوتا، یہ حضور سرورِ کائناتؐ کا احسان ہے کہ آج دنیائے عربیت ساری کائنات کو چیلنج کر سکتی ہے اور اسے یہ کہنے کا حق ہے کہ معجز نما کلام صرف ہماری زبان میں آیا ہے اور کسی زبان میں نہیں ہے۔ اعجاز کے لہجہ میں ہم ہی گفتگو کرتے ہیں کسی اور قوم کو اس لہجہ میں گفتگو کرنے کا حق نہیں ہے۔ صلوات!

اس کے بعد ایک نظر حضورؐ کے ذاتی فضائل و کمالات پر ڈال لیجئے کہ آپ نے

زندگی کے یہ عظیم کارنامے کس ماحول میں انجام دیئے ہیں اور کتنے مختصر وقت میں کتنا اہم کام کیا ہے۔

جہاں تک ذاتی کمالات کا تعلق ہے، اس کے بارے میں کچھ کہنا ہی نہیں ہے۔ یہاں زبان کھولنا آفتاب کو چراغ دکھانے کے برابر ہے اور اس موضوع پر بھی بحث کرنے کی ضرورت ہوتی اگر کسی نے کمال کے انکار کرنے کی ہمت کی ہوتی اور جب دشمن تک کمال کے معترف ہیں تو تفصیل کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ذکر خیر کی افادیت کے پیش نظر چند کلمات کافی ہیں۔

آپ کے علم کو دیکھا جائے تو آپ کے اس دنیا میں آنے کی غرض ہی یہ ہے کہ قوم کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیں اور ان کے درمیان تلاوتِ کتاب کریں۔ یعنی دنیا میں آکر تعلیم حاصل کرنے والے اور ہیں اور دنیا کو تعلیم دینے کے لئے آنے والے اور ہیں۔ یہ آپ کے الٰہی علم کا نتیجہ ہے کہ جادوگروں کو معجزہ سے آشنا کر دیا اور جاہلیت کے مارے ہوئے انسانوں کو علم کتاب و حکمت دے دیا۔

آپ کی محفل ایک مدرسۂ فکر و نظر تھی، جہاں صاحبانِ صلاحیت علوم و کمالات کے جواہر حاصل کر رہے تھے اور صبح و شام حقائق قرآن کا چرچا تھا۔ آپ کی زبان اقدس پر قرآن ہے تو سرچشمہ کمالات اور حدیث ہے تو مصدر فضائل و کرامات ـــــ اب یہ اپنے ظرف کی بات ہے کہ کسے کتنا حاصل ہوگا اور کون کس قدر فائدہ اٹھائے گا۔ نبیؐ کا دریائے فیض جاری ہے چاہے انسان مقداد بن جائیں یا ابولہب ابوذرؓ بن جائیں یا ابوجہل۔ حضورؐ کے کردار پر کوئی حرف نہ آئے گا۔ باد بہاری سے گلاب بھی پلتے ہیں اور کانٹے بھی۔ آب نیساں سے امرت بھی بنتا ہے اور زہر بھی۔ صاحب صلاحیت ہوتا ہے تو علم سے کے مسلمان بن جاتا ہے، کم ظرف ہوتا ہے

تو مسلمان بھی نہیں ہوتا۔ صلوات،

سخاوت کو دیکھا جائے تو پوری پوری دولت خدیجہ سماج پر صرف ہوتی نظر آتی ہے۔ عرب کی تاریخ گواہ ہے کہ جناب خدیجہ عرب میں سب سے بڑی دولتمند خاتون تھیں۔ اور جب حضور سرورکائناتؐ کے عقد میں آئی ہیں تو اپنی ساری دولت ہمراہ لے کر آئی ہیں لیکن چند روز کے بعد خدیجہ کی بیٹی کو فاقے کرتے ہوئے بھی دیکھا گیا ہے۔ دنیا بتائے کہ اتنی بڑی دولت کیا ہوئی اور اتنا عظیم خزانہ کہاں چلا گیا۔ یہ حضور سرورکائناتؐ کی سخاوت اور آپ کا کرم ہی تھا کہ گھر میں فاقے ہو رہے تھے اور قوم کے فقیر غنی بن رہے تھے۔ صلوات،

شانِ تجارت یہ ہے کہ زندگی میں دو اہم سفر تجارت فرمائے۔ ایک مرتبہ کمسنی کے عالم میں اپنے چچا جناب ابوطالب کے ساتھ گئے تو عالم یہ تھا کہ راستہ کے عیسائی راہب نے دیکھ کر آواز دی کہ ابوطالب اس بچہ کو واپس لے جاؤ اور اسے شر دشمن سے بچاؤ۔ میں اس کے چہرہ میں نبوت و رسالت کے آثار دیکھ رہا ہوں اور عنقریب یہ کائنات کی عظیم ترین شخصیت ثابت ہوگا۔ اور دوسری مرتبہ جب جوانی کے عالم میں گئے تو اتنی برکت حاصل ہوئی کہ جب جناب خدیجہ کے غلام نے مالکہ کو راستہ کے کرامات کی اطلاع دی تو خدیجہ نے سماج کے تمام بندھنوں کو توڑ کر عقد کا پیغام دے دیا اور ایک اپنے ہی مال سے تجارت کرنے والے عامل کے قدموں میں ساری دولت ڈال دی اور خود بھی اس کی خادمہ بن گئیں۔ اس کردار کا کوئی جواب ہے کہ انسان ایک سفر تجارت میں اتنی بڑی کائنات کا مالک ہو جائے اور ایک معاملہ تجارت سے زندگی کے بیشتر مسائل حل کر دے۔ اور مجھے تو جناب خدیجہ کے ظرف و کردار کی بھی تعریف کرنا پڑتی ہے کہ جہاں سماج میں اپنے سے

کمزور طبقہ کے انسان کو منہ لگانا عیب ہو وہاں اسی طبقہ کی ایک فرد کو اپنے مقدر کا مالک بنا دیا جائے، اور جہاں بڑے بڑے صنادید قریش کے پیغامات کو ٹھکرا دیا گیا ہو وہاں ایک یتیم عبداللہ کی کنیزی اختیار کر لی جائے۔

یاد رکھئے! غربت و افلاس کے عالم میں زوجیت کے سایہ میں پناہ لینا اور ہے اور دولت و سرمایہ کی آغوش میں شوہر کی پوری اُمت کو پناہ دینا اور ہے۔ صلوات۔

عبادت کا عالم اور بھی حیرت انگیز اور تعجب خیز تھا۔ کہ رات رات بھر سجدے اور دن بھر روزے، قیام و قعود، رکوع و سجود، تلاوتِ قرآن، ذکر و فکر کے مشغلے، غارِ حرا کی منزل اور عبادتِ پروردگار۔ زندگی کے کارناموں کا آغاز ہی شانِ عبادت سے ہوتا ہے اور تاریخ کو کردار کا سُراغ ہی غارِ حرا کے ذکر و فکر سے ملتا ہے اور معراجِ عبادت کا عالم یہ ہے کہ ساری کائنات سے بندگی کا مطالبہ کرنے والا پروردگار خود یہ کہتا ہے کہ میرے حبیب راتوں کو ذرا سو جایا کرو۔ حکمِ خدا پر سجدوں کے لئے اٹھنا اور ہے اور حکمِ خدا سے مصلّی چھوڑ کر آرام کرنا اور ہے۔ یہ شان یا نبیؐ میں دیکھی ہے یا علیؑ میں۔ کبھی حکمِ خدا سے نبیؐ کو آرام کرتے ہوئے دیکھا ہے اور کبھی حکمِ رسولؐ سے علیؑ کو بسترِ ہجرت پر سوتے ہوئے دیکھا ہے۔ حکمِ خدا سے ذرا دیر آرام کرے تو نبیؐ اور حکمِ نبیؐ سے تمام رات چین سے سوئے تو علیؑ۔ صلوات۔

خدا کو بھی یہ شانِ عبادت اس قدر پسند آئی کہ معراج کی رات عرشِ اعظم پر بھی بلایا تو محبت و نبوت کے نام پر نہیں۔ رسالت و سیادت کے نام پر نہیں، بلکہ ارشاد ہوا۔ سبحان الذی اسریٰ بعبدہٖ یعنی یہ معراج، رسالت و نبوت

کی معراج نہیں ہے، عبدیت اور بندگی کی معراج ہے۔ صلوات۔

عبادت ہی کی طرح زہد و قناعت کا انداز بھی جداگانہ ہے، پیٹ پر پتھر بندھے ہوئے ہیں اور تبلیغ اسلام ہو رہی ہے، گھر میں فاقے ہو رہے ہیں اور کارِ ہدایت انجام پا رہا ہے، دولتِ خدیجہ لُٹ رہی ہے اور اپنے لئے ایک ایک خرمہ کے عوض ایک ایک ڈول پانی کھینچا جا رہا ہے۔ کون تصور کر سکتا ہے کہ زیرِ قدم کائنات ہو، زیرِ نگیں جنت اور بہارِ جنت ہو، زیرِ اثر جن و ملک ہوں اور گھر کی زندگی اتنی سادی اور فقیرانہ ہو۔ یہ سب کیوں تھا؟ درحقیقت یہ حکمت کا ایک انداز تھا، کہ آج میں عیش و آرام کی زندگی گزار سکتا ہوں، میرے اختیار میں ساری کائنات ہے لیکن کل میری امت کا کیا ہوگا اور پھر ایک خطرہ یہ بھی ہے کہ نافہم امت عیش و عشرت ہی کو مذہب و ملت کا نام دے دیگی اور یہ اندازہ بالکل صحیح نکلا کہ آج جب سیرت رسولؐ کی اتنی سادگی پیشِ نظر ہے تو درباروں پر ریشمی پردے پڑ گئے ہیں، اگر کہیں سرکار کی زندگی میں بھی رنگینی آگئی ہوتی تو اسلام قیصریت و کسرویت کا دوسرا نام ہو جاتا اور دینِ الٰہی فنا کے گھاٹ اُتر جاتا۔ کوفہ اور شام کی زندگی میں یہی فرق ہے کہ کوفہ کا شہنشاہ حصیرِ مسجد پہ بیٹھتا ہے اور شام کا حاکم فرشِ محل پر آرام کرتا ہے۔ اور کردارِ پیغمبر آواز دے رہا ہے کہ میرا جانشین آسان محل نہیں ہوتا، "ابوتراب" ہوتا ہے۔ صلوات۔

ان حالات کو دیکھنے کے بعد جب سرکارِ دو عالمؐ کی شانِ شجاعت پر نظر جاتی ہے تو حیرت کی انتہا نہیں رہ جاتی، کہ ایک ایسا انسان جس کے دن محنت و مزدوری میں گزرتے ہوں، جس کی رات مصلّے پہ گزرتی ہو، جس کے کام عبادت و ریاضت ہوں اور جس کی زندگی صرف زہد و قناعت ہو، اسے

میدانِ جنگ سے کیا واسطہ۔ لیکن سرکارِ دو عالمؐ کے کردار کی ہمہ جہتی اور جامعیت تھی کہ آپ جہاں مصلّے پر عابدِ شب زندہ دار تھے وہاں میدانِ جہاد میں سردارِ لشکر ۔ جہاں بوریائے فقر پر ایک خاک نشین انسان تھے، وہاں محاذِ جنگ پر ایک قائدِ مہم آزما۔ آپ کی شجاعت کے تجزیہ کے لئے اسلام کے تمام معرکوں کا تجزیہ ضروری ہے اور اس کا محل ذکر نہیں ہے۔ اجمالی طور پر یہ کہنا کافی ہے کہ آپ محاذِ تبلیغ پر آئے تو پتھر برستے رہے لیکن اپنا راستہ نہیں بدلا، اور محاذِ جنگ پر آئے تو ثبات و استقلال کا مرقع بن گئے۔ آپ کا کوئی جہاد نہ اسلحہ کا ممنونِ کرم تھا نہ لشکر کا۔ جہاں لشکر کے قدم اکھڑ گئے ہوں وہاں آپ ثابت قدم رہے، اور جہاں سپاہیوں کے سر جھکتے تھے وہاں آپ میدانِ جنگ میں نظر آئے۔ سرکار کی شجاعت کا اندازہ دیکھنا ہے تو علیؑ سے پوچھئے۔ جس نے ہر میدان میں آخر تک ثابت قدم ۔ و کمر شجاعت و استقلال کا مشاہدہ کیا ہے اور جب احد کے میدان میں حضورؐ نے کہا کہ یا علیؑ جب سب چلے گئے تو تم کیوں نہیں گئے؟ تو عرض کی، حضور میں آپ کے نقشِ قدم پر ہوں۔ جب تک آپ نہ چلے جائیں گے میں بھی نہ جاؤں گا۔ گویا اشارہ تھا کہ نبیؐ کی شجاعت کا اندازہ کرنا ہے تو میری شجاعت کو دیکھو، جب وصی کا ثباتِ قدم یہ ہے تو نبیؐ کا عالم کیا ہوگا اور شاید اسی لئے قدرت نے علیؑ کے ہاتھ میں ذوالفقار دے دی کہ علیؑ و نبیؐ کے مراتب کا فرق بھی محفوظ رہے اور دنیا دیکھ لے کہ تلوار کے جوہر دکھانے والا وصی ہوتا ہے اور تلوار کے بغیر میدانِ جہاد میں ثابت قدم رہنے والا نبیؐ۔ صلوات

ورنہ اس فرق سے قطع نظر کر لیا جائے تو علیؑ کی شجاعت و ہمت بھی تلوار کی ممنونِ کرم نہیں ہے۔ علیؑ نے روزِ اول ہی تلوار سے بے نیازی کا اعلان کر دیا تھا اور دنیا کو بتا دیا تھا کہ بدر و احد و خیبر و خندق میں میری تلوار کے جوہر

بعد میں دیکھنا، ہجرت کی رات میرا صبر و سکون پہلے دیکھ لو تاکہ اندازہ ہو جائے کہ تلوار پر بھروسہ کرنے والے اور ہوتے ہیں اور کردار پر بھروسہ کرنے والے اور۔ تلوار پر تکیہ کرنے والوں کی شان اور ہوتی ہے اور نصرتِ الٰہی پر اعتماد کرنے والوں کا انداز اور۔ صلوات،

کردار پیغمبرؐ کے انھیں پہلوؤں پر نظر کرنے کے بعد خاتمہ کلام میں سرکارؐ کی زندگی کا ایک ہلکا سا خاکہ پیش کر کے یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ آپ نے کتنے مختصر وقت میں کتنے عظیم کارنامے انجام دیئے ہیں، فرائض کا یہ عالم تھا کہ تلاوتِ قرآن بھی کرنا ہے اور تزکیہ نفوس بھی۔ کتاب و حکمت کی تعلیم بھی دینا ہے اور دین کے اصول بھی سکھانے ہیں۔ فروعی تعلیمات اور احکامِ شریعت بھی بتانا ہیں اور امت کی پرورش بھی کرنا ہے، گلیوں اور کوچوں میں توحید کی آواز بھی بلند کرنا ہے اور مریضوں کی عیادت بھی کرنا ہے۔ مرنے والوں کے جنازے بھی اٹھانا ہیں اور دوسرے ملکوں میں اسلامی نمائندے بھی بھیجنا ہیں اور انھیں تبلیغی احکام و اصول کی بھی تعلیم دینا ہے، ازواج کے نفقہ کا بھی انتظام کرنا ہے اور بچوں کی تربیت کا بھی اہتمام کرنا ہے، اصحاب کی تعلیم و تدریس کا بھی اہتمام کرنا ہے اور سماج کے مشکلات میں بھی کام آنا ہے، لوگوں کی امانتوں کو رکھنا اور واپس بھی کرنا ہے، اور معاشرہ کے ہر اہم موقع پر حاضر بھی رہنا ہے، حج بیت اللہ کی قیادت بھی کرنا ہے اور میدانوں میں حاضری بھی دینا ہے، مسلمانوں کو جماعت بھی پڑھانا ہے اور تلاوتِ قرآن کے آداب بھی مقرر کرنا ہیں۔ خدیجہ کی بے پناہ تجارت و دولت کا انتظام بھی کرنا ہے اور ان تمام کاموں کے لئے وقت اتنا مختصر ہے کہ زندگی کے چالیس سال خاموش گزر گئے ہیں۔ ایک مدت غارِ حرا کی خاموش عبادت

میں گزری ہے۔ تین سال شعب ابوطالب میں محاصرہ کی مصیبت برداشت کی ہے، لگ بھگ اسّی لڑائیاں لڑی ہیں، متعدد سفیران مملکت سے روابط رکھے ہیں، جنگوں کے لئے لشکر تیار کیا ہے اور انھیں فنونِ جنگ تعلیم کئے ہیں۔ مباہلہ کے میدان کو سر کیا ہے۔ بچّوں کے لئے ناقہ بنے ہیں۔ سجدہ کو طول دیا ہے، فدک کا بندوبست کیا ہے۔ فتح مکہ کے موقع پر بت شکنی کا انتظام کیا ہے، وطن چھوڑ کر ہجرت فرمائی ہے، انصار و مہاجرین کے درمیان مواخات و برادری قائم کی ہے، حدیبیہ میں صلح کی ہے، بیٹی کا عقد کیا ہے، نواسوں کی ناز برداری کی ہے، حاشیہ نشینوں کو عرب صحرائی سے خیرامت بنایا ہے۔ آدمی کو انسان، انسان کو مسلمان اور مسلمان کو سلمان بنایا ہے، اتنے کارناموں کو اتنی مختصر ۲۳ سال کی تبلیغی مدت پر تقسیم کر دیا جائے تو شاید ایک کام کے لئے ایک دن کا وقت بھی نہ ملے گا، لیکن یہ رسولؐ اسلام کی معجزنما زندگی تھی کہ اتنے ہی عرصہ میں سارا کام انجام دے دیا اور اس طرح انجام دے دیا کہ دوست تو دوست دشمن نے بھی کمال کردار کا اقرار کر لیا اور مسلمان تو مسلمان ہے خالق کائنات نے بھی میدان غدیر میں اعلان کر دیا کہ آج میں نے دین کو کامل کر دیا، اور نعمتوں کو تمام کر دیا اور دین اسلام سے راضی ہو گیا۔ صلوات،

ان تمام باتوں کے بعد سب سے بڑا امتیازی کردار یہ ہے کہ کبھی اپنے کو رئیس اور حاکم کی شان سے نہیں پیش کیا، بلکہ امّت کے ہر دُکھ درد میں شریک رہے اور برابر کا برتاؤ کرتے رہے۔ آپ اس موقع کو یاد کریں کہ جب زندگی کے آخری لمحات تھے اور مرض الموت میں مسجد تک آ کر آپ نے اعلان کیا کہ میں عنقریب دنیا سے جانے والا ہوں، اگر کسی کا کوئی حق میرے ذمہ ہو

عزادارانِ امام! آپ نے محسوس کیا کہ امام محمد باقرؑ کو کس قدر حسرت ہے کہ امامؑ کا ماتم کیا جائے۔ اور ان پر گریہ کیا جائے۔ منیٰ کے میدان میں حج کے موقع پر تاکہ دنیائے اسلام گریہ کو دیکھ کر یہ پوچھے کہ یہ کس مظلوم کا ماتم ہو رہا ہے۔ اور ہماری شہادت کا راز دنیا کے سامنے آ جائے۔ اسی راز شہادت میں مذہب کی زندگی ہے اور اسی جستجو میں ہمارے مقصد کی حیات ہے۔ نہ جانے اس گریہ میں کیا کشش ہے کہ امام حسینؑ نے وصیت کی تو اسی گریہ کی۔ امام سجادؑ نے زندگی گذاری تو اسی گریہ میں۔ امام محمد باقرؑ نے تاکید کی تو اسی گریہ کے لئے خود معصومہ عالمؑ نے بھی سوال کیا تو یہی سوال کیا کہ بابا جب میرے لال کی شہادت کے وقت آپ نہ ہوں گے۔ میں نہ ہوں گی۔ ابوالحسنؑ نہ ہوں گے۔ میرا حسنؑ نہ ہوگا تو بابا میرے لال پر روئے گا کون؟ اور میرے فرزند کی صف عزا کون بچھائے گا؟ اور پیغمبرؐ اسلام نے تسکین دی بیٹی زہراؑ گھبراؤ نہیں۔ اللہ ایک قوم پیدا کرے گا جس کے مرد مردوں کا ماتم کریں گے اور اس کی عورتیں عورتوں کے مصائب پر گریہ کریں گی۔ میں کہتا ہوں شہزادی یہ آپنے کیا سوال کر لیا۔ آپ نہ رہیں گی۔ بابا نہ رہیں گے۔ مولائے کائنات نہ رہیں گے۔ حسنؑ مجتبیٰ نہ رہیں گے۔ خدا رکھے زینبؑ تو رہیں گی۔ ام کلثوم تو رہیں گی۔ سکینہ تو رہیں گی۔ عابدؑ بیمار تو رہیں گے۔ لیکن عجب نہیں شہزادی فرمائیں مجھے قیامت تک کے گریہ کی فکر ہے کہ یہ سلسلۂ عزا کیسے قائم رہے گا اور کربلا کے بارے میں بھی مجھے معلوم ہے کہ سب رہیں گے۔ لیکن کوئی رو نہ سکے گا۔ زینب و ام کلثوم رہیں گی لیکن گریہ کریں گی تو تازیانے لگیں گے۔ سکینہ رہے گی لیکن گریہ کرے گی تو شمر کے طمانچے کھائے گی۔ میرا عابد بیمار رہے گا لیکن ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ہوں گی پیروں میں بیڑیاں۔ گلے میں طوق خاردار۔ اور آنکھوں میں آنسو آ جائیں گے تو نوک نیزہ

سے اذیت دی جائے گی۔ یہی تو راز تھا کہ جب قید شام سے رہائی ہوئی تو سات دن تک بہن نے بھائی کا ماتم کیا اور جب پلٹ کر مدینہ آئیں تو قبر رسولؐ پر جا کر آواز دی نانا میں آپ کے حسینؑ کی سنانی لیکر آئی ہوں۔ نانا ہم کربلا میں لٹ گئے۔ ہمارا بھیا مارا گیا۔ نانا ہمیں قیدی بنایا گیا۔ نانا ہم کوفہ و شام کے بازاروں میں گئے۔ نانا ہمیں درباروں میں لے جایا گیا۔ نانا ہم پر کتنے مصائب پڑے کیسے بیان کریں —— بس مختصر یہ ہے کہ اگر آپ کی قبر پر نامحرموں کا مجمع نہ ہوتا تو شانوں سے ردا ہٹا کر دکھاتی کہ ہم کس طرح کربلا سے شام تک تازیانوں پر تازیانے کھاتے ہوئے گئے ہیں اور کوئی ہمارا فریاد سننے والا نہ تھا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُون ٥

جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا

اسم مبارک	:	فاطمہؑ،
لقب	:	زہرا، بتول، صدیقہ وغیرہ،
کنیت	:	ام الائمہ، اُم ابیہا،
والد ماجد	:	حضرت محمد مصطفےٰؐ،
والدۂ ماجدہ	:	جناب خدیجہؑ،
ولادت	:	۲۰ جمادی الثانیہ ۵ بعثت، مکہ معظمہ
اولاد	:	امام حسنؑ، امام حسینؑ، جناب زینبؑ، جناب ام کلثومؑ، جناب محسنؑ
شہادت	:	۱۳ جمادی الاولیٰ ۱۱ھ یا ۳ جمادی الثانیہ ۱۱ھ مدینہ منورہ،
عمر مبارک	:	۱۸ سال،
قبر مطہر	:	بین قبر و منبر رسولؐ یا جنت البقیع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ اشرف الاولین والآخرین خاتم النبیین سیدنا ومولانا ابی القاسم محمد وآلہ الطیبین الطاہرین ولعنۃ اللہ علیٰ اعدائہم اجمعین اما بعد فقد قال اللہ الحکیم فی کتابہ الکریم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِنَّ عَلَیۡنَا لَلۡهُدٰی وَاِنَّ لَنَا لَلۡاٰخِرَةَ وَالۡاُوۡلٰی۔

مالک کائنات کا ارشاد ہے کہ بے شک ہدایت کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے اور دنیا و آخرت کا اختیار ہمارے ہاتھوں میں ہے۔

کتنا کریم ہے وہ مالک جس نے عالم ہستی میں انسانیت کو بے راہنما نہیں چھوڑا اور ہر دور میں ہدایت کی ذمہ داری لے کر انسانیت کو منزل کمال تک پہنچنے کا سہارا دے دیا، بدنصیب ہیں وہ افراد جو الٰہی راہنمائی سے فائدہ نہ اٹھائیں اور قدرت کے انتظام ہدایت کو چھوڑ کر اپنے انتظام کی فکر میں لگ جائیں اور خوش نصیب ہیں وہ افراد جو منزل تسلیم و رضا طے کرتے ہوئے اپنے اختیار حیات کو مالک کائنات کے حوالے کردیں اور سراپا "اِنَّا لِلّٰہ" کی تصویر بن جائیں۔

میں نے بارہا اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ جسے پروردگار عالم ہدایت عالم کے لئے معین کرتا ہے اس کا انداز دنیا کے رہنماؤں سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ وہ عالم پیدا ہوتا ہے اور عالم رہتا ہے، وہ صاحب عصمت پیدا ہوتا ہے اور معصوم رہتا ہے، اس کی زندگی کمالات کا آئینہ ہوتی ہے، اور اس کے کمالات جمال و جلال الٰہی کا پرتو ہوتے ہیں۔

تفصیل کے ساتھ جملہ رہنمایان امت کے حالات پر تبصرہ کرنا مقصود نہیں ہے اور نہ اتنی گنجائش ہے۔ صرف ایک فرد کے حالات پر ہلکی سی روشنی ڈالدینا چاہتا ہوں جس سے باقی افراد کے کردار کا بآسانی اندازہ ہو جائے گا اور یہ محسوس کرنا آسان ہوگا کہ جب پہلی منزل پر اتنا اہتمام ہے تو باقی منازل پر اس اہتمام کے نہ ہونے کا کیا سبب ہے؟

مختصر الفاظ میں مولائے کائنات حضرت علی بن ابی طالب کے حالات زندگی اور آپ کی سیرت طیبہ پر روشنی ڈالتا ہے اور یہ واضح کرتا ہے کہ الٰہی راہنما کیسے سخت حالات میں اپنے فرائض ہدایت کو انجام دیتا ہے۔

مولائے کائنات کی زندگی کا جائزہ لینے کے لئے دو طریقے ہیں، ایک طریقہ یہ ہے کہ آپ کے ذاتی فضائل و کمالات کا جائزہ لیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ آپ نفسانی کمالات اور روحانی فضائل میں کس منزل پر فائز تھے اور آپ کی منزل خدا و رسولؐ یا اہل دنیا کی نگاہ میں کیا تھی؟ اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ آپ کے کارناموں پر نگاہ کی جائے اور یہ دیکھا جائے کہ آپ نے مساعد یا نامساعد حالات میں کس طرح زندگی گزاری ہے؟ اور اپنے گرد و پیش کے حالات کو کس طرح برتا ہے؟

میرے لئے دونوں راستے ایسے ہیں جس کا طے کرنا محال نہیں تو دشوار ضرور ہے، کہاں کردار ابن ابی طالبؑ اور کہاں مجھ جیسا بندہ ذلیل۔ کہاں ممدوح خدا و رسولؐ اور کہاں مجھ جیسا بے بضاعت مداح۔ کہاں ساقی کوثر کی شہد اور کہاں یہ زبان بے سخن، کہاں باب مدینۃ العلم کی توصیف اور کہاں مجھ جیسا جاہل۔ کہاں گردش آفتاب کا پلٹانے والا اور کہاں میرا جیسا برگشتہ مقدر۔ لیکن اسی کا نام لے کر قدم آگے بڑھانا چاہتا ہوں اور یہ جانتا ہوں کہ جہاں ٹھوکر کھاؤں گا وہ سہارا ضرور دے گا۔

اور جب کوئی مشکل پڑے گی وہ حل ضرور کر دے گا، اور مشکلات میں اسے نہ پکاروں گا تو کسے پکاروں گا، دوسرا کون ہے جو مشکلات میں کام آسکے، اور زندگی کے مسائل حل کر سکے۔ تجربہ یہی کہتا ہے کہ اسے بلاؤ جو غریبوں اور مفلسوں کے بلانے پر آجائے، اسے نہ بلاؤ جو پیغمبرؐ کے بلانے پر بھی نہ آئے۔ صلوات،

مولائے کائنات کے ذاتی فضائل کو دیکھنا ہے تو آغازِ حیات سے دیکھئے پہلی ہی منزل پر وہ شرف نظر آئیگا جس میں کائنات کا کوئی انسان حصہ دار نہیں ہے اور دوسرے کا کیا ذکر، اس شرف میں خاتم النبیین کو بھی شریک نہیں بنایا گیا تو کسی دوسرے کو کیا بنایا جائے گا۔ یہ علیؑ کا تنہا شرف ہے کہ اوّلین و آخرین میں خانۂ کعبہ میں سوائے مولائے کائناتؑ کے کوئی دوسرا نہیں پیدا ہوا، ممکن ہے کوئی شخص یہ کہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ علیؑ کو کوئی ایسا شرف دیا جائے جس سے نبیؐ کو بھی محروم رکھا جائے، کیا علیؑ کا مرتبہ نبیؐ سے بالاتر ہے؟ اور اگر ایسا نہیں ہے تو آپ نے ایسا سوچا ہی کیوں۔؟ لیکن میں عرض کروں گا کہ ایک ولادت کا کیا ذکر ہے، شہادت کی منزل کو دیکھ لیجئے جہاں خود محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ اللہ نے مصلحتاً اپنے حبیب کو شرفِ شہادت سے الگ رکھا ہے اور مصلحت یہ ہے کہ اگر حضورؐ کو تلوار کی شہادت دی جاتی تو زہر کی شہادت سے محروم رہ جاتے اور اگر زہر کی شہادت دی جاتی تو تلوار کی شہادت سے محروم رہ جاتے، دونوں شہادتیں بیک وقت ممکن نہیں تھیں، اس لئے اللہ نے آپ کو شہادت سے الگ کر کے آپ کے فرزند حسنؑ و حسینؑ کو دونوں طرح کی شہادت دی تاکہ ان کی شہادت نبیؐ کی شہادت بن جائے اور ان کے ذریعہ سے نبیؐ کے کمالات کی تکمیل ہو جائے ـــــ اب اگر محدث دہلوی کی نگاہ میں

شہزادوں کی شہادت سے نبیؐ کی شہادت کی تکمیل ہو سکتی ہے تو وصی کی ولادت سے نبیؐ کے شرفِ ولادت کی بھی تکمیل ہو سکتی ہے۔

اور مجھے تو اس منزل پر یہ کہنا ہے کہ محدث دہلوی کی تحقیق میں بھی مولائے کائنات کے فضائل کا ایک پہلو نظر آتا ہے کہ اللہ نے پیغمبرؐ کو درجۂ شہادت اسلئے نہیں دیا کہ ایک نہ ایک شرفِ شہادت سے محروم رہ جائیں گے اور درجۂ شہادت نامکمل رہ جائے گا۔ مگر کیا کہنا مولائے کائناتؑ کا کہ انہیں دونوں شرف براہِ راست مل گئے اور کسی واسطہ کی ضرورت نہیں پڑی۔ دشمن یہ سمجھ رہا تھا کہ ہم نے زہر میں تلوار بجھائی ہے اور علیؑ بچ نہ سکیں گے اور علیؑ مطمئن تھے کہ دشمنی ہی سے یکسر شرف کی تکمیل ہو رہی ہے اور بیک وقت زہر کی شہادت بھی مل رہی ہے اور تلوار کی شہادت بھی نصیب ہو رہی ہے۔ صلوات۔

ولادت کے بعد ایک نظر علم و فضل پر ڈالنا ہوگی جہاں یہ دیکھنا ہے کہ مولائے کائنات کے علم کی منزل کیا ہے۔ دور جانے کی ضرورت نہیں ہے خانۂ کعبہ کے قریب آجایئے یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ فاطمہؑ بنت اسد خانۂ کعبہ سے آرہی ہیں، پیغمبر اسلامؐ استقبال کے لئے بڑھ رہے ہیں۔ بچہ نبیؐ کی آغوش میں آرہا ہے اور آنکھیں کھول کر تقاضہ کر رہا ہے، خدا کے حبیب کچھ پڑھوں۔؟ پیغمبرؐ نے اجازت دی تو توریت و انجیل و زبور و قرآن کی تلاوت شروع کر دی، اور اس انداز سے تلاوت کی کہ نبیؐ کو کہنا پڑا کہ آسمانی صحیفے یوں پڑھے کہ ان کے انبیاء بھی نہ پڑھ سکتے تھے۔ اور قرآن حکیم اس طرح پڑھا جو تلاوت کرنے کا حق تھا۔ صلوات۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ جو بچہ پیدا ہو کر آسمانی صحیفوں کی تلاوت

کرسکتا ہے۔ اس کی جوانی کا درجۂ کمال کیا ہوگا؟ اور یہ تو ہم نے ہم دنیا کی بنا پر کہا ورنہ یہاں تو کمال کی وہ منزل ہے جہاں بچپنے اور جوانی کا کوئی فرق نہیں ہے، جو منزل نبیؐ ہے وہ منزلِ کمال ہے اور جو عمر ہے وہ عمر فضائل ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ بچپنے میں نبیؐ نے کمال دیکھا تھا تو انھوں نے سند فضیلت دے دی، اور آگے چل کر ساری دنیا کمالات کا مشاہدہ کرے گی تو سب اعترافِ فضیلت کریں گے۔ اور اپنوں کا کیا ذکر ہے جو غیر ہیں وہ بھی یہی کہیں گے کہ اگر علیؑ نہ ہوتے تو سوائے ہلاکت کے کچھ نہیں تھا۔"

دنیائے اسلام کا اتفاق ہے کہ اسلام میں کوئی علم ایسا نہیں ہے جس کا سلسلہ علیؑ ابن ابی طالب سے نہ ملتا ہو۔ علم قرآن ہو یا تفسیر، علم حدیث ہو یا فقہ، علم فرائض ہو یا علم احکام، علم تصوف ہو یا علم کلام، علم نحو ہو یا علم صرف، علم منطق ہو یا علم فلسفہ، علم شعر ہو یا علم کتابت، علم خطابت ہو یا علم حساب، علم ہیئت ہو یا علم جفر۔ کوئی علم ایسا نہیں ہے جس کا سلسلہ مولائے کائناتؑ سے نہ ملتا ہو۔ اور اس کی قرآنی دلیل بھی یہ ہے کہ اللہ نے علیؑ کو وارث کتاب اور امام مبین قرار دیا ہے اور جو کچھ کتاب میں ہے وہ سینۂ علیؑ میں ہے اور جو کچھ کائنات میں ہے وہ قلب امام مبین میں ہے، یہی علم ہے جسے دیکھ کر نبیؐ نے فرمایا تھا کہ میں شہر علم ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہیں۔ جسے شہر کے پاس آنا ہو وہ دروازے سے آئے اور یہی علم تھا جس کا مشاہدہ کرکے دنیائے علم و فلسفہ سربسجود تھی اور آج تک ہے، اور اسی علم کا کرشمہ تھا کہ مسجدِ کوفہ سے مسلسل اعلان ہو رہا تھا کہ جو کچھ پوچھنا ہے پوچھ لو۔ قبل اس کے کہ میں تمھارے درمیان نہ رہ جاؤں۔ میرے پاس زمین و آسمان دونوں کا

علم ہے، میرے سینے میں علم کا خزانہ ہے، میں اس بلندی پر ہوں جہاں سے علم کا سیلاب بہہ کر نکلتا ہے اور جہاں تک کسی کا طائرِ خیال بھی نہیں پہنچ سکتا۔

تاریخ کائنات میں کوئی اس شان کا دعویٰ کرنے والا نہیں ملا، مگر علیؑ نے یہ دعویٰ کرکے واضح کر دیا کہ اہل دنیا میرے علم کا مقابلہ کیا کریں گے وہ میرے علم کو سمجھنے سے بھی قاصر ہیں، تخت و تاج پر قبضہ کر لینا آسان ہے، مسند علم پر جلوہ گر ہونا مشکل ہے، یہ میری ہی منزل ہے جہاں یہ اعلان کر رہا ہوں کہ اگر مسندِ علم بچھا دی جائے اور مجھے بٹھا دیا جائے تو توریت والوں کے درمیان توریت سے فیصلہ کروں گا، انجیل والوں کے درمیان انجیل سے فیصلہ کروں گا، زبور والوں کے درمیان زبور سے فیصلہ کروں گا اور قرآن والوں کے درمیان قرآن سے فیصلہ کروں گا۔ مجھے یہ معلوم ہے کہ قرآن کی کون سی آیت کہاں نازل ہوئی ہے، کب نازل ہوئی ہے کس کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اس کا مفہوم کیا ہے، اس میں ناسخ و منسوخ کیا ہے، عام و خاص کیا ہے، محکم و متشابہ کیا ہے، میرے سینے میں علوم کا ایک دریا موجزن ہے مگر افسوس کہ کوئی لینے والا نہیں ہے اور کسی میں علم حاصل کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔

یہ انداز اعلان ہی بتا رہا ہے کہ علیؑ کا کمال کیا ہے، اور علیؑ کا دور کیا تھا، کس انداز سے بیقرار تھے کہ کوئی علم لینے والا مل جائے، اور کس طریقے سے کوشش ہو رہی تھی کہ کوئی درِ اہلبیتؑ پہ نہ جانے پائے، اس انداز ظلم کا کوئی جواب ہو سکتا ہے کہ معانیٔ قرآن کو جاننے والے سے قرآن نہ لیا جائے اور جاہلان امت تفسیر قرآن کرنے بیٹھ جائیں وارث کتاب سے علم کتاب نہ لیا جائے اور جاہلان تخت و تاج کتاب کو وارث بنا دیں: مجھے تو کہنا پڑے گا کہ یہ اہل دنیا کی بدنصیبی تھی کہ انھوں نے درِ اہلبیتؑ کو

چھوڑ دیا اور ان سے علم نہ لیا، ورنہ درِ اہلبیتؑ پر کیا کمی ہے، یہاں فرشتے علم لینے آئے، جنات علم لینے آئے، آسمان والے علم لینے آئے، اہلِ زر آئیں یا نہ آئیں ابوذرؓ آئے، سلمان آئیں یا نہ آئیں سلمانؓ آئے، بشر آئیں یا نہ آئیں ملک آئے، صاحبانِ اقتدار آئیں یا نہ آئیں سید الملائکہ آئے اور روایت گواہ ہے کہ جب بزمِ پیغمبرؐ میں جبرئیل کی موجودگی میں علیؑ آگئے تو جبرئیل تعظیم کیلئے کھڑے ہو گئے، پیغمبرِ اسلامؐ نے مسکرا کر پوچھا "جبرئیل تم نے علیؑ کی تعظیم کیوں کی؟" عرض کی "حضورؐ کو تو معلوم ہی ہے کہ علیؑ کا مجھ پر حق ہے اور استاد کی تعظیم ضروری ہے۔" فرمایا "جبرئیل یہ تمہارے استاد کیسے ہو گئے؟" عرض کی "سرکار! جب مجھ سے عرشِ اعظم پر سوال کیا گیا کہ "جبرئیل تم کون ہو اور میں کون ہوں؟" تو میری کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ میں کیا جواب دوں۔ ایک مرتبہ میں نے اسی نور کو دیکھا کہ آواز دے رہا ہے۔ جبرئیل کہہ دو کہ میں عبد ذلیل ہوں اور میرا نام جبرئیل ہے اور تو ربِّ جلیل ہے اور تیرا نام بھی جلیل ہے۔" اربابِ نظر آپ تعجب نہ کریں، جب ساکنِ جنت آدمؑ ملائکہ سے علم میں افضل ہو سکتے ہیں تو قسیم جنت و نار علیؑ کیوں کر افضل نہیں ہو سکتے۔

صلوات،

علم کے ساتھ شجاعت کو دیکھا جائے تو گہوارہ میں کلہ اژدر کے ٹکڑے نظر آئیں گے۔ سخاوت کو دیکھا جائے گا تو ڈیوڑھی پر زمین سے لے کر آسمان تک والوں کی قطاریں نظر آئیں گی اور جب کوئی یہ کہے گا کہ حاتم کی سخاوت کا یہ عالم تھا کہ مکان میں چالیسؔ دروازے تھے اور ایک ایک سائل کو ہر دروازے سے دیا کرتا تھا تو مسکرا کر فرمائیں گے کہ ایک ہی دروازے سے اتنا کیوں نہ دیا کہ چالیسؔ دروازوں پر جانے کی زحمت نہ ہوتی۔

زہد و قناعت کا یہ عالم تھا کہ تمام زندگی ایک غذا پر گزار دی، اور جب شبِ شہادت بیٹی نے نمک اور دودھ لا کر افطار میں رکھا تو فرمایا۔ بیٹی امّ کلثومؑ! ان میں سے ایک چیز کو اٹھا لو، تمہیں تو معلوم ہے کہ تمہارے باپ نے ایک وقت میں دو غذائیں نہیں استعمال کیں اور اس سے بالاتر یہ اعلان کہ جب تک میرے حدود مملکت میں کوئی ایک بھوکا رہ جائے گا میں شکم سیر ہو کر نہ کھاؤں گا۔

مملکتِ اسلامیہ کے فقیروں کو دیکھ کر کھانا کھانے والا امام اور اس کے مقابلہ میں وہ افراد لائے جائیں جنھیں اپنے گھر اور محلہ کی بھی خبر نہ ہو، کردارِ علیؑ آواز دے رہا ہے کہ سماج سے بے نیاز ہو کر زندگی گزارنے والے کو غنی کہا جاتا ہے اور سماج کو مالا مال کر دینے والے انسان کو جنابِ امیر کہا جاتا ہے،

صلوات،

محنت و مشقت کا یہ عالم تھا کہ کبھی غرباء کا ہاتھ بٹا رہے ہیں، کبھی باغ میں مزدوری کر رہے ہیں، کبھی کھیت میں پانی دے رہے ہیں، کبھی بازار میں خرمے فروخت کر رہے ہیں، کبھی دستِ مبارک سے نعلین کی اصلاح کر رہے ہیں، کبھی چاہنے والوں کی امداد کر رہے ہیں، کبھی دشمنوں کی مشکل کشائی کر رہے ہیں اور پھر ہر منزل پر دشواریوں کا سامنا کر رہے ہیں لیکن دنیا کو بتا رہے ہیں کہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جانا اسلام نہیں ہے، قوتِ بازو کا مظاہرہ کر کے زندگی گزارنا اسلام ہے، کاہل اور سست انسان صاحب تاج و سفر ہوتا ہے، اور زورِ بازو کا مظاہرہ کرنے والا فاتح خیبر ہوتا ہے، صلوات،

ان کمالات کے ساتھ اگر عبادات کا بھی جائزہ لیا جائے تو عالم ہی دوسرا نظر آئے گا، کس کی مجال ہے کہ زندگی بھر کی عبادتوں کا حساب لگا سکے جب کہ

خندق کی ایک ضربت ثقلین کی عبادت پر بھاری ہے اور کس کی مجال ہے کہ ساری سرا منتوں کا حساب کر سکے جبکہ ایک رات کا سو جانا مرضیٔ پروردگار کی قیمت بن جائے صلوات،

لیکن بہرحال اجمالی طور پر یہ عرض کرنا ہے کہ علیؑ کے اعمال نگاہِ قدرت میں اس قدر معزز اور بلند ہیں کہ جیسے آیاتِ قرآن منتظر بیٹھی ہیں، علیؑ کسی عمل کا مظاہرہ کریں اور ہم عرشِ اعظم سے زمین کی طرف قصیدہ بنکر آجائیں، نماز پڑھیں تو ہم مدح سرائی کریں، زکواۃ دیں تو ہم سرِ ولایت رکھیں، جہاد کریں تو ہم ثبات مرصوص کا پیغام سنائیں، مساکین کو روٹی دیں تو ہم سورۂ دہر لے کر جائیں، چادر میں آجائیں تو آیتِ تطہیر نازل کردیں، مباہلہ میں جائیں تو صداقت کا اعلان کردیں، خیبر فتح کرلیں تو محبتِ خدا و رسولؐ کی تعریف کریں اور غدیر میں مولا بن جائیں تو دین کے کمال اور نعمتوں کے اتمام کی سند دیدیں، صلوات،

علیؑ کی عبادتوں میں ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ یہ سر غیر خدا کے سامنے نہیں جھکا اور خدا کے سامنے بھی کسی طمع یا خوف کی بنا پر نہیں جھکا بلکہ اپنے اخلاص کا اعلان یوں کیا کہ خود بارگاہ احدیت میں عرض کی پروردگار میں نے تیری عبادت جنت کی لالچ یا جہنم کے خوف سے نہیں کی ہے، تجھے بندگی کا اہل پایا ہے تو سر جھکایا ہے، گویا علیؑ واضح کر رہے ہیں کہ اہلِ دنیا ہوشیار ہو جائیں علیؑ کا سر کسی نااہل کے سامنے نہیں جھک سکتا، علیؑ کو طمعِ جنت اور خوفِ جہنم نہیں ہے تو دنیا کے خدا اور سلاطین کے تاج علیؑ کو کیا جھکا سکیں گے۔

علیؑ کی عبادت کا امتیاز ہے کہ ان کی بندگی کسی طمع یا خوف کی بنا پر نہیں تھی بلکہ اہلیت واستحقاق کی بنا پر تھی یعنی خدا اہل اور حقدار تھا اس لئے علیؑ

نے سر جھکا دیا ورنہ اس کے سامنے بھی نہ جھکتے، تو اب کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ علیؑ کسی نااہل کے سامنے سر نہیں جھکاتے اور حیاتِ مرتضیٰؑ میں کسی بت پرستی کا امکان نہیں ہے اور یہ وہ فضیلت ہے جس کا اعتراف اور احساس ساری دنیا کو ہے کہ آج بھی عالمِ اسلام میں سب رضی اللہ عنہ ہیں صرف علیؑ کرم اللہ وجہہ ہیں، جس کی وجہ یہ ہے کہ سب کے سر بتوں کے سامنے جھکے ہیں، علیؑ کا سر کسی کے سامنے نہیں جھکا، اور یہی تو وجہ ہے کہ سب کے لئے رضائے خدا کی دعا ہو رہی ہے اور علیؑ نے ہجرت کی رات بسترِ پیغمبرؐ پر سو کر رضائے الٰہی کا سودا کر لیا ہے۔

بات کو طول بڑھتا جا رہا ہے اور ابھی حیات مولائے کائنات کا دوسرا پہلو بالکل تشنہ ہے۔ اس لئے دل چاہتا ہے کہ مختصر لفظوں میں ادھر بھی اشارہ کر دیا جائے، یہ ذاتی کمالات ایک طرف دنیا کے ساتھ علیؑ کا برتاؤ اور اسلام میں مولائے کائناتؑ کی خدمات کا جائزہ لینا ہے تو اس خاکہ کو نگاہ میں رکھنا ہوگا اور حیاتِ علی مرتضیٰؑ کو دو حصوں میں تقسیم کرنا ہوگا۔ ایک حصہ حیاتِ پیغمبرِ اسلامؐ میں اور ایک حصہ بعد پیغمبرِ اسلامؐ، تاکہ یہ تجزیہ آسان ہو جائے کہ حیاتِ پیغمبرؐ میں علیؑ کے کارنامے کیا تھے اور بعد پیغمبرِ اسلامؐ مولائے کائناتؑ نے کیوں کر زندگی گزاری ہے اور آپ اسلام اور امتِ اسلام کے کس طرح کام آئے ہیں!

یہ تقسیم کوئی جدید تقسیم نہیں ہے، حالات کا جائزہ لینے کے لئے ایک ضروری تقسیم ہے کہ جس طرح پیغمبرِ اسلامؐ کے کردار کے تجزیہ کے لئے مکہ اور مدینہ کی زندگی کو دو حصوں میں بانٹنا پڑے گا اور یہ دیکھا جائے گا کہ عالمِ غربت اور بے کسی میں رسولِ اکرمؐ کا کردار کیا تھا اور اعوان و انصار کے مل جانے کے بعد زندگی کا انداز کیا رہا، اسی طرح مولائے کائناتؑ کی زندگی کو بھی دو حصوں پر بانٹنا پڑے گا اور حیات،

وفاتِ رسولؐ دونوں کے ماحول میں کردار کا جائزہ لیا جائے گا بلکہ بعد رسولؐ بھی دو قسم کے حالات کو دیکھنا پڑے گا کہ خانہ نشین رہے تو کیا انداز رہا اور تختِ حکومت پہ آگئے تو کیا انداز رہا۔

تفصیلات سے قطع نظر ایک لمحہ کے لئے یہ دیکھنا ہوگا کہ حیاتِ پیغمبرِ اسلامؐ تک علیؑ کے کتنے فضائل و کمالات اور کارنامہ ہائے حیات سامنے آتے ہیں اور ان میں مولائے کائناتؑ کا کیا انداز رہا ہے۔ مختصر لفظوں میں یوں عرض کر دیا جائے کہ آئے تو خانۂ خدا میں آئے، خانۂ کعبہ سے آغوشِ پیغمبرؐ میں آئے، آغوشِ پیغمبرؐ میں تلاوتِ قرآن کی، آغوش سے گہوارے میں آئے تو اژدہے کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ ایک مدّت تک باپ کے ساتھ رہے، اس کے بعد رسولِ اکرمؐ کی صحبت میں آگئے۔ دس گیارہ برس کی عمر میں پیغمبرِ اسلامؐ نے اعلانِ رسالت کیا اور سارے قبیلہ کو جمع کر کے اسلام کا پیغام سنایا تو اس دعوت کا پورا انتظام علیؑ کے ہاتھوں سے ہوا۔ اعلانِ رسالت پر کفار و مشرکین نے ساحر، کاہن اور مجنون کہا تو علیؑ نے نصرتِ پیغمبرؐ کا وعدہ کیا، اور وعدۂ نصرت کے بعد قدم قدم پر رسولؐ پر جان قربان کرتے رہے۔ پیغمبرؐ مکہ کی گلیوں میں رہے تو علیؑ پیچھے پیچھے چلتے رہے اور کفار سے مقابلہ کرتے رہے۔ نبیؐ شعب ابی طالب میں گئے تو راتوں کو بابا پہ بستر بدل کے نبیؐ کے بستر پر سوتے رہے تاکہ حملہ ہو جائے تو میں قتل ہو جاؤں، میرا رسولؐ بچ جائے۔ تین سال کے محاصرہ کے بعد حکمِ ہجرت ہوا تو تمام رات تلواروں کی چھاؤں میں سو کر رضائے الٰہی کا سودا کیا، صبح کو اٹھے تو کفار و مشرکین کی امانتیں واپس کر کے دستارِ نبوت کو بچایا، ناموسِ رسالت کو لے کر مکہ سے مدینہ کی طرف چلے اور پیغمبرؐ اس وقت تک مدینہ میں داخل

نہیں ہوئے جب تک علیؑ آ نہیں گئے۔ گویا پیغمبرؐ اعلان کر رہے تھے کہ یاد رکھو، نہ میں نے مکہ میں کارِ تبلیغ علیؑ کے بغیر شروع کیا ہے نہ مدینہ میں شروع کروں گا۔ میں عرض کروں گا یا رسول اللہؐ! کل آپ تنہا تھے تو علیؑ کا انتظار کر رہے تھے، آج خدا رکھے آپ اکیلے نہیں ہیں۔ امّت کے بزرگ و تجربہ کار آپ کے ساتھ ہیں، اب علیؑ کی کیا ضرورت ہے؟ آپ فرمائیں گے "میں یہی تو واضح کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے اسلام کے مسائل میں کس کس پر اعتماد کیا ہے، یاد رکھو! میری جان خطرے میں تھی تو علیؑ کو بستر پر لٹایا تھا، میرا وقار خطرہ میں تھا تو علیؑ کو امانتوں کے واپس کرنے کا ذمہ دار بنایا تھا، میرا اسلام خطرات سے دوچار ہونے والا ہے تو علیؑ کے بغیر ایک قدم نہ اٹھاؤں گا۔

کاش دنیا کو اس بات کا احساس ہو جاتا کہ اہلِ دنیا کی یہی بساط و حادثات ہے۔ علیؑ کے بغیر نبیؐ قدم نہیں اٹھاتے اور جب نبیؐ، علیؑ کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں تو ہم علیؑ کو چھوڑ کر کہاں جائیں گے۔ ہمارا تو کھلا ہوا اعلان ہے کہ جس علیؑ کا سہارا لے کر نبیؐ اپنی ابدی آرام گاہ کی طرف گئے ہیں، اسی علیؑ کا سہارا لے کر ہم اپنی آخری منزل جنّت کی طرف جائیں گے۔

مدینہ منورہ آنے کے بعد حضورؐ نے اپنی اکلوتی بیٹی فاطمہ زہراؑ کا عقد علیؑ سے کیا اور ساری درخواستوں کو رد کر کے وحیِ الٰہی کے فیصلہ پر کیا کہ نور کا رشتہ نور ہی سے ہو سکتا ہے۔ ظلمت کو نور سے رشتہ کی ہوس بے کار ہے۔

اور یہ بھی عجیب قیامت ہے کہ جس کے حصہ میں نور کا رشتہ آیا، وہ ایک نور والا بھی نہ کہا گیا، اور جس کے حصّے میں ظلمت کے رشتے آئے وہ دو دو نور والا ہو گیا۔ عقد زہراؑ و علیؑ کی سادگی دلیل ہے کہ اسلامی رشتہ میں جاہلی رسوم کی

گنجائش نہیں ہے۔ یہاں شریعت کو سادہ ہونا چاہیئے، مہر کو نقد ہونا چاہیئے، جہیز کو مہر کی مقدار کے اندر ہونا چاہیئے۔ اس کے علاوہ ہر رسم اسلام میں دخل اندازی ہے اسلام نہیں ہے۔ کاش علیؑ و فاطمہؑ کے غلام و کنیزیں اس نکتہ کی طرف متوجہ ہوتے اور سماج کو مبتلائے مصائب نہ کرتے۔

عقد کے بعد اسلامی معرکوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، سب سے پہلے ۲ھ میں بدر کا معرکہ پیش آیا جس میں ساری لشکر کا فریضہ علیؑ ہی نے انجام دیا۔ اور سارے مسلمانوں کے برابر کفار تنہا علیؑ ہی نے قتل کیا۔ بدر کے بعد ۳ھ میں احد کی منزل آئی، یہاں بھی سارے مسلمانوں کے میدان سے بھاگ جانے کے بعد ثبات قدم کا مظاہرہ علیؑ ہی نے کیا اور جب پیغمبر اسلامؐ نے پوچھا کہ یا علیؑ سب چلے گئے، تم کیوں نہیں گئے؟ تو عرض کیا کہ میں آپ کے نقش قدم پر ہوں، میں ایمان کے بعد کفر نہیں اختیار کر سکتا۔ اب کوئی پوچھے کہ یا علیؑ کیا میدان جنگ سے بھاگ جانا کفر ہے اور اگر کفر ہے تو بھاگنے والوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

عزیزان محترم! آپ دیکھ رہے ہیں کہ عالم اسلام کا چوتھا خلیفہ کیا کہہ رہا ہے۔ اور پیغمبر اسلامؐ کو کیا ہو گیا ہے کہ ٹوکتے بھی نہیں کہ یا علیؑ یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو، بھلا فرار کو کفر سے کیا تعلق ہے؟ تو کیا یہ دونوں بھائیوں کا مشترکہ فیصلہ ہے کہ ایک اعلان کر رہا ہے۔ اور دوسرا اپنی خاموشی سے اس کے اعلان کی تائید کر رہا ہے اور اس طرح حضرت پیغمبر سے منہ موڑنے والوں کے مسلک کا اعلان ہو رہا ہے۔

احد کے بعد ۵ھ میں خندق کا معرکہ پیش آیا جہاں عمرو بن عبدود

کے حملے کے بعد بھی مسلمانوں کے سر نہیں اٹھے اور پیغمبر اسلامؐ کے اصرار پر بھی کوئی نہیں گیا تو بالآخر علیؑ ہی نے جا کر عمرو کا سر قلم کیا اور پیغمبرؐ نے آواز دی: "آج علیؑ کی ایک ضربت ثقلین کی عبادت پر بھاری ہے"۔ صلوات،

خندق کے بعد ۶ھ میں صلح حدیبیہ کی منزل آئی، جہاں پیغمبر اسلامؐ حج کے ارادے سے نکلے اور کفار کی مزاحمت کے بعد صلح کی نوبت آ گئی، جس پر بہت سے مسلمانوں نے اعتراض بھی کیا اور پیغمبر اسلامؐ کی رسالت میں شک بھی کیا تو صلح کی دستاویز علیؑ ہی کے ہاتھوں سے مرتب ہوئی اور صلح نامہ کی کتابت کا کام علیؑ ہی نے انجام دیا، نہ کوئی کاتب وحی نظر آیا، نہ کاتب الہام، صرف ایک علیؑ تھے جو صلح نامہ مرتب کر رہے تھے اور نبیؐ لکھوا رہے تھے۔ اور قرآن اس صلح کو فتح مبین قرار دے کر دنیائے اسلام کو متوجہ کر رہا تھا کہ اسلام میں کفار کا فاتح بھی علیؑ ہے اور اسلام میں مسلم کا فاتح بھی علیؑ ہے۔ صلوات،

حدیبیہ کے بعد ۷ھ میں خیبر کا معرکہ سامنے آتا ہے جہاں یہودیوں کے قلعوں کو فتح کرنے کے لئے بعض مسلمان سپاہی میدان تک جاتے ہیں اور الٹے پاؤں واپس چلے آتے ہیں اور بقول تاریخ "سردار یہ کہتا ہے کہ لشکر کمزور ہے اور لشکر یہ کہتا ہے کہ سردار بزدل ہے" اور آخر کار نبیؐ عملی طور پر اعلان کرتے ہیں کہ اسلام کے لئے دونوں بے کار ہیں اور کرار غیر فرار کا خطاب دے کر علیؑ کو میدان میں بھیجتے ہیں اور علیؑ مرحب و عنتر کو تہ تیغ کر کے خیبر کو فتح کر کے واپس آتے ہیں۔ صلوات،

خیبر کے بعد ۸ھ میں مکہ فتح ہوتا ہے، جہاں پیغمبر اسلامؐ خانہ کعبہ میں بت شکنی کا فرض انجام دیتے ہیں اور علیؑ کو حکم دیتے ہیں کہ

دوشِ پر سوار ہو کر طاقِ کعبہ سے بُت گراؤ اور علیؑ دوشِ رسولؐ پر بلند ہو کر اپنا مستقل فضیلت بھی ظاہر کر دیتے ہیں اور دنیا کو بتا دیتے ہیں کہ رسولِ اسلامؐ نے خانۂ حق سے باطل کے قبضے کے ہٹانے کا کام مجھ ہی سے لیا ہے اور خلیل کے مقابلہ میں اس جہاد کا فرض میں نے ہی انجام دیا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ انھوں نے پیادہ جہاد کیا تھا اور میں نے دوشِ رسولؐ پر سوار ہو کر جہاد کیا ہے۔ صلوات،

فتح مکہ کے بعد ۹ھ میں مباہلہ کی منزل آتی ہے، جہاں عیسائی حضرت عیسیٰؑ کو اللہ کا بیٹا ثابت کرنے کے لئے مدینہ آتے ہیں اور آیاتِ قرآن کے نزول کے باوجود ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں اور آخر کار قرآن مجید مباہلہ کا حکم دیتا ہے تو نبیؐ اس شان سے برآمد ہوتے ہیں کہ گود میں حسینؑ ہوتے ہیں، انگلی پکڑے ہوئے امام حسنؑ۔ حضورؐ کے پیچھے شہزادیٔ کائنات فاطمہ زہراؑ اور ان کے پیچھے نفسِ پیغمبرؐ علیؑ ابن ابی طالب۔ مباہلہ ختم ہوتا ہے، نصاریٰ اپنی شکست کا اعتراف کرتے ہیں اور تاریخ آواز دیتی ہے۔ مسلمانو! اب آلِ محمدؐ کا احسان پہچانو، اب تک تو میدانوں میں بعض اصحاب نظر بھی آجاتے تھے، اب اسلام کے اس معرکۂ حق و صداقت میں سوائے آلِ محمدؑ کے کوئی نظر نہیں آرہا ہے۔ مسلمان فضائلِ آلِ محمدؐ کو مانیں یا نہ مانیں عیسائیوں کو احساس ہے کہ ہماری شکست اہلبیت سے ہوئی ہے، اصحاب سے نہیں۔ اور شاید اسی فضیلت کو باقی رکھنے کے لئے اللہ نے عیسیٰؑ کو بچا رکھا ہے کہ اسلام کے آخری امام کے پیچھے نماز پڑھ لیں تو دنیائے اسلام کو بھی آلِ محمدؐ کے کمالات و احسانات کا اندازہ ہو جائے۔ صلوات،

مباہلہ کے بعد ۱۰ھ میں یمن کی مہم پیش آتی ہے، جہاں مولائے کائناتؑ

تبلیغِ اسلام کر کے پورے قبیلہ ہمدان کو مسلمان بناتے ہیں اور واپسی پر نبیؐ کے ساتھ آخری حج میں شریک ہو جاتے ہیں، جس کی واپسی پر میدانِ غدیر میں حاجیوں کا قافلہ روکا جاتا ہے اور پیغمبرِ اسلامؐ منبر پر جا کر علیؑ کو ہاتھوں پر بلند کر کے آواز دیتے ہیں۔ "جس کا میں مولا ہوں اس کا یہ علیؑ بھی مولا ہے" اور قرآن مجید تکمیلِ دین کا اعلان کرتا ہے اور اُمت سے دستِ علیؑ پر بیعت لی جاتی ہے تاکہ مسلمانوں کو ہوش آجائے کہ علیؑ کا ہاتھ بیعت لینے کے لئے پیدا ہوا ہے، بیعت کرنے کے لئے نہیں۔ صلوات،

غدیر کے دو مہینے دس دن کے بعد ۲۸ صفر ۱۱ھ کو حضور سرورِ کائنات کا انتقال ہوتا ہے، جہاں سے علیؑ کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے اور اُمت کے علیحدہ ہو جانے کے بعد علیؑ پیغمبرؐ کو غسل و کفن دے کر دفن کر دیتے ہیں اور دنیا کو متوجہ کر دیتے ہیں کہ تخت و تاج کے لئے دوڑنے والے اور ہیں اور نبوت کی تجہیز و تکفین کرنے والے اور ـــــ اور سچ ہے، جو جس کا مقصد ہوتا ہے وہ اس کے لئے ہر آن کوشاں رہتا ہے۔ دنیا کا رشتہ تخت و تاج سے ہے اور میرا رشتہ مرسلِ اعظمؐ سے ہے، کل کعبہ سے مجھے پیغمبرؐ لائے تھے، آج آخری منزل تک پیغمبرؐ کو میں پہنچا رہا ہوں۔

اربابِ کرم! ـــ میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن اتنا کہنے کو بے حد جی چاہتا ہے کہ آج کی دنیا میں بھی اگر کوئی جنازہ چھوڑ کر الگ ہو جائے تو ظاہری رشتہ بھی ختم ہو جاتا ہے، خدا جانے یہ کیسی وفادار اُمت تھی کہ جنازۂ رسولؐ چھوڑ کر بھی رشتۂ محبت رہ گیا؟

یہی نہیں، بلکہ فیصلۂ خلافت کے بعد اہلبیتؑ کی طرف مصائب کا

موڑ دیا جاتا ہے اور پسرِ رسول کے بجائے بیٹی کی جائداد پر قبضہ کیا جاتا ہے
داماد کو قیدی بنایا جاتا ہے، دروازے پر آگ اور لکڑیاں جمع کی جاتی
ہیں اور دربارِ حکومت میں کھینچ کر طلب کیا جاتا ہے اور قتل کی دھمکی دے کر بیعت
کا مطالبہ کیا جاتا ہے اور جب مولائے کائناتؑ فرماتے ہیں کہ تم ایک اللہ
کے بندے اور نبیؐ کے بھائی کو قتل کر رہے ہو، تو جواب ملتا ہے کہ ہم
تمہیں بندۂ خدا تو تسلیم کرتے ہیں لیکن رسولؐ کا بھائی تسلیم نہیں کرتے،
دیکھا آپ نے انقلابِ اُمت، جب یہ اُمت علیؑ کے نبیؐ کا بھائی ہونے سے
انکار کرسکتی ہے تو اگر باغِ فدکؑ اور منصبِ حکومت کا انکار کردے تو
کیا تعجب ہے، علیؑ نے اس مصیبت پر بھی صبر کیا اور قرآن جمع کرکے پیش
کیا، وہ بھی رد کردیا گیا، مصائب پیش آتے رہے اور علیؑ حسبِ وصیتِ پیغمبرؐ
خاموش رہے۔

تھوڑے عرصہ کے بعد حکومت بدلی، اور حکومت کا دوسرا دور آیا،
اس دور میں بھی مصائب میں اضافہ ہی ہوا، اور جسمانی اذیتوں کے ساتھ
روحانی اذیتیں بھی نمایاں طور سے شامل ہوگئیں، کل اپنے حقوق کا انکار ہو رہا
تھا اور اب دینِ خدا پر حملہ ہو رہا تھا اور آج کھلم کھلا احکامِ الٰہیہ کی مخالفت
ہو رہی ہے، حلالِ خدا کو حرام کیا جارہا ہے اور حرامِ خدا کو حلال بنایا جارہا ہے
اور حقِ علیؑ کو پامال کرنے کی عظیم سازش ہو رہی ہے کہ ایک طرف جاگیرِ فدک کے
ساتھ حقِ خمس کو بند کردیا گیا کہ آلِ محمدؐ کے پاس کوئی دولت باقی نہ رہ جائے اور
دوسری طرف چلتے چلتے نئی حکومت کا ایسا منصوبہ بنایا گیا کہ خلافت مولائے کائنات
تک پہنچنے ہی نہ پائے۔ چھ آدمیوں کی کمیٹی بنائی گئی، اکثریت پر فیصلہ رکھا گیا،

مخالف کے قتل کا فرمان نافذ ہوا، ایک شخص کو ثالث فرض کیا گیا اور ان سب کے بعد بھی
جب علیؑ کے حق کا انکار ممکن نہ ہوسکا تو سیرتِ شیخین پر عمل کرنے کی شرط لگائی گئی، مولائے
کائنات نے وقتِ وصیت ہی اس سازش کو محسوس فرمالیا اور آپکو معلوم تھا کہ یہ
خلافت مجھ تک آنے والی نہیں ہے اس لئے آپ نے چاہا کہ خلافت نہیں ملتی ہے
تو نہ ملے، کم از کم اس خلافت کی حقیقت تو واضح ہوجائے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا،
کہ سیرتِ شیخین مطابقِ سیرتِ رسولؐ ہے تو اس شرط کی ضرورت نہیں ہے اور مخالف
سیرتِ رسولؐ ہے تو میں سیرتِ رسولؐ سے ہٹ کر کسی شے پر عمل کرنے کے لئے
تیار نہیں ہوں ـــ خلافت نہیں ملی اور دوسرے کو دے دی گئی، لیکن علیؑ کا
سوال آج بھی محفوظ ہے اور مسلمانوں کو چیلنج کر رہا ہے کہ بتاؤ یہ سیرت،
سیرتِ رسولؐ کے موافق ہے یا مخالف؟ اور علیؑ آواز دے رہے ہیں کہ مجھکو
چھوڑنے والا سیرتِ رسولؐ کو بھی نہیں پا سکتا، سیرتِ رسولؐ میری ہی سیرت
کا نام ہے، جو مجھ سے الگ ہوگیا وہ رسولؐ سے الگ ہوگیا اور جو رسولؐ
سے الگ ہوگیا وہ خدا سے الگ ہوگیا۔ اب خدا سے الگ ہونے والے کے
بارے میں تم فیصلہ کرو؟

عزیزانِ محترم! اس مقام پر یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ علیؑ
نے سیرتِ حکام پر عمل کرنے سے انکار کرکے ایک مسئلہ اور بھی واضح کر
دیا کہ اگر علیؑ نے کل حکامِ وقت کی بیعت کرلی ہوتی تو آج سیرت کو
ضرور قبول کرلیتے، مولاؑ نے سیرت کو ٹھکرا کر واضح کردیا کہ جب میں
سیرت کے نام پر پوری حکومت چھوڑ سکتا ہوں تو مجھ سے یہ توقع ہرگز
نہ رکھنا کہ میں کسی اقتدار سے مرعوب ہوکر باطل کے سامنے سر جھکادونگا

اور غیرِ حق کی بیعت کر لوں گا۔

تاریخ کے دس سال یہ بھی گزر گئے اور حکومت کا تیسرا دور آ گیا۔ اس دور میں بھی مصائب و مظالم کا سلسلہ اسی شدت کے ساتھ جاری رہا اور دینِ خدا کی توہین و تذلیل ہوتی رہی۔

بنی امیہ پر وظائف و انعامات تقسیم ہوتے اور بنی ہاشم کے گھر فاقے ہوتے رہے اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جب خلیفۂ سوم کو حکومت ملی تو رئیس خاندان حضرت ابوسفیان نے آکر کہا۔ بیٹا! اب یہ خلافت تمھارے قبضہ میں آگئی ہے۔ اس گیند کو جس طرح چاہو نچاؤ، خبردار جنت و جہنم کے چکر میں نہ پڑنا، اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ میں نہیں جانتا کہ سعادتمند فرزند نے بزرگ خاندان کی بات مانی یا نہیں۔ لیکن اتنا ضرور معلوم ہے کہ اس بات پر ابوسفیان کو ٹوکا بھی نہیں اور یہیں سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اگر خلافت میں جنت و جہنم کا انکار نہ ہوتا تو ملوکیت میں خسروی کو بنی ہاشم کا کھیل نہ بنایا جاتا، یہ بنی امیہ کا قدیم عقیدہ تھا جو اب تک دبے چھپے انداز سے چلا آ رہا تھا، اور اب یزید نے اس پردہ کو چاک کر دیا۔ یزید میں اور دوسروں میں اتنا ہی فرق ہے کہ دوسروں نے بات کو پردہ میں رکھا تھا اور یزید نے پردہ کو ہٹا دیا تاکہ دنیا پہچان لے کہ یزیدیت ہر دور میں رہی ہے اور سفیانیت آج بھی زندہ ہے اور اس طرح یہ بھی واضح ہو جائے کہ حسینیت ہر دور میں رہی ہے اور محمدیت آج بھی زندہ ہے اور یہی معنی ہیں "حُسَینٌ مِنّی وَاَنَا مِنْ حُسَین" کے۔

تقریباً بارہ سال تک مظالم کا یہ سلسلہ بھی جاری رہا۔ اور دینِ الٰہی کی توہین و تحقیر ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ امّ المؤمنین عائشہ کی کوششوں سے خلیفۂ ثالث کا قتل واقع ہوا۔ اور مسلمان لاوارث ہو گئے۔ اب مشکلات تھیں، اور

مشکل کشا نہ تھا، مسائل تھے اور حلّالِ مسائل نہ تھا، شریعت تھی اور محافظِ شریعت نہ تھا، قرآن تھا اور مفسّرِ قرآن نہ تھا، اسلام تھا اور وفادارِ اسلام نہ تھا، اُمّت تھی اور قائدِ اُمّت نہ تھا، آخر امّت عاجز آکر درِ علیؑ پر آئی اور آواز دی یا علیؑ! اب مشکل کشا آپ ہیں، ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت کرنا چاہتے ہیں۔ ہم سے بیعت لے لیجئے علیؑ نے انکار کیا، اور جب اصرار بڑھا تو مسجدِ پیغمبرؐ میں منبر پر بیٹھ کر بیعت لی اور ثابت کر دیا کہ مسلمانوں میں تمھاری بیعت کا محتاج نہیں ہوں، تم میری بیعت کے محتاج ہو۔ کل یہ بات سمجھ میں نہ آئی تھی اور آج سمجھ میں آگئی۔ یہی بات کہ جب ٹھوکر لگتی ہے تو یا علی کہنا ہی پڑتا ہے۔ صلوات۔

تاریخ میں ایک نیا انقلاب آیا، اور علیؑ کی حکومت سے مایوسی کے بعد ام المومنین نے خونِ عثمان کے انتقام کا نعرہ بلند کیا۔ مولائے کائنات پر قتلِ عثمان کا الزام لگا کر انتقام کے لئے جمل کے میدان تک آگئیں۔ مولائے کائنات نے لاکھ سمجھایا لیکن کسی کی سمجھ میں نہ آیا اور آخرکار جمل کی لڑائی ہوئی۔ ام المومنین کی شکست ہوئی۔ حضرت علیؑ کو فتح نصیب ہوئی۔ لیکن آپ نے نہایت ہی عزت و احترام کے ساتھ انھیں مدینہ پہنچا دیا کہ دنیا پہچان لے کہ عزتِ پیغمبر کا محافظ کون ہے اور ناموسِ رسولؐ کو سرِ میدان لانے والا کون ہے اور اس طرح حق و باطل کا فیصلہ بھی ہو جائے۔

جمل کی آگ سرد نہ ہوئی تھی کہ انتقام کی دوسری مہم شام سے شروع ہوئی اور صفّین کا میدان گرم ہو گیا، یہاں بھی لڑائی علیؑ کی فتح پر تمام ہوتی لیکن اچانک حکومتِ شام نے نیزوں پر قرآن بلند کر کے جنگ کا رُخ بدل دیا۔ مقصد یہ تھا کہ ہم قرآن سے فیصلہ کرانا چاہتے ہیں، اب دیکھیں علیؑ کا مسلک کیا ہے؟ مولائے کائنات نے جنگ روک دی، اور مالکِ اشتر کو واپس بلا لیا اور دنیا پر واضح کر دیا کہ ہم وہ محافظِ قرآن

ہیں جو عزت کتاب کے لئے جیتی ہوئی جنگ بھی چھوڑ سکتے ہیں۔ قرآن کو چھوڑ کر حکومت کرنا انکا کام ہے اور قرآن کی عزت کے نام پر حکومت چھوڑ دینا ہمارا کام ہے۔

جنگ رکی، طرفین کے حکم معین ہوئے اور آخر میں ایک گہری سازش کے نتیجہ میں مولائے کائنات کے خلاف فیصلہ ہوگیا، فیصلہ میں اس قرآن کا نام بھی نہ آیا جس کے لئے جنگ رکی تھی اور اس طرح مولائے کائنات کے لشکر میں بھی بغاوت کی ایک لہر دوڑ گئی اور آپ کو نہروان کی لڑائی سے دوچار ہونا پڑا۔ الحمد للہ کہ آپ اس میں بھی فاتح رہے۔

بات تمام ہوگئی لیکن اتنا ضرور عرض کرنا چاہتا ہوں کہ خلافتوں کے دور میں علیؑ سے تین محاذوں پر جنگ کیوں ہوئی اور ان لڑائیوں کا ذمہ دار کون ہے؟ جنگوں کی نوعیت حقیقت کا فیصلہ کر رہی ہے کہ ان جنگوں میں ایک میں خلیفۂ اول کی بیٹی قائد تھیں، اور دوسری میں خلیفۂ دوم کا بنایا ہوا گورنر خاندان" اور تیسری میں بنی امیہ کے ہوا خواہ خوارج اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اگر صحابیت نے اہلبیت کے خلاف محاذ آرائی نہ کی ہوتی تو آج مسلمانوں میں یہ بحث نہ ہوتی اور شاید تاریخ کے اس تسلسل کو امام غزالی نے محسوس کر لیا تھا، جب یہ فتویٰ دیا تھا کہ "واقعہ پر ذکر شہادت حسینؑ حرام ہے کہ اس سے بغضِ صحابہ پیدا ہوتا ہے"۔

میرے گزارش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ امیر المومنینؑ نے اپنا چار سالہ دورِ حکومت ایسی ہی پریشانیوں اور الجھنوں میں گزارا لیکن اپنے فریضۂ ہدایت سے غافل نہیں رہے اور جب زندگی کا آخری لمحہ آیا اور شام کی سازش سے خوارج نے قتلِ علیؑ کا منصوبہ بنایا تو اس وقت بھی آپ قدم قدم پر اپنا فرضِ ہدایت ادا کرتے رہے۔

کیا دنیائے اسلام اس قیامت خیز رات کو فراموش کر سکتی ہے جب کائنات کا امیر اپنی بیٹی کے گھر مہمان تھا اور بیٹی نے افطار میں دودھ اور نمک لاکر حاضر کیا فرمایا، میری لال ام کلثوم! تجھے معلوم ہے کہ تیرے باپ نے ایک وقت میں دو غذا ئیں نہیں کھائیں، بیٹی! دودھ کا پیالہ اٹھالو۔

کسے معلوم تھا کہ مولا نے دودھ کا پیالہ کیوں اٹھوا دیا؟۔ راز تو اس وقت کھلا جب ابن ملجم کی تلوار سر اقدس پر لگی اور مولا زخمی ہو کر بیت الشرف میں تشریف لائے اور جراحی نے زخم سر دیکھ کر دودھ تجویز کیا،

عزادارو! ۱۹ویں شب افطار سے فارغ ہونے کے بعد مولا کا یہ عالم تھا کہ بار بار حجرۂ عبادت میں تشریف لے جاتے تھے اور نکل آتے تھے اور فرماتے تھے "بیشک یہ وہی رات ہے"! بیٹی نے گھبرا کے پوچھا۔ بابا جان! یہ کون سی رات ہے؟ فرمایا۔ میری لال یہ میری اور تیری جدائی کی رات ہے، یہ وہ رات ہے جس کی پیغمبر اسلامؐ خبر دے گئے ہیں، جس کے بعد مجھے بارگاہِ الٰہی میں حاضر ہونا ہے، بیٹی! دیکھ تیرا باپ کس طرح لرز رہا ہے۔ آج مجھے دنیا کے کسی بہادر سے مقابلہ نہیں کرنا ہے آج مجھے رب العالمین کی بارگاہ میں جانا ہے۔

رات گزرتی رہی، سحر کا ہنگام آیا، تجدید وضو فرما کر گھر سے باہر نکلنے کا قصد کیا، مرغابیوں نے بڑھ کر دامن تھاما، پلٹے کر امام حسن کو دیکھا، فرزند! ان جانوروں کا خیال رکھنا ان میں کوئی بھوکا پیاسا نہ رہ جائے، اگر ان کے آب و دانہ کا انتظام نہ ہو سکے تو انھیں آزاد کر دینا، میں کسی کو بھوکا پیاسا نہیں دیکھ سکتا ہوں۔

ارباب عزا! یہ کوفہ ہے کوفہ! کاش کوئی اہل کوفہ میں اس وصیت کو سنتا اور یاد رکھتا کہ علیؑ جانوروں کی بھوک اور پیاس برداشت نہیں کر سکتے،

اور کس انہیں علیؑ کی اولاد ہوگی جن کے خیموں سے العطش العطش کی آوازیں بلند ہوں گی۔ جی چاہتا ہے عرض کروں، مولاؑ! آپ کے گھر کے جانور پیاسے نہ رہیں اور آپ کی اولاد صحرائے کربلا میں تین دن کی پیاس، نگاہوں کے سامنے دھواں، زبانوں پر العطش العطش، وامحمداہ واعلیاہ واحسیناہ کی آوازیں۔

عزادارانِ امیرالمومنینؑ! مولاؑ بیت الشرف سے باہر چلے، امام حسنؑ اور امام حسینؑ ساتھ چلے۔ مڑ کر دیکھا، کہا: بیٹے لال واپس جاؤ، آج تمہارا گھر میں رہنا زیادہ ضروری ہے۔ شہزادے واپس ہوگئے، لیکن کسے معلوم تھا کہ مولاؑ نے کیوں واپس کر دیا، یہ تو باپ جانے یا فرزند۔ راز اس وقت کھلا جب علیؑ کا سجدہ شروع ہوا اور سرِ اقدس پر ابنِ ملجم کی تلوار لگی، فضا میں قَدْ قُتِلَ اَمِیْرُالْمُؤْمِنِیْن کی آواز گونجی اور شہزادی زینبؑ و ام کلثومؑ تڑپ کر بھائی کے پاس آئیں۔ بھیا! یہ میں کیا سن رہی ہوں کیا بابا مارے گئے؟ بھیا جلدی مسجد میں جاکر بابا کی خبر لائیے۔ میں کہوں گا شہزادی آج بھائی گھر میں موجود ہے، باپ کی خبرگیری کے لئے بھیج دیجئے لیکن بی بی! کل جب فضائے کربلا میں آواز گونجے گی "اَلَا قُتِلَ الْحُسَیْنُ بِکَرْبَلَا" تو کسے میدان میں بھیجئے گا، جو مقتل سے بھائی کی خبر لائے۔ عجب نہیں، شہزادی آواز دیں کہ میں خود ٹیلہ ہی تک جاؤں گی اور بھائی کے گلے پر چلتا ہوا خنجر دیکھ کر آواز دوں گی پسرِ سعد! میرا بھیا ذبح ہو رہا ہے اور تو کھڑا دیکھ رہا ہے۔

عزادارو! مولا مسجد میں آئے، آخری فرضِ ہدایت انجام دیا، گلدستہ پر اذان کہی، صحنِ مسجد سے قاتل کو بیدار کیا اور دنیا کو یہ پیغام سنا کر مصلے پر آئے کہ علیؑ وقتِ نماز قاتل کا سونا بھی برداشت نہیں کر سکتا تو چاہنے والوں کا بے نمازی ہونا کیونکر برداشت کرے گا۔

نماز شروع کی، سر سجدۂ خالق میں رکھا، ابن ملجم کی تلوار چلی، ستونِ مسجد ہلے، چراغِ مسجد بجھے، فضا میں کہرام برپا ہوا، آسمانوں میں تلاطم پیدا ہوا، روح الامین تڑپ کر چلائے نبیؐ کا بھائی مارا گیا، علیؑ شہید ہوگئے، ستونِ ہدایت گر گیا، ریسمانِ ہدایت ٹوٹ گئی۔

بیت الشرف تک آواز پہنچی، سیدانیوں میں کہرام برپا ہوا، نالہ و شیون کی آوازیں بلند ہوئیں، شہزادے مسجد تک آئے، امام حسنؑ نے مسلمانوں کو نماز پڑھائی اور دنیا کو سبق دیا کہ خبردار قتلِ علیؑ کو مسجد میں نہ جانے کا بہانہ قرار نہ دینا، مجھ سے زیادہ علیؑ کا چاہنے والا کون ہوگا، میں وارثِ علیؑ اور فرزندِ علیؑ ہوں، میں نے ٹھیک وقتِ ضربت مسجد میں آکر نماز پڑھائی ہے اور ہمیشہ مسجد میں نماز پڑھی ہے، خود مولائے کائنات نے ۱۹ ویں ماہِ رمضان کی صبح سب کچھ جانتے ہوئے مسجد میں آکر واضح کر دیا کہ علیؑ جان دے سکتا ہے مسجد کو ترک نہیں کر سکتا، ورنہ گھر ہی میں نماز ادا کر لیتا اور بظاہر خطرہ سے محفوظ رہتا۔

اس کے بعد شہزادے باپ کو لے کر چلے، بیت الشرف کے قریب پہنچے امیرالمومنینؑ نے آواز دی۔ بیٹا حسن! چاہنے والوں کو واپس کر دو، اب گھر قریب آگیا ہے، میں نہیں چاہتا کہ نامحرموں کے کانوں میں میری بیٹیوں کی آواز جائے۔

میں کہوں گا، مولاؑ یہ شیعوں کا کوفہ ہے جو چاہئے وصیت کر لیجئے، ابھی عمل کرنے والے فرزند موجود ہیں، لیکن مولاؑ کل اشقیا کا کوفہ ہوگا، جب سجے ہوئے بازار ہوں گے تماشائیوں کا مجمع ہوگا، طمانچوں کا ہجوم ہوگا، ہر طرف آئینہ بندی ہوگی، جشن کا سامان ہوگا، اور اسی عالم میں آپ کی بیٹیاں رسن بستہ لائی جائیں گی، آپ کے فرزند عابد بیمار کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں، پیروں میں بیڑیاں، گلے میں طوقِ خاردار، آپ کی زینبؑ زبانِ حال سے فریاد کر رہی ہوں گی، بابا! کچھ دور نہیں ہے، آپ کی بیٹی آپ کے دارالحکومت میں آ رہی ہے، بابا! آپ کو گوارا نہیں تھا کہ آپ کی بیٹی کی آواز نامحرموں کے کانوں میں جائے، اب تو

زینبؑ آپکو پکار بھی نہیں سکتی، ہرطرف نامحرموں کا ہجوم عام ہے، کس کس سے منھ چھپاؤں، کیسے پردہ کروں، بابا! زینبؑ کے سرپہ چادر نہیں ہے، بیٹی کے سر کے بال کھلے ہوئے ہیں۔ بابا شرم و حیا سے یوں ہی نظر نہیں اٹھتی اور جب کبھی نظر اٹھ جاتی ہے تو سامنے نوک نیزہ پر آپ کے حسینؑ کا سر نظر آتا ہے، بابا! آپ کو اپنے حسینؑ سے بڑی محبت تھی اور آج آپ کا حسینؑ آپ کے شہر میں آرہا ہے اور آپ لینے نہیں آتے۔

۱۹ ر رمضان کو آپ بہن ام کلثوم کے گھر مہمان تھے اور آج ام کلثوم آپ کے گھر مہمان بن کے آئی ہے۔ بابا ذرا اٹھ کے دیکھئے آپ کی سکینہ کا کیا عالم ہے۔ یہ کمسن بچی، یہ یتیمی، یہ قید کی محنت، یہ بے کسی، یہ اسیری اور یہ عالم غربت۔

یہ اپنی لال کی غربت تو دیکھئے بابا — نہیں ہے باپ تو گودی میں لیجئے بابا
عجیب آپکے عابد کا حال زار بھی ہے — کمال ضعف بھی ہے طوق خار دار بھی ہے
سلام مملکت غم کے تاجدار سلام — سلام بیکسہ بھرے گھر کے سوگوار سلام
جو ہوسکے تو کبھی کربلا بھی جائیے گا — گلے سے تربت بے شیر بھی لگائیے گا
مدد کرو مرے بابا کہ شام جاتی ہوں — برہنہ سر سوئے طراے عام جاتی ہوں

وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنقَلَبٍ يَنقَلِبُونَ

انا للّٰہ و انا الیہ راجعون

مولائے کائنات حضرت علی ابن ابیطالب علیہ السلام

اسم مبارک	:	علیؑ، حیدرؑ، ایلیاؑ،
لقب	:	مرتضیٰ، امیرالمومنین وغیرہ
کنیت	:	ابوالحسن، ابوالائمہ،
والد ماجد	:	عمران (کنیت ابوطالب)
والدہ ماجدہ	:	فاطمہؑ بنت اسد،
ولادت	:	۱۳ ر رجب ۳۰ عام الفیل، خانہ کعبہ، بروز جمعہ،
ازواج	:	جناب سیدہؑ، ام البنین وغیرہ
اولاد	:	امام حسنؑ، امام حسینؑ، جناب زینبؑ، جناب ام کلثومؑ، جناب عباسؑ، جناب محمد حنفیہؑ وغیرہ
شہادت	:	۲۱ ر رمضان المبارک یکشنبہ
عمر مبارک	:	۶۳ سال،
قبر مطہر	:	نجف اشرف

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید الانبیاء والمرسلین وخاتم النبیین سیدنا ومولانا ابی القاسم محمد وآلہ الطیبین الطاہرین ولعنۃ اللہ علیٰ اعدائہم اجمعین اما بعد فقد قال اللہ الحکیم فی کتابہ الکریم ۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِنَّ عَلَیۡنَا لَلۡھُدٰی وَاِنَّ لَنَا لَلۡاٰخِرَۃَ وَالۡاُوۡلٰی

مالک کائنات کا ارشاد ہے کہ " بیشک ہدایت کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے اور دنیا و آخرت کا اختیار ہمارے ہاتھوں میں ہے ۔

اس ارشاد گرامی نے یہ واضح کر دیا کہ مسئلہ ہدایت میں انسان کو دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے ۔ اس کا کام صرف اطاعت کرنا ہے اور انسان کا فرض ہے کہ جس کو پروردگار عالم ہادی و راہنما بنا دے اس کے سامنے سر تسلیم خم کرے اور اس کی اطاعت سے انکار نہ کرے ۔ اس سے زیادہ اختیار اسے نہیں دیا گیا ہے اور جس نے اس سے زیادہ اختیار کا مظاہرہ کرنا چاہا اس کا حشر بھی معلوم ہو گیا ۔ پروردگار عالم نے روز اول ہی واضح کر دیا تھا کہ آسمان والو تمہارا فرض ہے کہ میرے راہنما اور جانشین کے سامنے سر جھکا دو ۔ سر جھکا دو گے تو ملک معصوم بن جاؤ گے . سرکشی کرو گے تو شیطان رجیم ہو جاؤ گے

قدرت کا یہ قانون آج تک زندہ ہے اور انسانوں کو آواز دے رہا ہے کہ آدم کے فرزندو ہوشیار ہو جاؤ ۔ تمہارے سامنے تمہارے مورث اعلیٰ کی تاریخ موجود ہے ۔ تم نے دیکھا ہے کہ جس نے ہمارے نمائندہ کے سامنے سر نہیں جھکایا اس کا کیا حشر ہوا ۔ اب تمہیں اختیار ہے چاہو سر جھکا کے آدمی بن جاؤ یا سرکشی کر کے ابلیس بن جاؤ ۔

کیا کہنا ان خاصان خدا کا جن کی اطاعت معیار انسانیت ہے اور جن کی فرمانبرداری بنیاد شرافت ۔ ان کی بارگاہ میں سر نیاز خم کر دے تو انسان انسان بن جائے اور ان کے سامنے اکڑ جائے تو شیطان بن جائے ۔ اور میں تو سمجھتا ہوں کہ انسان کا کیا ذکر ہے ۔ انسان بھی ان کی بارگاہ میں سر جھکائے تو مسلمان بن جائے ۔ اور مسلمان سر جھکائے تو صاحب ایمان بن جائے ۔ صاحب ایمان سر جھکائے تو ابوذر و سلمان بن جائے ۔ صلوات

اس بارگاہ کی جلالت کا کون اندازہ کر سکتا ہے جس پر سر تسلیم خم کرنے والے صرف انسان ہی نہیں ہیں بلکہ جنت کا رضوان بھی ہے ۔ ملائکہ کا سردار بھی ہے آسمان کے بسنے والے بھی ہیں ، عرش کا تارہ بھی ہے ۔ کلام اللہ کا پارہ بھی ہے ۔

یہاں اگر رضوان درزی نہ بنے تو رضوان نہ رہ جائے ۔ جبریل خدمت نہ کرے تو سید الملائکہ نہ بن پائے ۔ آسمان والے حاضری نہ دیں تو قابل فلک نہ رہ جائیں ۔ نجم فلک سجدہ نہ کرے تو مقدر روشن نہ ہو ۔ اور قرآن مدح نہ کرے تو صامت رہ جائے ۔ صلوات ۔

انسان کی زندگی اور اس کا وجود دو چیزوں سے قائم ہے ایک اس کا دل اور ایک اس کی زبان ۔ جتنا دل پاکیزہ ہوگا اتنی ہی انسانیت روشن تر ہوگی اور جتنی زبان فصیح و بلیغ ہوگی اتنی ہی شرافت واضح تر ہوگی ۔

انسانیت کا مکمل کمال یہی ہے کہ دل کو مرکز علوم و کمالات بنائے اور زبان کو مرکز حق و صداقت بنائے اور جب انسانیت کے لئے علم و صداقت کا ہونا لازم ہے تو جسے انسانیت کا راہبر بنایا جائے گا اس کے کردار کا کیا عالم ہوگا اور یہی وجہ ہے کہ پروردگار نے جسے بھی دنیائے انسانیت کا راہنما بنایا اسے ان دونوں جوہروں سے ضرور نوازا ۔ دل کو علوم و فنون کا مرکز بنایا اور زبان

کو حق و صداقت کا ترجمان بنا دیا۔ اور کبھی کبھی یہ جوہر اس قدر نمایاں ہوا کہ دل کے علوم پر نگاہ گئی تو باقر العلوم کا لقب ملا اور زبان کی صداقت پر نظر گئی تو "صادق آل محمدؑ" کا خطاب مل گیا۔ اور کیا کہنا اس امام برحق کا جو خود صادق آل محمدؑ ہو اور اس کا باپ باقر علوم اولین و آخرین ہو ۔۔۔ اور باپ اور بیٹے ہی پر کیا منحصر ہے۔ پورے خاندان میں جس طرف دیکھو کمالات ہی کمالات نظر آئیں۔ سب علم کے مرکز۔ سب صداقت کے پیکر۔ علم ایسا کہ دشمن بھی مسائل دریافت کرنے آئیں اور صداقت ایسی کہ نصاریٰ بھی مباہلہ کی ہمت نہ کریں۔ صلوات

صادق آل محمدؑ کا تذکرہ آ گیا ہے تو ایک فقرہ عرض کر دوں کہ اہلبیتؑ اطہار کے کردار کی یکسانیت اور اس کے اتحاد ہی کا نتیجہ ہے کہ معصومینؑ نے یہ اختیار دیدیا ہے کہ ہماری روایت کو ہم میں سے کسی کی طرف بھی منسوب کر دیا جائے کوئی حرج نہیں ہے۔ ہمارے اول کی بات آخر کی طرف منسوب کر دی جائے۔ اور آخر کی بات اول کی طرف منسوب کر دی جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ اس لئے کہ حرج وہاں ہوتا ہے جہاں اول کچھ کہتا ہے اور آخر کچھ اور۔ یہاں عالم یہ ہے کہ جو اول نے کہا ہے وہی آخر نے کہا ہے اور جو آخر نے کہا ہے وہی اول نے کہا ہے۔ سب کا کلام ایک۔ سب کا بیان ایک۔ سب کا مدعا ایک۔ سب کا مقصد ایک۔ سب کا مفہوم ایک۔ سب کی مراد ایک۔ کوئی تفرقہ نہیں۔ کوئی امتیاز نہیں۔ کوئی جدائی نہیں۔ کوئی علیحدگی نہیں اور جدائی ہو بھی تو کیسے ہو۔ بیان میں جدائی ہوتی اگر ذات میں جدائی ہوتی اور یہاں تو ذات کا یہ عالم ہے کہ اول بھی محمدؐ اوسط بھی محمدؐ آخر بھی محمدؐ اور کل کے کل محمدؐ۔ صلوات

ایسا اتحادِ عمل۔ ایسا اتحادِ فکر و نظر۔ ایسی یگانگت۔ ایسی یکسانیت کہ سب کا قول ایک۔ سب کا عمل ایک۔ جو اول نے کہا اس کا آخر ذمہ دار اور جو آخر نے کہا اس کا اول ذمہ دار۔ سب صادق آل محمدؐ ہیں۔ جسے چاہو صادق کہہ کے روایت بیان کر دو کوئی غلط بیانی نہ ہوگی۔ اور بات صداقت کے سانچے میں ڈھلی ہی نظر آئے گی۔ یہ وہ دنیا نہیں ہے جہاں چار ہیں تو چاروں کی بات الگ، فتویٰ الگ۔ قانون الگ۔ نظام الگ۔ یہ وہ دنیا ہے جہاں چودہ ہیں لیکن سب کی بات ایک۔ سب کا کلام ایک۔ سب کا بیان ایک۔ کیوں نہ ہوتا۔ بات کلام اللہ سے الگ ہو جاتی ہے تو فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ اور جب سب خدا ہی کے ترجمان ہیں تو نہ اس کے یہاں کوئی فرق ہے نہ ان کے یہاں فرق ہوگا۔ صلوات

علم ایسا کہ کل کائنات نگاہوں کے سامنے آئینہ اور بیان ایسا کہ کلام اللہ کی ترجمانی شعار۔ دنیا نے ہر منزل پر آزمایا۔ کبھی علوم و کمالات کا امتحان لیا اور کبھی صداقت لہجہ کی آزمائش کی لیکن نہ کبھی علم میں جہالت کا اعتراف دیکھا نہ کبھی بیان میں غلطی کا شائبہ نظر آیا۔

بیشمار واقعات ہیں جہاں اہل دنیا نے امتحان لیا ہے اور لاتعداد مواقع آئے ہیں جہاں اپنوں اور غیروں نے آزمایا ہے لیکن یہ کمال کا اثر تھا کہ کوئی فضیلت کا اقرار کئے بغیر نہ رہ جا سکا۔ وہ دنیا کے نمائندے ہوتے ہیں جو ہر بات پر جہالت کا اقرار کرتے ہیں۔ اور یہ خدا کا نمائندہ ہے جو ہر مجمع میں سلونی کا نعرہ بلند کرتا ہے۔ صلوات

آئیے صادق آل محمدؐ کی زندگی کے چند واقعات پر نظر کریں اور یہ دیکھیں کہ آپ نے اشاروں اشاروں میں کیسے کیسے اہم مسائل حل کر دیئے ہیں۔

ایک دشمن دین دہریہ جس کا نام عبداللہ دیصانی تھا۔ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ میں آپ سے وجود خدا پر بحث کرنا چاہتا ہوں میں خدا کا قائل نہیں ہوں۔

آپ نے فرمایا تو کیا پریشانی ہے بحث ہو جائے گی۔ پہلے یہ تو بتا کہ تیرا نام کیا ہے۔ یہ کون سا طریقہ ہے کہ سلام نہ کلام جھگڑا شروع کر دیا۔ کچھ اخلاقیات تو ہونے چاہئیں۔ دہریہ ہونے کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ انسان انسانیت سے خارج ہو جائے۔

اس نے یہ سوال سُنا اور رخصت ہو گیا۔ لوگ حیرت زدہ رہ گئے کہ اس قدر زور و شور سے آیا اور اتنی جلدی چلا گیا۔ نہ کوئی بحث نہ مباحثہ نہ دلیل نہ جواب۔

کسی نے عرض کی فرزند رسولؐ! یہ کیا ہو گیا کہ یہ تو بڑی شان سے بحث کرنے آیا تھا یہ یکبارگی چلا کیسے گیا۔

آپ نے فرمایا تمہیں نہیں معلوم۔ بحث ہو گئی اور وہ ہار بھی گیا۔ لوگوں نے عرض کی کہ ہم نے تو کوئی بحث نہیں دیکھی۔ آپ نے فرمایا تم نے غور نہیں کیا۔ میں نے اس سے نام پوچھ لیا۔ اب وہ اس کشمکش میں پڑ گیا کہ نہ بتائے تو جہالت ثابت ہوتی ہے اور بتا دے تو فوراً سوال ہو گا کہ جب کوئی اللہ نہیں ہے تو تو عبداللہ کیسے ہو گیا۔ عبداللہ ہونا خود اس بات کی دلیل ہے کہ کوئی اللہ ہے۔ صلوات

معصومؑ نے کس خوبصورتی کے ساتھ لفظوں ہی لفظوں میں استدلال کر دیا اور دہریہ کا سارا زور گھٹ گیا۔ یہیں سے یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ لفظ عبداللہ خود بھی وجود خدا کی ایک دلیل ہے۔ اور شاید یہی راز تھا کہ جس کے وجود کو وجود خدا کی مجسم دلیل بنا کر دنیا میں بھیجنا تھا۔ اس کے نور کو آخری منزل میں صلب عبداللہ ہی میں رکھا تاکہ آغاز حیات ہی بتا دے کہ یہ بندگی پروردگار کا سبق دینے آیا ہے۔ عیسیٰؑ میں اور مرسل اعظمؐ میں یہی فرق ہے کہ

عیسیٰؑ بقول خود عبداللہ تھے۔ لیکن ابن عبداللہ نہ تھے۔ اسی لئے عیسائیوں نے گھبرا کر "ابن اللہ" کہہ دیا اور حضور سرور کائنات عبداللہ بھی تھے اور ابن عبداللہ بھی تھے۔ عیسیٰؑ کی عبدیت کا اعلان خود جناب عیسیٰؑ نے کیا تھا۔ اور حضور سرور کائنات کی عبدیت کا اعلان معراج کی منزل میں پروردگار نے کیا ہے۔
صلوات

ایک دہریہ اور حضرتؑ کی خدمت میں آیا۔ اور دین اسلام پر مختلف اعتراضات لے کر آیا۔

پہلی بات تو یہ کہ خدا نے شیطان کو اپنے بندوں پر کیوں قابو دیدیا کہ وہ اکیلا ساری خلقت کو گمراہ کر رہا ہے اور اسے کوئی روک نہیں پاتا۔

آپ نے فرمایا کہ شیطان کے اختیار کی دو صورتیں ہیں۔ خدا کے مقابلہ میں یا بندوں کے مقابلہ میں۔ اگر اس کا اختیار خدا کے مقابلہ میں ہوتا تو خدا کو خطرہ ہوتا اور خدا یہ اختیار نہ دیتا۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس کے اختیار سے خدا پر کیا اثر پڑتا ہے۔ وہ خدا کو کوئی فائدہ پہنچا سکتا ہے نہ نقصان۔ رہ گیا بندوں کے مقابلہ میں اختیار تو یہاں بھی اتنا ہی اختیار ہے کہ دلوں میں وسوسہ پیدا کر سکتا ہے۔ جبر نہیں کر سکتا اور وسوسہ کا مقابلہ کرنے کے لئے اللہ نے عقل دیدی ہے۔ اب اگر کوئی عقل سے کام نہ لے اور شیطان کے وسوسہ میں آجائے تو وہ خود بھی ایک شیطان ہے۔ اس میں خدا کا کیا قصور ہے۔ شیطان بھی روز اول سے شیطان نہیں تھا۔ ایک بہترین عبادت گذار بندہ تھا۔ ملائکہ کے ساتھ سجدے کیا کرتا تھا۔ اب ایک آدم کو سجدہ نہیں کیا اور ایسا بن گیا تو اس میں تخلیق کا کیا قصور ہے؟

اس نے کہا کہ جب غیر خدا کو سجدہ نہیں ہو سکتا تو آدم کے سجدہ کا حکم کیوں

کیوں دیا گیا۔

آپ نے فرمایا کہ جو سجدہ خدا کے حکم سے ہوتا ہے وہ خدا ہی کا ہوتا ہے بندہ کا نہیں ہوتا۔ ابلیس کا یہی تو قصور تھا کہ خدا کا قائل تھا۔ حکم خدا کا قائل نہیں تھا۔ اور بندہ وہی ہوتا جو حکم کے سامنے سر جھکا دے۔

یہیں سے دور حاضر کی توحید خالص کا حال بھی معلوم ہو گیا کہ جو لوگ خدا کے نام پر رسولؐ کا بھی احترام چھوڑ دیتے ہیں اور سلام و قیام کو حرام و بدعت سمجھتے ہیں ان کی یہ توحید بھی کچھ ابلیس ہی کی توحید سے ملتی جلتی ہے کہ غیر خدا کے آگے نہ جھکیں گے چاہے خدا ہی کیوں نہ حکم دے۔ یہی تو ابلیس بھی کہتا تھا کہ غیر خدا کو سجدہ نہ کروں گا چاہے خدا ہی کیوں نہ کہے۔ ان انسانوں میں اور ابلیس میں کیا فرق رہ گیا۔ معصوم کردار اختیار کرنا ہے تو حکم خدا کے آگے جھکنا پڑے گا۔ وہ آدمؑ کی تعظیم کے لئے سر جھکا دے تو جھکنا پڑے گا۔ اور نبیؐ کی تعظیم کو اٹھا دے تو اٹھنا پڑے گا۔ ورنہ نبی خود ہی محفل سے اٹھا دے گا۔ صلوات

دہریہ نے کہا کہ جب آپ کے خیال میں خدا کی صنعت میں عیب نہیں ہے تو یہ ختنہ کیا چیز ہے۔ خدا نے جس چیز کو جیسے پیدا کیا ویسے ہی رہنے دیجئے اس تغیر کی کیا ضرورت ہے۔

آپ نے فرمایا کہ ختنہ نہ صنعت خدا میں عیب ہے نہ عیب کی اصلاح۔ یہ ایک ضرورت ہے جس سے بہت سے فسادات کو روکا جاتا ہے۔ اور یہ بھی مصلحت پروردگار ہے کہ بچہ اس جز کو لے کر آئے اور دنیا میں اسے جدا کیا جائے۔ جیسے بال، ناخن، ناف وغیرہ کہ ان سب کی اصلاح دنیا میں ہوتی ہے۔ حالانکہ خدا کے امکان میں یہ بھی تھا کہ وہیں سے اصلاح کر کے بھیجتا۔ یہ مصلحت الٰہی ہے کہ اتنی کثافت لے کر آئے اور اسے دنیا میں جدا کیا جائے۔ اب اگر کوئی صاحب تطہیر ہے تو وہ وہیں سے کثافت سے طیب و طاہر بن کر آئے گا۔ اور اسے ختنہ کی بھی ضرورت نہیں ہو گی۔ صلوات

اس مقام پر ایک لفظ اور بھی ہے جو خطابت ہے استدلال نہیں ہے۔ لیکن لطف سے خالی بھی نہیں ہے۔ ہمارے ملک میں ختنہ کو اسلام کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ اور بچہ کو اس دن صحیح طور سے مسلمان تصور کیا جاتا ہے۔ جس دن اس کا ختنہ ہو جاتا ہے اور شاید یہ بھی ایک مصلحت الٰہی ہو کہ سب کو ختنہ کا محتاج پیدا کیا ہے۔ اور اپنے نمائندوں کو ختنہ سے مستثنیٰ کر کے پیدا کیا ہے کہ دنیا دیکھ لے کہ مسلمان بنانے کے محتاج اور ہوتے ہیں اور مسلمان بن کر آنے والے اور ہوتے ہیں۔ صلوات

اس نے کہا اچھا یہ تو بتائیے کہ اسلام میں غسل جنابت کیوں رکھا گیا ہے۔ کیا فعل حلال بھی اتنا برا ہوتا ہے کہ سارے بدن کو دھونے کی ضرورت پڑے؟

آپ نے فرمایا کہ مسئلہ یہ نہیں ہے بلکہ جنابت کے مادہ کا تعلق سارے بدن سے ہوتا ہے۔ اور وہ مادہ سارے بدن سے کھینچ کر نکلتا ہے۔ اور بدن کو ایک قسم کی بدبو دے دیتا ہے۔ اسلام نے چاہا کہ جب بھی کوئی ایسا مادہ خارج ہو تو غسل کرا دیا جائے تاکہ بدن کی طہارت و پاکیزگی پر کوئی اثر نہ پڑے۔

یہیں سے ایک نکتہ کی طرف اور اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ جنابت کے مادہ کا تعلق سارے جسم سے ہے اور یہ مادہ پورے جسم سے کھینچ کر نکلتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جنسی عمل کے انجام دیتے وقت اگر کوئی بھی جزو بدن دوسرے کام میں مصروف ہو جاتا ہے تو آنے والے بچہ میں وہ عضو ناقص ہو جاتا ہے۔ شریعت نے اسی نکتہ کی طرف متوجہ کرنے کے لئے کہا تھا کہ خبردار ایسے وقت میں کسی عضو بدن کو دوسری طرف متوجہ نہ کرنا ورنہ آنے والی نسل میں قصور پیدا ہو جائے گا۔ نظر مصروف ہو جائے گی تو آنے والے کی نگاہ کمزور ہو گی۔ زبان مصروف ہو گی تو آنے والے کی گویائی کم ہو گی۔ تصورات دوسری طرف ہوں گے تو آنے والے کا ذہن پراگندہ ہو گا۔ غرض کہ جیسا عمل ہو گا ویسا ہی نتیجہ ہو گا۔ اب یہ انسان کی ذمہ داری ہے کہ رشتہ زوجیت کو صرف اپنی راحت

کا ذریعہ نہ سمجھے بلکہ ایک پوری نسل کی ذمہ داری تصور کرے اور سوچے کہ روز قیامت اس نسل کے سامنے جوابدہ ہونا ہے۔

اس نے کہا کہ آپ کے نزدیک مجوسیت اسلام سے زیادہ قریب ہے یا عرب کا قدیم مذہب؟ آپ نے فرمایا کہ عرب کا قدیم مذہب اسلام سے زیادہ قریب ہے۔ عرب میں غسل جنابت تھا۔ ختنہ تھا۔ غسل و کفن تھا۔ مردوں کو دفن کرنے کا رواج تھا۔ خانہ کعبہ کا احترام تھا۔ ماں بہن بیٹی اور بیوی میں امتیاز تھا توریت و انجیل کے آسمانی کتاب ہونے کا اقرار تھا۔ اور مجوسیوں میں یہ کچھ نہیں تھا۔ وہ نہایت ہی ناہنجار لوگ تھے۔ ان سے اسلام کی کوئی قربت نہیں ہے۔

دہریہ نے کہا کہ مجوسیوں کے پاس بہن سے عقد کرنے کا جواز ہے کہ حضرت آدمؑ نے بھائی بہن کا عقد کیا ہے۔ آپ نے فرمایا اگر یہ مان لیا جائے تو ماں بیٹی کے جواز کی کیا دلیل ہے۔

اس نے کہا یہ اسلام نے شراب جیسی لذیذ چیز کو کیوں حرام کر دیا ہے آخر شراب نے مسلمانوں کا کیا بگاڑا ہے۔

آپ نے فرمایا کہ شراب ساری برائیوں کی جڑ ہے۔ شراب کا حملہ عقل پر ہوتا ہے۔ اور جس کی عقل قابو میں نہ رہے وہ ہر حرام کر سکتا ہے۔ ماں بہن سے زنا بھی کر سکتا ہے۔ اور بتوں کو سجدہ بھی کر سکتا ہے۔

خدا جانتا ہے کہ امامؑ نے ایک ایسے عظیم نکتہ کی طرف اشارہ کر دیا ہے جس کا تجربہ آج بھی ہو رہا ہے اور صدر اسلام میں بھی ہو چکا ہے کہ جس نے شراب کو اپنا لیا اس نے حلال و حرام کا امتیاز کھو دیا۔ یزید نے سوتیلی ماؤں کو حلال کر لیا۔ عبدالملک نے نشہ کی حالت میں کنیز سے نماز جماعت پڑھوا دی

کسی اور بادشاہ نے مردہ کنیز سے زنا کر لی۔ کسی نے کسی اور حرام پر ہاتھ صاف کر لیا غرض کہ شراب آئی اور اسلام گیا۔ قرآن حکیم نے اسی دن کے لئے شراب کو رجس سے تعبیر کیا تھا۔ اور اسلام کے سچے رہنماؤں کی تعریف میں "لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ" کہہ دیا تھا کہ یہاں زندگی میں رجس کا گذر ہی نہیں ہے۔ اور یہی زندگی خالص اسلامی زندگی ہے۔ صلوات

اس نے کہا کہ ذبیحہ اور مردار میں کیا فرق ہے کہ ذبیحہ کو حلال کیا گیا ہے اور مردار کو حرام کر دیا گیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ایک طبی فرق ہے اور ایک اخلاقی فرق ہے۔

طبی فرق یہ ہے کہ ذبیحہ کا خون نکل جاتا ہے اور گوشت کا نقصان ختم ہو جاتا ہے۔ اور مردار میں خون باقی رہ جاتا ہے۔ جو نقصان دہ ہوتا ہے اور اخلاقی فرق یہ ہے کہ ذبیحہ میں نام خدا لیا جاتا ہے اور مردار میں نام خدا نہیں ہوتا۔ اور حلال و حرام کا اختیار خدا ہی کو ہے۔ اب اس کی مرضی یہی ہے کہ جس پر اس کا نام لے لیا جائے اسے اپنے نام کے صدقہ میں حلال کر دے۔ اور جس پر اس کا نام نہ لیا جائے اسے اس بغاوت و سرکشی کے طفیل میں حرام کر دے۔ صلوات

یہ مردار کا خون بھی کیوں حرام ہے؟ اسی کو حلال کر دیا گیا ہوتا۔ آپ نے فرمایا کہ خون کا استعمال سنگدلی کا باعث ہوتا ہے اور خون انسان کے جسم کو بدبودار بنا کر اس میں جرام کے جراثیم پیدا کرتا ہے اور اسلام کسی ایسی چیز کو حلال نہیں کر سکتا۔ جس سے ایسی بیماریوں کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہو ۔۔۔۔ صلوات

اس نے کہا کہ اچھا ذبیحہ اور مردار کا یہ فرق ہے تو مچھلی کا ذبیحہ کیوں

نہیں ہوتا اور وہ پانی کے باہر آکر مرجائے تو حلال ہوجاتی ہے۔

آپ نے فرمایا کہ اول تو یہ باہر آنا ہی اس کا ذبیحہ ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ اس کے جسم میں اتنا خون نہیں ہوتا کہ گوشت کو فاسد کرسکے اس لئے اس کا مردہ جائز ہے۔ اور دوسرے حیوانات کا مردار جائز نہیں ہے۔ مچھلی کا قیاس ٹڈی پر ہوسکتا ہے۔ اور دوسرے جانوروں پر نہیں ــــ صلوات

کہنے لگا یہ قیامت میں میزان کیا ہے جس پر اعمال تولے جائیں گے۔

آپ نے فرمایا کہ عمل کوئی مجسم چیز نہیں ہے کہ اسے ترازو میں تولا جائے۔ یہ ایک تعبیر ہے۔ اعمال کے حساب وکتاب کی کہ جس کا پلہ بھاری ہوگا یعنی نیکیاں زیادہ ہوں گی اسے بہترین اجر دیا جائے گا۔

کہنے لگا اچھا یہ تو بتایئے کہ جب اہل بہشت میوہ استعمال کریں گے تو فضلہ کا کیا ہوگا؟

آپ نے فرمایا کہ وہ بہشت ہے اور بہشت کوئی دنیا نہیں ہے جہاں فضلہ وغیرہ کا سوال پیدا ہو۔ وہاں کی غذائیں اتنی لطیف ہوں گی کہ فاضل اجزا پسینہ بن کر نکل جائیں گے اور احساس بھی نہ ہوگا۔

کہنے لگا۔ اچھا یہ حوریں کیا ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ستر ستر کپڑے پہنے ہوں گی اور پھر بھی بدن نظر آئے گا۔ یہ کیسے کپڑے ہوں گے اور کیسا بدن ہوگا؟

آپ نے فرمایا یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے دنیا میں بھی پانی صاف ہوتا ہے تو تہ کی چیز نظر آجاتی ہے۔ یہ تو لطافت کی بات ہے کہ ان کے جسم اور لباس اتنے لطیف اور شفاف ہوں گے کہ ستر کپڑوں کے باوجود نظر آئیں گے۔

کہنے لگا یہ سب صحیح ہے لیکن ایسی جنت سے کیا فائدہ جس میں آدمی تنہا جائے اور اس کے سارے اعزا و اقربا و احباب جہنم میں رہیں وہاں تو عیشِ جنت بھی

خاک میں مل جائے گا؟

آپ نے فرمایا سچ ہے۔ اگر ایسے لوگ جائیں گے جنھیں جہنمیوں کی یاد ستائے گی تو ان کا عیش یقیناً غارت ہوجائے گا لیکن سوال یہ ہے کہ ایسے لوگ جائیں گے ہی کیوں جنھیں جہنمیوں کی یاد ستائے۔ ان کے لئے تو مناسب یہی ہے کہ جہنم ہی میں چلے جائیں تاکہ پوری پارٹی ایک جگہ پر رہے اور جدائی کا سوال ہی پیدا نہ ہو ــــ صلوات

اس قسم کے بے شمار سوالات ہیں جو استفادہ یا امتحان کی غرض سے کئے گئے ہیں اور امامؑ نے ان کی روشنی میں مذہب کے اہم مسائل سے نقاب کشائی کی ہے موقع نہیں ہے کہ تمام سوالات کی طرف اشارہ کیا جائے۔ لیکن چند سوالات کا ذکر کرنا ضروری ہے تاکہ ان کی روشنی میں آج کے تازہ ترین مسائل بھی حل ہوجائیں۔ اور امامت کی شان بھی نمایاں ہوجائے۔

ایک شخص نے آکر پوچھا کہ اولاد علیؑ و فاطمہؑ کو کون سا امتیاز حاصل ہے جو دوسرے مسلمانوں کو نہیں ہے۔ جو آپ اس پر فخر کرتے ہیں؟

آپ نے فرمایا کہ یہی فخر کیا کم ہے کہ سب ہمارے نسب میں داخل ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور ہم کسی کے نسب میں داخل ہونے کی کوشش نہیں کرتے۔ صلوات

ارباب کرم! امامؑ نے اس ایک فقرہ سے اسلام کے بہت سے واقعات کی نقاب کشائی کردی ہے۔ جہاں اہل حکومت واقتدار خاندان نبوت میں رشتہ کے طلبگار بن کر آئے ہیں۔ کبھی بیٹیاں دے کر آئے کبھی بیٹیاں لینے کے لئے آئے۔ اور دونوں مواقع پر در پردہ اقرار کر گئے کہ ان کو جو شرافت وجلالت حاصل ہے وہ کسی کو حاصل نہیں ہے۔ یہ بیٹی لے بھی لیں تو شرف ہے دینا تو بڑی بات ہے۔

ــــ صلوات

ایک چاہنے والا عرض کرتا ہے۔ فرزند رسولؐ بہت غریب ہوں۔ فاقوں میں بسر ہو رہی ہے۔ فرمایا کیوں غلط بیانی سے کام لیتا ہے۔ خزانہ چھپا کر رکھا ہے اور غربت کی شکایت کرتا ہے۔

اس نے عرض کی سرکار خدا گواہ ہے میرے پاس کوئی خزانہ نہیں ہے اور حد درجہ نادار ہوں۔

آپ نے فرمایا غلط بیانی سے کام نہ لے۔ اس نے عرض کی حضور میں بالکل صحیح کہتا ہوں۔ فرمایا اچھا اپنا خزانہ مجھے دے دے اور جو اجرت چاہے میں تجھے دے دوں۔ اس نے عرض کی سرکار میرے پاس کون سا خزانہ ہے جو میں آپ کو دیدوں۔ فرمایا تیرے سینے میں جو ہم اہلبیتؑ کی محبت ہے اسے دیدے پھر جو چاہے لے لے۔ اس نے عرض کی سرکار یہ تو نہیں ہو سکتا۔ فرمایا جب اتنی قیمتی شے رکھے ہوئے ہے تو غربت کی شکایت کیوں کرتا ہے۔ گویا امامؑ نے واضح کر دیا کہ محب اہلبیتؑ کی نگاہ مال دنیا پر نہیں ہونی چاہیئے۔ اور جس کے پاس محبت کا خزانہ ہوتا ہے اسے دنیا کے سرمایہ دار خرید بھی نہیں سکتے۔ بھلا یہ سرمایہ دار اس محبت کی قیمت کیا لگا سکیں گے جس کی قیمت خدا نے بھی لگائی ہے تو مقابلہ میں رسالت ہی کو رکھا ہے۔ کسی اور شے کو نہیں رکھا۔ صلوات

ایک شخص آکر مسئلہ دریافت کرتا ہے کہ مولا میری ماں بے حد ضعیف ہو گئی ہے اور میں اس کی اسی طرح خدمت کرتا ہوں جس طرح بچپنے میں اس نے مجھ کو پالا تھا کیا ماں کا حق ادا ہو گیا؟ آپ نے فرمایا نہ ادا ہوا ہے نہ ہو سکتا ہے۔ اس نے عرض کی فرزند رسولؐ میں نے بے حد خدمت کی ہے۔ آپ نے فرمایا بیشک لیکن حق ادا نہیں ہو سکتا۔ اس نے عرض کی کیوں؟ میری خدمت میں کیا کسر ہے؟ آپ نے فرمایا کہ تیری ماں جب تیری پرورش کر رہی تھی تو دعا کرتی تھی پروردگار میرا لال سلامت رہے تاکہ میں اور بھی خدمت کروں اور تو جب خدمت کرتا ہے تو تمنا کرتا ہے کہ پروردگار اسے اٹھا لے تاکہ اس کی مشکل آسان ہو جائے۔ اب تو ہی فیصلہ کر کہ کیا تمنائے موت بھی دعائے حیات کے برابر ہو سکتی ہے۔ صلوات

امامؑ نے یہ بھی واضح کر دیا کہ عمل کی قدر و قیمت زحمت و مشقت سے طے نہیں نہیں ہوتی۔ عمل کی قدر و قیمت نیت و خلوص سے طے ہوتی ہے۔ خلوص نہیں ہے تو زندگی بھر کے سجدے بھی بے کار ہو جاتے ہیں۔ اور خلوص ہے تو ایک ضربت بھی ثقلین کی عبادت پر بھاری ہو جاتی ہے۔ صلوات

اپنوں ہی کا ذکر نہیں۔ غیروں نے بھی بے شمار مسائل دریافت کئے ہیں۔ اور اپنی جانب میں امامؑ کو عاجز کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن قادر مطلق کا نمائندہ کہیں عاجز ہو سکتا ہے۔ جاہل عوام کا نمائندہ ہوتا تو چپ ہو جاتا یہ علام الغیوب کا نمائندہ ہے جو سوال کیا جائے گا فوراً جواب دیگا۔ چنانچہ چند سوالات کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ جن سے امامؑ کے علم کا بھی اندازہ ہو جائے گا اور امامؑ کا فلسفہ حیات بھی سامنے آجائے گا کہ حکومتوں کی مخالفت کے باوجود کس طرح زندگی گذاری ہے۔

دنیا جانتی ہے کہ امام صادقؑ کا دور سیاسی اعتبار سے بڑی کشمکش کا دور تھا۔ آپ کی زندگی میں متعدد بادشاہ گذرے ہیں۔ اور آپ نے بنی امیہ کا بھی اقتدار دیکھا ہے۔ اور بنی عباس کا بھی اور کمال یہ ہے کہ دونوں کے درمیان ایسی حسین اور پاکیزہ زندگی گذاری ہے کہ نہ انھیں گرفت کرنے کا موقع ملا نہ انھیں۔ آپ کی زندگی کا مختصر خاکہ یہ ہے کہ ۸۳ھ میں عبدالملک بن مروان کے دور حکومت میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔ ۳ سال کی عمر تک یہ دور دیکھا۔ اس کے بعد ۹۶ھ تک ولید بن عبدالملک بن مروان کی حکومت رہی۔ ۹۶ھ سے ۹۹ھ

تک سلیمان بن عبدالملک حاکم رہا۔ ۹۹ھ سے ۱۰۱ھ تک مروان کا پوتا عمر بن عبدالعزیز حاکم رہا۔ ۱۰۱ھ سے ۱۰۵ھ تک یزید بن عبدالملک کی حکومت رہی۔ ۱۰۵ھ سے ۱۲۵ھ تک ۲۰ سال ہشام بن عبدالملک حکومت کرتا رہا۔ ۱۲۵ھ سے چند ماہ تک ولید بن یزید کی حکومت رہی اور بالآخر ۱۲۶ھ میں قتل کر دیا گیا۔ اسکے قتل کے بعد ۱۲۶ھ میں یزید بن ولید حاکم ہوا اور تین ماہ کے بعد معزول کر دیا گیا۔ ۱۲۶ھ میں مروان الحمار بنی امیہ کا آخری بادشاہ ہوا اور ۱۳۲ھ میں بنی عباس کے ہاتھوں تہ تیغ ہو گیا۔ اس کے قتل کا دلچسپ واقعہ تاریخ میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ جب سفاح کو عراق پر تسلط حاصل ہو گیا تو اس نے مروان پر حملہ کیا۔ مروان نے ایک لاکھ فوج سے مقابلہ کیا لیکن آخر میں شکست کے آثار نمایاں ہو گئے تو مروان گھوڑے سے اتر کر پیشاب کرنے گیا اور گھوڑا بھاگ نکلا۔ لوگوں نے خالی گھوڑا دیکھ کر یہ خیال کیا کہ بادشاہ قتل ہو گیا ہے۔ اور فوج منتشر ہو گئی ـــــ اور بالآخر مروان نے فرار اختیار کیا۔ اثنائے راہ میں سفاح کے ایک سپاہی نے اسے قتل کر دیا اور بنی امیہ کی برسوں کی حکومت پیشاب کے ساتھ بہہ گئی۔

آپ اسے مزاح نہ سمجھیں۔ یہ بھی معصوم ہی کا استدلال ہے کہ جب بادشاہ وقت نے امامؑ کو حکومت سے مرعوب کرنا چاہا تو آپ نے فرمایا کہ اس ملک دنیا کی کیا قیمت ہے جس پر تو نے قبضہ جما رکھا ہے۔ یہ بتا کہ اگر گلے میں تکلیف ہو جائے اور طبیب آدھی حکومت مانگے کہ نصف حکومت دیدے تو علاج کر دوں گا اور پانی پینے کے لائق ہو جائے گا تو دے گا یا نہیں؟ ـــــ اس نے کہا ضرور دیدوں گا۔ فرمایا اچھا اس کے بعد اگر پیشاب رک جائے اور پھر آدھی حکومت مانگے تو دیگا یا موت اختیار کرے گا۔ اس نے کہا دے دوں گا۔ فرمایا اب پہچان لے کہ تیرے

کل ملک کی قیمت ایک پیشاب سے زیادہ نہیں ہے اور اس ملک کو لے کر تم اہلبیتؑ سے مقابلہ کرنا چاہتا ہے ـــــ صلوات

یہ مالک کائنات کا کرم ہے کہ ہمیں اس قسم کے امراض سے محفوظ رکھے ہوئے ہے۔ آپ اپنی غربت و پریشانی کو نہ دیکھیں۔ یہ دیکھیں کہ اس نے ایسے امراض سے محفوظ رکھا ہے جن پر پوری پوری حکومت قربان کی جا سکتی ہے۔ یہ صحت نہیں درحقیقت ایک سلطنت ہے جس کا شکریہ نہیں ادا کیا جا سکتا۔ ورنہ انسان صاحب معرفت ہوتا تو پوری زندگی سجدۂ شکر میں گذار دیتا ـــــ صلوات

معصوم نے مختصر سی مدت میں ۹ حکومتیں بنی امیہ کی دیکھیں اور اس کے بعد ۱۳۲ھ سے بنی عباس کی حکومت کا آغاز ہوا۔ ۴ سال تک سفاح کی حکومت رہی۔ ۴ سال کے بعد ۱۵۸ھ تک منصور کی حکومت رہی اور اسی کے دور حکومت میں ۱۴۸ھ میں امام جعفر صادقؑ کو زہر دے دیا گیا۔ منصور سے آپ کا وجود برداشت نہ ہوتا تھا۔ اور اس نے بار بار چاہا کہ امامؑ کو اپنا تابع بنالے لیکن آپ نے اسے قبول نہ کیا۔ ایک مرتبہ منصور نے کہا کہ آپ میرے دربار میں کیوں نہیں آتے۔ آپ نے فرمایا کہ نہ تیرے عذاب کا خوف ہے نہ تیرے انعام کی لالچ پھر کیا کرنے آؤں۔ کہنے لگا کہ نصیحت ہی کے لئے آیا کیجئے۔ فرمایا کہ طالب دنیا تجھے نصیحت نہ کرے گا اور طالب آخرت تیرے قریب نہ آئے گا۔ یہ جانتے ہوئے کہ تجھ پر نصیحت کا اثر نہ ہوگا ـــــ صلوات

ایک روز اصرار شدید کے بعد منصور کے دربار میں تشریف لے گئے۔ بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک مکھی منصور کی ناک پر آکر بیٹھ گئی۔ اس نے اڑانا چاہا۔ پھر آگئی۔ پھر اڑایا پھر آگئی۔ آخر جھنجلا کر کہا کہ اللہ نے یہ کیا بے کار مخلوق پیدا کی ہے۔ جس کا کوئی مصرف نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا اس کے بے شمار فوائد ہیں اور یہی کیا کم ہے کہ اس طرح

یہ فرمائی کہ دیکھو نماز سے غفلت نہ ہونے پائے۔ ہم اہلبیتؑ کی شفاعت اسے نہیں مل سکتی جو نماز کو سبک شمار کرے گا۔ یہ کہتے کہتے تین مرتبہ الصلوٰۃ الصلوٰۃ الصلوٰۃ کہا اور دنیا سے رخصت ہو گئے۔

امامؑ کو کس قدر نماز کی فکر تھی کہ وقت آخر چاہنے والوں کو کوئی وصیت کی تو نماز ہی کی وصیت کی اور آپ جانتے ہیں کہ امامؑ کی وصیت کی کیا اہمیت ہوتی ہے۔ آپ سے اس لئے وصیت کی ہے کہ آپ سے وفا کی امید ہے۔ امام حسینؑ نے بھی آپ ہی سے وصیت کی تھی کہ میرے لال جب قید شام سے چھوٹ کر مدینے جانا تو میرے شیعوں سے میرا سلام کہہ دینا۔ اور کہنا شیعو! جب ٹھنڈا پانی پینا تو امامؑ کی پیاس کو یاد کر لینا اور جب کسی غریب و بیکس کا ذکر آئے تو مجھ پر آنسو بہانا۔

امام جعفر صادقؑ نے رحلت فرمائی۔ اعزا موجود۔ اقربا موجود۔ چاہنے والے موجود۔ مدینہ وطن۔ دھوم سے جنازہ اٹھا۔ اہتمام سے مشایعت جنازہ کی گئی۔ کیوں نہ ہو جب کوئی وطن میں ہوتا ہے اور اس کے اقربا موجود ہوتے ہیں تو جنازہ اہتمام سے اٹھتا ہے۔

ہائے وہ غریب الوطن کیا کرے جس کو وطن پلٹ کر جانا بھی نصیب نہ ہوا اور جس کے وارثوں کو اتنی بھی مہلت نہ ملی کہ امامؑ کے لاشہ کو دفن کر دیتے۔ اور فرزند رسولؐ کی لاش کو بے گور و کفن چھوڑ کر رسن بستہ کربلا سے چلے گئے۔

عزادارو! غربت کا ذکر آ گیا تو ایک غریب الوطن کی یاد آ گئی جس کو کربلا کی خاک پر بھی سونا نصیب نہ ہوا۔ اور گھر کی فضا کو چھوڑا تو شام کے زندان میں سونا پڑا۔ ہائے وہ قیامت کا وقت جب شام کے زندان میں باپ کو یاد کر کے رونے والی۔ روتے روتے خاموش ہوئی اور ثانی زہراؑ نے شانہ ہلایا۔ بیٹی اٹھو میری لال نہ روؤ۔ بیٹی بابا اب نہ آئیں گے۔ اٹھو میری جان پھوپھی گلے لگا لے۔ بیٹی اب تیری ذمہ دار میں ہوں

بھیا تجھے میرے حوالے کر گئے ہیں۔ اور کوئی جواب نہ ملا تو غور سے جھک کر دیکھا۔ کیا دیکھا کہ بیبی دنیا سے رخصت ہو چکی ہے۔ ہائے وہ باپ کی عزادار ایک نیا صدمہ دے گئی۔

عزادارو! سوچ سکو تو سوچو غربت کا عالم قید کی مشقت۔ تاریک زندان اور اس میں ایک ننھی سی میت غسل کون دے گا۔ کفن کہاں سے آئے۔ قبر کون بنائے جنازہ کون اٹھائے اور میت کو کیسے سپرد خاک کیا جائے۔ ہائے رے بے کسی۔ اف رے بے بسی۔ عجب نہیں قلب زینبؑ نے آواز دی ہو۔ بھیا آؤ! تمھاری چاہنے والی دنیا سے رخصت ہو گئی۔ عباسؑ آؤ بہن کا ہاتھ بٹاؤ۔ اکبر کہاں ہو۔ قاسم و عون و محمد ذرا میری بے کسی کا عالم تو دیکھو۔ اور میرا دل کہتا ہے کہ عجب نہیں یتیم کا رخ کر کے آواز دی ہو ـــــ اماں آپ کا جنازہ تو پردۂ شب میں اٹھ گیا لیکن یہاں کوئی سامان نہیں ہے۔ اماں آؤ زینب کا دل سنبھالو ـــــ اللہ کیا قیامت کی ساعت تھی جب بیمار امامؑ غسل و کفن دے رہا تھا اور ثانیٔ زہراؑ جنازہ تیار کر رہی تھیں۔ جنازہ تیار ہوا۔ سپرد لحد کیا گیا۔ حسرتیں دفن ہوئیں۔ ارمان سپرد خاک ہوئے۔ اور ایک دکھیا ماں کے دل نے آواز دی۔ شاباش بیٹی شاباش۔ اصغر نے کربلا بسائی اور تو نے قید خانہ بسا لیا۔ اب ماں کس منھ سے وطن جائے گی۔ اور اہل وطن کو کیا منھ دکھائے گی۔ شاباش میری لال غربت میں یوں ہی ماں کا ساتھ چھوڑ دیا کرتے ہیں۔ بیٹی یہ تو بتاؤ کہ جب قید خانہ سے رہائی ملے گی تو میں کیا کروں گی۔ اور تیری قبر کو کیسے تنہا چھوڑوں گی۔ میری لال اگر قافلہ رہا ہو کر کربلا گیا تو میں وارث کو کیا جواب دوں گی۔ بیٹی تجھے وطن جانے کی تمنا تھی۔ تو نے وقت آخر بھی مولا سے کہا تھا کہ ہمیں مدینہ پہنچا دیجئے۔ بیٹی وقت آگیا ہے عنقریب قافلہ رہا ہو کر مدینہ جانے والا ہے۔ ایک تمھیں نہ ہو گی باقی تو سارا قافلہ وطن جائے گا۔

ارباب عزا! کون جانے کہ ماں پر کیا گذر گئی اور بیٹی کا کیا عالم ہوا۔ تاریخ

خاموش ہے۔ مقتل انگشت بدندان ہے۔ فضا میں سناٹا چھایا ہوا ہے کسی طرف سے کوئی آواز نہیں آرہی ہے۔ اور ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے کوئی بیٹی یہ کہہ رہی ہو۔ اماں کربلا جایئے گا تو بابا سے ہمارا سلام کہہ دیجئے گا۔ اور وطن جایئے گا تو بہن کو گلے سے لگا لیجئے گا ـــــ اماں اگر کبھی پانی مل جائے تو یہ یاد رکھئے گا کہ آپ کا اصغر بھی پیاسا ہے اور آپ کی بیٹی بھی پیاسی ہے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

جناب امام حسن علیہ السلام

اسم مبارک :	حسنؑ ،
لقب :	مجتبیٰ ، زکی ، وغیرہ ،
کنیت :	ابو محمدؑ ،
والد ماجد :	حضرت علیؑ ابن ابیطالبؑ ،
والدہ ماجدہ :	جناب فاطمہ زہراؑ ،
ولادت :	۱۵ رمضان المبارک ۳ھ مدینہ منورہ ،
ازواج :	کنیزوں سمیت ۶۴
اولاد :	جناب قاسم ، حسن مثنیٰ ، عبداللہ وغیرہ ۱۵ سے ۳۲ تک
شہادت :	۲۸ صفر ۵۰ھ مدینہ منورہ ،
عمر شریف :	۴۷ سال ،
قبر مطہر :	جنت البقیع ،

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید الانبیاء والمرسلین خاتم النبیین سیدنا ومولانا ابی القاسم محمد وآلہ الطیبین الطاہرین ولعنۃ اللہ علیٰ اعدائھم اجمعین — اما بعد فقد قال اللہ الحکیم فی کتابہ الکریم —

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى

ارشاد جناب احدیت ہوتا ہے ، بیشک ہدایت کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے اور دنیا و آخرت کا اختیار ہمارے ہاتھوں میں ہے۔

ارشاد گرامی سے واضح ہو گیا کہ عالم بشریت کی ہدایت و راہنمائی میں کسی بشر اور کسی انسان کا دخل نہیں ہے ، یہ کام صرف رب العالمین کا ہے اور وہ برابر انجام دے رہا ہے۔ یاد رکھئے ! مالک کائنات نے صرف اعلان کر دیا ہوتا اور کوئی عملی مظاہرہ نہ کیا ہوتا تو بھی امت کو یقین کر لینا چاہیئے تھا ، چہ جائیکہ ایک لاکھ چوبیس ہزار مرتبہ اس قانون پر عمل کرنے کے بعد بھی امت کو اعتبار نہ آیا اور یہی خیال ذہن میں رہ گیا کہ اپنی ہدایت کا انتظام ہمیں خود کرنا ہے اور رب العالمین سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے ، مجھے تو کہنا پڑتا ہے کہ جس قوم کو خدا کی تقریر پر اعتبار نہ آیا اسے نبی کی سیرت پر کیا اعتبار آئے گا۔

مالک کائنات نے ہر دور اور ہر عہد میں ہدایت کا انتظام کیا اور اس کے انتظام میں سن و سال اور قد و قامت کا کوئی فرق نہیں رہا۔ اس نے کمسن افراد کو بھی ذمہ دار بنایا ہے اور مسن افراد کو بھی ، چھوٹے قد والوں کو بھی دین کا عہدہ دار

بنایا ہے اور دراز قامت انسانوں کو بھی، اس کے یہاں ایسی کوئی تفریق نہیں اس کا نمائندہ وہیں سے منصب دار بن کر آتا ہے۔ اس کے نمائندے بنیادی طور پر کمسن اور کم عمر ہی ہوتے ہیں۔ وہ بوڑھوں کو منصب دار نہیں بناتا بلکہ ابتدا ہی سے منصب دار بنا کر بھیجتا ہے۔

آج آپ کے سامنے ایک ایسے ہی راہنما اور ہادی کا تذکرہ کرنا ہے جس نے بچپن ہی سے کار تبلیغ شروع کر دیا اور امت کی راہنمائی کی ذمہ داری سنبھال لی۔ قانونی طور پر ذمہ داریاں بہت دیر میں منتقل ہوئیں لیکن عملی طور پر وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ ہادی اعظمؐ کو گود میں لیکر فرمانا پڑا کہ "یہ میرے دونوں فرزند امام ہیں چاہے کھڑے رہیں یا بیٹھ جائیں۔ یہ دونوں جوانان اہل جنت کے سردار ہیں اور ان کا باپ ان سے بھی افضل ہے۔" پیغمبر اسلامؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ یہ دونوں بچے امام ہوں گے اور انھیں سردار بنایا جائے گا بلکہ یہ فرمایا کہ یہ دونوں امام ہیں اور جوانان جنت کے سردار ہیں، تاکہ دنیا واضح ہو جائے کہ اللہ والوں کا کمال سن و سال اور حالات کا پابند نہیں ہوتا، وہ جہاں رہتے ہیں، جیسے رہتے ہیں صاحب کمال ہی رہتے ہیں۔ صلوات،

بلکہ واضح لفظوں میں یہ کہہ دیا جائے کہ پیغمبر اسلامؐ نے اشارہ کردیا کہ امت کے بوڑھے بھی اگر جنت میں جانا چاہیں تو ان بچوں کو اپنا سردار اور ان کے باپ کو ان سے افضل مانیں۔ انھیں جنت کا سردار اور ان کے باپ کو ان سے افضل مانے بغیر نہ دنیا میں اسلام رہ جائے گا اور نہ آخرت میں جنت و کوثر کی امید رہ جائے گی۔ جنت ان کے قبضہ میں ہے اور کوثر ان کے باپ کا قبضہ ہے۔ صلوات۔

آج مجھے اسی شہزادۂ صلح و امن، سردار جوانان جنت، سبط رسولؐ، جان بتولؑ امام امت اور مصلح ملت کا تذکرہ کرنا ہے۔ اس کی زندگی کا ایک ہلکا سا خاکہ یہ ہے کہ ۳ھ میں ماہ رمضان المبارک کی پندرہ تاریخ کو ولادت ہوئی۔ سات برس نانا کے زیر سایہ گزارے، نانا کے بعد چند ماہ ماں کا ساتھ رہا، ماں کے بعد ۳۰ سال کا عرصہ باپ کے زیر سایہ گزارا۔ ۴۰ھ میں باپ کی شہادت کے بعد دس سال کا زمانہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں گزارا جس میں شریک کار اور مددگار چھوٹے بھائی امام حسینؑ اور چند اطاعت شعار افراد کے علاوہ کوئی نہ تھا۔

تقریباً ۴۷ سال کی اس زندگی میں اسلامی تاریخ کے بے شمار واقعات کا مشاہدہ کیا اور حالات و مصالح کے مطابق واقعات میں حصہ بھی لیا۔ ۵ھ میں جنگ خندق دیکھی، ۶ھ میں صلح حدیبیہ کا مشاہدہ کیا، ۷ھ میں جنگ خیبر دیکھی، ۸ھ میں فتح مکہ کا مشاہدہ کیا، ۹ھ میں مباہلہ میں شرکت کی، ۱۰ھ میں آخری حج میں شریک رہے، ۱۱ھ کے آغاز میں ۲۸ صفر کو نانا کا غم برداشت کیا اور اسی ۱۱ھ میں نانا کے چند دن کے بعد ماں کا داغ دیکھا، باپ کے مسائل الگ قابل دید تھے میراث لٹی، جاگیر چھنی، تخت و تاج گیا، عزت و احترام رخصت ہوا، سلام و کلام بند ہوا، قرآن واپس ہوا اور تقریباً ۲۵ سال تخت حکومت پر ایک حاکم کا قبضہ رہا، دس سال دوسرے حاکم کا قبضہ رہا، بارہ سال تیسرے حاکم کا قبضہ رہا، چند سال کی حکومت باپ کو ملی تو اس میں بھی فتنوں، ہنگاموں، شورشوں اور بغاوتوں کا ایک طوفان رہا۔ عنان حکومت سنبھالتے ہی خون عثمان کے نام پر ام المومنین جمل کے میدان میں آگئیں، ان سے فرصت ملی تو معاویہ نے صفین کا معرکہ گرم کر دیا، اس سے نجات ملی تو خوارج نہروان کے میدان میں اتر پڑے، اور بالآخر حکومت شام کی سازش سے

۴۰ھ کے ماہ رمضان میں ۱۹ ویں تاریخ کی صبح کو باپ کے سرِ اقدس پر ابنِ ملجم کی تلوار لگی، اور ۲۱ رمضان کی صبح کو باپ دنیا سے رخصت ہو گیا۔

باپ کے بعد ۴۱ھ میں حالات کے تحت حکومتِ شام سے صلح کی اور ۵۰ھ میں خاموش زندگی گزارنے کے باوجود حکومتِ شام کی قدیم سازش کی بناء پر جعدہ بنت اشعث کے ہاتھوں ۲۸ صفر کو زہرِ دغا سے شہید ہو گئے۔

تفصیلی حالات کا تذکرہ بعد میں کیا جائیگا، اجمالی طور پر یہ دیکھ لیا جائے کہ ۴۷ سال کی زندگی کتنے مصائب و آلام سے گزری ہے اور کس طرح حالاتِ دنیا کا مقابلہ کیا ہے اور کوئی موڑ زندگی کا ایسا نہیں آیا جس میں کسی نہ کسی انداز سے حصہ نہ لیا ہو، بچپنے کے واقعات میں بھی خاموش تماشائی نہیں رہے اور تعلیم و تربیت کے طور پر حالات کو نہیں دیکھا، بلکہ اکثر مقامات پر ذمہ دارانہ حیثیت سے حصہ لیا ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ دنیا کا بچپنا اور ہے اور امامت کا بچپنا اور۔ اخلاق میں نبیؐ کا انداز، کردار میں علیؑ کا انداز، صبر میں زہراؑ کا انداز، شجاعت میں ہاشم کا جلال، استقلال میں ابوطالب کے تیور، ایمان و یقین میں عبدالمطلب کا نقشہ، خاندان کی عزت، بزرگوں کی یادگار، مذہب کا ذمہ دار، اسلام کا خطیب، صلح کا نقیب، قرآن کا مفسر، امت کا مصلح، کعبہ کا محافظ اور سیرتِ رسولؐ کا ایسا ورثہ دار کہ جب ہجومِ مصائب میں طعن و طنز کے باوجود حدیبیہ کی تاریخ دہرا کر صلح کر لی اور اسلام کو ایک بڑے خطرے سے بچا لیا تو قدرت کو یہ ادا اس قدر پسند آئی کہ دونوں کی تاریخِ وفات کو ایک کر دیا، کہ جس تاریخ میں پہلا مصلح دنیا سے گیا تھا اسی تاریخ کو دوسرا شہزادۂ صلح بھی دنیا سے رخصت ہوا۔

امام حسن مجتبیٰؑ کی زندگی کے اس خاکہ کو نظر میں رکھنے کے بعد دو اہم پہلوؤں پر

نظر کرنا پڑتی ہے، ایک یہ کہ آپ کی ذاتی شخصیت اور آپ کا ذاتی کردار کیا تھا؟ اور دوسرے یہ کہ آپ نے کن حالات کا سامنا کیا ہے اور ان حالات میں آپکا طرزِ عمل کیا رہا ہے؟

جہاں تک پہلے موضوع کا تعلق ہے تاریخ میں بے شمار واقعات ملتے ہیں جن سے آپ کی عظمت و جلالت کا اندازہ ہوتا ہے اور تاریخ کے واقعات کیا خود قرآن مجید کی آیتیں اور مرسلِ اعظمؐ کے ارشادات عظمت کی گواہی دے رہے ہیں، آیۂ تطہیر عصمت کا اعلان کر رہی ہے، آیتِ مباہلہ صداقت کا اعلان کر رہی ہے، آیتِ صلح کردار پر روشنی ڈال رہی ہے اور سورۂ دہر سخاوت کا قصیدہ پڑھ رہا ہے، صلوات،

مرسلِ اعظمؐ کی زندگی کو دیکھیں گے تو وہاں بھی قول و عمل سے مسلسل فضائل و کمالات کا اعلان ملے گا، کبھی اپنے لال کو سردارِ جوانانِ جنت کہیں گے، کبھی امام کے لقب سے یاد کریں گے، کبھی اپنا سبط اور نائب قرار دیں گے اور کبھی اصلاحِ امت کا مژدہ سنائیں گے، کبھی اسے اپنے سے قرار دیں گے اور کبھی اپنے کو اس سے قرار دیں گے، صلوات،

اور یہ کمالات فقط زبانی ہی نہیں بلکہ عملی طور پر بھی ان کا اظہار ہوگا، نواسہ مسجد میں آ جائے گا تو منبر سے اتر کر گودی میں اٹھا لیں گے، سجدہ میں آ جائے گا تو سر نہ اٹھائیں گے، عید کا دن ہوگا تو کاندھے پر بٹھائیں گے، مباہلہ کا موقع ہوگا تو انگلی پکڑ کر لے چلیں گے، تطہیر کی منزل ہوگی تو گلے سے لگا کر ضعفِ رسالت کو قوت میں تبدیل کریں گے، زہراؑ کے گھر آئیں گے تو دہن اقدس کے بوسے لیں گے اور جب ہر نبی کا بچہ آ جائے گا تو اسے شہزادے کے حوالے

کر دیں گے۔

تاریخ نے مختلف منزلوں پر فضائل و کمالات کا اعتراف کیا ہے، علم کا یہ عالم ہے کہ امیرالمومنینؑ کے پاس جب کوئی مسئلہ آجاتا ہے تو اپنے فرزندوں سے جواب دلواتے ہیں۔ اور حکومت وقت تو بہر حال امامت کی محتاج ہے،

مشہور و معروف واقعہ ہے کہ بادشاہِ روم نے حاکم شام معاویہ بن ابی سفیان سے دو سوالات کئے، زمین پر وہ کون سی جگہ ہے جو آسمان کے ٹھیک وسط میں واقع ہے اور زمین کا وہ کون سا خطہ ہے جس پر سورج کی روشنی صرف ایک مرتبہ پڑی ہے، حاکم شام جواب سے عاجز ہو گیا اور مسئلہ کو امام حسنؑ کے سامنے پیش کر دیا، آپ نے فرمایا کہ وسط آسمان کی زمین میں پشت خانۂ کعبہ ہے، اور ایک مرتبہ سورج کی روشنی دیکھنے والی نیل کی گہرائی ہے جس پر حضرت جناب موسیٰؑ کے گذرتے وقت آفتاب کی روشنی پڑی تھی، اس کے بعد پھر دریا حائل ہو گیا اور سورج کی شعاع نہ پہنچ سکی۔

آپ نے اندازہ کیا کہ امام حسنؑ نے کس آسانی سے مسائل کو حل کر دیا اور واضح کر دیا کہ حاکم شام جب تجھے زمین کی خبر نہیں ہے تو آسمان کی خبر کیا ہوگی اور جب تو بیت کے فضائل سے باخبر نہیں ہے تو اہلبیتؑ کے کمالات کو کیا سمجھے گا۔؟

اس علم کی وسعت و جامعیت کا یہ عالم تھا کہ اپنوں کا کیا ذکر غیروں نے بھی اقرار کیا ہے کہ امام حسنؑ گہوارہ سے لوح محفوظ کا مطالعہ کیا کرتے تھے، یہ اور بات ہے کہ اعترافِ فضیلت میں ایک ایسی روایت

بھی شامل کر دی کہ فضیلت روشن ہو کر سامنے نہ آسکی، لیکن مجھے روایت سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ دشمن نے فضائل کا اقرار کیا ہے اور ایسی روایت کا اضافہ تو ہونا ہی چاہئیے تھا کہ ایسے ہی حالات گہوارہ کے علم پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اگر زلیخا نے کردار یوسف سے غلط روایت وابستہ نہ کی ہوتی تو گہوارہ کا بچہ کیسے بولتا۔ اگر یہودیوں نے جناب مریم کے ساتھ غلط تہمت منسوب نہ کی ہوتی تو عیسیٰؑ کا کمال کیسے سامنے آتا اور اگر امت میں ایسی روایت نہ ہوتی تو امام حسنؑ کے علم کا اقرار کیسے کیا جاتا۔؟

علم کے بعد عمل کی منزل آتی ہے؛ زہد و تقویٰ کا یہ عالم ہے کہ سادہ لباس میں زندگی گذار رہے ہیں اور اگر کبھی مجبوراً عمدہ لباس پہن لیا اور یہودی نے اعتراض کر دیا کہ آپ کے جد نے تو فرمایا ہے کہ دنیا کافر کے لئے جنت ہے اور مومن کے لئے قید خانہ، یہ آپ کا لباس مجھ سے بہتر کیوں ہے؟ تو ایک عظیم حقیقت کا اعلان فرما دیا کہ یاد رکھو، بہتر اور بدتر کا فیصلہ نتیجہ کے ساتھ ہوتا ہے تمہیں آخرت میں جو کچھ ملنے والا ہے اس کے اعتبار سے یہ لباس کہیں بہتر ہے اور مجھے جنت میں جو کچھ حاصل ہونے والا ہے اس کے اعتبار سے یہ ایک قیدی کا لباس ہے۔ یا واضح لفظوں میں یوں کہہ دیا جائے کہ یہودی حقائق سے بے خبر تھا ورنہ یہ سوال ہی نہ اٹھاتا، اسے یہ معلوم ہوتا کہ جس کے پہن جانے پر جنت سے لباس آجاتا ہے اس کے لئے دنیا کا لباس تو بہر حال ایک قیدی کا لباس ہوگا۔

زہد و تقویٰ کے ساتھ اس عظیم دسترخوان کا بھی اضافہ کر لیجئے جس پر بے نواؤں اور مسکینوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے تو کمالات کی منزل اور نمایاں ہو جائے گی کہ ایک طرف اپنی زندگی میں یہ سادگی کہ ایک دن لباس کو دیکھ کر یہودی کو تعجب ہو گیا اور وہ سوال کرنے پر مجبور ہو گیا اور اس کے سوال نے واضح کر دیا کہ اگر امام حسنؑ کی زندگی میں راحت پسندی اور عیش و آرام کا دخل ہوتا تو یہودی کو تعجب نہ ہوتا۔ یہودی کا تعجب خود کردار کی بلندی کی ایک دلیل ہے۔

اور دوسری طرف وہ عظیم دسترخوان جس کی بناء پر خلق حسنؑ کا شہرہ ہوا، اور جس کا یہ عالم تھا کہ کوئی سائل دروازہ سے واپس نہ جانے پائے، آلِ محمدؐ کی زندگی میں یہ کوئی خاص بات نہیں ہے جس کا تذکرہ کیا جائے۔ یہ ان کے گھر کا معمول ہے، جن کے گھر مدینہ کے سائل بھی آتے ہیں اور آسمان کے فرشتے بھی اور قرآن کا سورۂ دہر بھی۔ صلوات،

لیکن مجھے بھی ایک واقعہ کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ یہ واضح ہو جائے کہ اہلبیتؑ کی اپنی زندگی کتنی سادہ تھی اور ان کی خدمت خلق کا عالم کیا تھا۔ مشہور و معروف واقعہ ہے کہ ایک شخص امام حسنؑ کے دسترخوان پر مہمان ہوا، اور کھانے کے لئے بیٹھا تو عالم یہ تھا کہ ایک لقمہ کھاتا تھا اور ایک لقمہ بچاتا جاتا تھا آپ نے فرمایا بھائی! کیا تو صاحب عیال ہے؟ اس نے کہا نہیں، میں نے مسجد میں ایک شخص کو سوکھی روٹیاں کھاتے دیکھا ہے، چاہتا ہوں کہ اسکی بھی کچھ مدد کر دوں۔ آپ نے فرمایا بھائی! وہ میرے باپ مولائے کائنات علیؑ ابن ابی طالب ہیں، ان کی زندگی کا یہی معمول ہے کہ ہم اہلبیتؑ جو دنیا کو کھلاتے ہیں وہ اور ہوتا ہے اور جس پر خود اپنی زندگی گزارتے ہیں وہ

اور ہوتا ہے۔ تو رزقِ دنیا کھالے اور اپنا راستہ لے، ہم اہلبیتؑ کی فکر نہ کر، ہماری نعمتوں کا دسترخوان وہاں بچھایا گیا ہے۔

عزیزانِ محترم! یہ ایک مسافر، غریب اور عام مسلمان کی بات ہے۔ حسن مجتبیٰؑ کی سخاوت کا یہ عالم تھا کہ اسے دیکھ کر بڑے بڑے سلاطینِ وقت دنگ رہ جاتے تھے تاریخ کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ معاویہ مدینہ آیا اور اعلانِ عام کر دیا کہ لوگ بادشاہِ وقت کو سلام کرنے کی غرض سے حاضر ہوں، خزانوں کا منھ کھلا ہوا ہے، آج لوگوں کو انعام تقسیم کیا جائے گا۔ لوگ آنے لگے اور دولت تقسیم ہونے لگی۔ یہاں تک کہ امام حسنؑ کو بھی مجبور کیا گیا۔ آپ دربار میں آخری وقت تشریف لائے، معاویہ نے ارکانِ دولت کی طرف اشارہ کیا کہ حسنؑ نے آنے میں صرف اس لئے دیر کی ہے کہ میرا خزانہ خالی ہو جائے اور مجھے شرمندگی کا منھ دیکھنا پڑے۔ تو بھی کہ صبح سے اب تک جس قدر مال تقسیم ہوا ہے اتنی ہی مقدار میں تنہا حسن مجتبیٰؑ کو دیدیا جائے، دشمن کا عمل گواہی دے رہا ہے کہ جو حیثیت ساری امت کی ہے، وہ وقار تنہا زہراؑ کے لال حسن مجتبیٰؑ کا ہے۔

خزانوں کے منھ کھول دیئے گئے، جواہرات اکٹھا ہونے لگے، معاویہ مسکرا رہا ہے، امام حسنؑ دیکھ رہے ہیں۔ جب سب مال اکٹھا ہو گیا تو معاویہ نے بڑے غرور سے کہا۔ لیجئے یہ مال آپکے لئے ہے آپ نے قبول فرما لیا اور چلنے کا ارادہ کیا۔ معاویہ کے خادم نے بڑھ کر جوتیاں سیدھی کر دیں۔ آپ نے مال کی طرف اشارہ کر کے فرمایا۔ کہ تو نے میری خدمت کی ہے اور ہم اہلبیت کسی کا احسان نہیں لیتے لہٰذا یہ کل مال تیری خدمت کا صلہ ہے۔

اربابِ کرم! دیکھا آپ نے جو مال معاویہ نے امام حسنؑ کو فرزند رسولؐ سمجھ کر

بڑے غرور سے دیا تھا اسے امام حسنؑ نے معاویہ کے غلام کو عطا کر دیا اور واضح کر دیا کہ اب دونوں کے کرم کا فرق پہچان لے، جتنا تو نواسۂ رسولؐ کو دیتا ہے اتنا تو ہم ایک غلام کو دیدیا کرتے ہیں۔

اور میں تو کہوں گا مولا! اس شانِ کرم پر ہماری جانیں قربان، آپ نے غلاموں کا دل رکھ لیا اور اب تو یہ اطمینان ہو گیا کہ جب آپ معاویہ کے غلام کو اتنی بڑی دولت دے سکتے ہیں تو جب قیامت کے دن آپکے اپنے غلام آئیں گے تو انھیں کیا نہ دیدیں گے۔ صلوات،

لیکن عزیزانِ محترم! یاد رکھئے، یہ سب کچھ معاویہ کے غلام کو ملا ہے معاویہ کو نہیں ملا، گویا امام حسنؑ نے واضح کر دیا کہ ہمارے یہاں خدمت کرنے والوں کی قدر ہے مقابلہ کرنے والوں کی نہیں.

واقعہ نے یہ بھی واضح کر دیا کہ حکومت اور امامت کی نگاہ میں مال دنیا کی کیا قیمت ہے۔؟ حکومت اعلان کر رہی ہے کہ مال دنیا میں رسولؐ کی قرابت تولی جاتی ہے اور امامت آواز دے رہی ہے کہ ہم مال دنیا میں اپنی جوتیوں کو تولا کرتے ہیں، ہم خانوادۂ شاہی کو رسالت سے منسوب نہیں کرتے اپنی جوتیوں میں رکھا کرتے ہیں، صلوات،

وقت نہیں ہے ورنہ واقعہ کے دوسرے خصوصیات پر بھی روشنی ڈالی جاتی اور یہ دیکھا جاتا کہ امام حسنؑ نے ایک ہی واقعہ میں کتنے مسائل کا حل پیش کر دیا ہے، اس وقت تو صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ اہلبیتؑ کی تواضع و خاکساری، ان کی عبادت و ریاضت، ان کا زہد و تقویٰ اور ان کی سخاوت و عنایت اس منزل پر تھی کہ اہل دنیا اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے،

حج بیت اللہ کے لئے جا رہے ہیں، ناقے آگے آگے، اور خود پیادہ پا، دنیا دیکھ رہی ہے کہ مشقت و زحمت کے ساتھ عبادت کیسے کی جاتی ہے؟ اور اللہ والوں کی نگاہ میں خانۂ خدا کی عظمت کیا ہے اور جب مکان کی یہ عظمت ہے تو مالکِ مکان کی کیا جلالت ہوگی۔؟

عملی زندگی میں بھی امام حسنؑ کی انفرادیت قابل ملاحظہ ہے، زندگی چند ہی منزلوں سے گزری ہے مگر خندق، خیبر، حنین، فتح مکہ، غدیر، سارے واقعات نگاہوں سے گزر گئے اور سب میں کسی نہ کسی مقدار میں حصہ بھی لیا، وفاتِ پیغمبر کے بعد مصائب کا سلسلہ شروع ہوا، حق چھنا، گھر جلا، محسنؑ کی شہادت واقع ہوئی، باپ کی حکومت گئی، ماں کی تکذیب کی گئی۔ اور امام حسنؑ حالات کا گہرا مطالعہ کرتے رہے، جس دن موقع ملے گا امت کو بتادونگا کہ تمہاری بساط و اوقات کیا ہے۔؟ میرے باپ کا حق چھین لیا، میری مادرِ گرامی سرِ دربار آئیں اور ان کے دعویٰ کو رد کر دیا، حد یہ ہے کہ خود مجھے بھی گواہی میں پیش کیا گیا لیکن معصوم بچوں کی گواہی کو بھی نہ مانا... عصمت کے اعلیٰ تصور سے ناواقف تھے تو کمسن بچوں ہی کی عصمت پر اعتماد کر لیا ہوتا، آخر حضرت یوسف کے مسئلہ میں بچہ کی گواہی مانی گئی یا نہیں لیکن یہاں تو فلسفہ ہی دوسرا ہے، خیر آج منبر تمہارا قبضہ ہو گیا ہے ہو چاہو فیصلہ کرو، وقت آنے دو، میں تمہیں تمہاری حقیقت سے باخبر کروں گا۔

چند دن گزرے تھے کہ شہزادے کا گزر مسجد کی طرف سے ہو گیا، دیکھا بادشاہِ وقت منبر پر تشریف فرما ہیں اور اپنے حوالی وموالی کے درمیان

کچھ وعظ و نصیحت فرما رہے ہیں، امام حسنؑ آگے بڑھے اور بڑھ کر فرمایا "میرے باپ کے منبر سے اتر آؤ جہاں تمہارے باپ کا منبر ہو وہاں جاؤ" لہجہ میں کچھ اس قدر جلال تھا کہ کوئی بچپنا سمجھ کر نہ ٹال سکا اور حاکم وقت کو منبر سے اترنا پڑا، یہ ادب بات ہر گوشہ مندگی کو مٹانے کے لئے شہزادے کو گود میں لے کر منبر پر گئے اور فرمایا بیشک یہ ان کے باپ کا منبر ہے، میرے باپ کا نہیں ہے۔

عزیزانِ محترم! واقعہ آپ کی نگاہوں میں ہے، اب ذرا ایک ایک لفظ کا تجزیہ کیجئے تو کتنے ہی حقائق سامنے آجائیں گے۔ شہزادہ صلح نے اپنے باپ کا منبر کہہ کر اس حقیقت کی طرف اشارہ کر دیا کہ یہ میرے نانا کا بھی منبر ہے اور میرے بابا کا بھی منبر ہے۔ اگر بابا کا منبر سمجھتے ہو تو تمہیں بیٹھنے کا حق نہیں ہے اور اگر نانا کا منبر سمجھتے ہو تو تسلیم کرو کہ میں ان کا فرزند ہوں اور مباہلہ کے میدان میں ان کی صداقت و حقانیت کی گواہی کے لئے میں ہی گیا تھا۔ صلوات،

"اپنے باپ کے منبر پر جاؤ" یہ کرامت کی بے کسی کی طرف اشارہ کر دیا کہ تخت و تاج پر قبضہ کرنے والوں کا کوئی ماضی نہیں ہے اور ان کے آباؤ اجداد میں کوئی صاحبِ منبر تھا، اب یہ کتنا بڑا ظلم ہے کہ جس کے گھر کا منبر ہے وہ زیرِ منبر رہے اور جس کے بزرگوں نے منبر نہیں دیکھا وہ بالائے منبر جلوہ افگن ہو جائے۔

بادشاہ وقت نے کبھی منبر سے اتر کر امام حسنؑ کے بیان کی تصدیق کر دی اور عصمت حسنؑ نے آواز دی "ابھی چند ہی دن گزرے ہیں جب تم نے میری گواہی کو رد کر دیا تھا، دیکھا تم نے کس طرح میں نے اپنے حق کا اقرار لے لیا اور تمہیں منبر سے اتار لیا۔

قربان اس شہزادۂ صلح فرزند رسولؐ کے کہ قیامت تک کے لئے منبر کا فیصلہ کر دیا، اب کسی بھی آنے والے بادشاہ کے لئے یہ جواز نہ رہے گا کہ ہمیں امت سے منبر ملا ہے یا سابق خلفا و سلطان سے منبر ملا ہے، اس لئے کہ منبر امام حسنؑ کے بزرگوں کا ترکہ ہے، نہ کسی امت کو قبضہ کرنے کا حق ہے نہ بادشاہ کو، اس منبر پر جو بھی قدم رکھے گا وہ حق آلِ محمدؐ کا غاصب ہوگا، اور غاصب کو حقدار نہیں کہا جا سکتا۔

دیکھا آپ نے، ایک خاموش انسان نے کس طرح بڑے بڑے خطیبوں کی زبانیں بند کر دیں، اور حقائق کے دریا بہا دیئے، پہلی منزل پر حق و باطل کا فیصلہ کرنے کے بعد امام حسنؑ نے سکوت اختیار کر لیا اور باپ کی روش پر قائم رہے، باپ خانہ نشین رہے تو فرزند نے بھی گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کر لی اور تھوڑے عرصہ کے بعد باپ جمل کے میدان میں نظر آیا تو بیٹا بھی علم لشکر لے کر میدان میں آگیا۔ مشہور واقعہ ہے کہ جمل میں علم لشکر محمد حنفیہ کے ہاتھوں میں تھا لیکن جب محمد حنفیہ بار بار حملہ کرنے سے رک گئے تو امیر المومنین نے علم لشکر امام حسنؑ کے ہاتھ میں دیدیا اور فرمایا۔ میرے لال ذرا اس صاحبِ محمل کے اونٹ پر حملہ کرو، امام حسنؑ پرچم لے کر آگے بڑھے اور چند لمحوں میں جمل تک پہنچ گئے، اونٹ کو نیزہ مارا اور مسکراتے ہوئے باپ کی خدمت میں آگئے۔ محمد حنفیہ حسرت سے دیکھتے رہ گئے اور علیؑ کے لال نے معرکہ کو سر کر لیا، مولائے کائنات نے دونوں کا دل رکھنے کے لئے فرمایا، محمد! پریشان نہ ہو

تم میں اور حسنؑ میں بڑا فرق ہے، تم میرے فرزند ہو اور یہ رسول اللہؐ کے فرزند ہیں۔ یہ ظرف بھی مولائے کائناتؑ کا تھا ورنہ دنیا کا کوئی اور انسان ہوتا تو بلندی کو اپنی طرف منسوب کرتا اور کہتا کیوں نہ ہو، یہ طرفین سے ہاشمی ہونے کا اثر ہے، لیکن مولائے کائناتؑ نے کمال کو پیغمبرؐ کی طرف منسوب کر کے دنیا پر واضح کر دیا کہ اپنے لئے جینا اور ہوتا ہے اور پیغمبرؐ کے لئے زندہ رہنا اور ہوتا ہے،

صفین اور نہروان میں بھی امام حسنؑ کی یہی کیفیت تھی اور باپ کے زیر سایہ برابر مجاہدات میں حصّہ لیتے رہے۔ سنہ ۴۰ھ میں شام کی حکومت نے اپنی پے در پے شکست کا انتقام لینے کے لئے ابن ملجم سے سازش کی اور مسجد کوفہ میں عین حالت سجدہ میں امیرالمومنینؑ کو شہید کرا دیا۔ اور علیؑ نے اس شہادت کو بھی اپنی کامیابی قرار دے کر فزت ورب الکعبہ کا اعلان کر دیا۔ شہادت امیرالمومنینؑ کے بعد امام حسنؑ کی زندگی کا مستقل دور شروع ہوتا ہے، اب تک کبھی نانا کے ساتھ رہے، کبھی بابا کے ساتھ، اب امت کے جملہ معاملات کے خود ذمّہ دار ہیں اور قوم کے مقدر کا فیصلہ اپنے ہی ہاتھوں کرنا ہے، چنانچہ آپ نے بابا کی شہادت کے بعد ایک تاریخی خطبہ پڑھا اور امت کو جملہ حالات سے باخبر کر کے مجمع سے بیعت لی، معاویہ بن ابی سفیان کو اس بیعت کی اطلاع ملی تو ۶۰ ہزار کا لشکر روانہ کر دیا اور عراق کو زیر کرنے کا منصوبہ بنا لیا، آپ نے بھی ۴۰ ہزار کا لشکر مرتب کیا لیکن ایک منزل پر جب آپ نے صلح آمیز گفتگو کا سلسلہ شروع کیا تو فوج میں بغاوت پھیل گئی اور لوگوں نے یہ نعرہ لگایا،

کہ معاذ اللہ یہ بھی اپنے باپ کی طرح گمراہ ہیں، کل انھوں نے بھی صلح کر لی تھی اور آخر کار شکست کھا گئے تھے اور آج یہ بھی صلح کر کے امت کو ذلیل و رسوا کرنا چاہتے ہیں۔ ہنگامہ اتنا بڑھا کہ آپکو متعدد اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا، اور معاویہ نے عراقیوں کی حالت دیکھ کر باقاعدہ صلح کی پیش کش کر دی۔ اور یہ سوچا کہ اس طرح حسنؑ کا سارا لشکر منتشر ہو جائے گا، اور میں سب کو اپنی طرف کھینچ لوں گا، صلح میں اتنی فراخدلی کا مظاہرہ کیا کہ سادہ کاغذ بھیج دیا اور ہر شرط پر رضامندی کا اعلان کر دیا، امام حسنؑ نے حالات کا گہرا جائزہ لیا اور فوج کی بغاوت کے امکانات پر بھی نگاہ ڈالی، لیکن آپنے صلح پر رضامندی ظاہر کر دی اور یہ واضح کر دیا کہ میں فوج کی مرضی کی خاطر مرضیٔ پروردگار کو پامال نہیں کر سکتا، کل جب نانا نے صلح کی تھی تب بھی لوگ مخالف تھے، جب بابا نے صفین کے بعد تحکیم پر سکوت اختیار کیا تھا جب بھی لوگ مخالف تھے اور آج بھی بغاوت ہو گی لیکن میں صلح کا دامن نہیں چھوڑ سکتا آپ نے صلح نامہ مرتب کر دیا اور جس طرح باپ نے تحکیم میں کتاب خدا کو حکم بنایا تھا اسی طرح بیٹے نے بھی دو بنیادی شرطیں رکھیں پہلی شرط یہ ہے کہ حاکم شام کو کتاب و سنت پر عمل کرنا ہوگا اور دوسری شرط یہ ہے کہ امیرالمومنینؑ پر سب و شتم کے سلسلے کو ملتوی کرنا پڑے گا، صلحنامہ مرتب ہو گیا، حاکم شام نے قبول بھی کر لیا، امام حسنؑ نے تخت و تاج چھوڑ دیا اور فوج میں حسب توقع بغاوت پھیل گئی۔ لوگوں نے مومنین کو ذلیل و رسوا کرنے کا الزام لگانا شروع کر دیا اور فرزند رسولؐ نانا کی سیرت پر عمل کر کے مطمئن رہا۔

واقعہ تاریخ میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے اور ہر مقام پر

مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ مجھے تو صرف یہ عرض کرنا ہے کہ شام کے حاکم نے سادہ کاغذ بھیج کر واضح کر دیا کہ امام حسنؑ کوئی غلط اقدام نہیں کر سکتے اور امام حسنؑ نے بھی شرائط لکھ کر نادان مسلمانوں کی زبان بند کر دی کہ خبردار! اب مجھ پر معاویہ کی بیعت کرنے کا الزام نہ لگانا میں نے معاویہ کی شرائط پر عمل نہیں کیا ہے، معاویہ سے اپنے شرائط پر عمل کرایا ہے، ایسا کرکے صلح کی ہے بیعت تو نبیؐ کے لال نے بیعت لی ہے۔ بیعت کی نہیں، صلوات،

دوسری طرف معاویہ کے صلحنامہ کو روند دینے سے بھی یہ واضح ہو گیا کہ فریب کار حکومت سے امامت نہیں اور یہی وجہ ہے کہ جب یہ سوال اٹھا کہ امام حسنؑ حکومت شام کے مقابلہ میں دھوکہ کھا گئے اور انہیں حالات کا صحیح اندازہ نہ ہو سکا تو امامت کی جلالت نے مسکرا کر آواز دی کہ خدا کا شکر ہے کہ دھوکہ کھایا ہے دھوکہ دیا نہیں، نادانو! اسلام میں دھوکہ دینا جرم ہے دھوکہ کھانا کوئی جرم نہیں ہے، صلوات،

صلحنامہ میں امام حسنؑ نے کتاب خدا پر عمل کرنے کی شرط لگا کر واضح کر دیا کہ اگر حکومت شام کتاب و سنت پر عامل ہوتی تو مجھے شرط لگانے کی ضرورت نہ پڑتی، میں نے شرط اسلئے لگائی ہے کہ شام کی حکومت سے دستخط کرا کے اس کے طرز حکومت کو واضح کردوں اور اس کے کتاب و سنت سے الگ ہو جانے کا اقرار لے لوں، اب بتلاؤ کہ میرے بابا یا میرے بھائی نے صلح کر کے کچھ کھویا ہے یا کچھ پایا ہے۔ صلوات.

سب و شتم کے بند کرنے کی شرط بھی اسی حقیقت کا اعلان ہے کہ شام میں یہ سلسلہ جاری ہے ورنہ مجھے بند کرانے کی ضرورت نہ پڑتی، اب کوئی بنی امیہ کا نمک خوار یہ نہیں کہہ سکتا کہ شام کی حکومت نے علیؑ کے خلاف کوئی اقدام نہیں کیا اور غلامان علیؑ ہی اگر غاصب حکومتوں پر تنقید کرتے ہیں تو یہ ان کی کوئی ایجاد یا بدعت ہے۔ نہیں نہیں! یہ انداز حکومت شام پہلے اختیار کر چکی ہے، غلامان علیؑ پہل نہیں کرتے لیکن جواب دینے میں کہیں بند بھی نہیں ہوتے،

حکومت شام نے بروقت ان حالات کا اندازہ نہیں کیا لیکن چند ہی دنوں میں یہ محسوس کر لیا کہ اس صلح میں حکومت کو گھاٹا ہوا ہے اور امام حسنؑ نے صلح کر کے سیرت پیغمبرؐ کی تجدید کر دی ہے اب کسی مسلمان کو ان کی صلح پر اعتراض کرنے کا حق نہیں ہے البتہ میری خلاف ورزی پر اعتراض کرنے کا حق ہے اس لئے بہترین راستہ یہی ہے کہ انکی زندگی کا خاتمہ کر دیا جائے اور توہین و ذلت کا یہ سلسلہ بند ہو جائے، حکومت کیلئے یہ کام کوئی اہم کام نہیں تھا، امیرالمومنینؑ اپنی زندگی میں فرما گئے تھے کہ حاکم شام مجھ سے زیادہ ہوشمند نہیں ہے لیکن کیا کروں کہ میرے اقدامات میں دین حائل ہو جاتا ہے اور اسے دین کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ چنانچہ اس نے آپکی ایک زوجہ جعدہ بنت اشعث سے سازباز کی اور ایک لاکھ درہم انعام کے عوض آپکو زہر دلوا دیا۔ زہر اپنا کام کر گیا اور امام حسنؑ دنیا سے انتقال فرما گئے، لیکن دنیائے انصاف پر واضح ہو گیا کہ مظلومیت امامت کا شعار ہے اور ظلم و ستم حکومت کا کردار، امامت اسلام کے نام پر باپ کے قاتل سے بھی صلح کر سکتی ہے اور حکومت تخت و تاج کے لئے صلح کے بعد بھی زہر دے سکتی ہے

زہر دیا گیا اور زہر کا اثر پھیلا، عالم یہ تھا کہ امام حسنؑ کا جسم اقدس سبز ہو گیا اور ایک غشی کی کیفیت طاری ہو گئی، بہن زینبؑ قریب بیٹھی تھیں اعزا و اقرباء کا مجمع تھا کہ ایک مرتبہ قے ہونے لگی اور بہن نے دیکھا کہ بھائی کے جگر کے ٹکڑے کٹ کٹ کر لگن میں آرہے ہیں، کون بہن ہوگی جو اس منظر کو دیکھ سکے لیکن اللہ رے زینب کا حوصلہ، مدینہ میں بھائی کے جگر کے بہتر ٹکڑے دیکھے اور کربلا میں بھائی کے ساتھیوں کے بہتر لاشے دیکھے، یہاں بھائی کو موت کے بستر پر دیکھا اور وہاں بھائی کو شمر کے خنجر کے نیچے دیکھا لیکن نہ یہاں فریاد کی نہ وہاں بددعا کے لئے ہاتھ اٹھے، ہاتھ اٹھے بھی تو دعا کے لئے۔ پروردگار میرے حسینؑ کی قربانی قبول کر لے۔

امام حسنؑ کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا، امام حسینؑ بے سہارا ہو گئے، قاسمؑ و عبداللہؑ یتیم ہو گئے، ام فروہ کے سر سے وارث کا سایہ اُٹھ گیا، زینبؑ بھائی سے جدا ہو گئیں، ام کلثومؑ کا سہارا ٹوٹ گیا، تھوڑی دیر کے بعد جنازہ تیار ہوا، امام حسینؑ حسب وصیت جنازہ کو لے کر قبر رسولؐ کی طرف چلے، بنی امیہ نے راستہ روکا، ایک خاتون نے بنی امیہ کی قیادت کی اور ہاشمی شیروں کے غیظ و غضب کو دیکھ کر ظالموں نے تیروں کی بوچھار شروع کر دی، امام حسینؑ نے بھائی کی وصیت کے مطابق ہاشمی جوانوں کو روکا اور اب جو جنازہ رکھا گیا تو متعدد تیر جنازہ میں پیوست پائے گئے، میں نہیں جانتا کہ بھائی پر کیا گزر گئی اور محمد حنفیہؑ اور عباسؑ جیسے بہادروں نے کیسے برداشت کیا لیکن اللہ رے میرا استقلال کہ ان مصائب کے باوجود جنازہ کو واپس لا کر بقیع میں دفن کر دیا۔

میں کہوں گا مولا حسینؑ ہماری جانیں قربان، یہ صبر یہ حوصلہ بھائی کے جنازہ میں تیر دیکھے اور اُف نہ کی لیکن مولا ستر تیر دیکھ کر صبر کرنا آپ کا کام تھا اور تیروں پر جسم نازنین کو معلق دیکھ کر صبر کرنا آپ کی بہن زینبؑ کا کام تھا، اللہ! وہ عصر کا ہنگام، وہ زمین کربلا کا زلزلہ، حسینؑ کا زخمی ہو کر گھوڑے سے گرنا، وہ تیروں پر جسم نازنین، وہ شمر ملعون کا خنجر، وہ فاطمہ زہراؑ کی فریاد، وہ فضائے کربلا کی آواز اَلَا قُتِلَ الْحُسَیْنُ بِکَرْبَلَا اَلَا ذُبِحَ الْحُسَیْنُ بِکَرْبَلَا

حسن مجتبیٰؑ کی شہادت پر امام حسینؑ روئے، غم منایا، مرثیہ پڑھا، لیکن مجھے کہیں نہیں ملا کہ شدت غم میں یہ کہدیا ہو کہ بھیا آپ کے مرنے سے میری کمر ٹوٹ گئی اور راہ چارہ و تدبیر مسدود ہو گئی، عجب نہیں مصلحت یہ رہی ہو کہ ابھی میرا عباسؑ زندہ ہے، میری کمر مضبوط ہے لیکن جب کربلا میں مقتل سے آواز آئی تو حسینؑ کے ہاتھ کمر تک پہنچ گئے، بھیا عباسؑ تمہارے مرنے سے کمر ٹوٹ گئی اور راہ چارہ و تدبیر مسدود ہو گئی، بھیا! دشمن طعنے دے رہے ہیں کہ علمدار کہاں ہے؟ عباسؑ اٹھو، میں دشمنوں کو کیا جواب دوں؟..... میرے بھیا.....!

عزادارو! بیان آخری منزل تک آ گیا ہے، ایک جملہ کہہ کے مجلس کو تمام کر دینا چاہتا ہوں، صاحبانِ اولاد کا مجمع ہے، ایک لمحہ کے لئے سوچیں، آل محمدؐ کے لئے سارے صدمے ایک طرف ہیں اور کمسن بچے کی یتیمی کا خیال ایک طرف۔ ہائے وہ ماں کیا کرے جس کا دو برس کا بچہ یتیم ہو گیا ہو، وہ بی بی کیا کرے جس کی آغوش میں مرحوم شوہر کی یادگار ہو اور حسرت سے باپ کے جنازہ کو دیکھ رہی ہو، وہ اپنے والی کا ماتم کرے یا اپنے کمسن بچے کو بہلائے، غم و الم کی ماری خاتون اپنے حالات کا مرثیہ پڑھے یا اپنے بچوں کو لوریاں دے، کون سمجھ سکتا ہے کہ یہ غم کیسا ہے اور ام فروہ کے دل پر کیا گزر رہی ہے لیکن میں اتنا عرض کروں گا کہ بی بی آپ پریشان نہ ہوں، خدا رکھے ابھی حسینؑ کا سایہ قائم ہے، ابھی عباسؑ جیسا جوان موجود ہے، ابھی تسکین دینے کے لئے شہزادی زینبؑ ہیں، ابھی بچوں کو بہلانے کے لئے بی بی ام کلثومؑ ہیں، ابھی خواتین کا مجمع ہے، ابھی ہاشمی گھرانے کی عورتیں موجود ہیں، بی بی! ابھی غم ایک ہے اور غمگسار بہت، ماتم ایک ہے اور ماتم دار بہت، صدمہ ایک ہے اور تسکین دینے والے بہت، مگر اس وقت کیا کیجئے گا جب سارا ماحول غمزدہ ہوگا، جب بی بی کو دیکھا کسی کی مانگ اجڑ گئی، کسی کی گود خالی ہو گئی، کسی کا جوان بیٹا مارا گیا، کسی کا بھائی شہید ہو گیا، کسی کا سقا ذبح ہو گیا، کسی کا فدیہ میدان سے پلٹ کر نہیں آیا، ہر طرف غم، ہر طرف مصیبت، ہر طرف لاشیں، ہر طرف کوہِ الم، ایسے میں جب آپ کے لال کا پامال جنازہ آئے گا تو کیا کیجئے گا، اور جب مقتل میں آپ کی گود کے پالے کے ہاتھ چچا پر قربان ہوں گے تو کیا عالم ہوگا، اور بی بی! آج آپ کا کمسن فرزند یتیم ہوا ہے تو خدا رکھے تسکین دینے والے ہیں، بہلانے والے ہیں، گود میں کھلانے والے ہیں، مگر بی بی! جب کربلا میں سکینہ یتیم ہوگی تو اس وقت کا عالم ہی عجیب ہوگا، نہ کوئی تسکین دینے والا، نہ کوئی پرسہ دینے والا

گھر میں رہے تو خیمہ میں آگ، نکلنا چاہے تو دامن میں آگ، خاک پر بیٹھ جائے تو ظالموں کے طمانچے اور گھبرا کر باپ کی لاش کے قریب آجائے تو شمر ملعون کے تازیانے، زمین کربلا کا زلزلہ، سکینہ کی فریاد، بابا شمر نے طمانچے مارے، بابا چادریں چھن گئیں، بابا گوشوارے اتار لئے گئے، بابا خیموں میں آگ لگ گئی، بابا آپ سو رہے ہیں اور سکینہ جاگ رہی ہے، بابا وہ سینہ کہاں ہے جس پر میں سویا کرتی تھی، یہ آپ کے سینے پر تیر کیسے ہیں، یہ آپ کا جسم زخمی کیوں ہے، بابا! یہ آپ کے جسم پر سر کیوں نہیں ہے؟ بابا.....

اُف وہ بچی جو اندھیروں میں سحر ڈھونڈتی تھی
باپ کی لاش سے لپٹی ہوئی سر ڈھونڈتی ہے

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ
وَسَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ

جناب امام حسینؑ علیہ السلام

اسم مبارک	:	حسینؑ،
لقب	:	سیدالشہداءؑ،
کنیت	:	ابو عبداللہ،
والدۂ ماجدہ	:	جناب فاطمہؑ،
والدِ ماجد	:	حضرت علیؑ،
ولادت	:	۳ شعبان المعظم سنہ ۴ھ،
ازواج	:	پانچ،
اولاد	:	چھ،
شہادت	:	۱۰ محرم سنہ ۶۱ھ،
عمر شریف	:	۵۷ سال،
قبر مطہر	:	کربلائے معلیٰ،

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ اشرف الاولین والآخرین خاتم النبیین سیدنا ومولانا ابی القاسم محمد وآلہ الطیبین الطاہرین ولعنۃ اللہ علیٰ اعدائہم اجمعین اما بعد فقد قال اللہ الحکیم فی کتابہ الکریم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

إِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدَىٰ وَإِنَّ لَنَا لَلْآخِرَةَ وَالْأُولَىٰ

ارشادِ رب العزت ہوتا ہے کہ بے شک ہدایت کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے اور دنیا و آخرت کا اختیار ہمارے ہاتھوں میں ہے۔

مالکِ کائنات نے اس ذمہ داریٔ ہدایت کو ادا کرنے کے لئے ہر دور میں انبیاءؑ بھیجے، مرسلین بھیجے، کتابیں نازل کیں، شریعتیں معین کیں اور سب کا مقصد ایک رہا کہ عالمِ انسانیت راہِ راست پر آجائے اور ہدایت و رہنمائی میں کوئی کسر باقی نہ رہ جائے۔ انبیاءؑ زحمتیں برداشت کریں یہ گوارہ ہے، مرسلین پتھر کھائیں یہ گوارہ ہے۔ اولیاء خدا کانٹوں پر چلیں یہ گوارہ ہے، صادق و صدیق بندے جھٹلائے جائیں یہ گوارہ ہے، آدمؑ جنت چھوڑ کر دنیا میں آجائیں یہ گوارہ ہے، نوحؑ طوفانوں میں رہیں، ابراہیمؑ آتشِ نمرود میں جائیں یہ گوارہ ہے۔ موسیٰؑ نیل کی موجوں میں رہیں یہ گوارہ ہے، عیسیٰؑ تہمتِ عصمتِ مادر سے دوچار ہوں یہ گوارہ ہے، مرسلِ اعظمؐ مکہ کی گلیوں میں لہولہان ہو جائیں یہ گوارہ ہے لیکن انسانیت بے راہ ہو جائے یہ گوارہ نہیں ہے، عالمِ بشریت بے ہادی رہ جائے یہ برداشت نہیں ہے، بندوں کی حجت خدا پر تمام ہو جائے یہ ممکن نہیں ہے۔ ادھر سے قرآن آئے گا تو "ھدی للمتقین" بن کر، رسولؐ آئیں گے تو "بشیراً و نذیراً" کا مصداق بن کر، ولی و امام

آئیں گے تو "لکل قوم ہاد" کا نمونہ بن کر، یہ پورا نظامِ ہدایت ہے اور یہ پورا سلسلۂ رہنمائی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ گمراہی ابتدائی منزلوں میں رہتی ہے تو رہنما ابتدائی کمالات کا حامل ہوتا ہے اور گمراہی آخری منزلوں میں پہنچ جاتی ہے تو رہنما بھی صاحبِ معراج ہوتا ہے۔

آدمؑ کے دور میں گمراہوں کی تعداد قلیل تھی تو انھیں اسماء کا علم دیکر بھیجا گیا تھا، نوحؑ کے دور میں یہ تعداد بڑھی تو انھیں طوفانوں سے ٹکرانے کی طاقت دیدی گئی، ابراہیمؑ کے دور میں حالات اور شدید ہوئے تو انھیں آگ کو گلزار بنانے کی صلاحیت دیدی، موسیٰؑ کو موجوں سے کھیلنے کا حوصلہ دیا تو عیسیٰؑ کو مصائب جھیلنے کا دم دیا۔ سرورِ کائنات کا دور آتے آتے گمراہی منزلِ کمال کو پہنچ گئی، اب ابراہیمؑ کے دور کے پتھر بھی خدا ہیں، موسیٰؑ کے دور کے جانور بھی خدا ہیں، عیسیٰؑ کے دور کے انسان بھی خدائی کے دعویدار ہیں اور کوئی مخلوق ایسی نہیں ہے جسے خدائی منصب نہ ہو، اور کوئی انسان ایسا نہیں ہے جو جہالت کے سمندر میں غرق نہ ہو، افراد جاہل نہیں ہیں زمانہ جاہلیت کا ہے، سماج جاہل نہیں ہے عالم غرقِ جہالت ہے۔ ایسے دور میں ضرورت تھی کہ کوئی ایسا رہنما آئے جو ہر ضلالت سے ٹکر لے سکے اور ہر طوفان کو فنا کر سکے اس میں نوحؑ کا حوصلہ بھی ہو، ابراہیمؑ کا استقلال بھی ہو، موسیٰؑ کی ہمت بھی ہو، عیسیٰؑ کا کردار بھی ہو اور یہ سب ان سب سے بالاتر ہو کہ اپنے دور کا باقاعدہ مقابلہ کر سکے اور قیامت یہ ہے کہ اس کا دور بھی قیامت تک کا دور ہے، اس کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے ضرورت ہے کہ اسمیں وہ تمام صلاحیتیں اور وہ تمام حوصلے موجود ہوں جو قیامت تک کے لئے کافی ہوں اور اس کے پاس وہ تمام کمالات ہوں جن کا جواب صبح قیامت تک ممکن نہ ہو سکے۔ اور یہی وجہ تھی کہ خالقِ کائنات نے

نے ہر اس کمال سے نوازا جس کا قیامت تک کوئی امکان نہ تھا اور ہر وہ اعجاز عطا کیا جس کی راہ پر دنیا کے چلنے کے امکانات تھے، قرآن جیسی کتاب دیدی تاکہ قیامت تک علم کیلئے چیلنج رہے، چاند کے ٹکڑے کرا دیئے تاکہ آسمان نوردی کیلئے چیلنج رہے صاحب معراج بنا دیا تاکہ سرعت رفتار پر نازاں انسان بھی سر تسلیم جھکاتا رہے جاہلیت زدہ تاہم دور میں عرش اعظم تک بلا کے معراج دینے کا منشاء یہی تھا کہ آنے والی دنیا بھی اندازہ کرے کہ شمس و قمر و مریخ کی سیر کا حوصلہ پیدا کرنا اور ہے اور ایک رات میں سارے عالم کو زیر قدم رکھ لینا اور ہے۔

سرورِ کائنات تک یہ سلسلۂ ہدایت اسی انداز سے پہنچا اور پروردگار نے حالات کے مطابق ہادی اور رہنما بھیجے اور انھیں کے تقاضوں کے مطابق انکی صلاحیتیں مقرر کیں، خود اعلان فرمایا "ہم نے رسولوں میں بھی بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اور سب کو یکساں نہیں بنایا" اور اس منزل پر کہنے کو جی چاہتا ہے کہ جب اللہ والے ایک جیسے نہ ہو سکے تو امت والے کیسے برابر ہو جائیں گے اور جب انبیاء ایک مرتبہ کے نہ ہو سکے قرآن کے اصحاب میں سب ہم مرتبہ کیسے ہو جائیں گے۔؟ انبیاء کو ہم مرتبہ سمجھنا مرسل اعظمؐ کی توہین ہے اور امت کو ہم رتبہ سمجھنا آل محمدؐ کی توہین ہے!

مالک کائنات نے جاہلیت کے آثار کو دیکھ کر مرسل اعظمؐ جیسا کامل و اکمل پیغمبر بھیجدیا لیکن کیا ۲۳ سال میں سارا زمانہ راہِ راست پر آگیا، کیا جاہلیت فنا ہو گئی، کیا کفر و شرک کا جذبۂ انتقام ختم ہو گیا، کیا نفاق کی چنگاریاں بجھ گئیں۔؟؟ ہرگز نہیں! تو اگر ایسا نہیں ہے اور جاہلیت اور جہالت کے اثرات باقی ہیں تو کیا خدا نے اپنے نظام ہدایت کو معطل کر دیا ہے اور اب مرسل اعظمؐ

کے بعد کی امت سے کوئی ہمدردی و محبت نہیں ہے، وہ سب کو تباہ و برباد ہی دیکھنا چاہتا ہے اور اس کا منشاء یہی ہے کہ تم میرے پیغمبرؐ کے بعد کیوں پیدا ہوئے، اب یونہی تباہ و برباد ہو جاؤ تاکہ میں تمھیں داخل جہنم کر دوں اور اگر یہ ظلم موجود نہیں ہے تو قدرت نے نظام ہدایت کے بارے میں کیا کیا؟ کیا بدترین حالات میں قوم کو اسی کے حال پر چھوڑ دیا اور یہ طے کر دیا کہ جذبۂ انتقام سے خالی سماج کو خاتم النبیینؐ جیسے راہنما کی ضرورت ہے اور جذبۂ بغض و حسد و انتقام سے لبریز ماحول کے لئے جاہل، گنہگار، خطاکار راہنما کافی ہیں؟ (العیاذ باللہ) ایسا تو سوچا بھی نہیں جا سکتا تو ماننا پڑیگا کہ جیسا دور تھا اس نے ویسے ہی راہنما معین کئے۔ اور جیسا زمانہ آیا ویسے ہی ہادی مقرر کئے، اگر جاہلیت کے ماحول میں سب سے بہتر پیغمبرؐ کو قانون کا ذمہ دار بنا کر بھیجا تو جذبۂ انتقام سے لبریز ماحول کے لئے محافظ قانون بھی ایسے ہی افراد کو بنایا جن میں سارے انبیاء کی صلاحیتیں، سارے مرسلین کے کمالات، ساری کتابوں کا علم اور سارے قوانین کی جامعیت پائی جاتی تھی، ان کا پہلا ہی وہ تھا جس کے لئے پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا تھا کہ اگر آدمؑ کا علم دیکھنا ہے نوحؑ کا تقویٰ دیکھنا ہے، ابراہیمؑ کی خلّت دیکھنا ہے، موسیٰؑ کی ہیبت دیکھنا ہے، عیسیٰؑ کا زہد دیکھنا ہے، ایوبؑ کا صبر دیکھنا ہے، یوسفؑ کا حسن و جمال دیکھنا ہے تو علیؑ کے چہرے پر نظر کرو، یہاں سارے انبیاء کے کمالات نظر آجائیں گے، سارے مرسلین کا جلال و جمال نظر آجائیگا، اور انبیاء و مرسلین کا کیا ذکر ہے، اس کے چہرے میں الٰہی جلال و جمال کا پرتو نظر آئیگا، زبان اس کی ہو گی لیکن لسان اللہ ہو گی، پہلو اس کا ہوگا لیکن جنب اللہ ہو گا، ہاتھ اس کا ہو گا لیکن ید اللہ ہو گا، چہرہ

اس کا ہوگا لیکن وجہ اللہ ہوگا اور نفس اس کا ہوگا لیکن نفس اللہ ہوگا۔

اس کے بعد جب حالات منقلب ہوں گے اور افق شریعت پر گمراہی کے بادل چھا جائیں گے، جاہلیت دوبارہ سر اٹھائے گی، اسلام کے نام پر کفر کی تبلیغ ہوگی، حلال محمدؐ کو حرام اور حرام محمدؐ کو حلال بنایا جائیگا تو ایسے راہنما کو معین کیا جائیگا جس میں سارے انبیاء کے کمالات بدرجہ اتم موجود ہوں گے اور ہر شخص اس کے بارے میں اقرار کریگا، آدمؑ کے وارث تجھ پر سلام، نوحؑ کے وارث تجھ پر سلام، موسیٰؑ کے وارث تجھ پر سلام، عیسیٰؑ کے وارث تجھ پر سلام، محمد مصطفےٰؐ کے وارث تجھ پر سلام، ابنائے خدیجہؑ کے وارث تجھ پر سلام، صبر زہراؑ کے وارث تجھ پر سلام۔

اور عزیزانِ گرامی! امت ہی کیا ذکر ہے، خود پیغمبر بھی ڈیوڑھی پر آئیں گے تو سلام ہی کریں گے، گھر میں رہے گا تو سلام کریں گے، باہر نکلے گا تو دوش پر بٹھا کر ناقہ بنیں گے، مسجد میں آجائیگا تو سجدہ سے سر نہ اٹھائیں گے، منزلِ جہاد میں رہیگا تو صبر و ثبات کو دیکھ کر تحسین و آفرین کے کلمات کہیں گے، زندہ رہیگا تو اس پر نثار ہوں گے اور شہید ہو جائیگا تو سر کے بال بکھرا دیں گے، آغازِ حیات دیکھیں گے تو "حسین منی" کہیں گے اور انجامِ عمل پر نگاہ ڈالیں گے تو "انا من الحسین" کہیں گے۔

آج مختصر لفظوں میں اسی حسینؑ کا تذکرہ کرنا ہے جو انبیاءؑ کا وارث، قرآن کا محافظ، حرمتِ کعبہ کا پاسبان، اسلام کا ذمہ دار، پیغمبر اکرمؐ کا لال، علیؑ کا نورِ نظر، فاطمہؑ کا لختِ جگر، دوشِ رسولؐ کا سوار، دامانِ انبیاءؑ کا آئینہ دار، تبلیغِ اسلام کا جوہر، کمالاتِ کبریا کا مظہر، جمالِ رسولؐ کا جواب، جلالِ علیؑ کا شباب، عرصۂ کربلا کا خطیب، فتحِ مرتضیٰؑ کا نقیب، قلبِ رسالت کا چین اور سلسلۂ امامت

کا حسینؑ ہے۔

حسینؑ کی زندگی کا ایک مختصر سا خاکہ یہ ہے کہ ۳ شعبان ۴ھ کی صبح کو فاطمہ زہراؑ کی آغوش میں آئے، نانا کی زبان چوسی، باپ کی گود میں رہے، بھائی کے ساتھ کھیلے، ۵ھ میں خندق کا معرکہ دیکھا، ۷ھ میں خیبر کی فتح دیکھی، ۸ھ میں فتح مکہ کا منظر دیکھا، ۹ھ میں مباہلہ کے میدان میں گواہِ رسالت بن کر آئے، ۱۰ھ میں زیرِ کساء آکر مرکزِ تطہیر بنے، ۱۱ھ میں ۲۸ صفر کو نانا کا غم دیکھا اور ۱۳ جمادی الاولیٰ کو ماں کا صدمہ اٹھایا، ۲۵ سال تک باپ کے ساتھ خانہ نشین رہ کر خلافتوں کے حالات کا جائزہ لیا، گھر میں جمع قرآن کا منظر دیکھا، باہر جانے والوں پر شب کی یورش کا مشاہدہ کیا، اور سب کے ساتھ باپ کا صبر و استقلال بھی دیکھتے رہے، سقیفہ کی بیعت دیکھی، فدک میں گواہ بن کر گئے تو ارث کی تکذیب کی مصیبت دیکھی، گھر پر آگ اور لکڑیاں دیکھیں، اسلامی فتوحات کے نام پر ہمدردوں کی پامالی دیکھی، بنو امیہ کی پرورش کا منظر دیکھا، بنی ہاشم اور ان کے پرستاروں کا قتل عام دیکھا، آخری دور میں حاکم وقت کا محاصرہ دیکھا اور باپ کے رحم و کرم کا مشاہدہ کیا، خلیفہ سوم کے بعد باپ کے ہاتھوں پر بیعت کرنے والوں کا ہجوم دیکھا، اور جمل و صفین و نہروان کے معرکے دیکھے اور فقط دیکھے نہیں بلکہ ان میں شریک بھی رہے، ۴۰ھ میں باپ کی شہادت دیکھی، ۴۱ھ میں بھائی کی صلح دیکھی، صلح کے بعد اس کا انجام دیکھا، دس سال تک بھائی کی طرف سے صلح کی پابندی دیکھی، ۵۰ھ میں بھائی کی شہادت اور جنازہ کی بے حرمتی دیکھی، ۶۰ھ تک دس سال بھائی کی صلح کو نباہتے رہے اور رجب ۱۵ رجب ۶۰ھ کو شام کے حاکم کی وفات ہوئی اور حالات نے انگڑائی لی اور جو کام ۱۱ھ میں ہوا تھا یعنی پیغمبرؐ کے بعد

امیر المومنینؑ سے مطالبہ بیعت کیا گیا تھا وہی کام ۶۰ھ میں ہوا اور امام حسینؑ نے طے کرلیا کہ جیسے میں نے آج تک بزرگوں کی روش سے علیحدگی نہیں اختیار کی تو آج علیحدگی کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔ مجھے ثابت کردینا ہے کہ میں بھائی کے صلح کے احترام میں خاموش تھا ورنہ مجھ میں نانا کا عزم، دادا کا حوصلہ، ہاشم کا خون، عبد المطلب کا جوش سب سلامت ہے ۔

صبر زہراؑ کا تقاضہ تھا جہاں تک تھا خموش
ورنہ پہلو میں دلِ حیدرِ کرار بھی ہے (پیام)

ان واقعات کی تفصیل پر اس لئے روشنی ڈالی گئی ہے کہ آپ ایک نظر واقعات پر ڈال لیں اور یہ دیکھ لیں کہ حسینؑ بن علیؑ کی زندگی کس سرد و گرم سے گزری ہے نانا کے ساتھ رہے تو خیبر و خندق کی جنگ بھی دیکھی اور حدیبیہ کی صلح بھی، حنین کے حملے بھی دیکھے اور فتح مکہ کی عمومی معافی بھی، نانا کے بعد دروازہ پر آگ اور لکڑیاں بھی دیکھی ہیں اور سرِ دربار ماں کا عظیم الشان خطبہ بھی، ان کے بعد حکومتوں کا جبر و تشدد بھی دیکھا ہے اور باپ کی مشکل کشائی بھی، خلیفۂ ثالث کی خاندان پرستی بھی دیکھی ہے اور باپ کا رحم و کرم بھی، خلیفۂ ثالث کے بعد جمل کی جنگ بھی دیکھی ہے اور باپ کا دشمن کو با احترام واپس کر دینا بھی، صفین کا معرکہ بھی دیکھا ہے اور قرآن کے نام پر جیتی ہوئی جنگ کا چھوڑ دینا بھی، نہروان میں خوارج کی بغاوت بھی دیکھی ہے اور مسجد کوفہ میں باپ کا قاتل کو بیدار کر کے سجدۂ آخر کرنا بھی، ابن ملجم کی گرفتاری بھی دیکھی ہے اور باپ کا شکمیں کھلوا دینا بھی، باپ کے بعد بھائی کا عزم جہاد بھی دیکھا ہے اور مصلحت اسلام کی خاطر باپ کے قاتل سے صلح کر لینا، شام کی طرف سے تلوار کی پامالی بھی دیکھی ہے اور بھائی کی طرف سے پابندی بھی۔

باپ پر سب و شتم بھی دیکھا ہے اور بھائی کا صبر و ثبات بھی۔ ۵۰ھ میں بھائی کی شہادت بھی دیکھی ہے اور جنازہ پر تیر بھی، بھائی کے بعد مسلسل دس سال تک شام کے حملے بھی دیکھے ہیں اور اپنا صبر و استقلال بھی، یہاں تک کہ ۶۰ھ کی ۲۸ رجب کو اٹھے اور ۶۱ھ کی دس محرم کو بہتر ساتھیوں کے ساتھ راہ خدا میں قربان ہو گئے۔ امام حسینؑ نے چار دور تک سرد و گرم زمانہ کا جائزہ لیا، نانا کے ساتھ رہے، ماں کے حالات دیکھے۔ باپ کا زمانہ دیکھا، بھائی کا دور دیکھا، اور ہر دور میں مختلف حالات دیکھے، اب اگر حسینؑ کا اپنا کوئی مزاج ہوتا تو کسی منزل پر تو بزرگوں سے اختلاف کرتے، جنگ کا مزاج ہوتا تو نانا کی صلح کو روکتے، ماں کے صبر کو روکتے، باپ کے سکوت کو روکتے، بھائی کی صلح کو روکتے اور صلح کا مزاج ہوتا تو خندق و خیبر و حنین کے مواقع پر مچل جاتے، ماں کے مطالبہ فدک کو روکتے، باپ کے جمل و صفین و نہروان کے معرکوں پر پابندی عائد کرتے، بھائی کی جنگ کی تیاریوں پر ہاتھ پکڑ لیتے، لیکن تاریخ گواہ ہے کہ ایسا کچھ نہیں ہوا، اور جس کے ساتھ رہے اس کے عمل کے پابند رہے اور بھائی کے تو مرنے کے بعد بھی دس سال تک ان کی صلح پر قائم رہے اور جنگ کا نام نہیں لیا، جھوٹے ہیں وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ حسنؑ و حسینؑ کے مزاج میں فرق تھا، حسنؑ مزاجاً طبعاً صلح پسند تھے اور حسینؑ کے مزاج میں حرارت تھی۔ اسی لئے امام حسنؑ نے صلح کرلی، اور امام حسینؑ کربلا کے میدان میں آگئے۔ ان زنگ خوردہ ذہنوں سے کہہ دو کہ کب تک حقائق کا انکار کرتے رہیں گے اور کب تک واقعات پر پردہ ڈالتے رہیں گے یاد رکھیں کہ جس کے مزاج میں حرارت ہوتی ہے وہ اتنی خاموشی سے زندگی نہیں گزارتا ہے اور جس کی طبیعت میں جنگ پسندی ہوتی ہے وہ باپ پر سب و شتم سن کر بھائی کی صلح کی پابندی نہیں کرتا۔ حسینؑ کا مزاج نہ جنگ کا مزاج تھا نہ صلح کا، حسینؑ کا مزاج مشیت کا

مزاج تھا جب جو مشیت پروردگار ہوتی حسینؑ نے وہی اقدام کیا، بزرگوں کے دور میں وہ ترجمان مشیت تھے، حسینؑ ان کے اقدام میں برابر کے شریک رہے، بزرگوں کے بعد حسینؑ وارث مزاج مشیت بنے تو ان کے مصالح پر قدم اُٹھایا، حسینؑ کا مزاج پہچاننا ہے تو بچپنے میں دوش رسولؐ اور پشت رسولؐ پر دیکھو، رسولؐ مشیت الٰہی کا پابند ہے، حسینؑ کا مزاج ذرہ برابر مشیت سے الگ ہوتا تو نہ رسولؐ دوش پر بٹھا کر زلفیں حوالے کرتے نہ پشت پر بٹھا کر سجدہ کو طول دیتے۔ یہ سجدہ کو طول اس لئے دیا جا رہا ہے کہ دنیا پہچان لے کہ جو حسین کا مزاج ہے وہ شریعت کا مزاج ہے اور یہ زلفیں اسی لئے دی گئی ہیں کہ نافہم دیکھ لیں کہ جو حسینؑ کا ارادہ ہے وہی مشیت کا حوصلہ ہے۔

سوال یہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ جب حسینؑ کے مزاج میں اور بزرگوں کے مزاج میں فرق نہیں تھا تو حسینؑ خاموش کیوں نہیں رہے اور جنگ کے لئے کیوں اٹھ کھڑے ہوئے اور اتنی بڑی قربانی کیوں دیدی؟ لیکن مجھے اتنا ہی کہنا ہے کہ یہ بھی بزرگوں ہی کے مزاج کا اثر تھا، وہ بدر واُحد، خندق وخیبر وحنین میں اُٹھے، وہ جمل وصفین ونہروان میں اُٹھے، وہ جنگ کے مختلف محاذوں پر اٹھے، اور یہ کربلا کے محاذ پر اٹھے۔ مزاج کا اختلاف ہوتا تو ایسا اتحاد کیوں ہوتا؟ اب اگر ان سب کا اقدام صحیح ہے تو حسینؑ کا اقدام بھی صحیح ہے، اگر حسینؑ کا اقدام غلط ہے تو ان سب کا اقدام بھی غلط ہے (معاذ اللہ)

آپ کہیں گے کہ ان سب کی جنگ میں اور حسینؑ کی جنگ میں ایک فرق تھا، مرسل اعظمؐ کی جنگیں مکہ سے دور مدینہ سے قریب حضورؐ کے علاقہ میں ہوئی ہیں، اور مولائے کائنات کے مجاہدات شام سے دور کوفہ سے قریب علیؑ کے علاقہ میں ہوئے ہیں لیکن کربلا تو حسینؑ کا علاقہ نہیں تھا۔ بزرگوں کی جنگ کو دفاعی کہا

جاسکتا ہے لیکن حسینؑ کی جنگ کو دفاعی نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن ارباب کرم! اوّلاً تو رسول اکرمؐ اور مولائے کائنات میدانوں میں خود گئے تھے لیجائے نہیں گئے تھے لہٰذا ان پر یہ الزام زیادہ عائد ہوسکتا ہے، امام حسینؑ تو حر کے رسالہ کے ذریعہ لیجائے گئے تھے، ان پر یہ الزام کیوں کر عائد ہوسکتا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ امام حسینؑ کی دور اندیشی اور نگاہِ امامت کی وسعت تھی کہ آپ نے سرزمین کربلا پہنچ کر پہلا کام یہ کیا کہ اہلِ قریہ کو بلا کر ان سے زمین کو خریدلی اور زمین کو خرید کر قیامت تک کے لئے مسئلہ کو صاف کر دیا کہ خبردار اب یہ نہ کہنا کہ میں اپنے نانا کی سیرت سے الگ ہوگیا ہوں، میں نے نانا ہی کی سیرت کا ایک حسین نمونہ پیش کیا ہے، وہ فقط علاقوں پر حملہ کرنے والوں سے لڑے تھے اور میں نے تو ان سے جہاد کیا ہے جو میری زمین پر آگئے تھے، یاد رکھو کربلا کا جہاد کسی غیر کی زمین پر نہیں ہے، یہ جہاد حسین کی زمین پر ہے اسلئے دنیا کی ہر طاقت پر جارحیت کا الزام لگایا جاسکتا ہے لیکن حسینؑ پر یہ الزام نہیں لگایا جاسکتا۔

دوسرا ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ امام حسین کے حالات بزرگوں کے حالات سے قدرے مختلف تھے اور امام حسنؑ کے حالات سے تو قطعاً مختلف تھے، امام حسنؑ کے حالات میں صلح کرنا ہی عین اسلام تھا اس لئے امام حسینؑ صلح میں شریک رہے اور امام حسینؑ کے دور میں جنگ کرنا ہی واجب تھا، اسلئے امام حسنؑ نے قاسم کو وصیت کر دی تھی کہ بیٹا جب بھی تیرے چچا پر کوئی وقت پڑ جائے تو اپنے چچا پر قربان ہو جانا، تاکہ میری صلح میں حسینؑ کی شرکت رہے اور ان کی جنگ میں میری شرکت ہو جائے۔

حالات کے فرق کو سمجھنا ہے تو تاریخ اسلام کے ایک واقعہ پر نگاہ کرنا ہوگی، جس کے بغیر بدلے ہوئے حالات میں اقدام کی نوعیت کا اندازہ ممکن نہیں ہے۔ دنیائے اسلام میں مباہلہ کا واقعہ کسے نہیں معلوم، کون نہیں جانتا کہ ۹ھ میں حضور سرورِ کائنات سے اور عیسائیوں سے بڑا سخت مقابلہ ٹھہرا۔ اور یہ مقابلہ تیر و شمشیر کا نہ تھا بلکہ حق و صداقت، علم و آگہی اور بندگی اور فرزندی کا مقابلہ تھا۔ تیر و شمشیر کے مقابلہ میں بظاہر ہار جانا بھی عیب نہیں ہوتا اس پر کسی نہ کسی جہت سے مظلومیت کی چھاپ لگا دی جاتی ہے لیکن علم و دانش اور حق و صداقت کی جنگ میں ہار جانا قانون کی فنا اور مذہب کی بربادی کے مترادف ہے۔ دنیا میں بے شمار افراد ہیں جو حملہ کرنے کے بعد بھی جب ہار جاتے ہیں تو اپنی ہار کو تسلیم کر کے جارحیت پر مظلومیت کا لیبل لگا دیتے ہیں، لیکن مقام بحث میں یہ پسند نہیں کرتے کہ انہیں ظالم و جارح اور باطل پرست کہدیا جائے گا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تیر و شمشیر کا معرکہ آسان ہوتا ہے اور علم و آگہی کا معرکہ سخت۔ تلوار کا زخم جلدی بندمل ہو جاتا ہے اور زبان کا زخم کبھی بندمل نہیں ہوتا، خصوصیت کے ساتھ اسلام کے ساتھ تو یہ معرکہ اور بھی سخت ہے، وہ تیر و شمشیر کا مذہب نہیں ہے علم و دانش کا مذہب ہے، اس کی نظر میں تخت و تاج، حکومت و ملک گیری اقتدار و اختیار کوئی شے نہیں ہے، وہ دنیا کو عقائد کی تعلیم اور صحیح نظریات کی تلقین کرنے کے لئے آیا ہے، وہ اس دن اپنی فتح نہیں سمجھتا جب دشمن تہ تیغ ہو جائے بلکہ وہ اس دن کو فتح مبین سمجھتا ہے جب اصول کی فتح ہو اور ظلم و ذلت والوں کو عظمتِ کردار کا اقرار کرنا پڑے۔ ایسے حالات میں مباہلہ کا مقابلہ اسلام کی موت و حیات کا مقابلہ تھا، اسلام شکست کھا جائے تو اسے روئے زمین پر رہنے کا حق نہیں ہو۔

اور عیسائیت ہار جائے تو اسے چلو بھر پانی میں ڈوب مرنا چاہیئے۔ مسئلہ بے حد نازک ہے، عیسائیت کا دعویٰ ہے کہ عیسیٰ اللہ کے بیٹے ہیں اور اسلام کا دعویٰ ہے کہ عیسیٰ اللہ کے بندے ہیں، عیسائیت کی نگاہ میں توحید بے قیمت ہے اور اسلام کی نگاہ میں توحید ہی اصل مذہب اور جانِ عقیدہ ہے۔ ایسے سخت موقع پر عیسائیوں نے اپنے علم و عقل کے غرور میں اسلام کے دربار پر سرد حملہ کر دیا، اور پیغمبر اسلام کی خدمت میں یہ ثابت کرنے کے لئے آگئے کہ عیسیٰ اللہ کے بیٹے ہیں بندے نہیں، سوال یہ ہے کہ اگر اللہ کے بیٹے بھی ہیں تو آپ مانیے، کون آپ کو منع کرتا ہے آپ تو صدیوں سے مانتے چلے آرہے ہیں۔ خود رسول اعظم کی زندگی میں تقریباً ۹ برس سے آپ مان رہے ہیں، کہاں پیغمبر نے آپ پر حملہ کر دیا، کون سی جنگ آپ سے کی، کس کو تلوار ماری، کس کو نیزہ چبھو دیا، یہ آج کیا ہو گیا ہے کہ آپ اپنے وطن سے مدینہ چلے آئے ہیں اور یہ ضد ہے کہ پیغمبر بھی عیسیٰ کو اللہ کا بیٹا مان لیں، یہ چھیڑ چھاڑ کر لڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر پیغمبر نہیں مانیں گے تو آپ کے عقیدہ پر کیا اثر پڑے گا، اور آپ کا مذہب کہاں باطل و برباد ہو جائے گا لیکن نہ جانے کیا راز تھا کہ عیسائیت کو اس کے وطن میں قرار نہیں آیا اور بالآخر دیارِ اسلام میں آگئے۔ قدرت نے حالات کی نزاکت کو دیکھ کر آیتوں پر آیتیں نازل کیں، عیسیٰ کی مثال آدم جیسی ہے جب آدم بغیر ماں باپ کے پیدا ہو کر اللہ کے بیٹے نہ ہو سکے تو عیسیٰ صرف باپ کے بغیر پیدا ہو کر کیوں کر ابن اللہ ہو سکتے ہیں۔ آیتیں نازل ہوئیں لیکن عیسائی اپنی ضد پر اڑے رہے اور حوصلہ یہ رہا کہ اسلام کو شکست دے کر توحید کو پارہ پارہ کر دیں گے۔ قدرت کی تیوریوں پر بل آگئے، پیغمبر! اب یہ نہیں مانتے ہیں تو آج سے مباہلہ کے لئے کہدو، وہ اور تم دونوں مل کر ہماری بارگاہ میں جھوٹوں پر

لعنت کرو، جو جھوٹا ہوگا ہم اسے ہلاک و برباد کردیں گے۔ پیغمبرؐ نے مباہلہ کی پیشکش کردی، عیسائیوں نے غرورِ حقانیت میں اسے قبول کرلیا، اور دوسرے دن مباہلہ کی بات طے ہوگئی۔

واقعہ پر تبصرہ کرنے سے پہلے یہ عرض کردینا ضروری ہے کہ میں نے تاریخ میں یہ واقعہ پڑھا تو مجھے بیحد تعجب ہوا کہ آخر مباہلہ کا کیا مطلب ہے؟ یہ بددعا کی لڑائی کیسی لڑائی ہے، مٹھی بھر عیسائی اپنے وطن سے دور آئے ہوئے ہیں۔ یہاں مسلمانوں کا ہجوم ہے، ایک سے ایک جری، ایک سے ایک ساونت، ایک سے ایک سورما، ایک سے ایک غازی، حضور تلوار اٹھائیے اور سب کا خاتمہ کردیجئے حقیقت کو مانیں یا داخلِ جہنم ہوجائیں، یہ مباہلہ وغیرہ کیا چیز ہے؟

پیغمبرؐ فرمائیں گے، تو نے مصلحت کو پہچانا نہیں، اسلام تیر و شمشیر کا مذہب نہیں ہے، عیسائی طاقت کے بھروسے پر آئے ہوتے تو اب تک سب کا خاتمہ ہوگیا ہوتا۔ یہ علم و دانش کے اعتماد پر آئے ہیں لہٰذا ان سے علمی مقابلہ ہی ہوگا۔ ایسا نہ ہو کہ کل انھیں یہ موقع مل جائے کہ اسلام کے پاس علم و حق نہیں تھا، اس لئے تلوار پر اتر آیا میں مباہلہ کروں گا اور جارحیت کا الزام نہ لوں گا۔ وہ جاہل ہوتے ہیں جو علمی مسائل میں تلوار اٹھالیا کرتے ہیں، میری سیرت یہ ہے کہ علم کا جواب علم سے دیا جائے تلوار سے نہیں۔ اب اگر کوئی علمی میدان میں تلوار اور تازیانہ سے کام لیتا ہے تو اسے وارثِ رسول نہیں کہا جاسکتا، اور وہ میری سیرت سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔

مباہلہ ہوا، تلوار نہیں اٹھی اور عیسائیوں نے شکست کا اعتراف کیا، اور مجھے کہنا پڑا کہ کس قدر بے شرم ہے وہ قوم جس کے مقابلہ میں کبھی تلوار نہیں

اٹھی اور وہ اسلام پر بزورِ شمشیر پھیلنے کا الزام لگارہی ہے۔ کاش یہ بات کفار و مشرکین نے کہی ہوتی تو کوئی پہلو نکل بھی سکتا۔ یہ عیسائی کس منہ سے کہہ رہے ہیں جنھوں نے بغیر تلوار کے اٹھے ہوئے اپنی شکست کا اقرار کرلیا تھا۔

مباہلہ کی صبح آئی، مرسلِ اعظمؐ بیت الشرف سے برآمد ہوئے۔ انگلی پکڑے ہوئے امام حسنؑ، گود میں امام حسینؑ۔ رسول اکرمؐ کے پیچھے معصومۂ عالمؑ اور ان کے پیچھے مولائے کائناتؑ۔ نہ کوئی صحابی، نہ کوئی زوجہ، نہ کوئی ساونت، نہ کوئی ہم آزما، نہ کوئی شہسوار۔ پہچان لیجئے کہ اسلام کے محافظ کون ہیں اور دینِ الٰہی کی حقانیت پر وقت پڑتا ہے تو کون کام آتا ہے؛ یہاں غلاموں کا ذکر نہیں ہے۔ وہ تو آقا کے ہوتے ہوئے ضرورت ہی نہیں محسوس کرتے، اور اپنے کو مرضیِ مولا کا پابند سمجھتے ہیں ان کا ذکر ہے جنھیں محافظِ اسلام اور پاسبانِ شریعت بننے کا شوق ہے اور جن کے دامنِ صداقت پر کوئی ایسا دھبّہ ہے کہ پیغمبرِ اسلامؐ مباہلہ میں لیجانے سے گریز کررہے ہیں بلکہ مجھے تو کہنا پڑتا ہے کہ جس کی صداقت مباہلہ میں جانے کے لائق نہ ہو وہ اسلام میں سچا مسلم ہوجائے اور جسے مباہلہ کا فاتح اور رسالت کا مصداق قرار دیا جائے اس کی گواہی ناقابلِ اعتبار ہوجائے، ایسے مسلمانوں سے تو عیسائی بہتر تھے کہ انھوں نے صداقتِ آلِ محمدؐ کو پہچان لیا تھا، مسلمان تو آج تک بھی نہیں پہچان سکے۔

میدان میں قدم رکھنا تھا کہ عیسائی عالم نے آواز دی۔ خبردار مباہلہ نہ کرنا، یہ وہ چہرے ہیں کہ اگر خدا سے دعا کردیں تو پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ جائیں، یہ بددعا کردیں گے تو روئے زمین پر ایک بھی عیسائی باقی نہ رہے گا۔ مباہلہ رکا، اسلام فاتح بنا، جزیہ ملا، قرآن کی آبرو بچی، توحید کا وقار قائم ہوا، رسالت

کی صداقت ثابت ہوئی، دینِ خدا کا بھرم رہا، مسلمان سربلند ہوئے اور یہ سب صدقہ ہے آلِ محمدؐ کی صداقت و حقانیت و جلالت کا۔ قیامت ہے کہ بعض مسلمان آج تک ان کی صداقت و حقانیت پر شبہ کر رہے ہیں۔

بات آگے بڑھ گئی۔ مجھے صرف یہ عرض کرنا تھا کہ جب قدرت نے سینکڑوں سال عیسائیوں کے عقیدہ کو برداشت کر لیا تھا اور عذاب نازل نہیں کیا تھا، مرسلِ اعظمؐ ساٹھ سال دیکھتے رہے، اور مقابلہ پر نہیں آئے تو آج کیا ہو گیا ہے کہ رسولؐ مباہلہ کے لئے تیار ہو گئے؟ اور قدرت عذاب نازل کرنے پر آمادہ ہے۔ اب وہ صبر کی طاقت کہاں گئی؟ اب وہ قوتِ برداشت کیا ہو گئی؟ کیا یہ کہہ دیا جائے کہ خدا کا مزاج بھی بدلتا رہتا ہے؟ کیا یہ سوچ لیا جائے کہ نبوت کے مزاج کا بھی کوئی اعتبار نہیں ہے ... یا نہیں ... بات صرف یہ ہے کہ جب تک باطل اپنے دیار میں باطل پرست رہتا ہے، حق اسے برداشت کرتا ہے اور جب حق سے اپنے باطل کو منوانے پر آمادہ ہو جاتا ہے تو مقابلہ سخت ہو جاتا ہے۔

صلحِ حسنؑ اور جنگِ حسینؑ میں یہی فرق تھا، امام حسنؑ کے دور میں باطل اپنے باطل پر اڑا ہوا تھا لیکن حق سے بیعت کا مطالبہ نہیں کر رہا تھا اور امام حسینؑ کے دور میں مطالبۂ بیعت بھی ہو گیا تھا، اسی لئے امام حسنؑ کے دور میں باطل نے صلح کر کے حکومت مانگی تو آپ نے تخت و تاج کو ٹھکرا دیا اور امام حسینؑ کے دور میں بیعت یا سر کا سوال ہو گیا تو آپ نے بیعت کو ٹھکرا کر سر دے دیا۔ جو حسنؑ نے کیا، وہ حسینؑ نے کیا۔ جو حسینؑ نے کیا وہ حسنؑ نے کیا۔

عیسائیت نے شکست مان لی لیکن دل میں جو جذبۂ انتقام پیدا ہوا وہ ناقابلِ برداشت تھا۔ مختلف راستوں سے اسلام کو مٹانے کا منصوبہ بنایا

گیا، کبھی معاویہ کے دربار میں شاہی طبیب کی شکل میں پہنچی اور ایسا زہر تیار کیا جس سے مولائے کائنات تک محفوظ نہ رہ سکے اور ابنِ ملجم کی تلوار کے ذریعہ وہ زہر حضرت علیؑ پر آزمایا گیا اور جعدہ بنتِ اشعث کے ذریعہ امام حسنؑ پر آزمایا گیا۔ اب مباہلہ کی آخری فرد امام حسینؑ باقی تھے اور عیسائیت انھیں بھی فنا کر دینا چاہتی تھی، چنانچہ حاکمِ شام کے محل میں زوجہ کی شکل میں پہنچی اور یزید جیسے منحوس فرزند کو جنم دیا۔ یزید دیہات میں عیسائی ماحول میں پلا اور شراب و کباب کا ایسا خوگر ہو گیا کہ ظاہری اسلام بھی نہ رہ گیا، اور اسی یزید کے ذریعہ امام حسینؑ کے قتل کا منصوبہ بنایا گیا، یزید کو باپ کی طرف سے نفاق ملا تھا اور ماں کی طرف سے عیسائیت۔ اور دونوں اسلام کے شدید دشمن تھے اب اسلام کے ذمہ دار تنہا امام حسینؑ تھے، چنانچہ دونوں طاقتوں نے مل کر انتقام کا منصوبہ بنایا، اور ۲۷ رجب کو امام حسینؑ کے سامنے بیعت کا سوال پیش کر دیا گیا۔ امام حسینؑ نے سوالِ بیعت کو رد کر دیا اور وطن چھوڑ کر باہر نکلنے کا عزم کر لیا۔ جس رات میں خدا کا رسولؐ معراج میں گیا تھا اس رات میں رسولؐ کا نواسہ نانا کی قبر سے لپٹا ہوا رو رہا ہے اور فریاد کر رہا ہے کہ نانا! آپ کی امت نے بہت ستایا ہے۔ اب میرے بارے میں کیا ارشاد ہوتا ہے؟

آواز آئی۔ بیٹا حسینؑ کربلا جاؤ میرے لال۔ بیٹا! تم سر کٹا دینا کہ میرا دین سربلند ہو، اور میرے لال تنہا نہ جانا، میری بیٹیوں کو ہمراہ لے کر جانا تاکہ یہ قیدی بنیں تو میرا دین آزاد ہو۔

نانا کی قبر سے اٹھ کر حسینؑ ماں کی لحد پر گئے۔ آخری سلام کیا۔ اماں! آپ کی قبر کا مجاور حسینؑ جا رہا ہے۔ اماں اپنے لال کا آخری سلام لے لو۔ قبرِ اطہر سے آواز آئی۔ میرے لال! میرا بھی سلام لے لے، حسینؑ تم تنہا نہیں

جاؤ گے۔ یہ ماں تمہارے ساتھ چلے گی، جہاں تم رہو گے وہیں یہ ماں بھی رہے گی۔ قبر سے رخصت ہو کر گھر آئے، سامانِ سفر تیار کیا، صبح کو قافلہ روانہ ہوا، ہاشمی خواتین نے شہزادیوں کو رخصت کیا، ام البنین نے اپنے فرزندوں کو خدا حافظ کہا، عبداللہ بن جعفر نے عون و محمد کو ساتھ کیا۔ محمد حنفیہ بھائی سے لپٹ کر رو دیے اور ایک کمسن بچی اپنے کمسن بھیا سے لپٹ کر رو دی۔ ام سلمہ نے حسینؑ کو خدا حافظ کہا، بیبیوں نے حلقہ بنایا، سیدانیوں کی سواری درمیان سے گزری۔ الوداع الوداع الفراق الفراق، السلام السلام کی آوازیں بلند ہوئیں۔

کیا قیامت کا منظر تھا، قبرِ رسولؐ ہل رہی تھی، زہراؑ کی لحد کو زلزلہ تھا، حسنؑ تربت میں تڑپ رہے تھے، بیبیوں میں شورِ ماتم تھا، دیکھئے اب یہ قافلہ کب آتا ہے اور ایک منادی کی آواز فضا میں گونج رہی تھی، مدینہ والو جی بھر کر دیکھ لو، اب یہ قافلہ اس شان سے نہ آئیگا، اور جب آئیگا تو لوگوں کی گودیوں میں بچے نہ ہوں گے، سروں پر وارثوں کے سائے نہ ہوں گے، ام کلثوم کی فریاد ہوگی، نانا کے مدینے ہمارے آنے کو قبول نہ کرنا، ہم لٹ کر آئے ہیں۔

چند دنوں کے بعد قافلہ مکہ پہنچا، اہلِ کوفہ نے طلب کے خطوط بھیجے، امام حسینؑ نے اپنے بھائی مسلم کو روانہ کیا۔ ۹ ذی الحجہ کو مسلم کوفہ میں شہید ہوئے اور ادھر حاجیوں کے بھیس میں قاتلوں کا قافلہ مکہ آیا۔ امام حسینؑ نے ۸ ذی الحجہ حج کو عمرہ سے تبدیل کر کے سفر شروع کیا۔

ابن عباس نے روکا، مولا! سب حج کر رہے ہیں اور آپ جا رہے ہیں؟ آپ نے فرمایا! ابن عباس میں عراق جا رہا ہوں، نانا کے حکم سے سر کٹانے جا رہا ہوں۔ عرض کی۔ فرزندِ رسولؐ! پھر عورتوں اور بچوں کو کیوں لیے جا رہے ہیں؟ فرمایا!

ابن عباس مصلحت پروردگار یہی ہے، ادھر پردۂ محمل سے زینبؑ کی آواز آئی۔ ابن عباس خاموش، خبردار! کیا چاہتے ہو، زینبؑ اپنے حسینؑ کا ساتھ چھوڑ دے، یاد رکھو! زینبؑ جب تک زندہ ہے اپنے ماں جائے کا ساتھ نہ چھوڑے گی۔

قافلہ چلا، راستہ میں شہادتِ مسلمؑ کی خبر ملی، آگے بڑھے تو حرؑ کا لشکر ملا، راستہ روکا گیا، آپ نے حر کے لشکر کو سیراب کیا اور دونوں قافلے ساتھ چلنے لگے، دوسری محرم کو سرزمینِ کربلا پر وارد ہوئے، قافلہ اترا، زینبؑ نے کہا بھیا اس مٹی سے تو آپ کے خون کی بو آتی ہے۔ فرمایا۔ بہن! بس یہی ہماری آخری منزل ہے، ہمیں یہیں شہید ہونا ہے اور تمہیں یہیں قیدی بننا ہے، وقت گزرتا رہا۔ دشمنوں کے لشکر آتے رہے۔ پانچویں سے پانی بند ہوا۔ ساتویں سے قحطِ آب ہوا، نویں کو امام حسینؑ نرغۂ اعداء میں گھر گئے۔ عصر کو حملہ کی تیاریاں ہوئیں، علمدارِ حسینیؑ نے ایک شب کی مہلت مانگی، تمام رات عبادتِ الٰہی میں بسر ہوئی۔ بیبیوں نے بچوں کو جنگ کی تلقین کی، شہزادیوں نے گود کے پالوں کو فنونِ جنگ تعلیم کئے۔ سحر کا ہنگام آیا، علی اکبرؑ نے اذانِ صبح کہی، بیبیوں نے صدائے پیمبرؐ سنی، اصحاب نے مصلے بچھائے، امامؑ نے نماز پڑھائی، فوجِ دشمن میں طبلِ جنگ بجا، حملہ شروع ہوا، تیروں کی بوچھار ہوئی، اصحاب نے حملوں کو روکا۔ چند ساعت میں تقریباً ۵۰ اصحاب کام آ گئے، ظہر کا ہنگام آیا، اصحاب کی خواہش پر صفیں قائم ہوئیں، امامؑ نے نماز پڑھائی، تیر آتے رہے، سعید و زہیر روکتے رہے اور زخمی ہوتے رہے۔ نماز کے بعد ایک ایک کر کے میدان میں گئے، حبیب، مسلم، زہیر، بریر، عابس، ہلال، حر، وہب سب کام آئے، اصحاب کے بعد دل کے ٹکڑوں کی باری آئی، اولادِ عقیل، اولادِ ابوطالب، اولادِ علیؑ سب راہِ خدا میں قربان ہو گئے۔ اکبرؑ نے برچھی کھائی، قاسم کا لاشہ پامال ہوا، عون و محمد کی لاشیں آئیں۔

عباس ترائی میں سو گئے۔ اصغرؑ کو امام حسینؑ گودی میں لے کر آئے۔ بچہ تیر حرملہ کا نشانہ بنا۔ رخصت آخر کے لئے آئے۔ بیمار بیٹے کو وصیت کی۔ میرے لال قید شام سے چھٹ کر مدینہ جانا تو ہمارے شیعوں سے ہمارا سلام کہہ دینا اور کہنا، شیعو! ٹھنڈا پانی پینا تو ہماری پیاس کو یاد کر لینا، اور کسی غریب دیے کس کا ذکر سننا تو ایسے رونا جیسے کوئی ماں اپنے لال کو تڑپ تڑپ کر روتی ہے۔ بیبیوں کو رخصت کیا۔ بہن کو بھرا گھر سونپا، بیٹی سے دامن چھڑایا، سلام آخر کر کے باہر آئے۔ اصحابؓ کو پکار کر ضعف و ناتوانی کا اعلان کیا۔ زینبؑ نے خیمہ سے نکل کر گھوڑے پر سوار کیا، سکینہ نے دامن پکڑا، بابا! مدینہ پہونچا دو۔ حسینؑ نے مرثیہ پڑھا، بیٹی مدینہ جانا ممکن ہوتا تو یہ بھرا گھر کیوں اُجڑتا؟ اور تیرا باپ مرنے کے لئے کیوں جاتا۔؟ رخصت کیا، میدان میں آئے، حملہ پر حملہ کیا، ندائے قدرت آئی، بس اے حسین بس! میرے نفس مطمئن اب پلٹ آ۔ تلوار نیام میں رکھی، پشت زین پر سر جھکایا، حملے شروع ہوئے۔ تیر۔ تلوار، نیزہ، پتھر، زخموں سے چور ہو کر گھوڑے سے گرے۔ ذوالجناح نے جھک کر سہارا دیا۔ تیروں نے اُٹھ کے استقبال کیا۔ خاکِ کربلا تک پہونچے۔ سجدہ آخر میں پیشانی رکھی، مناجات کا سلسلہ شروع ہوا۔ پروردگار! حسین تیری مرضی پر راضی ہے۔ تیرے حکم کے سامنے سر تسلیم جھکائے ہوئے ہے، میرے معبود! میں نے اپنا وعدہ وفا کر دیا۔ اب تو نانا کی اُمت کا خیال رکھنا۔ مناجات تمام ہوئی، شمر کا خنجر چلا۔ زینبؑ نے پسر سعد کو آواز دی۔ پسر سعد! میرا منجایا ذبح ہو رہا ہے اور تو کھڑا دیکھ رہا ہے۔ زمین کربلا ہلی، سیاہ آندھیاں چلیں، آفتاب کو گہن لگا۔ صحرا میں زہراؑ کی فریاد کی آواز گونجی۔ آسمان سے منادی نے پکار کر کہا۔

اَلَا قُتِلَ الْحُسَیْنُ بِکَرْبَلَا اَلَا ذُبِحَ الْحُسَیْنُ بِکَرْبَلَا۔

زینبؑ تڑپ کے عابد بیمار کے قریب آئیں، میرے لال آنکھیں کھولو، قیامت آگئی، بیٹا! زینبؑ بن بھائی کے ہوگئی۔ میرے لال تم یتیم ہو گئے۔ عابد بیمار نے آنکھیں کھولیں۔ پھوپھی اماں۔ ذرا خیمہ کا پردہ تو اُٹھایئے۔ زینبؑ نے بڑھ کر خیمہ کا پردہ اُٹھایا۔ بیمار نے سنبھل کر دیکھا۔ ایک نیزۂ طویل پر باپ کا سر۔ آواز دی۔ السلام علیک یا ابا عبداللہ، السلام علیک یا ابن رسول اللہ۔ بابا یتیم بیٹے کا سلام لے لو بابا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔!

وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون

امام زین العابدین علی الحسین علیہ السلام

اسم مبارک :- علیؑ

کنیت :- ابو محمد

والد ماجد :- امام حسین علیہ السلام

والدۂ ماجدہ :- حضرت شہربانو (شاہ زنان)

ولادت :- ۱۵ جمادی الاولیٰ ۳۸ھ یا ۵ شعبان المعظم

اولاد :- گیارہ فرزند۔ چار دختر

شہادت :- ۲۵ محرم ۹۵ھ

عمر مبارک :- ۵۷ سال

قبر مطہر :- جنت البقیع۔ مدینہ منورہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی اشرف الاولین والآخرین خاتم النبیین سیدنا و مولانا ابی القاسم محمد وآلہ الطیبین الطاہرین ولعنۃ اللہ علی اعدائھم اجمعین اما بعد فقد قال اللہ الحکیم فی کتابہ الکریم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِنَّ عَلَیْنَا لَلْھُدٰی وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَۃَ وَالْاُوْلٰی

ارشاد رب العزت ہوتا ہے "بیشک ہدایت کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے اور دنیا و آخرت کا اختیار ہمارے ہاتھوں میں ہے" آیت کریمہ نے صاف واضح کر دیا کہ رب العالمین نے انسان کی جسمانی تربیت کے ساتھ اس کی روحانی تربیت کی بھی ذمہ داری لی ہے اور یہ طے کر دیا ہے کہ جس طرح انسان کی پیدائش سے پہلے شکم مادر میں اس کا جسمانی اور مادی رزق فراہم کر دیا تھا اسی طرح عالم عقل و شعور میں قدم رکھنے سے پہلے اس کی روحانی اور عقلی تربیت کا انتظام بھی ہوگا۔ اس نے ہر دور میں ہادی مقرر کئے۔ ہر زمانہ میں راہنما بنائے اور ایسے پاکیزہ کردار بنائے کہ ان کی زندگی میں عیب و نقص کا کوئی دھبہ بھی نظر نہ آسکا ۔۔۔ ایسے اطاعت شعار کہ اس کی مرضی کے بغیر قدم نہ اٹھائیں۔ ایسے عبادت گذار کہ سجدہ سے سر اٹھانا فرض نہ ہو تو سر سجدہ میں رکھ کر کبھی نہ اٹھائیں۔ ایسے بندے کہ خدائی کا دھوکہ ہو اور ایسے بندہ نواز کہ بندوں میں رہ کر بھی خدا کی شان دکھائی دیں۔

عرب کے مشہور شاعر فرزدق نے امام زین العابدینؑ کی شان میں اسی انداز کی مدح کی تھی کہ اگر تشہد میں "لا" نہ ہوتا تو یہ ایسے کریم تھے کہ زندگی میں کبھی "نہیں" نہ کہتے اور ان کی ہر "نہیں"۔ "ہاں" بن جاتی۔ کتنا حسین نکتہ نکالا ہے اور شاید یہ بھی

دین ہے واقعہ کربلا کی ـــــ کہ اگر کربلا کے حادثۂ عظمیٰ نے "نہیں" کی قدر و قیمت نہ سمجھا دی ہوتی تو شاعر کا ذہن اس بلندی کردار تک نہ پہونچ سکتا۔ یہ باپ اور بیٹے کے کردار کا اتحاد ہے کہ وہاں "نہیں" سنائی دی تو بیعت یزید کے نام پر اور یہاں "نہیں" سنائی دی تو تشہد کے موقع پر۔ اور یہ دونوں "نہیں" باپ اور بیٹے میں مشترک ہیں۔ تشہد میں "لا" ہے دونوں کے یہاں ہے اور بیعت یزید سے انکار ہے تو دونوں کے یہاں ہے۔ اور میرا تو جی چاہتا ہے کہ میں فرزدق کے کلمہ کو امام حسینؑ کے انکار بیعت سے ملا کر یہ کہوں کہ جس کے یہاں لا الٰہ سلامت ہے اس کے یہاں بیعت یزید سے انکار بھی ہے اور جہاں بیعت یزید سے انکار نہیں ہے وہاں کلمہ "لا الٰہ" بھی ریاکاری ہے ایمان نہیں ہے ـــــ

اور یہ میں نہیں کہہ رہا ہوں خواجہ اجمیری کہہ گئے ہیں "حقا کہ بنائے لا الٰہ است حسینؑ" ـــــ اور علامہ اقبال نے بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے "نقش الا اللہ بر صحرا نوشت"۔ حسینؑ لا الٰہ کی بنیاد بھی ہیں اور حسینؑ ہی الا اللہ کے نقاش بھی ہیں۔ اب جو حسینؑ کا نہیں ہے وہ نہ لا الٰہ کا ہے نہ الا اللہ کا ـــــ اور جو لا الٰہ الا اللہ کا نہیں ہے وہ مسلمان کہے جانے کے قابل نہیں ہے۔

عزیزان محترم! میرا موضوع کلام فلسفہ کربلا نہیں ہے اور نہ اس وقت اس سلسلہ میں کوئی تفصیل بحث کرنا چاہتا ہوں۔ مقصد صرف یہ ہے کہ اللہ کے بندے اور اس کے نمائندے ہمیشہ اس کی مرضی کے پابند اور اس کے احکام کے پابند ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی کا کوئی قدم اس کی مرضی کے بغیر نہیں اٹھتا۔ وہ بیدار ہو کر میدان میں آتے ہیں تو "راضیۃ مرضیۃ" کی سند لیتے ہیں اور بستر پر لیٹ کر سو جاتے ہیں تو رضائے الٰہی کا سودا کر لیتے ہیں۔

ایسے پاکیزہ کردار بندے یا آسمان پر ملائکہ میں دیکھے ہیں یا زمین پر انبیاء و مرسلین میں۔ ملائکہ کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے "یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ" وہ وہی کرتے ہیں جو انھیں حکم دیا جاتا ہے اور انبیاء کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے "جَعَلْنَا هُمْ اَئِمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا" ہم نے انھیں امام اور راہنما بنایا ہے تاکہ ہمارے حکم سے ہدایت کریں اور ان کی طرف وحی کی کہ نیک عمل کرتے رہیں۔ نمازیں قائم کرتے رہیں۔ زکوٰۃ ادا کرتے رہیں اور یہ سب ہمارے عابد اور عبادت گذار بندے تھے۔

آیت کریمہ میں ایک طرف انبیاء و مرسلین کی ذمہ داری بیان کی گئی ہے اور دوسری طرف ان کی شان بھی بیان کر دی گئی ہے کہ ایسا نہیں ہے کہ ہم نے ذمہ داری معین کر دی اور انھوں نے مقام عمل میں فرار اختیار کیا ـــ نہیں نہیں۔ ہم نے انھیں ذمہ دار بنایا تو انھوں نے مکمل طور پر اپنی ذمہ داری کو ادا کیا اور اس شان سے ادا کیا کہ ہم نے انھیں "عابدین" کی سند دے دی اور ان کی عبادت کا اعلان کر دیا ـــــ لیکن یاد رکھو کہ ہم نے یہ نہیں کہا کہ ہم نے انھیں امام بنا دیا اور نیک عمل نماز۔ زکوٰۃ کی نصیحت کر دی تو وہ عابدین گئے۔ بلکہ ہم نے واضح لفظوں میں یہ اعلان کیا ہے کہ وہ عابد تھے اس لئے ہم نے انھیں منصب امامت عطا کیا ہے۔

ارباب نظر! غور فرمائیں کہ مالک کائنات نے کیا ارشاد فرمایا ہے ـــ یہاں عبادت گذاری منصب کے بعد نہیں ہے کہ انبیاء کو اپنا جیسا بشر فرض کر لیا جائے منصب عبادت کے بعد ہے کہ اگر منصب کا اعلان دنیا میں ہوا ہے تو شان عبادت یہاں دیکھنا ہوگی اور اگر منصب کا اعلان قبل خلقت آدمؑ ہوا ہے تو شان عبادت بھی وہی نظر آئے گی۔ ملاء اعلیٰ کا ماحول ہوگا۔ عالم قدس کی فضا ہوگی۔ کائنات میں سناٹا ہوگا۔ موجودات کا دور دور پتہ نہ ہوگا ایک خالق کا جلوہ ہوگا اور ایک نور مجسم

ہوگا جو محو تسبیح و تہلیل ہوگا اور اسی کی تسبیح و تہلیل کو سن کر ملائکہ تسبیح و تہلیل کریں گے۔ وہ استاد ہوگا۔ سید الملائکہ شاگرد ہوگا۔ وہ معلم ہوگا اور عالم عصمت متعلم ہوگا۔ وہ طریقے معین کرے گا اور آسمان والے اس کے نقش قدم پر چلیں گے۔ دنیا والے اس کی راہ پر چلیں یا نہ چلیں آسمان والے جانتے ہیں کہ صراط مستقیم اسی کے نقش قدم کا نام ہے اور نعمتیں انھیں بندوں پر تمام ہوئی ہیں۔ اللہ انھیں کے عمل سے راضی ہے اور دین انھیں کا دین کامل ہے ——

مخلوقات الٰہی میں دو قسم کی مخلوقات معصوم ہیں۔ جن کے دامن کردار پر خطا و غلطی کا کوئی دھبہ نہیں ہے۔ ایک ملائکہ ہیں اور دوسرے انبیاء و مرسلین۔ لیکن دونوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ ایک کو اللہ نے اپنے منصب امامت کا اہل سمجھا ہے اور ایک وہ ہے جسے اس منصب کا اہل نہیں سمجھا گیا اور روز اوّل ہی اعلان کر دیا گیا کہ تمھاری تسبیح و تہلیل اپنے مقام پر ہے۔ تمھاری عبادت و بندگی اپنے مقام پر ہے لیکن ہمارا منصب اس سے بالاتر ہے اور ہم ہر عبادت گذار ہر معصوم کردار کو اس کا اہل نہیں سمجھتے۔

اب یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ جو منصب اتنا طیب و طاہر ہو کہ معصوم فرشتوں کو نہ مل سکے وہ غیر معصوم بندوں کو کیوں کر مل سکتا ہے ——

میں تو اس سے بالاتر کہنا چاہتا ہوں کہ نگاہ مذہب میں کل عزت آدمؑ یہی ہے کہ انھیں اس عظیم منصب کا اہل قرار دیا گیا جس کے اہل معصوم فرشتے بھی نہیں تھے۔ اسلام میں منصب خلافت فرشتوں کا حصہ نہیں ہے آدم جیسے نیک کردار انسانوں کا حصہ ہے۔ اب اگر کوئی شخص خلافت و امامت کے منصب سے عصمت کردار کی شرط نکال دے تو وہ عظمت قرآن کا بھی مخالف ہے اور عزت آدمؑ کا بھی۔

اور یاد رکھئے کہ عظمت قرآن سے ایمان وابستہ ہے اور عزت آدمؑ سے آدمیت وابستہ ہے۔ اس منزل میں راہ حق سے ہٹ جانے والا نہ آدمی رہ سکتا ہے نہ صاحب ایمان ——

معصوم مخلوقات میں اللہ نے ایک کو منصب کا اہل بنایا ہے اور ایک کو نہیں —— لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ فرشتوں کے عمل و اخلاص اور ان کے معصوم کردار میں کوئی فرق ہے۔ نہیں۔ اس نے خود فرشتوں کے کردار کی بلندی کا اعلان کیا ہے اور ان کی پیدائشی عصمت کو واضح کیا ہے بلکہ خود آدمؑ کے مسئلہ میں بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ کر دیا ہے کہ میرے معصوم فرشتو! تم منصب خلافت کے اہل نہیں ہو لیکن تمھارا فرض ہے کہ جب پیکر آدم میں روح ہدایت پھونک دی جائے تو تم سب کے سب سجدہ میں گر پڑنا —— اس انداز سے تمھاری عصمت کا امتحان ہوگا کہ تم کس قدر اطاعت شعار اور فرماں بردار ہو —— صرف منصب کی طلب ہے یا ذوق بندگی بھی ہے۔ ملائکہ نے سجدہ کر کے بتا دیا کہ ہم بندے ہیں اور ہمارا کام بندگی کرنا ہے۔ ابلیس نے سجدہ سے انکار کر کے واضح کر دیا کہ ہمیں صرف منصب کی ضرورت ہے اور وہ نہ ملے گا تو سجدہ بھی نہ کریں گے —— اور سجدہ بھی تیرا ہوتا تو شاید کر لیتے لیکن یہ کیا غضب ہے کہ آدمؑ کے مقابلہ میں منصب سے محروم بھی کیا اور اب اسی آدمؑ کو سجدہ بھی کرایا جا رہا ہے۔ یہ ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔ ملائکہ اور ابلیس میں یہی فرق ہے کہ ملائکہ میں ہوس منصب نہیں ہے ذوق بندگی ہے اور ابلیس میں ہوس منصب ہے ذوق بندگی نہیں ہے اور یہی میرے کہنے کا مطلب ہے کہ جس میں ہوس منصب کے بجائے ذوق بندگی ہو اسے فرشتوں سے ملایا جائے اور جس میں ہوس منصب ہو اور خلیفۃ اللہ کے سامنے جھکنے کا حوصلہ نہ ہو اسے ابلیس سے ملایا

جائے۔ وہ آدم سے نہیں ملایا جا سکتا ــــ

ملائکہ نے سجدہ کیا اور "ساجدین" کہلائے۔ ابلیس نے انکار کیا اور مردود بارگاہ الٰہی قرار پایا۔ اب یہ فیصلہ آسان ہو گیا کہ نگاہ قدرت میں مقرب کون ہے۔ اور ابلیس کون ہے! دین الٰہی میں سجدہ کی کیا اہمیت ہے اور سجدہ نہ کرنے کا کیا حشر ہوتا ہے۔ مجھے کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف ایک لفظ کہہ دینا کافی ہے کہ جب آدم کو سجدہ نہ کرنا ابلیس بنا دیتا ہے تو خود پروردگار کو سجدہ نہ کرنا کیا بنا دیگا۔ یہ آپ خود فیصلہ کریں۔

اور تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ جب آدم کے سامنے سر جھکا دینے والے "ساجدین" بن گئے تو زندگی بھر سجدہ پروردگار کرنے والے کس منصب کے حامل ہوں گے اور ان کا کیا مرتبہ ہوگا ــــ اس سلسلے میں صرف ایک لفظ کی طرف اشارہ کر دینا کافی ہوگا کہ اللہ نے اپنی دونوں معصوم مخلوقات کا تذکرہ کرتے ہوئے دو لفظیں استعمال کی ہیں۔ انبیاء کے بارے میں لفظ "عابدین" استعمال کیا ہے اور ملائکہ کے بارے میں لفظ "ساجدین" ــــ

اب ارباب نظر خود فیصلہ کریں کہ اس بندہ پروردگار کا کیا مرتبہ ہوگا جو عابدین کی محفل میں جائے تو زین العابدین بن جائے اور ساجدین کی بزم میں آئے تو سید الساجدین بن جائے۔ اس کا مقابلہ نہ انبیاء سے ہو سکتا ہے نہ ملائکہ سے۔ وہ انبیاء کے بزم کی رونق ہے تو ملائکہ کے کاروان سجود کا میر کارواں ــــ

اسے ان معصوم مخلوقات سے بھی ملانا۔ اس کا مرتبہ ان دونوں سے بھی بلند ہے۔ وہ انبیاء سے بھی بالاتر ہے اور ملائکہ سے بھی افضل۔ وہ نافہم مسلمان ہیں جو ایسے عظیم کردار کو امت کے گنہگاروں سے ملاتے ہیں اور وہ جاہل قرآن یزید تھا جو ایسے عظیم انسانوں سے مطالبہ بیعت کر رہا تھا۔ کربلا کے راہنماؤں نے اپنے کردار سے واضح کر دیا کہ جب مجھ سے انبیاءؑ اور ملائکہ اطاعت کا مطالبہ نہیں کر سکتے تو یزید کی کیا بساط اوقات ہے اور امام زین العابدینؑ

نے تو صاف انداز سے واضح کر دیا کہ جب دوسرے علیؑ کو امت کے گنہگاروں سے نہیں ملایا جا سکتا تو پہلے علیؑ کا کیا مرتبہ ہوگا۔ اور جب دوسرا علیؑ انبیاء اور ملائکہ سے بہتر ہے تو پہلے علیؑ کی کیا منزل ہوگی یا واضح لفظوں میں یوں کہا جائے کہ جب حسینؑ کا بیٹا کائنات کے تمام ارباب عصمت سے افضل و بالاتر ہے تو حسینؑ کے باپ کی کیا منزل ہوگی۔

اور شاید اسی لئے پیغمبر اسلامؐ نے کہہ دیا تھا کہ میرے فرزند حسنؑ و حسینؑ جنت کے جوانوں کے سردار ہیں اور ان کے باپ ان سے بھی افضل و بہتر ہیں۔ اب دنیا خود فیصلہ کرے کہ جب سرداروں کو چھوڑ کر جنت نہیں مل سکتی تو ان کے باپ سے لڑ کر کیونکر جنت مل سکتی ہے ــــ

امام زین العابدینؑ کی زندگی میں افضلیت و برتری کے دلائل تلاش کئے جائیں اور یہ دیکھا جائے کہ وہ کون سے امتیازات ہیں جن کی بناء پر آپ کا مرتبہ انبیاء و مرسلین اور ملائکہ سے بہتر ہے تو اس ذیل میں سب سے پہلے معرفت کی منزل میں قدم رکھنا ہوگا۔ انبیاء و مرسلین کی معرفت اور ملائکہ مقربین کے عرفان میں کوئی شک نہیں ہے۔ عرفان میں کمی ہوتی تو معصوم نہ ہوتے اور معرفت میں کوئی نقص ہوتا تو عصمت کی منزل ہی حاصل ہوتی۔ لیکن قرآن مجید اور تاریخ مذہب نے ان معصومین کے عرفان کے جو مرقع پیش کئے ہیں ان کو دیکھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ آل محمدؐ کی منزل کچھ اور ہے اور ان کا طرز معرفت کچھ نرالا اور انوکھا ہی ہے۔

سارے معصومین کے تذکرہ کا محل نہیں ہے۔ صرف ایک جناب ابراہیمؑ کی مثال لے لیجئے۔ جن کا مرتبہ مرسل اعظمؐ کے بعد سارے انبیاء سے افضل و برتر ہے اور جنھیں نسلی اعتبار سے بھی مرسل اعظمؐ کا مورث اعلیٰ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ قرآن مجید ان کے بارے میں حکایت کر رہا ہے کہ جب ابراہیمؑ قوم کے سامنے آئے اور قوم کو گمراہی میں غرق

پایا۔ کوئی ستارہ پرست تھا کوئی چاند کو خدا بنائے ہوئے تھا۔ کوئی سورج کی پوجا کر رہا تھا تو ایک نظر میں سب کی خدائی کو باطل کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر یہ ستارہ خدا ہے تو ڈوبتا کیوں ہے۔ اگر یہ چاند خدا ہے تو غروب کیوں ہوتا ہے اور اگر یہ سورج خدا ہے تو اسے زوال کیوں ہوتا ہے۔ خدا کے لئے تو زوال و غروب نہیں ہے۔ خدا کو زوال آگیا تو بندوں کا کیا حشر ہوگا اور خدا ڈوب گیا تو بندوں کا کیا انجام ہوگا۔ انھیں تو ایک چلو پانی بھی نہ ملے گا کہ اسی میں ڈوب مریں —

انداز گفتگو بتا رہا ہے کہ ابراہیمؑ نے معرفت الٰہی میں مخلوقات کو ذریعہ معرفت بنایا ہے اور یہ ظاہر کیا ہے کہ بندوں کو معرفت خدا میں مخلوقات ہی کو ذریعہ بنانا ہوگا اور اسی طرح سوچنا ہوگا کہ جب یہ مخلوقات خدائی کرنے کے قابل نہیں ہیں تو کوئی دوسری ہستی ہے جو خدائی کی اہل ہے اور اسی کے اشاروں پر یہ کائنات چل رہی ہے لیکن امام زین العابدینؑ کا انداز معرفت اس سے جداگانہ ہے۔ آپ دعائے ابوحمزہ ثمالی میں بارگاہ احدیت میں عرض کرتے ہیں بِكَ عَرَفْتُكَ وَأَنْتَ دَلَلْتَنِي عَلَيْكَ وَدَعَوْتَنِي إِلَيْكَ۔ پروردگار میں نے تجھ کو تیرے ہی ذریعہ پہچانا ہے اور تو نے ہی اپنی طرف مجھے دعوت دی ہے اور تو نے ہی میری راہنمائی کی ہے۔ تو نہ ہوتا تو تیری معرفت نہ ہوتی اور تیری رہنمائی نہ ہوتی تو کوئی تجھ تک پہونچ نہ سکتا۔ یہ انداز امام زین العابدینؑ کا نہیں ہے بلکہ محمدؐ و آل محمدؐ کا مشترک انداز ہے۔

مولائے کائنات "دعائے صباح" میں عرض کرتے ہیں "يَا مَنْ دَلَّ عَلَىٰ ذَاتِهِ بِذَاتِهِ" — اے وہ خدا جس نے اپنی ذات کی طرف اپنی ذات ہی سے راہنمائی کی ہے اس کی معرفت کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہے وہ اپنی معرفت کا خود ذریعہ ہے — ایسا کیوں ہے اور آل محمدؐ نے یہ نیا طریقہ کیوں نکالا ہے۔ انبیاء اس راہ پر کیوں نہیں چلے۔

راز بہت واضح ہے۔ ایک لمحہ کے لئے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ یاد رکھئے انبیاء اس راستہ کو اختیار کر لیتے تو بے معرفت رہ جاتے اور اہلبیتؑ اس راستہ کو اختیار نہ کرتے تو بے معرفت رہ جاتے۔ یعنی اہلبیتؑ کے لئے وہی راستہ ممکن تھا جو انھوں نے اختیار کیا ہے اور انبیاء و مرسلین کے لئے وہی راستہ ممکن تھا جو انھوں نے اختیار کیا ہے۔ اس میں نہ اُن کا کوئی قصور ہے اور نہ اِن کا کوئی قصور۔ یہ تخلیق کا ایک فلسفہ ہے جس نے ہر ایک کا انداز معرفت جُدا جُدا کر دیا ہے تفصیل میں جانا مناسب نہیں ہے۔ مختصر لفظوں میں یوں کہا جائے کہ انبیاء کی تخلیق زمین و آسمان کے بعد ہوئی ہے۔ انھوں نے پیدا ہو کر زمین کو دیکھا ہے۔ آسمان کو دیکھا ہے۔ ستاروں کو دیکھا ہے۔ چاند کو دیکھا ہے سورج کو دیکھا ہے۔ کواکب کو دیکھا ہے۔ سیارات کو دیکھا ہے اور پھر انھیں کو ذریعہ معرفت بنایا ہے اور دنیا کو آواز دی ہے کہ اگر خدا کو پہچاننا ہے تو انھیں مخلوقات کو ذریعہ بناؤ۔ میں معرفت لے کر آیا ہوں لیکن اس کائنات میں معرفت کا واحد ذریعہ یہی مخلوقات ہیں جنھیں دیکھ کر خالق کے وجود، اس کے علم و اقتدار اور اس کی حکمت و عدالت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں ہے لیکن آل محمدؐ کی منزل اس سے جداگانہ ہے۔ ان کا نور اس وقت پیدا ہوا ہے جب زمین نہیں تھی۔ آسمان نہیں تھا۔ ستارے نہیں تھے۔ کواکب و سیارات نہیں تھے۔ ایسے موقع پر ان مخلوقات کو معرفت کا ذریعہ بنایا جاتا تو یہ نور بے معرفت ہی رہ جاتا اور نور کا بے معرفت رہنا ممکن نہیں تھا اس لئے قدرت نے اس کے لئے معرفت کا نیا راستہ نکالا اور آواز دی۔ اے نور محمدی، کائنات مجھے مخلوقات کے ذریعہ پہچانے گی تجھے میں اپنی معرفت براہ راست عطا کروں گا۔ تو نہ زمین کا محتاج ہوگا نہ آسمان کا۔ نہ ستاروں کا محتاج ہوگا نہ کواکب و سیارات کا۔ تیرا انداز الگ ہوگا۔ تیری منزل الگ ہوگی اور تجھے اتنا بلند تر بنا دوں گا کہ دنیا مجھے مخلوقات کے ذریعہ پہچانے گی اور میں مخلوقات کو

اپنی معرفت تیرے ذریعہ سے عطا کروں گا۔ سب مجھے دنیا کے ذریعہ پہچانیں گے اور دنیا مجھے تیرے ذریعہ پہچانے گی تاکہ محتاج اور بے نیاز کا فرق واضح ہو جائے اور اہل دنیا سمجھ لیں کہ جو کائنات کا محتاج ہوتا ہے وہ کون ہوتا ہے اور جس کی کائنات محتاج ہوتی وہ کون ہوتا ہے۔

اور جب کائنات اپنے وجود میں تیری محتاج رہے گی تو معرفت میں تیری محتاج کیسے نہ رہے گی اور جب سب کو تیرا محتاج بنا دوں گا تو سب تیرے تابع فرمان ہوں گے چاند تیرے اشاروں پر ٹکڑے ہوگا۔ سورج تیرے اشاروں پر مغرب سے پلٹ آئیگا۔ پانی تیرے اشاروں پر جواہرات میں تبدیل ہو جائے گا سنگریزے تیرے اشارہ پر کلمہ پڑھنے لگیں گے اور ملک الموت تیرے اشارہ پر تیری زائرہ کی روح کو واپس کر دیگا۔ دنیا پہچان لے کہ تجھے میں نے کچھ اور بنایا ہے اور دنیا کو اور ـــــ تیری منزل کچھ اور ہی ہے اور انبیاء کی منزل کچھ اور ـــ انبیاء میں سلیمان بھی ہونگے تو ملک الموت انھیں بیٹھنے کی اجازت نہ دیں گے اور تیرے گھرانے کا قیدی بھی ہوگا تو ملک الموت بلا اذن قدم آگے نہ بڑھائیں گے۔

جب انبیاء کا انداز معرفت دیکھ لیا اور آل محمدؐ کی انفرادیت سمجھ میں آگئی تو ملائکہ کے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہاں معرفت کردگار تو بڑی چیز ہے۔ بلا وسیلہ اپنی معرفت بھی نہیں ہے۔ کیا دنیا اس واقعہ کو بھلا دے گی کہ بزم پیغمبرؐ میں جبرئیلؑ امین بیٹھے ہوئے ہیں۔ اچانک علیؑ آ گئے۔ جبرئیلؑ تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے۔ پیغمبرؐ نے پوچھا جبرئیل تم نے تعظیم کیوں کی۔ عرض کی خدا کے رسولؐ! علیؑ کا مجھ پر حق ہے۔ جب عالم انوار میں مجھ سے سوال ہوا تھا کہ جبرئیل بتاؤ تم کون ہو اور میں کون ہوں؟ تو نور علیؑ ہی نے میری راہنمائی کی تھی ـــــ اب کتنی بدنصیب ہے وہ امت جس کو

ملائکہ کا اُستاد اور عالم قدس کا راہنما مل جائے اور وہ اسے چھوڑ کر کرامت کے گنہگاروں کو راہنما بنا لے ـــ

صحیفہ کاملہ آپ کے انداز معرفت کا شاہکار ہے اس کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ عبد و معبود کا رشتہ کیا ہے اور بندگی کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ وہ دعائیں، وہ مناجاتیں، وہ حسن طلب، وہ حسن قبول۔ وہ صفات جلال و جمال کا تذکرہ۔ وہ ذات و صفت کی بحثیں۔ وہ معرفت کے درس۔ وہ انجام دنیا کا اعلان وہ عاقبت کی فکر۔ وہ خوف خدا۔ وہ بیان جنت۔ وہ تذکرہ جہنم۔ غرض جو کچھ صحف انبیاء میں ہے سب اسی مختصر مجموعہ میں موجود ہے اور بدرجہ اتم موجود ہے۔ جبھی تو صاحبان معرفت نے کبھی اسے زبور آل محمدؐ کہا ہے اور کبھی انجیل اہلبیتؑ اور یہ واضح کر دیا ہے کہ اگر قرآن کتاب باقی نہ ہوتا اور یہ بیانات تفسیر و تشریح قرآن نہ ہوتے تو اسے مصحف کا مرتبہ حاصل ہوتا لیکن یہ عظمت قرآن ہے کہ اسے مصحف کا مرتبہ نہیں دیا گیا اور انفرادیت کے اظہار کے لئے کلام کو صحیفہ کہا گیا اور متکلم کو مصحف ناطق

معرفت کے ساتھ جب عبادت کی منزل پر نظر جاتی ہے تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ ہر نماز اس شان سے ادا ہوتی ہے جیسے یہی زندگی کی آخری نماز ہو اور ہر سجدہ اس شان سے ادا ہوتا ہے جیسے یہی زندگی کا آخری سجدہ ہو۔ واقعہ کربلا کے بعد بھی آپ کی زندگی صرف گریہ و زاری میں نہیں گذری اور یہ الزام بالکل غلط ہے کہ آپ کے پاس رونے پیٹنے کے سوا کوئی کام نہیں تھا جیسا کہ بعض نافہم افراد کہہ دیا کرتے ہیں کہ امام کا کام ہدایت امت ہے۔ گریہ و زاری نہیں ہے۔ اور امام زین العابدینؑ نے سارا وقت گریہ و زاری میں صرف کر دیا اور معاذ اللہ اپنے

فریضہ منصبی کو ادا نہیں کیا۔ آپ کا مشغلہ عبادت الٰہی بھی تھا اور تبلیغ دین بھی —
ہدایت امت بھی تھا اور باپ پر گریہ وزاری بھی۔

اس موضوع پر تفصیلی بحث آخر کلام میں ہوگی۔ فی الحال امام کے مشاغل زندگی پر گفتگو ہو رہی ہے۔ عبادت۔ درسِ معرفت۔ احترام طالب علم دین۔ فرمانبرداری۔ یتیم نوازی ہی وہ مشاغل تھے جن میں آپ کے صبح و شام بسر ہوتے تھے۔

عبادت کا یہ عالم تھا کہ زین العابدین اور سید الساجدین لقب مل گیا۔ درس معرفت کی یہ کیفیت تھی کہ کلام کا مجموعہ زبور آل محمدؐ اور انجیل اہلبیتؑ ہو گیا۔.....
احترام طالب علم کا یہ انداز تھا کہ کوئی معمولی سا طالب علم بھی آ گیا تو یہ کہہ کر کھڑے ہو گئے کہ اس کا احترام وصیت پیغمبرؐ ہے اور اس کی ذات سے وصیت پیغمبرؐ زندہ ہے۔ غربا پروری اور یتیم نوازی کا یہ عالم تھا کہ رات کا بڑا حصہ غریبوں کے گھر سامان، غذا پہونچانے میں صرف ہوتا تھا اور اکثر یتیموں کو یہ معلوم بھی نہیں ہوتا تھا کہ ہمارا سامان لانے والا کون ہے۔ یہ تو اس دن معلوم ہوا جب یتیموں کا یہ والی، غریبوں کا یہ وارث زہر دغا سے شہید ہو کر دنیا سے گذر گیا اور بیکسوں کا آخری سہارا بھی ٹوٹ گیا۔ ایسی مصروف اور فعال زندگی پر بے کاری کا الزام جہالت نہیں تو اور کیا ہے اور میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ واقعہ کربلا کے بعد فوراً ایک طبقہ پیدا ہو گیا تھا جو آپ کی امامت سے الگ ہو گیا تھا اور اس نے محمد حنفیہ کو امام مان لیا تھا۔ اس طبقہ کے پاس دو تصورات تھے۔ ایک تو یہ کہ محمد حنفیہ امام حسینؑ کے بھائی ہیں اور حضرت علیؑ ابن الحسینؑ بیٹے ہیں اور کھلی ہوئی بات ہے کہ بھائی کے ہوتے ہوئے بیٹے کے امام ہونے کا کوئی سوال نہیں ہے۔ یعنی جس طرح امام حسنؑ کے بعد امام حسینؑ امام ہوئے ہیں اسی طرح ان کے بعد ان کے

دوسرے بھائی محمد حنفیہ کو امام ہونا چاہیئے۔ دوسرا تصور یہ تھا کہ واقعہ کربلا ایک نیا اقدام چاہتا ہے اور اتنا عظیم ظلم خاموشی سے برداشت نہیں کیا جا سکتا ضرورت ہے کہ وقت کا امام اُٹھے اور یزیدیت سے انتقام لے کر اسے فنا کر دے اور امام علیؑ بن الحسینؑ تو خاموش ہو کر بیٹھ گئے اور صرف اپنے باپ کا ماتم کر رہے ہیں۔ لہٰذا کسی ایسے کو امام بنا لینا چاہیئے جو حالات کے تقاضے کے مطابق اُٹھے اور بنو امیہ کے تخت و تاج کو خاک میں ملا دے۔

ان دونوں تصورات کی حقیقت صرف یہ ہے کہ ان میں امامت کو اہلیت کے بجائے وراثت سے مربوط کر دیا گیا ہے اور دین الٰہی اسے برداشت نہیں کر سکتا۔ اس کے علاوہ امامت کے لئے اقدام اور انتقام کو ضروری سمجھا گیا ہے جب کہ ایسا نہیں ہے۔ امامت کے لئے اقدام و انتقام ضروری ہوتا تو وفات پیغمبرؐ کے بعد امیر المومنینؑ بھی امام نہ رہ جاتے اور آپ کا مسلسل ۲۵ سال کا سکوت محلِ اعتراض بن جاتا۔ امامؑ کا سکوت خود اس بات کی دلیل ہے کہ امامت کے اقدامات حالات اور مصالح کے تابع ہوتے ہیں۔ مصلحت ہوتی ہے تو اقدام کیا جاتا ہے ورنہ سکوت اختیار کر لیا جاتا ہے۔ امام زین العابدینؑ کے حالات کیا تھے اور آپ کی ذمہ داریاں کیا تھیں اس کا تجزیہ کرنے کے لئے کسی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔ حالات ہر انسان کی نگاہ کے سامنے ہیں۔ اب یہ ذمہ داری براہ راست جناب محمد حنفیہ کی تھی کہ وہ قوم کو امامت کے مفہوم سے آشنا کریں اور لوگوں کو بتائیں کہ امام میں نہیں ہوں۔ امام میرا بھتیجا ہے لیکن ان کے ساتھ بھی یہ دشواری تھی کہ وہ ایک ایسی نا اہل قوم دیکھ چکے تھے جس نے باپ کی صلح پسندی کو دیکھ کر خوارج کا رنگ اختیار کر لیا تھا اور باپ ہی سے درپے جنگ ہو گئے تھے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ حقیقت واضح ہو جائے اور لوگ

مجموعی طور پر اس گھرانہ سے بیزار بھی نہ ہونے پائیں۔ چنانچہ آپ نے نہایت حسین رخ یہ اختیار کیا کہ مجمع عام میں امام زین العابدینؑ سے بحث کرنے لگے اور یہ کہا کہ امامت کا حقدار مجھے ہونا چاہیئے۔ میں عمر میں تم سے بڑا ہوں۔ تمہارا فرض ہے کہ تم میراث امامت میرے حوالے کر دو اور اس طرح امت پر حقیقت واضح کر دی۔ امام زین العابدینؑ نے فرمایا کہ چچا آپ تو جانتے ہیں کہ اپنے باپ کے بعد امت کا امام میں ہوں اور اگر آپ کو اس میں کچھ کلام ہے تو چلئے خانہ کعبہ میں حجر اسود سے شہادت طلب کریں وہ جس کی امامت کی گواہی دے دیگا اسے امام تسلیم کر لیا جائے گا۔ محمد حنفیہ خوش ہو گئے اور خوشی خوشی مجمع کے ساتھ حجر اسود تک آئے۔ سلام کیا کوئی جواب نہیں ملا۔ اس کے بعد امام زین العابدینؑ نے سلام کیا۔ حجر اسود نے جواب سلام دیا اور آواز دی کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ وصی رسولؐ اور امت کے امام ہیں ـــ

فیصلہ ہو گیا۔ حقیقت بے نقاب ہو گئی۔ محمد حنفیہ مطمئن ہو گئے لیکن قوم کے نافہم افراد یہ کہنے لگے کہ محمد حنفیہ نے بھی معاذ اللہ اسی طرح دعوائے امامت کیا تھا جس طرح امیر المومنینؑ کے دور میں اور لوگوں نے خلافت کا دعویٰ کیا تھا۔ لہٰذا دونوں کے ساتھ ایک ہی جیسا سلوک ہونا چاہیئے۔ لیکن میں کہوں گا کہ کاش دنیا نے اتنا سوچا ہوتا کہ کل کے دعویداروں میں اور محمد حنفیہ میں ایک بنیادی فرق ہے کہ وہ لوگ امامت کو قوم کا حق سمجھتے تھے اور محمد حنفیہ اسے خدائی منصب سمجھتے ہیں ـــ خدائی منصب نہ سمجھتے تو قوم سے الکشن کراتے۔ حجر اسود سے فیصلہ نہ کراتے ـــ

دوسری بات یہ ہے کہ محمد حنفیہ کو معلوم تھا کہ حجر اسود کسی کا تابع نہیں ہے۔ قوم کا امام مان لینا آسان ہے۔ حجر اسود کا گواہی دینا بہت مشکل ہے۔ اگر ان کی نیت میں ذرا بھی فساد ہوتا تو کبھی اس فیصلہ پر راضی نہ ہوتے لیکن ان کا تو منشا ہی یہی تھا کہ

قوم دیکھ لے کہ امام کیسا ہوتا ہے اور امامت کے کمالات کیا ہوتے ہیں تاکہ جہاں ایسے کمالات نظر آئیں وہاں امامت تسلیم کی جائے اور جہاں ایسے کمالات نہ ہوں وہاں خلافت و حکومت ہو تو ہو امامت نہ مانی جائے۔

محمد حنفیہ نے اپنا فریضہ ادا کر دیا اور قوم پر واضح کر دیا کہ امامت سید الساجدین کا حق ہے میرا حق نہیں ہے۔ اب امام کی ذمہ داری ہے کہ چچا کی نیک نفسی کی جزا دیں اور دنیا پر واضح کر دیں کہ میرا چچا بدنفس اور بے عمل نہیں ہے۔ چنانچہ امامؑ نے بھی حسن نیت کی جزا دی اور بہترین جزا دی کہ جب حضرت مختار نے انتقام خون حسینؑ کی تحریک چلانے کی اجازت چاہی تو حضرت نے فرمایا یہ مسئلہ میرے چچا کے حوالے ہے۔ اب اگر محمد حنفیہ مخالف ہوتے تو اتنا بڑا مسئلہ ان کے حوالے نہ کیا جاتا اور ان کی مرضی کو مرضی امامت نہ قرار دیا جاتا ـــ یہ محمد حنفیہ کے حسن نیت کی جزا تھی کہ میرے کمال کا اظہار آپ کا فریضہ ہے اور آپ کے کمال کا اعلان میرا فرض ہے۔ اس کا ایک عظیم مذہبی فائدہ یہ ہوا کہ مختار کو تحریک انتقام کی اجازت مل گئی اور سیاسی دنیا میں امامت پر انتقام کا الزام نہیں لگایا جا سکا۔ ورنہ جس طرح کل امیر المومنینؑ کے اقدامات پر حرص ملک کا الزام لگا دیا گیا تھا اسی طرح آج بھی مختار کی تحریک کو امام زین العابدینؑ کے "حرص ملک" کا نام دے دیا جاتا۔ کیا کتنا مصلحت امامت کا کہ قاتلان حسینؑ کا خاتمہ بھی ہو گیا اور دامن امامت پر کوئی دھبہ بھی نہیں آنے پایا اور کیا کہنا مختار کی نیک نیتی کا کہ اپنے اقدام میں کھلم کھلا امامؑ کو شریک نہیں بنایا اور آواز دی مولا! غلام ملک گیری کا الزام لے سکتا ہے لیکن آپ کے دامن پر کوئی الزام نہیں آنے دے گا۔

دنیا امام زین العابدینؑ کی شخصیت کو پامال کرنے پر کس طرح تلی ہوئی تھی اس کا اندازہ اس وقت ہوا جب حضرت حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے اور ادھر سے

ہشام بن عبد الملک بھی آگیا۔ ہشام کو حجر اسود تک جانے کا راستہ نہ ملا اور حضرت بڑھے تو مجمع خود بخود ہٹ گیا۔ کسی نے ہشام سے پوچھا یہ کون ہیں جن کے لئے قدرتی طور پہ یہ اہتمام ہوا ہے۔ ہشام نے کہا کہ میں نہیں پہچانتا ــــ! یہ سننا تھا کہ فرزدق شاعر کو جوش آگیا۔ کہنے لگا کہ امیر تو اسے نہ پہچانے گا'' یہ وہ ہے جس کے قدموں کی چاپ کو سرزمین بطحا پہچانتی ہے۔ اسے حل و حرم پہچانتے ہیں۔ اسے خانہ کعبہ پہچانتا ہے۔ یہ رسول اعظمؐ کا وارث ہے۔ بہترین بندگان خدا، متقی، پرہیزگار، اور قریش میں انتہائے کرم کی منزل پر قائم ہے۔ یہ کعبہ کی طرف بڑھتا ہے تو کعبہ خود اس کے ہاتھوں کو بوسہ دیتا ہے۔ یہ ابن فاطمہؑ ہے۔ یہ فرزند رسولؐ ہے۔ اس کا عالم یہ ہے کہ جب کوئی سامنے آجاتا ہے تو یہ کمال غیرت سے سر نہیں اٹھاتا اور وہ بھی کمال ہیبت سے سر جھکائے رہتا ہے ــــ

فرزدق کا کیا انجام ہوا یہ آپ کو معلوم ہے۔ حکومتوں کے پاس سزا دینے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے۔ لیکن فرزدق نے مدح کا حق ادا کر دیا اور بتا دیا کہ انھیں نہ پہچانتا اپنے کفر کی علامت ہے۔ ان کی شخصیت پر اس کا کوئی اثر نہیں ہے۔

حالات کی یہی نزاکت تھی جس نے بظاہر امامؑ کا مشغلہ گریہ وزاری کو بنا دیا تھا اور آپ آنسوؤں کی چھاؤں میں تبلیغ دین کر رہے تھے۔ منشاء یہ تھا کہ گریہ و بکا کے ذریعہ ذہنوں کو ہموار کیا جائے۔ طبیعتوں کو پگھلایا جائے اور جب غم کی آنچ پہ لوہا نرم ہو جائے تو صحیفہ کاملہ کی چوٹ لگائی جائے۔ گریہ مقصد زندگی نہیں تھا، تمہید تبلیغ تھا۔ جس طرح مرسل اعظمؐ نے چالیس سالہ سکوت سے قوم کے ذہن کو ہموار کیا تھا اور اس کے بعد اپنے نظام کو پیش کیا تھا۔ اسی طرح امام زین العابدینؑ نے گریہ وزاری،

مجلس و ماتم سے ذہنوں کو ہموار کیا اور پھر معرفت کے سبق سکھائے۔ اس کا صحیح اندازہ اس وقت ہوا جب قید شام سے رہائی ہوئی اور ثانی زہراؑ نے کہا بیٹا۔ یزید سے کہو کہ ہمارے لئے ایک مکان خالی کرا دے تاکہ ہم اپنے وارثوں کا ماتم کر سکیں۔ ثانی زہراؑ کربلا یا مدینہ جا کر بھی ماتم کر سکتی تھیں۔ لیکن چاہتی تھیں کہ صف ماتم شام میں بچھے تاکہ یہاں کے لوگ اور یہاں کی عورتیں پرسہ دینے کے لئے آئیں اور ہم ان سے اپنے واقعات بیان کریں اور یہی آنسو تمہید غم بن جائیں۔ امام زین العابدینؑ کی زندگی کا انداز بھی یہی تھا کہ پہلے مجلس غم برپا کرتے تھے اور جب لوگ جمع ہو جاتے تھے تو اپنے مصائب کے ذیل اسلام کے حقائق نشر کر دیا کرتے تھے۔ تاریخ کائنات میں اس سے زیادہ حسین طریقہ تبلیغ دیکھنے میں نہیں آیا اور نہ کوئی انسان تصور کر سکتا ہے۔ یہ امامت کا کمال تھا کہ ہجوم مصائب میں تبلیغ کا انوکھا راستہ نکال لیا اور ایسا راستہ نکالا کہ دشمن کو بھی اس کی تاثیر کا کلمہ پڑھنا پڑا اور آج جو لوگ بیان فضائل کو حرام نہیں کہتے وہ بھی بیان مصائب اور ذکر مقتل کو حرام کہتے ہیں۔ یہ آنسوؤں کے خلاف فتوے۔ یہ گریہ و بکا کے خلاف آوازیں۔ یہ بدعت و حرام کے نعرے دلیل ہیں کہ دوست غم کی تاثیر کو پہچانیں یا نہ پہچانیں دشمن ضرور پہچانتا ہے اور اس سلسلہ کو روکنا چاہتا ہے لیکن وہ سیلاب کیا رکے گا جس میں عابد بیمار کے ۳۵ سال کے آنسو شامل ہوں۔ جس میں زینب کبریٰ کا گریہ شامل ہو۔ جس میں فاطمہ زہراؑ کی فریاد شامل ہو۔ جس میں آل محمدؐ کی صف عزا شامل ہو۔ جس میں اولاد رسولؐ کا درد شامل ہو۔ حکومتیں مٹ گئیں غم حسینؑ نہ مٹ سکا۔ سلطنتیں فنا ہو گئیں۔ ذوق عزا فنا نہ ہو سکا۔ یہ فاطمہ زہراؑ کی تمنا ہے۔ یہ پیغمبر اکرمؐ کا وعدہ ہے۔ یہ قدرت کا انتظام ہے۔ یہ زینبؑ کبریٰ کی بنیاد ہے۔ یہ عابدؑ بیمار کا جہاد ہے ــــ وہ شام کا بازار۔ وہ دربار۔ وہ قید خانہ ــــ وہ ہجوم مصائب اور وہ بیمار امامؑ کا درد و غم۔

کون اندازہ کرسکتا ہے کہ زندگی کن مصائب سے گذری ہے اور بیمار امامؑ نے کس طرح سے صبر کیا ہے۔ دنیا سے تو آلِ محمدؐ کا رونا بھی برداشت نہ ہو سکا۔ کربلا سے شام تک تازیانوں پر تازیانے مارے گئے کہ کوئی عزیزوں کے غم میں رو نہ سکے۔

آپ سمجھ سکتے ہیں کہ سکینہؑ باپ کے لاشہ سے لپٹی ہوئی ہے اور شمر تازیانے لگا رہا ہے۔ عابدِ بیمار کی آنکھوں میں آنسو ہیں اور اشقیا نوکِ نیزہ چبھو رہے ہیں شہزادیاں رونا چاہتی ہیں اور سامنے وارثوں کے سر لاکر رکھ دیئے جاتے ہیں اور تماشائیوں کا مجمع لگا دیا جاتا ہے۔ جس پر یہ مصائب گذرے ہوں انھیں کا دل جانتا ہے کہ ایک دوپہر میں لاشوں پہ لاشیں، جنازوں پر جنازے آئیں۔ عصر ہوتے ہوتے باپ کا سر نوکِ نیزہ پر۔ تھوڑی دیر میں باپ کے لاشہ پہ اِدھر کے سوار اُدھر، اُدھر کے سوار اِدھر۔ چند لمحے گذرے تھے کہ خیموں میں آگ، بھڑکتے شعلے، لٹتی چادریں، تازیانے، طمانچے — ۱۱ محرم کو بے گور و کفن لاشوں کو چھوڑ کر اس شان کی روانگی کہ ماں بہنیں کھلے سر۔ اپنے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں۔ پیروں میں بیڑیاں۔ گلے میں طوقِ خاردار۔ پھر کوفہ کا بازار۔ ابن زیاد کا دربار۔ شام کی منزلیں۔ منادی کی آواز تماشائیو! تماشا دیکھو یہ اہلبیتِ رسولؐ ہیں جنھیں قیدی بنا کر لیجایا جا رہا ہے — جس کی نظر میں ایسے مصائب ہوں اس کا گریہ کیا تھم سکتا ہے۔ یہی تو وجہ ہے کہ جب خادم نے عرض کی کہ مولا کب تک روئیے گا۔ فرمایا۔ بھائی تو نے انصاف نہیں کیا۔ یعقوبؑ سے ایک یوسفؑ جدا ہو گیا تھا۔ اتنا روئے کہ آنکھیں سفید ہو گئی تھیں۔ میرے تو اتنے یوسف ایک دوپہر میں ذبح کر دیئے گئے — عرض کی مولا! یعقوب کے لئے یہ نیا حادثہ تھا لیکن آپ کے لئے تو شہادت میراث ہے۔ فرمایا۔ بھائی شہادت میراث ہے لیکن کیا یہ بھی میراث ہے کہ ماں بہنوں کے کھلے ہوئے سر ہوں۔ تماشائیوں کا مجمع ہو۔ نوکِ نیزہ پر سرہائے شہداء ہوں اور ہمیں قافلہ کو لے کر دیار بہ دیار

اور شہر بہ شہر جاؤں۔

امامؑ کا یہ عالم ہے کہ دن ہے تو رونا۔ رات ہے تو رونا۔ کھانا دیکھا تو رونا۔ پانی آیا تو رونا — کیسے کھاؤں میرا بابا بھوکا ذبح ہو گیا۔ کیسے پانی پیوں میرا باپ پیاسا مارا گیا۔ وضو کا پانی سامنے آیا تو اتنا روئے کہ پانی دوچند ہو گیا اور پھینک دیا۔ دنیا سے یہ گریہ بھی برداشت نہ ہو سکا اور ظالم ولید بن عبد الملک نے ۲۵ محرم ۹۵ھ کو زہر دے کر امامؑ کو شہید کرا دیا۔ زہر کا اثر شروع ہوا تو امام محمد باقرؑ کو بلا کر فرمایا۔ بیٹا اب میں دنیا سے رخصت ہو رہا ہوں۔ میری تجہیز و تکفین کی ذمہ داری تمھارے اوپر ہے۔ یہ میری زندگی کی آخری رات ہے۔ تھوڑی دیر گذری تھی کہ زہر کا اثر بڑھا۔ امامؑ خاموش ہو گئے۔ ملک الموت نے روح قبض کی اور امامؑ نے دنیا سے انتقال فرمایا۔ مدینہ میں خبرِ شہادت پھیلی۔ چاروں طرف کہرام۔ پرسہ دینے والوں کا ہجوم۔ رونے والوں کا مجمع۔ نمازِ جنازہ ادا کرنے والوں کا اژدھام۔ آج مدینہ کا رنگ کچھ اور ہی ہے۔ آج مسلمانوں کا انداز ہی کچھ اور ہے۔ گریہ بیمار کا اثر۔ یہ اہلبیتؑ میں پہلا جنازہ ہے جو اہتمام سے اُٹھ رہا ہے۔ جنازۂ پیغمبرؐ میں چند افراد۔ جنازہ زہراؑ رات کی تاریکی میں۔ جنازہ امیرؑ خاموشی کے ساتھ۔ جنازہ حسنِ مجتبیٰؑ پہ تیروں کی بارش اور جنازہ حسینؑ کربلا کی خاک پہ کہ اِدھر کے سوار اُدھر اور اُدھر کے سوار اِدھر — یہ پہلا موقع تھا کہ جب امام محمد باقرؑ نے غسل و کفن دے کر جنازہ رکھا ہے تو نماز پڑھنے والوں کا بے پناہ ہجوم تھا۔ آسمان سے ملائکہ کی تکبیر کی آوازیں بلند تھیں۔ ہر طرف شورِ گریہ و بکا تھا — مگر عزادارو! کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ منظر دیکھ کر روحِ سید سجادؑ شاد ہو گی اور اپنے جنازہ کا یہ عالم دیکھ کر روحِ امامؑ مطمئن ہو گی۔ نہیں ہرگز نہیں! میرا دل تو یہ کہتا ہے کہ جب جنازہ کاندھوں پہ بلند

ہوا ہوگا اور ہزاروں کے مجمع میں بقیع کی طرف چلا ہوگا تو بیمار امامؑ نے تابوت سے کربلا کا رُخ کر کے آواز دی ہوگی۔ بابا! یہ آپ کا لال شرمندہ ہے کہ آج میرے جنازہ میں یہ مجمع۔ میرا تابوت اُٹھانے والے اتنے ـــ مگر کل جب میں کربلا سے رخصت ہو رہا تھا تو آپ کا جنازہ خاک گرم پر پڑا ہوا تھا۔ ریگ صحرا کا کفن ـــ بابا آپ کا جنازہ دفن بھی ہوا تو ایک اکیلا بیمار فرزند۔ نہ اعزا نہ اقربا۔ نہ چاہنے والے۔ نہ دل کے ٹکڑے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جب میں نے آپ کے جسم اقدس کو قبر میں اُتارا تھا تو دو ہاتھ برآمد ہوئے تھے اور آواز آئی تھی۔ لاؤ بیٹا زین العابدینؑ ـــ لاؤ میری امانت کو میرے حوالے کر دو۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون

ختم شد

امام محمد باقر علیہ السلام

اسم مبارک	محمد
لقب	باقر، شاکر، ہادی، امین
کنیت	ابوجعفر
والد ماجد	امام زین العابدینؑ
والدہ ماجدہ	فاطمہ بنت حسنؑ
ولادت	یکم رجب ۵۷ھ۔ مدینہ منورہ بروز جمعہ
ازواج	دوؔ
اولاد	ساتؔ
شہادت	۷ ذی الحجہ ۱۱۴ھ دوشنبہ
عمر مبارک	۵۷ سال
قبر مطہر	جنت البقیع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ اشرف الاولین والآخرین خاتم النبیین سیدنا ومولانا ابی القاسم محمد وآلہ الطیبین الطاہرین ولعنۃ اللہ علیٰ اعدائہم اجمعین اما بعد فقد قال اللہ الحکیم فی کتابہ الکریم ۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى

ارشاد جناب رب العزت ہوتا ہے "بیشک ہدایت کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے اور دنیا و آخرت کا اختیار ہمارے ہاتھوں میں ہے۔" کائنات کا اختیار رکھنے والا پروردگار اپنے فضل وکرم سے انسان کو جملہ امور کا اختیار دے دیتا ہے۔ کھانا، پینا، سونا، جاگنا، رہنا، سہنا، اٹھنا بیٹھنا سب اس کے اختیار میں ہے۔ لیکن یہ اس کے اختیار میں نہیں ہے کہ اپنے ہادی ورہنما کا انتظام خود کرے بلکہ صاف لفظوں میں اعلان کر دیا گیا مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ انتخاب کا حق انسان کو نہیں ہے۔ یہ صرف رب العالمین کا اختیار ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے خلق کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے منتخب کرتا ہے۔ انتخاب بندوں کے بس کا نہیں ہے اور یاد رکھو اگر کسی نے یہ اختیار اپنے ہاتھ میں لیا تو وہ صرف گنہگار ہی نہ ہوگا بلکہ پروردگار کے حق کا غاصب اور اسلام کا باغی بھی کہا جائے گا۔ اور دنیا کے کسی نظام میں باغی کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ قانون اپنے گنہگاروں کو چھوٹ دے سکتا ہے لیکن باغیوں کو

چھوٹ دینے کے لئے تیار نہیں ہے۔ صلوات

یہ اس کا کرم تھا کہ اس نے انتخاب کا حق اپنے ہاتھوں میں رکھنے کے بعد یہ بھی بتا دیا کہ ہم کسے منتخب کریں گے اور ہمارے منتخب بندوں کا انداز کیا ہوگا۔ اس مسئلہ کو محض اپنی ذات تک محدود نہیں رکھا۔ اور اس علم کو خالص علم غیب نہیں بنا دیا۔ ایسا کر دیا ہوتا تو کل جس کا جی چاہتا وہ الٰہی انتخاب کا دعویٰ کر دیتا۔ اور بندوں کے پاس کوئی تردید کا حق بھی نہ ہوتا۔ ہر شخص نگاہ قدرت میں منتخب بن جاتا اور بندے اس کے اس کے انتخاب کے چکر میں آجاتے۔ یہ اس کا کرم تھا کہ اس نے ایک طرف غلط دعویٰ کرنے والوں کے حوصلے پست کر دیئے اور دوسری طرف صاف دل اور سادہ لوح بندوں کو آگاہ کر دیا کہ خبردار ہمارے معیار سے ہٹ کر کسی کے دعویٰ پر اعتماد نہ کرنا اور جب تک ہمارے بنائے ہوئے قوانین نہ مل جائیں کسی کو اپنا ہادی اور راہنما تسلیم نہ کرنا۔

شرائط اور قوانین کو سمجھانے کا بھی بار بار انتظام کیا گیا۔ اور مختلف مواقع پر اس کا اعلان ہوتا رہا۔ لیکن سب سے زیادہ اہم انتظام روز اول کیا گیا۔ جب ملائکہ معصومین کے مقابلہ میں جناب آدمؑ کو اپنا خلیفہ اور جانشین بنایا گیا اور آنے والی نسل انسانیت پر واضح کر دیا گیا کہ اگر تمہیں عزت آدمؑ کا خیال ہے اور تم آدمؑ کی صحیح اولاد ہو۔ تم میں ذرہ برابر آدمیت پائی جاتی ہے تو اس کا لحاظ رکھنا کہ تمہارے بابا آدمؑ کا امتیاز کبھی ملائکہ مقربین کے مقابلہ میں ان کا علم و فضل تھا ورنہ عصمت ملائکہ میں بھی تھی۔ نیک کردار وہ بھی تھے۔ سجدہ گذاری میں ان کا بھی کوئی جواب نہیں تھا۔ تسبیح و تقدیس ان کا بھی شعار تھی۔ اور ایسا شعار کہ انھیں اس کے اظہار و اعلان میں کوئی تکلف بھی نہ ہوا

اور اسے عظمت آدمؑ کے مقابلہ میں پیش کر دیا۔ لیکن وہ علم و فضل میں آدمؑ جیسے نہ تھے۔ اس لئے میں نے آدمؑ کو خلیفہ بنا دیا۔ اور ملائکہ کو نہیں بنایا۔ تو اے اولادِ آدمؑ یاد رکھنا کہ ہمارے منصب کے لئے عصمت بھی ضروری ہے اور علم بھی۔ تنہا علم کافی ہوتا تو آدمؑ کو معصوم نہ بناتا اور تنہا عصمت کافی ہوتی تو ملائکہ کو خلافت دے دیتا۔ آدمؑ کو عصمت و علم دے کر میں نے واضح کر دیا کہ میرا منصب صاحبان علم و کردار کے لئے ہے۔ اب اگر کسی کے پاس ملائکہ سے بلند تر علم اور آسمان والوں سے زیادہ عصمت کردار نہیں ہے تو وہ ہمارا منصب دار نہیں ہے۔ اور نہ فقط یہ کہ منصب دار نہیں ہے بلکہ دعوائے منصب کرے تو ہمارے حق کا غاصب اور ہمارے قانون کا باغی کہا جائے گا اور باغی کو کسی قانون میں معاف نہیں کیا جا سکتا۔ صلوات

مالک کائنات نے روز اول اپنے ہادی و رہنما کے شرائط بیان کر کے عالم انسانیت کو مطمئن کر دیا اور دنیا کو بتا دیا کہ ہمارے راہنما کو علم و کردار سے پہچانا جا سکتا ہے۔ ہم اس وقت تک کسی کو صاحب منصب نہیں بناتے جب تک اس کے علم میں ہمہ گیری اور کردار میں معصومیت نہ پیدا ہو جائے۔ گنہگاروں کو منصب دینا ہوتا تو ہم یہ کام اپنے ذمہ لیتے ہی کیوں؟ گنہگاروں کو تو تم بھی پہچانتے ہو۔ اور خوب پہچانتے ہو۔ وہ تمہاری ہی برادری کے آدمی ہیں۔ تمہیں ان کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے اور ہمیں کیا ضرورت ہے کہ ہم گنہگار کو منصب دے کر اپنے منصب کی توہین کریں۔ اور دین کی قیادت کو بھی دنیا کی حکومت بنا دیں۔ یہ عصمت ہی ایک ایسی چیز ہے جس کا علم تمہیں نہیں ہے۔ یہ کردار کی پاکیزگی ہی ایک ایسا جوہر ہے جو تمہیں نہیں معلوم ہے۔ جس کے لئے ہم نے یہ کام اپنے

ذمہ لیا ہے تاکہ تمہیں حالات سے آگاہ کرتے رہیں اور یہ بتاتے رہیں کہ جنہیں ہم منصب دار بناتے ہیں سمجھ لو کہ ان کے کردار میں عصمت ہے اور جن مردوں کو منصب سے محروم کر دیں۔ سمجھ لو کہ ان کے کردار میں عصمت نہیں ہے۔

— صلوات

عصمت کردار کا مسئلہ نہایت پیچیدہ ہے اور اس پر روشنی ڈالنے کے لئے بڑا وقت درکار ہے۔ اس وقت صرف مختصر انداز سے گفتگو کرتے ہوئے ایک لفظ کی طرف اشارہ کر کے آگے بڑھ جانا ہے کہ جس وقت اللہ نے پہلے خلیفہ جناب آدمؑ کو خلافت دی ہے اس وقت انسانی آبادی کتنی تھی۔ کتنے مخالف تھے۔ کتنے موافق۔ کتنی فوج تھی کتنا لشکر۔ کتنے حملوں کا خطرہ تھا۔ کتنے تاک میں بیٹھے ہوئے تھے؟ آپ کہیں گے یہ کچھ نہیں تھا۔ اس وقت انسان تھے ہی کہاں۔ جو فوجیں ہوتیں۔ لشکر ہوتے۔ حملہ آور ہوتے۔ حملے ہوتے۔ خطرات ہوتے۔ اندیشے ہوتے۔ انسان تو آدمؑ کی اولاد ہی کا نام ہے آدمؑ سے پہلے انسان کہاں سے آتے اور لشکر و فوج تو اولاد آدمؑ ہی سے ترتیب پاتی ہے۔ خلقت آدمؑ کے وقت لشکر و فوج کا کیا تصور ہو سکتا تھا۔ یہ بحثیں اس مقام پر بالکل بے کار ہیں اور ان کے اٹھانے کا کوئی محل نہیں ہے۔ میں کہوں گا کہ بحثیں بیکار نہیں ہیں۔ اس کے بعد ایک بحث اور پیدا ہو گئی کہ جب لشکر نہیں تھے۔ فوجیں نہیں تھیں۔ مخالف نہیں تھے حملے نہیں تھے اندیشے نہیں تھے۔ خطرات نہیں تھے تو آدمؑ کو خلیفہ بنانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ دنیا کو یونہی چھوڑ دیا جاتا۔ جب آدمؑ پیدا ہو جاتے نسل آدمؑ خلق ہو جاتی۔ دنیائے انسانیت وجود میں آ جاتی۔ بدکردار اور باغی جنم لے لیتے۔ دین خدا کے مٹنے کا اندیشہ پیدا ہو جاتا۔ حملوں کی تیاریاں ہو جاتیں

ملک خطرہ میں پڑجاتا۔ دشمن فوج کشی پر آمادہ ہوجاتے۔ منافقین کی ریشہ دوانیاں منزل عروج پر پہنچ جاتیں۔ کفر پورے طور سے تیار ہوجاتا تو آدمؑ کو خلافت دے دی جاتی۔ اور آدمؑ فوراً حملہ کرکے دشمنوں کو فنا کر دیتے یا دفاعی لڑائی لڑکر دین الٰہی کو بچا لیتے۔ گویا قبل از مرگ واویلا کی کیا ضرورت تھی۔ اور قبل از وقت اتنے بڑے ہنگامے کی کیا ضرورت تھی کہ خلافت کا اعلان بھی ہوجائے۔ سجدہ کا حکم بھی ہوجائے۔ ملائکہ کا دعویٰ بھی ہوجائے "اِنِّیْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ" کہہ کے اس کی تردید بھی ہوجائے۔ ملائکہ مقرب بھی بن جائیں۔ ابلیس نکال بھی دیا جائے۔ آدمؑ جنت چھوڑ کر روئے زمین پر آبھی جائیں اور ساری کائنات درہم برہم ہوجائے۔ نہ کوئی موضوع نہ کوئی ضرورت۔ صرف گھر کی رونق کے لئے اتنا ہنگامہ ہورہا ہے۔ آپ کہیں گے خبردار۔ یہ کیسی کفر کی باتیں ہیں۔ نظام الٰہی پر اعتراض۔ انتظام قدرت پر اعتراض؟ میں کہوں گا استغفر اللہ۔ میں اعتراض نہیں کر رہا ہوں۔ میں تو فقط پوچھ رہا ہوں کہ جب کوئی حملہ کا خطرہ اور اندیشہ نہیں تھا۔ جب دنیا میں کوئی شر و فساد نہیں تھا تو آدمؑ کو خلیفہ بنانے کی کیا ضرورت تھی۔ مجھے فرزند آدمؑ ہونے کے اعتبار سے خوشی ہے کہ ہمارے بابا کو مفت میں خلافت مل گئی۔ لیکن ایک صاحب نظر ہونے کے اعتبار سے یہ جستجو بھی ہے کہ یہ خلافت کیوں ملی اور اس کی کیا ضرورت تھی۔ آپ کہیں گے تم نے غلط سمجھا ہے۔ خلافت کا مصرف لشکر کشی اور جنگ و دفاع نہیں ہے۔ خلافت کا منصب فوجداری اور کشت و خون کے لئے نہیں دیا جاتا۔ خلافت کے لئے داخلی یا خارجی حملوں کی ضرورت نہیں ہے۔ خلافت ایک نیابت الٰہیہ ہے جو دین کی حفاظت کے لئے دی جاتی ہے اور اس کا منشا صرف یہ ہوتا ہے کہ دین الٰہی محفوظ رہے

اور اس کے احکام میں کوئی خلل نہ پڑنے پائے۔ دین کے واقعی احکام لوگوں کی فکر و نظر کی نذر نہ ہوجائیں اور ایک ایسا ذمہ دار انسان بھی رہے جو دین کے جملہ قوانین کو اپنے سینے میں محفوظ رکھے۔ اور جب دنیا میں یہ مسئلہ اٹھے کہ اس موضوع میں دین کی صحیح رائے کیا ہے تو وہ فکر و نظر کے اجتہاد کے بجائے علم الٰہی پر اعتماد کرکے مسئلہ کو بیان کر دے اور دین کی صحیح صورت محفوظ رکھے۔ یہ اور بات ہے کہ یہ منصب پروردگار اسی کو عنایت کرتا ہے جس میں دین کو رائج کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے اور جو دین پر ہونے والے حملوں کو روک سکتا ہے اور اس میں روکنے کی اتنی طاقت ہوتی ہے کہ اگر سارا لشکر ایک طرف ہوجائے تو وہ اکیلا بھی میدان سے فرار نہ کرے۔ تم نے موسیٰ اور ہارون کی تاریخ پڑھی ہے۔ پروردگار عالم نے انھیں منصب سے سرفراز فرمایا لیکن اس حوصلہ کے ساتھ کہ جب ساری قوم نے کہہ دیا کہ موسیٰ تم ہارون کو لے کر چلے جاؤ اور فرعون سے مقابلہ کرو۔ ہم یہیں بیٹھ کر تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ تو جناب موسیٰؑ نے یہ نہیں کہا کہ جب تمھیں نہ جاؤ گے تو میں اکیلا جاکر کیا کروں گا۔ اور ایک بیچارے ہارونؑ کیا کریں گے۔ بلکہ جناب موسیٰؑ آگے بڑھ گئے اور ہارون نے ساتھ دیکر واضح کر دیا کہ جو لشکروں کے ساتھ بھاگ جائے وہ موسیٰ کا وزیر نہیں ہوتا۔ میرا کردار یاد رکھنا۔ میں خاتم النبیینؐ کا وصی نہیں ہوں۔ لیکن مجھ میں یہ حوصلہ ہے کہ لشکر کے بغیر بھی حملہ کر سکتا ہوں۔ اور میں یہ کبھی نہ کہوں گا کہ جب لشکر بھاگ گیا تو میں ہی ٹھہر کر کیا کرتا۔ اب تم خود فیصلہ کرو کہ خاتم النبیینؐ کے وصی کو کیسا ہونا چاہئے۔ صلوات۔

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ پروردگار کی خلافت کا معیار علم و کردار ہے۔

اور یہ خلافت اس کی طرف سے اسی انسان کو دی جاتی ہے۔ جس میں علم و کردار کے ساتھ ایسا عزم و حوصلہ ہو کہ ہر مخالفت کا مقابلہ کر سکے اور ہر بڑی سے بڑی طاقت سے ٹکرا سکے۔ اس کا جانشین کسی محاذ پر خاموش نہیں رہ سکتا۔ اور اس کا نمائندہ کسی میدان سے فرار نہیں کر سکتا۔ لشکر کشی اور فوجداری اصل خلافت نہیں ہے۔ خلافت کی بنیاد حفاظت دین ہے۔ لشکر و فوج بعد کے مسائل ہیں اور یہ سب میں نے اس لئے عرض کر دیا کہ آدمؑ کی اولاد کو ہوش آ جائے کہ آدمؑ کی خلافت میں لشکر و فوج۔ خطرہ و حملہ بنیاد نہیں تھا۔ تو خاتمؐ کی خلافت میں یہ مسائل کیسے بنیاد بن سکتے ہیں۔ اور ایک لفظ اور بھی کہہ دوں کہ اگر خلافت کا معیار دشمن سے مقابلہ ہی تھا تو میرا خیال تھا کہ ملک الموت کو خلیفہ بنا دیا جاتا۔ وہ آدمؑ سے کہیں بہتر ہوتے۔ آدمؑ تو فقط جنگ کر سکتے ہیں۔ اور آخر میں قتل بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن ملک الموت دوسروں کو فنا کر سکتے ہیں اور خود نہیں مر سکتے۔ لیکن پروردگار عالم نے ملک الموت کے مقابلہ میں آدمؑ کو منتخب کر کے واضح کر دیا کہ ہمیں لشکر و فوج درکار نہیں ہے۔ علم درکار ہے۔ اب خبردار نبیؐ آخر کے بعد یہ کہہ کے خلافت نہ لے لینا کہ دشمنوں کے حملے کا اندیشہ تھا۔ لہٰذا ہم نے سردار چن لیا اور عالم کا انتظار نہ کیا۔ کاش تم نے ایسا ہی کیا ہوتا اور اس سردار کا انتخاب کیا ہوتا جو کسی میدان سے پیچھے نہ ہٹا ہو۔ اور خیبر میں کرار غیر فرار کی سند لے چکا ہو ــــــ صلوات

خلافت الٰہیہ کو علم و کردار سے ہٹا کر سرداری فوج و لشکر میں ڈال دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام میں یزید جیسے شرابخوار اور ولید فاسق جیسے ناہنجار بھی خلیفہ بن گئے۔ اور آج تک امت اسلامیہ بارہ کی تعداد پورا کرنے کے

لئے روزانہ ایک خلیفہ کو نکالتی ہے۔ اور ایک کو داخل کرتی ہے۔ کوئی انھیں نکال کر انھیں شامل کرتا ہے۔ کوئی انھیں نکال کر انھیں شامل کرتا ہے۔ اسی طرح یہ دنیا چل رہی ہے۔ اور خلافت کی تعداد مکمل نہیں ہو رہی ہے۔ اب آپ سوچیں کہ جب تعداد تک معلوم نہیں ہے تو شرائط و قوانین کیا معلوم ہوں گے۔ یہ نتیجہ ہے انتخاب الٰہی سے ہٹ کر اپنے ہاتھ میں انتظام لے لینے اور رب العالمین کے مقابلہ میں اپنی رائے کو مقدم کرنے کا ــــ اس نے صاف واضح کر دیا تھا کہ دین ہمارا ہے تو ذمہ دار بھی ہمارا ہوگا۔ نہ تم نے دین بنایا ہے نہ تمھیں اس کا ذمہ دار بنانے کا کوئی حق ہے۔ اگر تم نے کوئی دین بھی بنا لیا ہے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ تم جسے چاہو اس کا ذمہ دار بنا سکتے ہو ــــ اور ہم تو اسی دن طے کر دیں گے کہ تم نے کوئی نیا دین بنا لیا ہے جس دن تم ہمارے دین کے نام پر اپنا کوئی نمائندہ منتخب کر لو گے ــــ صلوات

علم کی گفتگو چل رہی ہے تو جی چاہتا ہے کہ ایسے عالم کا تذکرہ کیا جائے جس کو مرسل اعظمؐ نے "باقر العلوم" کی سند دی ہو اور یہ واضح کر دیا ہو کہ سارے انبیاء و مرسلین کے علوم و کمالات کو تفصیل و تشریح کے ساتھ حاصل کرنا ہے تو میرے اس فرزند کے پاس جاؤ اور دیکھو کہ علم و فضل کا کیا عالم ہے۔ جہاں ساری کائنات مسائل کو حل کرنے سے عاجز ہوگی۔ جہاں ارباب حکومت سرگرداں ہوں گے۔ جہاں دماغ چکرا رہے ہوں گے۔ جہاں ذہن ماؤف ہو رہے ہوں گے۔ جہاں اقتدار کی پیشانی پر پسینہ آ رہا ہوگا۔ وہاں میرا فرزند سکون و اطمینان سے علمی مسائل حل کر رہا ہوگا اور اس شان سے حل کر رہا ہوگا کہ دنیا کی امتیں شاگردی کے لئے بے چین ہوں گی اور اگر کچھ مل جائے گا تو اسے سرمایہ افتخار بنائیں گی۔

ہشام بن عبدالملک کا دورِ حکومت ہے۔ لوگوں نے یہ گذارش کی ہے کہ مکہ کے راستے میں پانی کا کوئی انتظام نہیں ہے اور عراق و شام سے آنے والے حاجیوں کو سخت زحمت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہشام کا کرم جوش میں آچکا ہے۔ حکم دے دیا گیا ہے کہ ایک مقام پر کنواں کھودا جائے۔ اور حاجیوں کی سیرابی کا انتظام کیا جائے۔ جگہ معین ہو گئی ہے اور کھدائی کا کام شروع ہو گیا ہے۔ آخری منزل پر آنے کے بعد جب پانی نکلنے کے امکانات پیدا ہوئے تو سوتے سے پانی نکلنے کے بجائے ایسی گرم ہوا نکلی کہ سارے مزدور جھلس کر رہ گئے۔ اور کوئی ایک باہر نہ آسکا۔ لوگ منتظر رہے کہ ڈول مٹی سے بھر جائے تو نکالا جائے۔ لیکن یہاں ہے کون جو ڈول بھرے گا۔ آخر کار چند مزدور تحقیق کی غرض سے اترے اور وہ بھی اسی گرم ہوا کی نذر ہو گئے۔ دوبارہ دوسرے افراد گئے اور ان کا بھی یہی حشر ہوا۔ اندر جانے والے فنا ہوتے جاتے ہیں۔ اور باہر والوں کا اضطراب بڑھتا جاتا ہے۔ آخر یہ معمہ کیا ہے اور مزدور باہر کیوں نہیں آتے۔ اگر وہ مر بھی گئے ہیں تو کنواں تو بند کیا جا سکتا ہے۔ لیکن حاجیوں کا کیا حشر ہوگا۔ وہ مسئلہ تو پھر باقی رہ جائے گا۔ اور اگر دوسری جگہ دوسرا کنواں کھودا جائے تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ وہاں ایسا نہ ہوگا اور اس طرح کی آندھی نہ آئے گی۔ اور اگر وہاں بھی یہی حشر ہوا تو اتنا سرمایہ کہاں سے آئے گا کہ روز ایک کنواں کھودا جائے۔ اور اتنے مزدور کہاں [illegible] سے آئیں گے کہ ہر کنوئیں میں دس بیس مزدور بھینٹ چڑھا دیئے جائیں۔ سخت تردد ہے۔ ہشام کو خبر دی گئی ہے۔ سارا جوشِ کرم سرد پڑ گیا ہے۔ اہلِ علم کو بلایا گیا ہے۔ جغرافیہ دانوں کو طلب کیا گیا ہے۔ مورخین سر جوڑ کر بیٹھے ہیں۔ اور کوئی نہیں بتا سکا کہ آخر اس کا راز کیا ہے

اور اس کا انجام کیا ہونے والا ہے۔ بالآخر حکومت نے مجبور ہو کر امامت کے آستانے پر جبیں رکھی اور امام محمد باقرؑ کو طلب کیا گیا۔ حضرت اس جگہ پر تشریف لے گئے اور فرمایا کہ یہ جگہ وہ ہے جہاں قوم احقاف پر عذاب نازل ہوا تھا اور ایک "ریح عقیم" نے ان کا خاتمہ کر دیا تھا۔ یہ ایسی آندھی کی حرارت ہے کہ آج تک زمین جھلس رہی ہے۔ تھوڑے فاصلے پر کنواں کھودا جائے۔ انشاء اللہ کوئی زحمت نہ ہوگی۔ حضرت کے حکم کے مطابق دوسرا کنواں کھودا گیا اور بہ آسانی پانی نکل آیا۔ واقعہ تو بہت مختصر ہے لیکن دو تین باتیں واضح طور پر معلوم ہو گئیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ علم و عصمت کو چھوڑ کر خلافت تقسیم کرنے کا انجام یہ ہوتا ہے کہ جب علمی مسئلہ سامنے آتا ہے تو صاحبانِ علم و عصمت کے سامنے ہی سرِ تسلیم جھکانا پڑتا ہے۔ صلوات۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہشام کے دور میں علم و فکر کا بڑا چرچا تھا۔ دربار میں مختلف علوم کے علماء موجود تھے۔ اس نے سب سے مشورہ کیا لیکن کوئی نہ بتا سکا تو کیا یہ کوئی تاریخ و جغرافیہ کا مسئلہ تھا۔ سائنس اور حساب کا مسئلہ تھا کہ علماء سے غیر متعلق ہوتا۔ یہ تو قرآن کے سورہ احقاف کا مسئلہ تھا۔ یہ تو کتاب اللہ کے "ریح عقیم" کا مسئلہ تھا۔ پھر علماء کیوں نہیں بتا سکے اور امام محمد باقرؑ کی ضرورت کیوں پیش آئی — یہ قدرت کا انتقام تھا۔ جیسا کتاب اللہ کا کل تم نے کتاب اللہ کے نام پر عترت کو چھوڑ دیا تھا۔ تو اب قیامت تک کتاب اللہ ہی کے مسئلہ میں تمہیں عترت کی ڈیوڑھی پر سجدے کراؤں گا۔ اور تمہیں یہ محسوس ہوتا رہے گا کہ عترت کو چھوڑنے کا یہاں کیا انجام ہوتا ہے۔ وہاں کا حشر تو معلوم ہے۔ پیغمبرؐ نے خود واضح کر دیا تھا کہ قسیم النار والجنۃ علیؑ ہیں اب جسے جنت

میں جاتا ہوگا وہ علیؑ کے دامن سے وابستہ ہوگا۔ صلوات

ایک بات اور بھی واضح ہوگئی کہ حاجیوں کو پانی پلانے کا کام آلِ محمدؐ کے بزرگوں کا منصب تھا۔ اس راہ میں جناب ہاشم نے زحمتیں برداشت کی تھیں جناب عبدالمطلب نے مصائب جھیلے تھے۔ حضرت ابوطالب نے قرضے لئے تھے۔ مرسلِ اعظمؐ نے پریشانیاں اٹھائی تھیں ـــ اور آج بنی امیہ کا وارث اس شرف کو اپنے حصہ میں لینا چاہتا ہے۔ قدرت نے کہا تو بھی تم زحمتیں برداشت کرو لیکن نتیجہ کچھ نہ حاصل ہو۔ تم نے [illegible] رے نمائندوں سے کنارہ کشی کیسے کی۔ تم نے ان کے وجود کو معطل کیسے بنادیا۔ اور میں تو یہ کہوں گا کہ قدرت نے اپنے ہلکے سے انتقام میں واضح کر دیا کہ تمہارے حصہ میں گرم آندھی، شعلہ خیز ہوا اور آگ ہے۔ تمھیں پانی سے کیا تعلق ہے۔

امام محمد باقرؑ نے دوسری جگہ کنواں کھدوا کر واضح کر دیا کہ بالآخر جس کا آبائی منصب تھا پلٹ کر اسی کی ڈیوڑھی تک آگیا۔ اور رہتی دنیا تک یہ بات یادگار رہے گی کہ سقائی کا انتظام امامت نے کیا ہے حکومت نے نہیں کیا اور میں تو ایک لفظ یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ یہ انتظام امام محمد باقرؑ کے علاوہ دوسرا کون کر سکتا تھا سقائی ساقی کوثر کے لال کا ترکہ ہے۔ "اولٰئک اصحاب النار" کی میراث نہیں ہے ـــ صلوات

دوسرا واقعہ ہشام کے باپ عبدالملک کے زمانہ کا ہے۔ اس کے دور میں اسلامی حکومت میں رومی سکے رائج تھے اور روم کا بادشاہ قیصر سخت قسم کا عیسائی تھا۔ اس نے عبدالملک کے پاس پیغام بھیجا کہ آئندہ سال سے ہمارے ملک میں خالص عیسائی سکے ڈھالے جائیں گے۔ اور ان پر اسلام کے عقائد کے خلاف چیزیں نقش کی جائیں گی اب تمھیں اختیار ہے چاہے ہمارے سکوں کو استعمال کرو اور اپنے مذہب سے الگ ہو جاؤ۔ یا اپنے نئے سکہ کا انتظام کرلو۔ ہماری رائے میں کوئی

ترمیم نہیں ہو سکتی ـــ قیصر روم کو اسلامی بادشاہوں کی جہالت اور عاجزی کا علم تھا۔ اور وہ جانتا تھا کہ ایک ایسے دباؤ میں آکر انھیں عیسائیت نواز سکوں پر راضی ہو جانا پڑے گا۔ اور اس طرح اسلامی ممالک میں عیسائیت کا سکہ چلنے لگے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور جب عبدالملک نے اربابِ حل و عقد کو بلا کر مشورہ کیا کہ اب کیا کیا جائے تو سب کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ نیا سکہ کیسے بنے گا اور اگر بن گیا تو اس پر کیا نقش کیا جائے گا؟ کوئی رائے نہ طے ہو سکی اور سب کی عاجزی منظرِ عام پر آگئی ـــ بالآخر عبدالملک نے مجبور ہو کر امام محمد باقرؑ کی طرف توجہ کی اور عرض کی فرزندِ رسولؐ آپ فرمائیں اس مسئلہ میں آپ کا کیا خیال ہے۔ عیسائی سکہ رائج کیا جائے یا دوسرا سکہ ایجاد کیا جائے۔ اور ایجاد کیا جائے تو اس کا نقش کیا ہوگا؟ آپ نے فرمایا کہ رومی سکے فوراً بند کر دیئے جائیں۔ اس سکہ پر ایک لا الٰہ الا اللہ لکھا جائے اور دوسری طرف محمدؐ رسول اللہ نقش کیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور اسلامی حکومت میں اسلامی سکہ چلنے لگا۔

واقعہ میں چند باتوں پر نگاہ رکھنے کی ضرورت ہے ـــ اولاً یہ کہ حکومت عیسائی سکہ پر راضی ہو جاتی اگر امام محمد باقرؑ کا مشورہ درمیان میں نہ آجاتا ـــ یعنی اقتدار کو اقتدار سے غرض ہے مذہب سے نہیں اور مالکِ کائنات بھی بتانا چاہتا ہے کہ ہمارا نمائندہ مذہب کا ذمہ دار ہوتا ہے، اقتدار کا پرستار نہیں ـــ بھلا فاتح مباہلہ کا فرزند اس بات پر راضی ہو سکتا تھا کہ اسلامی دنیا میں عیسائیت کا سکہ چل جائے اس پر تو وہی لوگ راضی ہو سکتے تھے جن کے بزرگوں کو مباہلہ میں کوئی حصہ نہیں ملا تھا۔ اور جو جھوٹوں پر لعنت کرنے سے ہمیشہ گھبراتے رہتے ہیں۔ صلوات

دوسری بات یہ ہے کہ الٰہی نظام سے ہٹنے کے بعد عیسائیت کی احتیاج یہ عبدالملک کے دور کا حادثہ نہیں ہے۔ بلکہ آج کتنے اسلامی ملک ہیں جن میں عیسائی یا در پردہ عیسائی سکہ چل رہا ہے اور مسلمان کو اس کا ہوش بھی نہیں ہے۔ کبھی عیسائیت سے مقابلہ کیا ہوتا تو اپنی فتح کا خیال بھی ہوتا۔ جب کبھی مقابلہ کیا ہی نہیں تو فتح کی قدر و قیمت کیا معلوم ہو گی۔ ہاں جو فاتح ابن فاتح تھا وہ نہ کبھی عیسائیت کے سامنے جھکا نہ جھکے گا اور عیسائیت کا کیا ذکر ہے خود عیسیٰ بھی آسمان سے اتر کر آجائیں تو اسے نہیں جھکا سکتے۔ بلکہ اسی کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں گے۔ اور وہ وقت آئے گا جب پردۂ غیب سے نبیؐ کا آخری وارث آئے گا اور آسمان سے جناب عیسیٰ آئیں گے۔ عیسیٰ ماموم بن کر جماعت میں کھڑے ہوں گے اور نبیؐ کا لال امامت کے فرائض انجام دیگا۔ قدرت آواز دے گی۔ دنیا والو دیکھو خلافت ختم ہو چکی ہے اور امامت آج تک امامت کر رہی ہے۔ صلوات

خاتمہ کلام میں ایک لفظ اور کہہ دینا چاہتا ہوں کہ تاریخ کے اس واقعہ نے اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا کہ اسلامی سکوں پر "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کا نقش امام محمد باقرؑ کی ایجاد ہے کسی بادشاہ دنیا کی نہیں ہے۔ اب دنیائے اسلام میں جہاں کہیں بھی ایسا سکہ چلے گا یا ایسا نقش رہے گا اس پر امام محمد باقرؑ کا احسان رہے گا۔ دنیا کتنی احسان فراموش ہے کہ امام کے نقش کو لیکر اسلامی حکومت بنالی اور پھر انھیں کے مزار اقدس پر انہدام کی سازش چلنے لگی۔ یہ ہے اہل ہوس واقتدار کا انداز اور میرا دل تو کہتا ہے کہ قبر امام محمد باقرؑ آج بھی آواز دے رہی ہے کہ اسلام کے دعویدارو میری قبر مٹائی جا سکتی ہے میرا نقش نہیں مٹایا جا سکتا۔ ہم اپنے لئے جیتے ہوتے تو قبر کے مٹنے پر پریشان ہوتے۔ ہم

اسلام کے لئے زندہ رہے ہیں تو ہم آج بھی مطمئن ہیں کہ ہمارے مٹانے والے ہمارے نقش کو ابھارتے ہی جا رہے ہیں۔ مٹا نہیں پاتے۔ صلوات

بیان اپنی آخری منزل پر آ رہا ہے اور واقعات کا ایک سلسلہ ہے جو ختم نہیں ہو رہا ہے۔ اس لئے خاتمہ کلام میں صرف ایک واقعہ کی طرف اور اشارہ کر دینا ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ جس کو اللہ منصب دیتا ہے اس کے علم و فضل کا کیا عالم ہوتا ہے۔

طاؤس یمانی دنیائے اسلام کی ایک جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ ایک مرتبہ امام محمد باقرؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ عرض کرتے ہیں فرزند رسول! ذرا یہ تو بتائیے کہ وہ کون سا دن تھا جب ایک تہائی دنیا فنا ہو گئی تھی۔ آپ نے فرمایا بھائی تمھیں تو سوال کرنے کا بھی سلیقہ نہیں ہے۔ ایک تہائی نہیں بلکہ ایک چوتھائی۔ اور یہ اس دن کا واقعہ ہے جب قابیل نے ہابیل کو شہید کیا تھا۔ اور ایک چوتھائی دنیا فنا ہو گئی تھی۔ اس وقت دنیا کی کل آبادی چار آدمیوں پر مشتمل تھی۔ جناب آدمؑ۔ جناب حوا۔ جناب ہابیل۔ اور قابیل اور جب ایک کم ہو گیا تو گویا ایک چوتھائی دنیا کم ہو گئی۔ صلوات

امام نے ایک مسئلہ کی طرف اور بھی اشارہ کر دیا کہ شہادت کا مرتبہ افراد سے طے نہیں ہوتا منزلت سے طے ہوتا ہے۔ ہابیل کی شہادت کو ایک فرد کی شہادت نہ سمجھو ایک چوتھائی دنیا کا قتل سمجھو اور جیسا قتل ہوتا ہے ویسا ہی قاتل کے بارے میں فیصلہ کیا جاتا ہے۔ ہابیل ایک چوتھائی دنیا تھے تو ان کا قاتل ۱/۴ دنیا کا قاتل کہا جائے گا۔ امامؑ قلب کائنات ہوتا ہے تو اس کا قاتل کل کائنات کا قاتل کہا جائے گا۔ لہٰذا اس کے مقابلے میں ستر ہزار کا قتل کیا ہے۔ اگر ساری دنیائے مخالفت بھی تہ تیغ کر دی جائے تو بھی خون امامؑ کا انتقام نہیں ہو سکتا۔

امامؑ نے واضح کر دیا کہ مختار کے اقدام کو دیکھ کر یہ نہ سمجھنا کہ خون حسینؑ کا انتقام ختم ہو گیا۔ ابھی آخری انتقام باقی ہے اور اس میں وہ لوگ بھی شامل کئے جائیں گے جو کربلا کے واقعات سنتے رہے ہیں اور خوش ہوتے رہے ہیں۔ اور شاید ایسوں ہی کے انتظار میں یہ انتقام رکا ہوا ہے کہ سارے بدنفس منظر عام پر آجائیں تو ذوالفقار حیدری اٹھے اور اپنے اصلی جوہر دکھائے۔ صلوات

طاؤس عرض کرتے ہیں: سرکار! وہ کون سی چیز ہے جس کا تھوڑا سا حلال ہے اور زیادہ حرام ہے۔ فرمایا۔ وہ نہر طالوت کا پانی ہے کہ جب جناب طالوت لشکر کو لے کر چلے اور لوگ پیاس سے بے قرار ہوئے۔ تو پروردگار نے ایک نہر سے ان کا امتحان لیا۔ اور جن لوگوں نے پانی پی لیا وہ جناب طالوت کی صحابیت سے خارج ہو گئے۔ اور جن لوگوں نے صرف ایک چلو پانی لیا انھیں معاف کر دیا گیا۔ گویا یہ دلیل ہے کہ اس نہر کا قلیل حلال تھا اور کثیر حرام۔

یہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ کبھی کبھی پروردگار پیاس سے بھی بندوں کو آزماتا ہے اور نہر سامنے رکھ کر بھی امتحان لیتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ طالوت کے ساتھی نہر پر ٹوٹ پڑے۔ اور "لیس منی" کے سزاوار ہو گئے۔ اور کربلا والوں نے مڑ کر بھی نہر کی طرف نہیں دیکھا اور "یا بنی ادم" ... کے حق دار ہو گئے۔ صلوات

طاؤس عرض کرتے ہیں فرزند رسولؐ! وہ کون سا روزہ ہے جس میں کھانا پینا حلال ... فرمایا۔ وہ جناب مریم کا روزہ تھا جس میں صرف بات کرنے کی پابندی تھی اور کوئی پابندی نہیں تھی۔

عرض کی وہ کون سی شے ہے جو کم ہوتی ہے مگر زیادہ نہیں ہوتی۔ فرمایا۔ عمر انسان ہے کہ اس میں ہر روز کمی ہوا کرتی ہے کبھی اضافہ نہیں ہوتا۔

عرض کی وہ کون سی شے ہے جس میں اضافہ ہوتا ہے کمی نہیں ہوتی۔ فرمایا۔ سمندر کہ اس کا پانی بڑھتا ہی رہتا ہے گھٹنے کا کوئی سوال نہیں ہے۔

عرض کی وہ کون سا اڑنے والا ہے جو صرف ایک مرتبہ اڑا ہے اور بس۔ فرمایا وہ کوہ طور ہے جسے بنی اسرائیل کے سر پر بلند کیا گیا اور انھیں عذاب الٰہی سے ڈرایا گیا اس کے بعد پھر اس پہاڑ نے جگہ سے جنبش نہیں کی۔

عرض کی وہ کون لوگ ہیں جنھوں نے بات سچی کہی اور پھر جھوٹے کہے گئے۔ فرمایا۔ وہ منافقین ہیں جنھوں نے یہ کہا کہ پیغمبر اللہ کے رسول ہیں اور یہ صحیح تھا لیکن اللہ نے کہا کہ منافقین جھوٹے ہیں۔ اس لئے کہ ان لوگوں نے جو کچھ کہا تھا وہ ان کے دل میں نہیں تھا۔ دل میں کچھ اور تھا اور زبان پر کچھ اور یہیں سے ایک مسئلہ اور بھی معلوم ہو گیا کہ اگر زبان صحیح کہہ رہی ہے اور دل ساتھ نہیں دیتا تو جھوٹ ہے اور اگر دل صحیح کہہ رہا ہے اور زبان صحیح نہیں کہہ رہی ہے تو اسے جھوٹ نہیں کہا جا سکتا۔ جھوٹ کا تعلق صرف الفاظ سے نہیں ہے بلکہ انسان کی نیت اور اس کے ارادہ سے بھی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ منافق کو جھوٹا کہا گیا۔ لیکن تقیہ کرنے والوں کو جھوٹا نہیں کہا جا سکتا۔ ان کے الفاظ ضرور غلط ہوتے ہیں لیکن ان کے ارادہ میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اور ان کی نیت بہر حال صاف ہوتی ہے۔ صلوات

مگر افسوس کہ ایسا صاحب کمال امامؑ بھی دنیا کی نگاہوں سے نہ دیکھا گیا۔ اور حکومتوں کو ہر آن فکر رہی کہ کیسے ان کی زندگی کا خاتمہ کر دیا جائے۔ امام محمد باقرؑ کی پوری زندگی عجیب کرب و بے چینی کے عالم میں گذری ہے۔ آپ کے دور حیات میں متعدد بادشاہ گذرے۔ سنہ ۶۰ھ تک معاویہ کی حکومت رہی سنہ ۶۴ھ تک یزید بادشاہ رہا۔ یزید کے بعد معاویہ بن یزید نے حکومت

حکمرانی تو مروان بن حکم دس ماہ بادشاہ رہا۔ اس کے بعد ۸۶ھ تک عبدالملک بن مروان کی حکومت رہی۔ ۸۶ھ سے ۹۶ھ تک ولید بن عبدالملک بن مروان کی بادشاہت رہی۔ ۹۶ھ سے ۹۹ھ تک سلیمان بن عبدالملک بادشاہ رہا اور ۹۹ھ سے ۱۰۱ھ تک مروان کا پوتا عمر بن عبدالعزیز بادشاہ رہا۔ ۱۰۱ھ سے ۱۰۵ھ تک یزید بن عبدالملک کی حکومت رہی اور ۱۰۵ھ سے ۱۲۵ھ تک ہشام بن عبدالملک کا دور دورہ رہا۔ واقعہ کربلا اسی عرصہ میں گزرا۔ مدینہ کی تاراجی اسی زمانہ میں ہوئی۔ مکہ کی غارت گری اسی دور میں ہوئی اور تاریخ اسلام کے نہ جانے کتنے حادثات اسی ۵۰ سال کی مدت میں گذر گئے۔ ظاہر ہے کہ جب کسی حکومت کی بنا کسی فرد یا خاندان کی مخالفت پر ہوتی ہے تو ہر نیا آنے والا ظالم کی رفتار کو تیز تر کر دیتا ہے۔ اور عوام کی رائے کو ہموار کرنے کے لئے مصائب میں اضافہ کر دیتا ہے۔ امام محمد باقرؑ کی زندگی بھی اسی کشمکش سے دوچار رہی۔ لیکن کیا کہنا تدابیر امامت کا کہ حکومت کے دس دور گذر گئے۔ اور سوائے عمر بن عبدالعزیز کے کسی نے ظلم کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ لیکن نہ امام کے کردار میں کوئی عیب نکال سکے۔ اور نہ واقعی طور پر رائے عامہ کو ہموار کر سکے۔ دنیا امام کے علم و کمالات سے متاثر ہوتی رہی۔ اور تشنگان علوم بارگاہ امامؑ میں حاضری دیتے رہے۔ یہاں تک کہ ہشام بن عبدالملک کا دور آیا اور اس نے سوچا کہ یہ اگر زندہ رہ گئے تو ہمارا رہنا مشکل ہو جائے گا۔ اس نے ۹ سال تک مسلسل حالات کا جائزہ لینے کے بعد اور ہر لحاظ زندگی پر شکست کھانے کے بعد برا طریقہ اختیار کیا اور امامؑ کو نئے انداز سے زہر دینے کی سازش کی۔ ایک زین میں زہر قاتل جذب کرا کے امامؑ کی خدمت میں بھیج دیا کہ آپ اس زین پر سواری کریں یہ خاص طریقہ سے آپ کے لئے تیار کرایا گیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے اس کی حقیقت معلوم ہے۔ لیکن

مرضی پروردگار یہی ہے کہ میں اسی ذریعہ سے دنیا سے رخصت ہوں۔ چنانچہ آپ نے سواری فرمائی اور زہر سارے بدن میں سرایت کر گیا۔ موت کے آثار نمایاں ہو گئے۔ تین دن تک بستر پر کروٹیں بدلتے رہے۔ امام جعفر صادقؑ کو بلا کر فرمایا بیٹا میں آج دنیا سے رخصت ہو رہا ہوں۔ میں نے اپنے پدر بزرگوار کو خواب میں دیکھا ہے وہ فرما رہے ہیں کہ فرزند عنقریب تم میرے پاس آرہے ہو۔ میرا وقت آگیا ہے۔ اب تم چند لوگوں کو بلاؤ تاکہ میں ان کے سامنے وصیت کر دوں اور وہ تمھیں پہچان لیں۔ لوگ آئے آپ نے وصیتیں فرمائیں۔ بیٹا تم ہی مجھے غسل دینا تمھیں کفن پہنانا۔ تمھیں نماز جنازہ ادا کرنا اور تمھیں دفن کرنا۔ میرے چاہنے والوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا اور میرے اموال میں سے ایک رقم معین کر دینا کہ دس سال تک حج کے موقع پر منیٰ میں میرا ماتم ہوتا رہے۔

ارباب عزا! وصیت تمام ہوئی۔ امامؑ نے انتقال فرمایا۔ امام جعفر صادقؑ نے حسب وصیت سارے امور انجام دیئے۔ اہتمام سے جنازہ اٹھا اور بقیع میں دفن ہوئے۔ ۷ ذی الحجہ ۱۱۴ھ کو یہ قیامت خیز حادثہ پیش آیا کہ دنیا امام محمد باقرؑ کے فیوض سے محروم ہو گئی۔ لیکن خدا رکھے فرزند سرہانے موجود تھا۔ وصیت کی تو وصیت پر عمل ہوا۔ کیوں نہ ہو۔ جس کا فرزند سرہانے موجود ہوتا ہے وہ وصیت بھی کرتا ہے اور اس کا جنازہ بھی اہتمام کے ساتھ اٹھتا ہے۔ مگر اے سید سجادؑ باپ مقتل میں زیر خنجر شمر اور بیٹا خیمہ میں بستر بیماری پر۔۔۔ باپ بیٹے کے سرہانے وصیت کرنے آیا ہے۔ میرے لال جب شام سے پلٹ کر مدینہ جانا تو ہمارے چاہنے والوں سے ہمارا سلام کہہ دینا اور کہنا کہ شیعو! شیوۂ وفا یہی ہے کہ جب ٹھنڈا پانی پینا تو ہماری پیاس کو یاد کر لینا اور جب کسی غریب و شہید کا ذکر آجائے تو مجھ پر گریہ کرنا اور اس طرح ماتم کرنا جس طرح میری ماں فاطمہ زہراؑ جنت میں ماتم کرتی ہیں۔ واحسیناہ واحسیناہ۔

تو لے لے، اور ایک شخص نے کھڑے ہو کر یہ دعویٰ کیا تھا کہ آپ ایک سفر میں جا رہے تھے اور آپ نے اپنے ناقہ کو تازیانہ مارنا چاہا تھا اور اتفاق سے وہ تازیانہ مجھے لگ گیا تھا، میں اس کا انتقام لینا چاہتا ہوں، تو آپ نے بلال کو بھیجا تھا کہ بلال سیدہؑ کے گھر سے تازیانہ لے آؤ۔ بلال نے دروازے پر آ کر آواز دی، شہزادی! آپ کے بابا نے تازیانہ طلب کیا ہے۔ شہزادی نے گھبرا کے کہا۔ بلال! بابا تو بیمار ہیں، ان میں تاب سفر نہیں ہے یہ تازیانہ کا کیا کام ہے؟ بلال نے عرض کی۔ بی بی! ایک شخص نے اپنے قصاص کا مطالبہ کیا ہے اور آپ کے بابا اس کا حق دینا چاہتے ہیں۔ یہ سننا تھا کہ زہراؑ کا دل تڑپ گیا۔ بلال یہ کون سا انسان ہے جسے بابا کی بیماری پر رحم نہیں آیا۔ میں کہوں گا۔ شہزادی! بیمار پہ تازیانہ کا نام سنتا اور دل بیقرار ہو گیا۔ کاش آپ کربلا کے میدان میں ہوتیں جہاں آپکا بیمار قید ہو کر کربلا سے شام تک تازیانوں پر تازیانے کھا تا جا رہا تھا۔

عزادارو! بلال تازیانہ لائے، پیغمبرؐ نے اس کے ہاتھ میں تازیانہ دیا، اس نے کہا، آپ پشت سے پیراہن ہٹا لیں، آپ نے پیراہن ہٹایا۔ اس نے بڑھ کر مہر نبوت کے بوسے لئے، میرے سرکار! خدا گواہ ہے کہ آپ کے ذمہ کسی کا کوئی حق نہیں ہے، یہ میری آخری تمنا تھی جسے پورا کرنے کے لئے میں نے یہ گستاخی کی تھی۔

دنیا جانتی ہے کہ رسولؐ کے ذمہ کسی شخص کا حق نہیں رہ سکتا۔ رسولؐ کسی کو تازیانہ نہیں مار سکتا، رسولؐ سے غلطی کا امکان نہیں ہے، لیکن آپ نے نہایت فراخدلی سے انتقام کا موقع دے کر دنیا کو دکھا دیا کہ میں دربار میں صحابی کو بھی نہیں جھٹلانا چاہتا۔ مگر اللہ رے انقلاب زمانہ، کہ ابھی

دربار میں جب رسولؐ کی بیٹی آتی ہے تو اس کی تکذیب کی جاتی ہے اور اسے صدمے پہنچائے جاتے ہیں، کیا فاطمہؑ کا یہ حق نہیں تھا کہ وہ فریاد کرتیں کہ بابا آپکے بعد اتنے مصائب پڑے کہ دنوں پر پڑتے تو راتوں کی طرح سیاہ و تاریک ہو جاتے۔

وقت گزرتا رہا، زندگی کا آخری لمحہ آیا، ملک الموت نے دروازہ پر آ کر آواز دی، سیدہؑ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، باپ کے رخسار پر آنسو گرے باپ نے آنکھیں کھول دیں۔ بیٹی خیر تو ہے یہ آنکھوں میں آنسو کیسے؟ عرض کی۔ بابا! کوئی آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ میں بار بار سمجھا رہی ہوں لیکن وہ برابر اصرار کر رہا ہے، فرمایا۔ سیدہؑ! اجازت دے دو، تمہیں تو معلوم ہے کہ یہ ملک الموت ہے اور قبض روح کے لئے آیا ہے، بیٹی، یہ صرف تیرے در کا شرف ہے کہ ملک الموت بھی اجازت کے بغیر اندر نہیں آ سکتا۔

عزادارو! جس زہراؑ نے آج اپنی ڈیوڑھی کا یہ شرف دیکھا ہے، اسی نے دو دن کے بعد یہ انقلاب بھی دیکھا ہے کہ دروازے پر آگ اور لکڑیوں کا انبار ہے اور دھواں اٹھ رہا ہے۔ سیدہ فریاد کر رہی ہیں۔ جلتا ہوا دروازہ گرایا جاتا ہے، محسنؑ کی شہادت واقع ہوتی ہے، فاطمہؑ کا پہلو شکستہ ہوتا ہے، غشی کا عالم طاری ہوتا ہے، آنکھ کھلتی ہے تو وارث کے گلے میں رسی نظر آتی ہے۔ آواز دیتی ہیں۔ ظالمو! ابوالحسن کو چھوڑ دو، ورنہ میں اپنے سر کے بال پریشان کر دوں گی۔ میں کہوں گا، شہزادی! ابھی آپ سر کے بال پریشان نہ کریں، ابھی تو فقط ایک دروازہ میں آگ لگی ہے، ابھی تو فقط ایک پہلو زخمی ہوا ہے، ابھی فقط ایک محسنؑ کی شہادت ہوئی ہے، ابھی

فقط ایک علیؑ کے گلے میں رسی باندھی گئی ہے۔ بی بی! سر کے بال پریشان کرنا ہیں تو اس وقت کیجئے گا جب عصرِ عاشور کا ہنگام ہوگا، سارے خیمے جل رہے ہوں گے، بیبیاں ایک خیمہ سے دوسرے خیمے کی طرف جا رہی ہوں گی، اور واجداہ واجداہ کے نعرے بلند ہوں گے، جب مقتل میں ہر طرف شہیدوں کے لاشے ہوں گے، شہزادیوں کی گود خالی ہو چکی ہوگی، رباب کا شش ماہہ تیرِ سہ شعبہ کھا کر کربلا کی خاک پر سو گیا ہوگا۔

بی بی! سر کے بال کھولنا ہیں تو اس وقت کھولئے گا جب آپ کے حسینؑ کا گلا ہوگا اور شمر کا خنجر ہوگا، آپ کی زینبؑ فریاد کر رہی ہوگی اور زمینِ کربلا کو زلزلہ ہوگا — سیاہ آندھیاں چل رہی ہوں گی اور فضائے کربلا میں ایک آواز ہوگی اَلَا قُتِلَ الْحُسَیْنُ بِکَرْبَلَا اَلَا ذُبِحَ الْحُسَیْنُ بِکَرْبَلَا۔

بی بی! آپ کو بددعا کے لئے ہاتھ اٹھانا ہیں تو ابھی نہ اٹھائیے، یہ ہاتھ اس وقت اٹھائیے گا جب آپ کی زینبؑ کے ہاتھ بندھ جائیں، جب آپ کی ام کلثومؑ قیدی بن جائے، جب آپ کی سکینہؑ شمر کے طمانچے کھائے، جب آپ کا عابدؑ بیمار ہاتھوں میں ہتھکڑیاں، پیروں میں بیڑیاں، گلے میں طوقِ خاردار پہنے ماں بہنوں کے ساتھ کوفہ و شام کے بازار، تماشائیوں کے ہجوم میں لٹے ہوئے قافلہ کے ساتھ بلوائے عام میں جائے گا۔

بی بی! فریاد کرنا ہے تو اس وقت کیجئے گا جب شام کے زندان میں کمسن بچی دنیا سے سفر کر جائے اور آپ کی زینبؑ اپنی بے کسی کا ماتم کرے، نہ کوئی غسل دینے والا ہو نہ کفن پہنانے والا۔ نہ کوئی جنازہ اٹھانے والا ہو نہ پُرسہ دینے والا اور فضائے شام میں ایک آواز گونج رہی ہو، بی بی! اٹھو تمہیں وطن جانے کی تمنا تھی، میری جان! قافلہ جا رہا ہے۔ بیٹی! ماں تجھے چھوڑ کر کیسے جائیگی بی بی!

اور جیسے قبر سے آواز آ رہی ہوگی۔ قافلے والو! — میرے چاہنے والوں سے میرا سلام کہہ دینا اور کہنا تمہاری مشتاق قیدخانہ شام میں سو گئی اور اب پلٹ کر نہ آئے گی۔!

عزادارانِ مرسلِ اعظمؐ! وفاتِ سرورِ عالمؐ کا ذکر آ گیا ہے تو ایک جملہ اور سن لیجئے۔ باپ کا وقتِ آخر تھا بیٹی سرہانے موجود تھی، بیٹی نے باپ کی آخری خدمت انجام دی، اس کے بعد بنی ہاشم کے جوانوں، باوفا اصحاب اور مولائے کائناتؑ نے مل کر نہایت اہتمام و احترام سے جنازہ دفن کر دیا۔ جی چاہتا ہے فریاد کروں صدیقہ طاہرہ۔ آپ اس بے قراری سے رو رہی ہیں جبکہ آپ نے باپ کی قبر دیکھی ہے، احترام سے جنازہ اٹھتا دیکھا ہے، میں اس بیٹی کے بارے میں کیا کہوں جو وقتِ آخر باپ کے سرہانے نہ آ سکی اور جب شامِ غریباں کے سناٹے میں آئی تو ظالموں کے تازیانے کھائے اور پھر کربلا سے چلی تو جلتی ریتی پر باپ کا جنازہ چھوڑ کر — اور پھر شام کے زندان میں یوں سو گئی کہ باپ کی قبر بھی نہ دیکھ سکی۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

امام جعفر صادق علیہ السلام

اسم مبارک	جعفرؑ
لقب	صادقؑ
کنیت	ابو عبداللہ
والد ماجد	امام محمد باقرؑ
والدہ ماجدہ	ام فروہ بنت قاسم ابن محمد ابن ابی بکر
ولادت	۱۷ ربیع الاول ۸۳ھ بروز جمعہ۔ مدینہ منورہ
ازواج	فاطمہ بنت الحسین۔ حمیدہ مصفاۃ
اولاد	امام موسیٰ کاظمؑ اسماعیل عبداللہ ام فروہ اسحاق محمد عباس علی اسماء صغریٰ
شہادت	۱۵ شوال ۱۴۸ھ مدینہ منورہ
عمر مبارک	۶۵ سال
قبر مطہر	جنت البقیع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ اشرف الانبیاء والمرسلین خاتم النبیین سیدنا ومولانا ابی القاسم محمد وآلہ الطیبین الطاہرین ولعنۃ اللہ علیٰ اعدائہم اجمعین اما بعد فقد قال اللہ الحکیم فی کتابہ الکریم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِنَّ عَلَیْنَا لَلْهُدٰى وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى

ارشاد جناب اقدس الٰہی ہے، بے شک ہدایت کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے اور دنیا و آخرت کا اختیار ہمارے ہاتھوں میں ہے

کیا کہنا اس معبود کریم کا کہ اس نے ہدایت کی ذمہ داری جاہل اور نادان انسانوں پر نہیں ڈالی بلکہ عظیم کام اپنے ہی ذمہ لیا اور انسان کی ذمہ داری فقط یہ قرار دی کہ وہ مالک کے بتائے ہوئے اصولوں پر عمل کرے اور اسکے معین کئے ہوئے نظام کے مطابق زندگی گزارے اسی میں فوز دنیا بھی ہے اور فلاح آخرت بھی، مالک کا یہ کرم نہ ہوتا تو آج ایک مرد مسلم بھی اسی طرح ٹھوکریں کھاتا پھرتا جس طرح دنیا کے دوسرے افراد ٹھوکریں کھا رہے ہیں، صبح و شام قوانین بنتے ہیں اور مرض گھٹنے کے بجائے بڑھتا ہی جارہا ہے۔ صاحبان فکر و نظر ہیں، ارباب عقل و دانش ہیں، منتخب روزگار افراد ہیں، چاند کی سیر کرنے والے ہیں، مریخ پر کمند ڈالنے والے ہیں، سینۂ دریا کو چیرنے والے ہیں، بطن گیتی سے خزانے نکالنے والے ہیں، لیکن اپنی ہی زندگی کے اصول و قوانین سے بے خبر ہیں، دنیا کے بارے میں جو تجربہ کرتے ہیں کامیاب ہوتا ہے اور اپنے بارے میں جو قانون بناتے ہیں وہ ناکام ہو جاتا ہے صبح کا بنایا ہوا قانون شام کو بدل جاتا ہے اور شام کا بنایا ہوا قانون صبح کو تبدیل

ہو جاتا ہے اور یہ طے نہیں ہو پاتا کہ پہلا قانون زیادہ مناسب تھا یا دوسرا۔ یہ تو تجربہ ہی بتائے گا کہ کس میں زیادہ صلاحیتیں پائی جاتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات دوسرے قانون کا تجربہ ہی واضح کرتا ہے کہ پہلا قانون زیادہ صحیح تھا اور انسان اسی کی طرف پلٹنے کی کوشش کرتا ہے۔

نظام زندگی کی تفصیلات میں جانے سے پہلے ایک معمولی سی مثال دنیا کے فیشن کی لے لیجئے۔ فیشن کے پرستار صبح و شام بدلتے ہیں اور ہر تبدیلی کے بعد یہی دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ طرزِ عمل زیادہ مناسب اور عصری تقاضوں کے مطابق ہے لیکن چند دنوں کے بعد جب اس کے عیوب و نقائص سامنے آجاتے ہیں تو اس سے بہتر فیشن ایجاد کر لیتے ہیں اور چند ہی دنوں کے بعد اس کا عیب بھی ظاہر ہو جاتا ہے۔ تو اب یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ پہلا ہی انداز زیادہ صالح اور مناسب تھا۔ آپ تجربہ کر لیں کہ انسان نے چند سال کے اندر کتنی مرتبہ انداز بدلے ہیں اور کس کس طرح اپنے نفس کو دھوکا دیا ہے۔ کبھی چست لباس اختیار کیا اور دنیا کے معاشی حالات کی ابتری کو دلیل بنایا اور کبھی ڈھیلا ڈھالا لباس اختیار کر کے یہ دلیل دی کہ چست لباس میں انسان کام کرنے سے معذور ہو جاتا ہے، اور دنیا کے حالات عمل چاہتے ہیں، کبھی درمیانی راستہ نکالا اور یہ دلیل دی کہ گذشتہ دونوں انداز کمزوریوں کے حامل تھے لہذا یہ طریقہ ایجاد کیا گیا ہے اور بعد میں پھر معاشی حالات یاد آگئے اور پہلے ہی انداز کی طرف پلٹ گیا۔ غرض کہ انسانی زندگی تغیرات کا مجموعہ ہے اور اس کی بدنصیبی یہ ہے کہ کسی تغیر کے بعد یہ نہیں کہہ پاتا کہ یہی تغیر صحیح ہے اور اس کے پہلے کے جملہ قوانین و قواعد غلط تھے۔

الٰہی نظام اور دنیاوی دستور میں یہی فرق ہے کہ دنیاوی نظام حالات کو دیکھ کر بدلتا ہے اور الٰہی نظام ایک محدود وقت کے لئے معین ہوتا ہے اس میں تجربہ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی اور یہی وجہ ہے کہ دنیا اپنے تغیر کو تجربہ کا نام دیتی ہے اور اسلام اپنے تغیر کو شریعت کا نام دیتا ہے۔ دنیا کے لئے یہ ممکن ہے کہ نئے تجربہ کے بعد پھر پرانے تجربہ کی طرف پلٹ جائے لیکن اسلام کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ شریعت آنے کے بعد تجربہ پھر پرانی شریعت کی طرف پلٹا دے اور اسی کو اولیٰ و انسب ثابت کر دے۔ یہاں نظام میں اتنی پختگی اور اصول میں اتنی درستگی ہے کہ پرانی شریعت کا نمائندہ ہزاروں سال بھی زندہ رہے تو نئے شریعت کے وارث کی اقتدا ہی کرے گا اس کا امام نہیں ہو سکتا۔ صلوات۔

انسان نے دین الٰہی کو چھوڑ کر یہ بدنصیبی اپنے ذمہ لی کہ اپنا نظام حیات خود معین کرے اور مسلمان کی کل خوش قسمتی یہی ہے کہ اس نے اس بارِ گراں کو اپنے ذمہ نہیں رکھا، بلکہ اپنے مالک کے حوالے کر دیا ہے۔ اسے یہ سوچنا ہی نہیں ہے کہ ہمارے لئے کیا مناسب ہے اور کیا نامناسب، اس کی یہ ذمہ داری ہی نہیں ہے کہ ہمارے حق میں کیا اولیٰ ہے اور کیا غیر اولیٰ۔ ہمارا کام فقط یہ ہے کہ ہم یہ دریافت کریں کہ ہمارے لئے کیا نظام بنا ہے اور ہمیں کس قانون پر عمل کرنا ہے یہ اور بات ہے کہ یہ خوش نصیبی بھی انہیں مسلمانوں کا حصہ ہے جنہوں نے یہ کام پروردگار کے حوالے کیا ہے اور دین الٰہی میں اپنی دخل اندازی کو جائز نہیں سمجھا ورنہ ان مسلمانوں اور کافروں میں کوئی فرق نہیں ہے جنہوں نے دین الٰہی کو بھی اپنے خواہشات کا کھلونا بنا دیا ہے اور کمالِ بے شرمی سے اس اعلان پر فخر کیا ہے کہ ہم نے حلال محمدؐ کو حرام بنایا ہے اور حرام محمدؐ کو حلال بنایا ہے اور میں تو یہ کہتا ہوں

کہ یہ حلال و حرام محمدؐ کے معنی ہی نہیں سمجھے اور ان کا یہی خیال تھا کہ اس طرح اختلاف صرف حضور سرورِ کائناتؐ سے ہوگا ورنہ روحِ اسلام سے باخبر ہوتے تو انہیں یہ اندازہ ہوتا کہ یہ بغاوت پروردگار سے ہے اور پروردگار کا باغی دائرۂ اسلام میں نہیں رہ سکتا۔

مالکِ کائنات کے اس کرم کا احساس اور بھی شدید تر ہو جاتا ہے جب صنفِ نسواں کی کمزوری پر نگاہ جاتی ہے اور یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس نے قانون کا بار اس ضعیف و ناتواں مخلوق پر نہیں رکھا ورنہ جب دورِ قدیم کے ترقی یافتہ مردوں نے اپنی قانون سازی سے انسانیت کو یوں تباہ و برباد کر دیا ہے تو اگر یہ کام جذبات و خواہشات کی مجسمہ عورت کے ہاتھ میں ہوتا تو کائنات کا نقشہ کچھ اور ہی ہوتا اور روئے زمین پر کسی اور ہی قسم کے افراد آباد ہوتے۔ یہ مالک کا کرم تھا کہ اس نے مردوں کی طرح عورتوں کی ہدایت کی ذمہ داری بھی اپنے ہی ہاتھوں میں رکھی ہے اور آخری دور میں جب آخری شریعت آ رہی تھی تو پاسبانِ شریعت بنا کر ایک ایسی خاتون کو بھیج دیا جس کا کردار صبحِ قیامت تک عورتوں کے لئے مشعلِ راہ بنا رہے گا اور جسے دیکھ کر دنیا کی ساری خواتین اپنی زندگی کے اصول مرتب کرتی رہیں گی۔ اس کے کردار میں کوئی نقص نہ ہوگا، اس کی زندگی میں کوئی کمزوری نہ ہوگی، "آیتِ تطہیر" اس کی طہارت کی ضمانت لے گی، "آیتِ مباہلہ" اس کی صداقت کا اعلان کرے گی۔ آیتِ مودت اس کی قرابت کا اظہار کرے گی۔ "سورۂ دہر" اس کی سخاوت کا قصیدہ پڑھے گا گھر میں رہے گی تو ملک پاسبانی کے لئے آئیں گے، حوریں خدمت کے لئے آئیں گی، رضوان درزی بن کے آئے گا، زہرا سجدہ کرتا نظر آئے گا، جبرئیل جھولا جھلانے آئیں گے، میکائیل چکی چلانے آئیں گے۔ اور گھر سے باہر میدانِ مباہلہ میں نکلے گی تو نبوت سینہ سپر بن جائے گی اور امامت پشت پناہی کا فریضہ

انجام دے گی۔ صلوات،

گفتار کا وہ انداز کہ گویا رسولؐ بول رہے ہیں، رفتار کا وہ انداز ہے کہ باپ سے ذرہ برابر فرق نہ آنے پائے، کرم کا وہ عالم کہ ماں کی روح خوش ہو جائے۔ ایثار کی وہ کیفیت کہ دینِ خدا شرمندۂ احسان ہو جائے اور مردوں کی ہدایت کے لئے تیرہ آئیں تو عورتوں کے لئے ایک ہی خاتون قیامت تک کے لئے کافی ہو جائے صلوات"

اور جب تنہا پوری صنف کی ہدایت کی ذمہ دار ہو اور تیرہ مردوں کا فرض اکیلے ادا کرے تو ہر ایک کا انداز بھی ہونا چاہیئے۔ اور ہر ایک کے جمال و جلال کا پرتو بھی ہونا چاہیئے، اخلاق میں رسالت کا انداز ہو، ہمت و استقلال، علم و حلم صبر و شجاعت میں امامت کی شان نظر آئے، بولے تو علیؑ معلوم ہو، چپ رہے تو حسنؑ کا انداز پیدا ہو، اٹھ جائے تو حسینؑ کردار ہو، صبر کرے تو زین العابدینؑ کا حلم نظر آئے، علم میں محمد باقرؑ کی شان ہو، صدق میں جعفر صادقؑ کا انداز ہو، قوتِ برداشت میں موسیٰ کاظمؑ کا رنگ ہو، تسلیم و رضا میں علی رضاؑ کا انداز ہو، تقویٰ میں تقیؑ جیسا ہو، طہارت نقیؑ جیسی ہو، جلال و غضب میں عسکریت پائی جاتی ہو، ارشاد و ہدایت میں مہدویت کا انداز ہو۔

فاطمہ زہرا صلوات اللہ و سلام علیہا کی زندگی ایک ایسی ہی زندگی ہے، آپ کی ذاتِ گرامی بیٹی ہونے کے رشتہ سے وارثِ رسولؐ ہے، رفیقِ زندگی ہونے کے اعتبار سے شریکِ امامت ہے، اور ام الائمہ ہونے کے لحاظ سے ہر امام کے کمال و جمال کی آئینہ دار ہے، جو کچھ "گیارہ اماموں" کے کردار سے کل ظاہر ہونے والا ہے اس کا پرتو معصومۂ عالم کی زندگی میں آج ہی پایا جا رہا ہے اور شاید یہی راز تھا کہ پروردگار نے بھی کساء کے نیچے زہراؑ کا تعارف کرایا تو سارے فرشتوں کا مرکز

بنا دیا، اور اولاد کی منزل میں "بنوھا" جمع کا صیغہ استعمال کر دیا تاکہ زہراؑ جملہ اوصاف و کمالات کی مصدر و مرکز قرار پا جائیں۔

آج مختصر لفظوں میں اسی معصومہ کونینؑ کی حیات و شخصیت پر روشنی ڈالنا ہے، اور یہ دیکھنا ہے کہ صدیقہ طاہرہؑ کی ذاتی شخصیت کیا ہے اور آپ کی خدماتِ دین و مذہب قوم و ملت اور دنیائے اسلام و ایمان میں کیا ہیں۔؟

زندگی کا مختصر خاکہ یہ ہے کہ بعثت کے پانچویں سال اس دنیا میں تشریف لائیں، تقریباً دو برس کی عمر تھی کہ حیاتِ پیغمبرِ اسلام ایک تازہ ترین مصیبت سے دوچار ہوئی، آپ کو پریشان کرنے، آپ کی راہ میں کانٹے بچھانے والے آپکے سر پر کوڑا پھینکنے والے مشرکین نے یہ طے کیا کہ آپ کا مکمل بائیکاٹ کر دیا جائے۔ جبتک سماج سے آپ کا رشتہ منقطع نہ ہو جائے گا آپکے تبلیغی اثرات کو روکنا ممکن نہیں ہے، آپکا مذہب روز بروز پھیلتا جا رہا ہے اور آپکے کردار کی روشنی دلوں میں گھر کرتی جا رہی ہے۔ بائیکاٹ کا منصوبہ بنا، جناب ابوطالب پورے خاندان کو لے کر ایک غار میں چلے گئے، تین سال تک "مقاطعہ" برقرار رہا۔ اور بنی ہاشم درخت کے پتے چباتے رہے۔ نہ کوئی پرسان حال تھا نہ ہمدرد، نہ کوئی ان کے ہاتھ سامان بیچنے والا تھا نہ ان کے حالِ زار پر رحم کھانے والا۔ بالآخر کفار کو خود اپنے مظالم کا احساس ہوا اور بندش توڑ دی گئی۔ اربابِ دانش خود پہچان سکتے ہیں کہ بنی ہاشم کا صبر و استقلال کیا تھا؟ جہاں ظالم ظلم کرنے سے تھک گیا، مظلوم ظلم برداشت کرنے سے عاجز نہیں ہوا۔ اسی بندش کی روشنی میں صفین کا فیصلہ بھی ہو سکتا ہے اور کربلا کا بھی، ظلم، جبر و تشدد ہی سے مرعوب کرنا چاہتا ہے اور مظلوم صبر و استقلال ہی سے مقابلہ کرتا ہے۔ تاریخ نے صاف واضح کر دیا کہ کفار و مشرکین کے ورثہ دار شام سے کلام ہے

اور محمد مصطفےؐ کے وارث علیؑ بن ابی طالب اور حسینؑ بن علیؑ ہیں۔

پانچ سال کی عمر تھی جب یہ محاصرہ ٹوٹا، لیکن چند دنوں کے بعد ایک تازہ مصیبت آگئی کہ اُدھر جناب ابوطالب کا انتقال ہوا اور اِدھر ماں کا سایہ سر سے اٹھ گیا، کمسنی میں یتیمی اور تنہائی کا صدمہ کیسا ہوتا ہے یہ زہراؑ ہی کا دل جانتا ہے۔ لیکن خدا رکھے ابھی باپ زندہ تھا، تھوڑے عرصہ کے بعد حکم ہجرت آیا اور فاطمہؑ آٹھ برس کی عمر میں مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ آگئیں۔ نو برس کی عمر میں مولائے کائناتؑ سے عقد ہوا، دس برس کی عمر میں امام حسنؑ کی ولادت ہوئی، دوسرے سال امام حسین پیدا ہوئے، ایک سال کے بعد زینبؑ کی ولادت ہوئی اور اس کے دو سال کے بعد جناب ام کلثومؑ پیدا ہوئیں۔ اٹھارواں سال تھا جب شکم اقدس میں محسنؑ کی شہادت واقع ہوئی اور صدیقہ طاہرہؑ امت کے مظالم کی تاب نہ لا کر اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔

اٹھارہ سال کی مختصر عمر اور اس میں مصائب کی یہ کثرت کہ خود اپنے حال کا مرثیہ پڑھا، "مجھ پر اتنے مصائب ڈالے گئے کہ اگر دن پر پڑتے تو راتوں کی طرح تاریک ہو جاتے"۔ لیکن کیا کہنا بنتِ رسولؐ کے صبر و استقلال کا کہ نہ ذاتی اوصاف و کمالات میں کوئی فرق آیا نہ خدمتِ مذہب و ملت سے انحراف فرمایا، قوم ستاتی رہی اور سیدہؑ ہدایت کی دعائیں دیتی رہیں۔ دنیا گھر جلاتی رہی اور فاطمہؑ فرضِ تبلیغ ادا کرتی رہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ نہ اس شان کا باپ دیکھا ہے نہ اس شان کی بیٹی، نہ اس کردار کا شوہر دیکھا ہے نہ اس عظمت کی زوجہ، نہ اس جلالت کے بچے دیکھے ہیں نہ اس رفعت و منزلت کی ماں۔ رشتوں کے ساتھ فضیلتیں سیدہؑ کے گھر کا طواف کر رہی تھیں اور نسبتوں کے ساتھ عظمتیں فاطمہؑ کی

ڈیوڑھی پر خیمہ ڈالے ہوئے ہیں۔

ذاتی فضائل کا یہ عالم تھا کہ مصلائے عبادت پر آگئیں تو دنیا نورِ عبادت سے منور ہو گئی۔ صبح کے وقت ایک نور ساطع ہوتا، ظہر کے وقت دوسرا نور اور مغرب کے ہنگام تیسرا نور۔ مدینہ نورِ زہراؑ سے منور ہو جاتا اور فضیلت آواز دیتی۔ نمازیں پڑھ کر خود مقرب بارگاہ بن جانا امت کا کام ہے اور نماز سے کائنات کو منور کر دینا بنت رسولؐ کی منزل ہے۔ صلوات۔

مساوات و مواسات کا یہ عالم تھا کہ گھر کا کام ایک دن فضہ انجام دیتی تھیں اور ایک دن خود بہ نفس نفیس۔ یعنی خانۂ زہراؑ میں ایک دن وہ بھی آتا جب کائنات کی شہزادی گھر کی خدمت کرتی تھی اور فضہ سکون سے بیٹھتی تھی۔ دنیا کا کوئی انسان تصور کر سکتا ہے کہ کوئی شہزادی اپنی خادمہ کے ساتھ ایسا برتاؤ کرے گی۔؟ ہرگز نہیں۔! میں تو یہ کہتا ہوں کہ یہ انداز یا علیؑ میں دیکھا ہے یا زہراؑ میں۔ وہاں قنبر نیا لباس پہنے اور خود بوسیدہ ردا اوڑھیں اور یہاں فضہ آرام کرے اور خود گھر کی خدمت کریں۔ کیا ایسا ماحول کبھی اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ غلام و آقا کی تفریق کی جائے۔؟ اور کیا ایسا مولا پا کر کبھی کوئی غلام و کنیز درِ آقا سے جدا ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں! اور خدا گواہ ہے ہم نے بھی اسی کرم کو دیکھ کر غلامی کا دم بھرا ہے، اور ہمیں اعتماد ہے کہ ہم دنیا میں اپنی بدنفسی کی بنا پر غافل ہو جائیں تو ہو جائیں لیکن وہ قیامت کے دن اپنے کرم سے غافل نہ ہوں گے، جب ان کا دامن ہاتھ میں ہے تو جنت بھی اپنی ہے اور کوثر بھی اپنا ہے، خدا بھی اپنا ہے اور رسولؐ بھی اپنا ہے، اسلام بھی اپنا ہے، ایمان بھی اپنا ہے، کعبہ بھی اپنا ہے قرآن بھی اپنا ہے اور مختصر یہ ہے کہ ہم ان کے ہو گئے تو کل کائنات

اپنا ہے۔ صلوات،

کردار کی بلندی کو دیکھا تو یہ عالم نظر آیا کہ مرسلِ اعظمؐ نابینا صحابی کے ہمراہ بیٹی کے گھر آتے ہیں۔ دروازہ پر رک کر اجازت مانگتے ہیں۔ بیٹی نے عرض کی، بابا! یہ گھر آپ کا گھر ہے اور یہ سیدہ آپ کی خادمہ ہے، اجازت کا کیا سوال ہے؟

مرسلِ اعظمؐ نے پھر اجازت مانگی، سیدہ نے عرض کی۔ بابا! یہ آپ کیا فرما رہے ہیں۔؟ یہ گھر آپ کا گھر ہے۔! فرمایا۔ بیٹی! میرے ساتھ ایک نابینا صحابی بھی ہے۔ عرض کی بابا! آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ میرے پاس ایک چادر ہے سر چھپاتی ہوں تو پیر کھل جاتے ہیں، پیروں کو ڈھانکتی ہوں تو سر کھل جاتا ہے کیسے اجازت دوں؟

جی چاہتا ہے عرض کروں، بی بی! وہ صحابی نابینا ہے، آ جانے دیجئے۔! سیدہ فرمائیں گی، صحابی نابینا ہے میں تو نابینا نہیں ہوں! مجھے یہ پسند نہیں کہ میری نگاہ نامحرم کے چہرے پر پڑے اور اسی حقیقت کا اعلان اس وقت کیا تھا جب پیغمبر اسلامؐ نے یہ سوال اٹھایا تھا کہ عورت کے لئے سب سے بہتر شے کیا ہے؟ اور لوگ جواب کی منزل میں لباس، زیور، آرائش، آسائش کے بارے میں سوچ رہے تھے اور مولائے کائنات بیت الشرف میں آئے تھے تو سیدہ نے عرض کی تھی یا ابا الحسن بابا سے کہہ دیجئے کہ عورت کے لئے سب سے بہتر شے یہ ہے کہ نہ اس کی نگاہ نامحرم پر پڑے اور نہ نامحرم کی نگاہ اس پر پڑے۔ اور پیغمبر نے یہ جواب سن کر بیٹی کو گلے سے لگا لیا تھا۔ بے شک رسولؐ کی بیٹی کا کردار ایسا ہی ہونا چاہئے۔ میں کہوں گا شہزادی! آپ کے بلند کردار

کے قربان لیکن بی بی! آپ تو معصومہ ہیں، آپ کے یہاں یہ امکان کہاں ہے کہ آپ کی نگاہ کسی نامحرم پر پڑ جائے، آپ نابینا صحابی کو آ جانے دیجئے! عجیب نہیں شہزادی فرمائیں۔ بیشک میرا کردار ایسا ہی ہے لیکن میں امت کے لئے ایک درس ہدایت اور نمونۂ عمل فراہم کر رہی ہوں اور دنیا کو بتا دینا چاہتی ہوں کہ جو اس منزل کردار کو سوچ بھی نہ سکیں وہ تم ہو اور جو اس منزل کردار پر فائز ہو وہ نبیؐ کی بیٹی فاطمہ زہراؑ ہے۔

اس مقام پر مجھے ایک واقعہ اور یاد آتا ہے کہ صحیح ترمذی کی روایت کے مطابق اس انداز سے ایک مرتبہ رسول اکرمؐ اپنی ایک زوجہ کے گھر آئے تھے اور جب زوجہ نے بجمالِ مسرت داخلہ کی اجازت دیدی تھی تو آپؐ نے فرمایا تھا کہ میرے ساتھ میرا ایک نابینا صحابی بھی ہے، تو زوجہ نے کہا تھا، کوئی مضائقہ نہیں ہے وہ تو نابینا ہے۔

مجھے کچھ زیادہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ واقعات دونوں آپکی نگاہ کے سامنے ہیں، اب اگر کردار کا فرق سمجھنا چاہتے ہیں تو یوں سمجھئے کہ بیٹی معصومہ ہے اور کہہ رہی ہے کہ بابا! وہ نابینا ہے، میں تو نابینا نہیں ہوں۔ اور زوجہ غیر معصومہ ہے اور کہہ رہی ہے کہ کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ یعنی جس منزلِ عصمت پر رسولؐ کی دختر فائز تھی، وہ منزلِ عصمت زوجہ کے تصور میں بھی نہیں تھی، اور دنیا جانتی ہے کہ عمل ہمیشہ تصور و تصدیق کے بعد ہوتا ہے، جس کا تصور ہی ذہن میں نہیں ہے، اس پر انسان عمل کیوں کر کر سکتا ہے؟ دختر پیغمبرؐ آواز دے رہی ہے۔ مسلمانو! اب دیکھے کردار کی بلندی کو پہچانو کہ میں جس منزلِ عصمت پر فائز ہوں وہاں

دنیا کی خواتین کا ذہن بھی نہیں پہنچ سکتا، کتنی گہری مناسبت ہے زوجہ اور شوہر کے کردار میں۔ زوجہ کا اعلان ہے کہ جہاں میری منزل ہے وہاں تک کسی عورت کا ذہن نہیں پہنچ سکتا، شوہر کا اعلان ہے کہ جہاں میری بلندی ہے وہاں تک کسی کا طائرِ وہم و خیال پرواز نہیں کر سکتا۔ صلوات۔

اور میں تو کہتا ہوں کہ خواتین کا کیا ذکر ہے، فاطمہؑ اس منزلِ کمال پر ہیں جہاں مرسلِ اعظمؐ فرماتے ہیں کہ "اگر علیؑ نہ ہوتے تو میری بیٹی زہراؑ کا کوئی ہمسر نہ ہوتا، نہ آدمؑ اور نہ غیر آدمؑ" اور جب اللہ کے معصوم انبیاء زہراؑ کا مقابلہ نہ کر سکے تو امت کے گنہگار افراد کیا مقابلہ کریں گے اور جس کی زوجہ کا مقابلہ ممکن نہ ہوگا اس علیؑ سے کوئی کیا مقابلہ کرے گا۔ صلوات،

قدرت کو یہی ادائیں اور یہی ذمہ دارانہ انداز پسند آیا کہ زہراؑ کی ہر خاطر کا خیال زمین سے آسمان تک رکھا گیا۔

عید کے موقع پر بچے مچل گئے، اور ماں نے کہہ دیا کہ بچو! سو جاؤ تمہارے کپڑے درزی کے یہاں ہیں۔ اور بچے بہ اطمینان سو گئے، ابھی تھوڑی دیر بھی نہیں گزری تھی کہ کسی نے آواز دی۔ بچو! کپڑے لے جاؤ۔ پوچھا گیا کون ہے؟ آنے والے نے جواب دیا "میں حسنینؑ کا درزی ہوں بچوں کیلئے کپڑے لیکر آیا ہوں"۔

آپ نے پہچانا یہ کون تھا؟ یہ رضوانِ جنت تھا جو حسنینؑ کا درزی بن کر آیا تھا۔ اور بچوں کے لئے جنت سے کپڑے لایا تھا۔ میں کہوں گا رضوان! تو نے اچھا کیا کہ کپڑے لے آیا، زہراؑ کی بات بھی رہ گئی اور بچوں کی عید کا سامان بھی ہو گیا، لیکن رضوان تیری عصمت خطرے میں پڑ گئی، معصوم جھوٹ نہیں بولتا اور تو فرشتہ ہو کر اپنے کو درزی کہہ رہا ہے۔ اللہ نے تجھے رضوانِ جنت بنایا ہے تجھے

اپنے کو رضوان کہنا چاہئے تھا، اس طرح تیری عصمت بھی محفوظ رہتی اور زہرا کا وقار بھی دوبالا ہو جاتا کہ رضوانِ جنت کپڑے لے کر آیا ہے لیکن جب تو نے اپنی حقیقت ظاہر نہیں کی تو ممکن ہے کہ اہلِ دنیا یہی سوچیں کہ کسی درزی کے یہاں کپڑے رہے ہوں گے اور وہی لایا ہوگا۔ رضوان آواز دے گا۔ یہ سب صحیح ہے لیکن میں اپنی حیثیت تم سے بہتر جانتا ہوں، تم کیا چاہتے ہو کہ میں بھی اپنا حشر نطرس جیسا کرلوں؟۔ یاد رکھو کہ میں انسان نہیں ہوں کہ اپنی حد سے آگے بڑھ جاؤں میں فرشتہ ہوں، اپنی منزل خوب پہچانتا ہوں، میں رضوانِ جنت ہوں بیشک رضوانِ جنت ہوں اور میری منزل بہت بلند ہے لیکن کاش تم نے یہ بھی سوچا ہوتا کہ رضوانِ جنت باشندوں کے لئے اہمیت رکھتا ہے سرداروں کے لئے ایک خادم سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا، حسنینؑ جنت کے سردار ہیں انکے مقابلہ میں میری کوئی حیثیت نہیں ہے، میں نے غلط بیانی سے کام نہیں لیا بلکہ حقیقت بیانی سے کام لیا ہے اور تمہیں سمجھا دیا ہے کہ رضوان جنت کھانے سامنے آتا ہے تو رضوان ہوتا ہے اور حسنینؑ کی بارگاہ میں جاتا ہے تو درزی بن جاتا ہے۔

عزیزانِ محترم! یہ ہے جناب سیدہؑ کی عظمت اور یہ ہے فاطمہ زہراؑ کے بیان کی اہمیت کہ اگر بچوں کی تسکین کے لئے بھی کوئی فقرہ کہہ دیں تو جنت کھنچکر روئے زمیں پر آ جائے۔ اب کوئی اس زہراؑ کی منزلت کو پہنچے جسکے در کی یہ بلندی ہے کہ سلام کرنے کے لئے نبیؐ آتے ہیں، کپڑے دینے کے لئے رضوان آتا ہے، خدمت کرنے کے لئے جبریل آتا ہے اور سجدہ کرنے کے لئے ستارہ زہرا آتا ہے۔

معصومۂ عالمؑ کی زندگی کا وہ واقعہ بھی یادگار ہے کہ مولائے کائناتؑ کے شدید اصرار پر آپ نے ایک انار کی فرمائش کی ..... اور مولاؑ انار لے کر چلے تو راستہ میں ایک غریب مریض کو دیکھا، اس نے انار کھانے کی فرمائش کی اور آپنے انار اسے کھلا دیا، اور گھر کی طرف اس عالم میں چلے کہ سر جھکا ہوا ہے، بنت رسولؐ نے مجبکر اصرار پر ایک فرمائش کی تھی اور میں اسے پورا نہ کر سکا، دل کو یہ سکون ضرور تھا کہ سیدہؑ واقعہ کو سنیں گی تو خوش ہونگی، سیدہؑ کا مزاج خود بھی یہی ہے۔ بنت رسولؐ کا تو یہ عالم ہے کہ باپ کے گھر سے شادی میں ایک لباس ملا تھا اور جب شبِ عروسی کسی سائل نے آکر سوال کر لیا تو وہ لباس بھی اٹھا کر دیدیا، بھلا سیدہؑ کے ناراض ہونے کا کیا سوال ہے اور یہاں شکوہ کی کیا گنجائش ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ میں تو بنت رسولؐ کی فرمائش کو پورا نہ کر سکا۔ میں تو انار نہ لا سکا۔ یہ سوچتے ہوئے درِ سیدہؑ کی طرف چلے، ادھر جبریل امین طبق انار لیکر پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اے حضورؐ! اس سے علیؑ کے آنے سے پہلے یہ انار سیدہؑ کے گھر تک پہنچا دیجئے، آپکی بیٹیؑ نے فرمائش کی تھی، علیؑ نے انار سائل کے حوالے کر دیا، پیغمبرؐ نے انار سلمان کے حوالے کئے، سلمان درِ سیدہ پر لائے، معصومۂ عالمؑ نے پوچھا "سلمان! یہ انار کہاں سے لائے؟" عرض کی۔ آپ کے بابا نے بھیجے ہیں۔ فرمایا۔ "بابا نے کیوں بھیجے ہیں؟" عرض کی۔ جبریل امین لائے ہیں۔ آپ نے مولائے کائناتؑ سے فرمائش کی تھی، انھوں نے انار لیا لیکن غریب سائل کے حوالے کر دیا، اللہ نے اس کے صلے میں یہ انار بھیجے ہیں کہ آپ کو انار بھی مل جائے اور علیؑ کی بات بھی رہ جائے۔ صلوات،

معصومۂ عالمؑ کی خوشی کا عالم نہ پوچھئے، ادھر مولائے کائنات بیت الشرف میں داخل ہوئے، سر جھکائے ہوئے۔ فرمایا۔ بنت رسولؐ! یہ انار کی خوشبو کہاں سے

آرہا ہے۔؟ عرض کی۔ ابا الحسن! یہ آپ ہی نے تو بھیجے ہیں۔ آپ نے انار سائل کے حوالے کر دیئے اور پروردگار نے جنت سے انار بھیج دیئے۔ اللہ رے! خلاصِ علیؑ۔ جو عمل کیا وہ خدا کو پسند آیا، جو ایثار کیا وہ راہِ خدا میں مقبول ہوا، انگوٹھی دی تو آیت آگئی۔ انار دیا تو طبقِ جنت آگیا۔ روٹیاں دیں تو سورۂ ہل اتیٰ آگیا مال دیا تو انفاق و ایثار کا قصیدہ پڑھا گیا اور جان دی تو مرضیٔ پروردگار کا سودا کر لیا۔ صلوات۔

معصومۂ عالمؑ کی حیات میں ایسے بے شمار واقعات پائے جاتے ہیں جن سے آپ کی عظمت کردار پر روشنی پڑتی ہے لیکن تمام واقعات کا بیان کرنا مقصود نہیں۔ صرف خدمات کے سلسلے میں چند فقرے عرض کر کے بیان کو آخری منزل تک پہنچا دینا چاہتا ہوں۔

دنیا یہ سوچتی ہے کہ ایک عورت کسی مذہب کی کیا خدمت کر سکتی ہے اور اس کے امکان ہی میں کیا ہے۔؟ پھر عورت بھی اگر سیدہ عالمؑ جیسی خاتون ہو کہ گھر سے باہر قدم نکالنا ممکن نہ ہو۔ قوم و ملت کی خدمت کے لئے میدانِ عمل میں آنا پڑتا ہے۔ گھر میں رہ کر کوئی خدمت نہیں کی جا سکتی لیکن اربابِ کرم! معصومۂ عالمؑ نے اپنے کردار سے واضح کر دیا کہ ایک عورت اپنے دائرہ عمل میں رہ کر بھی بہت کچھ خدمت انجام دے سکتی ہے عورت کا کام سر بازار گھومنا نہیں ہے، عورت کا کام خدمتِ خانہ ہے اس کا میدانِ عمل گھر کی چہار دیواری ہے۔ ایک عورت اپنی تربیت سے صالح نسل مہیا کرے تو وہ ان لاکھوں عورتوں سے بہتر ہے جو خود میدانِ عمل میں رہتی ہیں اور بچوں کی تربیت سے یوں غافل ہو جاتی ہیں کہ

جتنا انھوں نے بنایا ہے سب اولاد نے تباہ کر دیا ہے۔ سیدۂ عالمؑ کو یہ کہنے کا حق ہے کہ میں نے گھر کے اندر رہ کر وہ نسل کائنات کے حوالے کی ہے جس کا کوئی جواب آج تک نہیں پیدا ہو سکا۔ میرے بچے معصوم اور امام تھے تو وہ بھی جانِ کائنات تھے۔ اور غیر معصوم تھے تو وہ بھی روحِ عالم تھے، کیا تم نے نہیں دیکھا کہ میرے معصوم بیٹے نے دین کو بچا لیا تو میری نورِ نظر زینبؑ نے میرے فرزند کے مقصد کا تحفظ کیا۔ میری صالح اور صحت مند تربیت نہ ہوتی تو ہجومِ مصائب میں میری بیٹی بھی ہوش کھو بیٹھتی لیکن یہ میری آغوش کا اثر تھا کہ مصائب بڑھتے گئے اور زینبؑ کے استقلال میں کوئی فرق نہیں آیا۔

میری خدمات کا جائزہ لینا ہے تو دیکھو کہ میری ماں عرب کی سب سے بڑی مالدار خاتون تھی اور میں نے زندگی بھر فاقے کئے، ہم نے امت کی پرورش کو ضروری سمجھا ہے اور اپنے لئے فاقے ہی مناسب سمجھے ہیں۔

ماں کے انتقال کے بعد یتیمی کا صدمہ سہا لیکن صبر و استقلال میں فرق نہیں آیا اور باپ کی یوں خدمت کی کہ بابا نے مجھے اپنی ماں کہہ کر پکارنا شروع کر دیا۔ یعنی میرے باپ کو بیٹی کی محبت ملی ہے تو مجھ سے اور ماں کی الفت ملی ہے تو مجھ کر میں بیک وقت آمنہ بھی ہوں اور فاطمہ بھی۔ اس رشتے کو تم نہ سمجھو گے! اسے رسولِ اعظمؑ سمجھتے ہیں، تم تو ابو طالب اور بنت اسد ہی کا احسان نہ سمجھ سکے تو میرا احسان کیا سمجھو گے۔

بابا نے ہجرت فرمائی تو میں اسی گھر میں رہی جس میں علیؑ آرام فرما رہے تھے۔ یہ میرا کوئی معمولی ایثار نہ تھا کہ کمسنی کے عالم میں بھی میں نے کوئی فریاد نہیں کی، گھر گھرا رہا۔ تلواریں چمکتی رہیں، نیزے چمکتے رہے اور میں سکون و اطمینان کے ساتھ گھر میں بیٹھی رہی میری منزل کو یوں سمجھا ؤ کہ تصورِ ظلم کیا میں مظالم کو دیکھ کر بھی نہیں گھبرائی۔ میرا

صبر و سکون اس منزل پر ہے کہ جہاں بڑے بڑے انسان ظلم سے ڈر کر رو دیا کرتے ہیں وہاں میں نفسِ مطمئن کا اظہار کرتی ہوں۔

مدینہ آکر عقد ہوا تو زندگی بھر شوہر سے کوئی فرمائش نہیں کی اور دنیا کی خواتین کو بتا دیا کہ شوہر سے فرمائش کرنا عورت کی کمزوری ہے اس کا کمال نہیں ہے اور ساتھ ساتھ مردوں کو بھی سکھا دیا کہ میرے شوہر کی طرح گھر کا خیال رکھو، تاکہ زوجہ کو فرمائش کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔

اُحد کا میدان آیا، میرا باپ زخمی ہو گیا، سارے مسلمان ساتھ چھوڑ کر چلے گئے لیکن باپ کی خدمت کے لئے میں پہنچ گئی اور میں نے زخم کی مرہم پٹی کی، کلمہ سب نے پڑھا تھا لیکن کام میرا ہی گھرانہ آیا۔ میدان میں دفاع میرے شوہر نے کیا اور گھر میں باپ کا علاج میں نے کیا۔

مباہلہ کے میدان میں عزتِ اسلام بچانے کے لئے میں ہی اپنے باپ، شوہر اور بچوں کے ساتھ گئی تھی، اسلام میں ہزاروں خواتین تھیں، خود میرے باپ کے گھر میں متعدد ازواج تھیں اور ایک سے ایک باکمال اور صاحبِ فضائل تھیں لیکن اسلام کے وقت پر میرے علاوہ کوئی کام نہیں آیا۔ وہ میں ہی تھی جو اس شان سے نکلی تھی کہ آگے آگے نبوت، پیچھے پیچھے امامت اور درمیان میں عصمتِ کبریٰ، منظر دیکھنے والے حیرت سے دیکھ رہے تھے کہ عصمت نبوت کے نقشِ قدم پر چل رہی ہے اور امامت عصمتِ کبریٰ کے قدم پر قدم جمائے ہوئے ہے۔

حجۃ الوداع کے موقع پر بھی میں اپنے بابا کے ہمراہ تھی، اور میں نے وہ منظر دیکھا ہے جب میرے شوہر کی ولایت کا اعلان ہو رہا تھا اور مسلمان اس ولایت پر مبارکباد دے رہے تھے اور اس حقیقت کو ظاہر کرنے کے لئے میں بابا کے انتقال

کے بعد دربارِ حکومت میں آئی تھی اور میں نے اعلان کیا تھا کہ کل کے بیعت کرنے والے آج کے حاکم کس طرح بن گئے؟

میں نے ایک پوری صنف کو زندگی کا سلیقہ سکھایا ہے۔ بیٹی کا برتاؤ ماں باپ کے ساتھ، زوجہ کا برتاؤ شوہر کے ساتھ، ماں کا برتاؤ بچوں کے ساتھ، عزیز کا برتاؤ عزیز کے ساتھ، یہ سارے حقائق میرے کردار میں ملیں گے اور اس کی مثالیں نہ مریم کے کردار میں ملیں گی نہ سارہ کے کردار میں، نہ حوا کی زندگی میں ملیں گی نہ ہاجرہ کی زندگی میں۔ اور جب وہ پاکیزہ زندگیاں اتنی مثالوں کو پیش کرنے سے قاصر ہیں تو امت کی غیر معصوم عورتوں کا کیا ذکر ہے؟

لیکن چاہنے والو! اس دنیا نے میرے ساتھ کیا برتاؤ کیا، یہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے۔ ابھی میرے بابا کی آنکھیں بند ہوئی تھیں کہ میری جاگیر پر قبضہ کر لیا گیا۔ میرے دروازے پر آگ اور لکڑیاں جمع کر دی گئیں اور مجھ سے کہا گیا کہ علیؑ کو باہر نکالو، ورنہ گھر میں آگ لگا دی جائے گی، میں کہتی رہی کہ اس گھر میں رسولؐ کے چھوٹے چھوٹے نواسے حسنؑ و حسینؑ بھی ہیں، لیکن جواب ملا کہ ہم سب کو جلا دیں گے اور بالآخر مجھ پر وہ ظلم ہوا کہ میرا محسنؑ شہید ہو گیا، میرا پہلو شکستہ ہو گیا، میری پسلیاں ٹوٹ گئیں، میں خاک پر گر پڑی ——— اب جو ہوش آیا تو میں نے اپنے وارث کے گلے میں رسی دیکھی۔

آواز دی! ابوالحسنؑ کو چھوڑ دو، ورنہ سر کے بال پریشان کر دوں گی مسجدِ پیغمبر کی دیواریں بلند ہو گئیں، کائنات میں زلزلہ آ گیا۔ لیکن ظالموں کے

دل پر کوئی اثر نہ ہوا۔

عزیزو! میں دربار میں گئی تو مجھے جھٹلایا گیا اور میرے گواہوں کو رد کر دیا گیا، میں نے باپ کے بعد صرف ۷۵ دن زندگی گزاری ہے لیکن یہ ۷۵ دن میرے لئے ۷۵ سال بن گئے اور میں مصلے پر بیٹھ کر دعا کرتی تھی کہ پروردگار اب مجھے دنیا سے اٹھا لے زہراؑ کو زندہ رہنے کو جی نہیں چاہتا۔

عزادارو! ایک لمحہ کے لئے سوچو۔ کوئی ماں اپنے کمسن بچوں کو چھوڑ کر مرنا چاہتی ہے، کوئی خاتون اٹھارہ برس کی عمر میں موت کی تمنا کرتی ہے۔ کوئی عورت اپنے وارث کو ہجوم مصائب میں روتا چھوڑ کر جانا چاہتی ہے لیکن ہائے مجھ پر وہ وقت پڑ گیا تھا کہ میری زبان پر دعائے موت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ پروردگار میں اس امت کے لئے بددعا نہ کروں گی۔ میں اپنی ہی موت کی دعا کر رہی ہوں۔ آخر وہ وقت بھی آیا جب میری دعا قبول ہوئی۔ اور میں نے زندگی کے آخری لمحات میں اپنے بچوں کو نہلا دھلا کر مسجد کی طرف بھیج دیا اور حجرۂ عبادت میں جا کر مشغولِ بندگیِ پروردگار ہو گئی۔ میں نے اسماء کو تاکید کر دی کہ میرے بچوں کا خیال رکھیں۔ میں نے ابوالحسنؑ سے وصیت کر دی کہ میرے کمسن بچوں کا خیال رکھیں۔ میں دنیا سے رخصت ہوئی تو سارے حقوق ادا کر کے گئی اور کوئی حق اپنے ذمہ لے کر نہیں گئی۔

جی چاہتا ہے عرض کروں، ہاں شہزادی آپ نے جملہ حقوق ادا کر دیئے لیکن بی بی! ایک لمحہ کے لئے مڑ کر دیکھئے آپ کے بچوں پر کیا گزر رہی ہے۔ آپ تو دنیا سے رخصت ہو گئیں، ذرا حسینؑ کی حالت تو دیکھئے، ذرا اپنی زینبؑ و ام کلثومؑ کا تڑپنا تو دیکھئے۔

عزادارو! زہراؑ سب کچھ دیکھ رہی تھیں، اور یہی وجہ ہے کہ جب علیؑ نے حسب وصیت غسل و کفن دے کر جنازہ تیار کیا اور بچوں کو آواز دی۔ بچو! آؤ ماں کا آخری دیدار کر لو۔ اور شہزادوں نے پائنتی کھڑے ہو کر ماں کو حسرت سے سلام کیا اور آواز دی۔ اماں! نانا سے ملاقات ہو تو ہمارا سلام کہئے گا اور کہئے گا ہم یتیم ہو گئے، ہم دنیا میں غریب ہو گئے۔ تو ایک مرتبہ بندِ کفن ٹوٹے، زہراؑ کے ہاتھ بڑھے، بچوں کو گلے سے لگا لیا، ارے میرے بچو! میں سامنے موجود ہوں اور تم غربت کا نام لے رہے ہو مجھ سے یہ کیسے برداشت ہو سکے گا۔ مولائے کائناتؑ آگے بڑھے۔ بچوں کو لاش سے جدا کیا۔ سر پر دستِ شفقت پھیرا۔ میں کہوں گا۔ عزادارو! جب یتیموں کو لاش سے جدا کیا جاتا ہے تو اتنی ہی شفقت و محبت سے جدا کیا جاتا ہے۔ مگر ہائے سکینہ! باپ کی لاش، شمر کا تازیانہ۔ بچی کا نوحہ، زمینِ کربلا کا زلزلہ، زینب کی فریاد، کون تھا جو بچی کو تسکین دیتا۔ بھائی زنجیروں میں جکڑا ہوا، ماں رسن بستہ، ہر طرف دشمنوں کا ہجوم ہر چہار سمت نامحرموں کا مجمع، عجب نہیں لاشِ حسینؑ کو جنبش ہوئی ہو اور آواز آئی ہو۔ میری سکینہ، میری لال، صبر کر بیٹی صبر۔

عزادارو! میں اپنا بیان تمام کر دیتا لیکن ایک جملہ اور کہنے کو جی چاہتا ہے۔ کس سے کہوں اور کیوں کر کہوں۔ آیئے معصومۂ عالمؑ سے فریاد کریں۔ بی بی! آپ نے حسینؑ کی زبان سے غربت کا نام نہ سنا گیا، اب ذرا عصرِ عاشور کربلا میں آیئے۔ ہائے وہ عصر کا ہنگام، وہ حسینؑ کا آخری سجدہ، وہ شمر کا خنجر، وہ زمین کا زلزلہ، وہ آسمان سے خون کی بارش، وہ تیز آندھیاں، وہ آفتاب کا گہن اور وہ بلندی سے ایک بہن کی فریاد۔ "پسرِ سعد میرا بھائیا ذبح ہو رہا ہے اور تو کھڑا دیکھ رہا ہے۔" اور اس ہنگام میں وہ حسینؑ کا اشارہ۔ زینب! واپس جاؤ، ابھی بھائی زندہ ہے، حسینؑ

اپنے سامنے تمھیں خیمے کے باہر نہ دیکھ سکے گا۔

میں کیوں گوارا! بہن کو آجانے دیجئے، ابھی زینب کے سر پر چادر ہے ــــ بہن بھائی سے رخصت ہولے۔ مولا! تھوڑی دیر کے بعد کیا ہوگا۔ جب آپ کا سر تن سے جُدا ہوجائے گا، خیموں میں آگ لگے گی، سیدانیاں ایک خیمہ ــــ سے دوسرے خیمہ کی طرف اور آخر میں جلتے خیموں سے اس شان سے باہر نکلیں گی کہ سر کے بال بکھرائے ہوئے، منھ پر طمانچے مارتی ہوئی ــــ وا محمداہ، وا علیاہ، وا حسیناہ،

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

وَسَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْن

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام

اسم مبارک	موسیٰ
لقب	کاظم
کنیت	ابوابراہیم
والد ماجد	امام جعفر صادق ؑ
والدہ ماجدہ	جناب حمیدہ
ولادت	۷ صفر ۱۲۸ھ مقام ابواء (مدینہ منورہ)
ازواج	ایک
اولاد	فرزندان و دختران
شہادت	۲۵ رجب ۱۸۳ھ (جمعہ) بغداد
عمر مبارک	۵۵ سال
قبر مبارک	کاظمین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین خاتم النبیین سیدنا ومولانا ابی القاسم محمد وآلہ الطیبین الطاہرین ولعنۃ اللہ علی اعدائہم اجمعین ۔ اما بعد فقد قال اللہ الحکیم فی کتابہ الکریم ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِنَّ عَلَیْنَا لَلْھُدٰی وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَۃَ وَالْاُوْلٰی

ارشاد جناب رب العزت ہوتا ہے: "بیشک ہدایت کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے اور دنیا و آخرت کا اختیار ہمارے ہاتھوں میں ہے۔"

آیت کریمہ نے صاف واضح کر دیا ہے کہ خدائے صادق الوعد نے ہر دور میں ہدایت کا انتظام کیا ہے۔ اور عمر دنیا کا کوئی موڑ ایسا نہیں آیا جہاں ایک نہ ایک ہادی اور ایک نہ ایک راہنما نہ مقرر کیا گیا ہو۔ یہ اہل دنیا کا سازشی ذہن تھا کہ انھوں نے کسی زمانے میں خدائی راہنما کا اتباع نہ کیا۔ اُدھر ہر دور میں اپنی طرف سے ایک نہ ایک راہنما مقرر کرتے رہے۔ نتیجہ کیا ہوا۔ یہ تاریخ کی نگاہوں کے سامنے ہے۔ اتنا ضرور ہوا کہ انھیں ہادیوں اور راہنماؤں کے کردار سے اللہ والوں کے بلند کردار پر بھی روشنی پڑتی رہی۔ اور دنیا یہ دیکھتی رہی کہ اِدھر کے نمائندوں کا کیا حال ہے اور اُدھر کے نمائندوں کا کیا عالم ہے۔ اِدھر جہالت کا کیا رنگ ہے اور اُدھر علم کی کیا وسعت ہے۔ اِدھر عاجزی اور ناتوانی کے کیا اعترافات ہیں۔ اور ادھر قدرت و اختیار کے کیا مظاہرے ہیں۔ اِدھر بد عملی اور بدسلوکی کے کیا انداز ہیں اور اُدھر حسن اخلاق اور کرم کے کیا سلیقے ہیں ——— اور حقیقت حال تو اس وقت کھلتی تھی جب سلاطین دنیا رعب سلطنت سمیت بوریہ نشینوں کی چوکھٹ پر مٹے

سے کر آیا کرتے تھے اور آواز دیتے تھے کہ اب دین کا بچانا آپ کا کام ہے۔ اب عزت اسلام آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اب آبروئے ملت آپ کے قبضہ میں ہے۔ اور اللہ والے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ مسائل حل کر کے آواز دیتے تھے کہ تخت و تاج سنبھال لینا آسان ہے۔ دین کا سنبھالنا مشکل ہے۔ حکومت پر قبضہ کر لینا آسان ہے۔ مسند علم پر جلوہ گر ہونا مشکل ہے یا یوں کہا جائے کہ خلیفہ بننا آسان ہے امامؑ بننا مشکل ہے۔ فاتحِ ایران بننا آسان ہے کلِ ایمان بننا مشکل ہے۔ امیر بننا آسان ہے جناب امیرؑ بننا مشکل ہے ——— صلوات

تاریخ اسلام کا جائزہ لیجئے تو اندازہ ہوگا کہ اہل دنیا نے کیسے کیسے افراد کو تخت حکومت پر جلوہ گر کیا ہے۔ اور اسلام کی باگ ڈور کیسے کیسے ہاتھوں میں دی ہے کہ اگر ہر دور میں چند اللہ کے مخلص بندے اور قدرت کے سچے نمائندے نہ ہوتے تو اسلام کب کا فنا ہو چکا ہوتا۔ اور دین خدا نام لینے کے قابل بھی نہ ہوتا۔ دین الٰہی کے ذمہ دار مصائب میں رہے۔ پریشانیوں میں رہے۔ قید و بند میں رہے۔ حالات کے شکنجوں میں رہے۔ گھر میں نظر بند رہے۔ قیدخانوں کی نذر رہے۔ آوارہ وطن رہے۔ غربت زدہ رہے۔ تشنہ و گرسنہ رہے۔ سر و پا برہنہ رہے۔ لیکن دین کے مشکلات میں بہرحال کام آتے رہے۔ اور ہر ہوشمند بادشاہ دنیا کا یہی اصول رہا کہ انھیں پریشان رکھو لیکن زندہ رکھو۔ حتی الامکان انھیں مرنے نہ دیا جائے۔

اکثر لوگ یہ سوچتے ہیں کہ اگر حکومتیں اللہ والوں کی مخالف تھیں اور دونوں کے درمیان شدید اختلافات تھے تو حکومتوں نے روز اول ہی ان کی زندگیوں کا خاتمہ کیوں نہیں کرا دیا اور انھیں زندہ کیوں رکھا جن بادشاہوں

نے ایک ایک دن میں سیکڑوں اور ہزاروں کو تہ تیغ کرایا تھا۔ جنھوں نے اپنی ماں اور اپنے بھائی کو زہر دینے سے تکلف نہیں کیا تھا۔ انھوں نے اللہ والوں کو زندہ ہی کیوں رہنے دیا ـــ یہ زندہ رکھنا دلیل ہے کہ تعلقات بہتر تھے اور آپس میں کوئی ایسا اختلاف نہیں تھا ـــ لیکن اولاً تو مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ موت و حیات کسی کے بس میں نہیں ہے۔ کہ جب جس کا جی چاہے کسی کا خاتمہ کر دے۔ ہر شخص کی موت کا وقت مقرر ہے۔ اس کے پہلے انسان لاکھ کوشش کرے مجرم بن سکتا ہے فنا نہیں کر سکتا۔ موت سلاطین کے اختیار میں ہوتی تو موسیٰؑ قصر فرعون میں زندہ نہ رہتے۔ ابراہیمؑ نمرود کے سامنے نہ ہوتے ـــ شداد اپنی جنت سے محروم نہ رہتا۔ یہ واقعات خود اس بات کی دلیل ہیں کہ موت انسان کے اختیار میں نہیں ہے۔ اور جب ان انسانوں کے اختیار میں نہیں ہے جو خدائی کے دعویدار تھے تو ان کے اختیار میں کیا ہوگی جو آخر تک بندے ہی بنے رہے اور خدائی کا دعویٰ نہیں کر سکے۔ خود مولائے کائنات نے نہج البلاغہ" میں ارشاد فرمایا ہے کہ مجھے کسی فوج اور لشکر کی ضرورت نہیں ہے۔ میں میدان جہاد میں اپنے ایمان اور عقیدے کے بھروسہ پر لڑتا ہوں۔ میرا اعتبار نصرت پروردگار پر ہوتا ہے۔ اور میں جانتا ہوں کہ اگر میرا وقت نہیں آیا تو مجھے کوئی قتل نہیں کر سکتا۔ اور اگر وقت آگیا تو یہ فوجیں بچا بھی نہیں سکتیں۔ جب وقت معین سلیمان جیسے بادشاہ کو نہ بچا سکا تو کسی اور کو کیا بچا سکے گا۔

بعینہ یہی انداز امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کا تھا۔ جب آپ کو ہارون نے اپنے دربار میں طلب کیا اور کہا کہ میں نے سنا ہے کہ آپ خفیہ طور سے لوگوں سے بیعت لیتے ہیں اور اپنی امامت کی تبلیغ کرتے ہیں تو آپ نے فرمایا کہ مجھے

علانیہ بیعت سے کون سی چیز روک سکتی ہے کہ میں خفیہ بیعت لوں گا۔

ہارون نے جل کر کہا کہ آپ کو بیعت لینے کا حق کہاں سے حاصل ہوگیا۔ فرمایا کہ میرا حق زائل کس نے کر دیا ـــ؟

اس نے کہا کہ آپ کا حق تھا ہی کب کہ زائل کرنے کا سوال پیدا ہو۔ آپ نے فرمایا کہ اگر میرا حق نہیں ہے تو تیرا بھی حق نہیں ہے۔

اس نے کہا میں بادشاہ وقت ہوں۔ میرا حق کیوں نہیں ہے آپ نے فرمایا کہ میں بھی بادشاہ ہوں۔ فرق یہ ہے کہ تو جسموں کا بادشاہ ہے اور میں دلوں کا بادشاہ ہوں۔

یہ سننا تھا کہ ہارون کو غیظ آگیا اور کہنے لگا کہ آپ کو مجھ پر کوئی فضیلت حاصل ہے؟ آپ نے فرمایا وہی فضیلت جو جسم پر روح کو حاصل ہے۔ اس نے کہا کہ خیر قرابت کے اعتبار سے تو ہم اور آپ برابر ہی ہیں۔ دونوں خاندان رسولؐ کی فرد ہیں۔ آپ نے فرمایا یہ بھی غلط ہے۔ روز قیامت تو رسولؐ اللہ کو یابن العم کہہ کر سلام کرے گا اور میں اپنا باپ کہہ کر خطاب کروں گا۔ ظاہر ہے کہ اولاد کا مرتبہ اور ہوتا ہے اور خاندان والوں کا مرتبہ اور ـــ صلوات

ہارون یہ سن کر جل گیا اور سوچنے لگا کہ یہ میرے مقابلے میں اپنے کو دلوں کا بادشاہ سمجھتے ہیں۔ کوئی تدبیر ہونا چاہئے کہ انھیں مرعوب کر دیا جائے۔ چنانچہ حج کے موقع پر مجمع عام میں چند مسائل پوچھے اور یہ کہا کہ اگر آپ ان کا صحیح جواب نہ دیں گے تو میں آپ کو صفا و مروہ کے درمیان قتل کرا دوں گا۔ حضرت یہ سن کر خاموش ہو گئے۔ اور ہارون کے ایک غلام نے بڑھ کر سفارش کی امیر! حرم خدا میں قتل حرام ہے۔ اس جوان کو معاف کر دے حضرت یہ سن کر مسکرانے لگے۔ فرمایا میں سوچتا ہوں کہ غلام اور حاکم میں

کون زیادہ احمق ہے ـــ وہ جو قبل از وقت موت دینا چاہتا ہے یا وہ جو آئی ہوئی موت کو سفارش سے ٹالنا چاہتا ہے۔ یاد رکھو اگر میری موت آگئی ہے تو سفارش سے ٹل نہیں سکتی۔ اور اگر نہیں آئی ہے تو ہارون کے ارادہ سے آ نہیں سکتی۔

یہ انداز بعینہ مولائے کائنات سے ملتا جلتا ہے اور دنیا کو آواز دے رہا ہے کہ آل محمدؐ کسی بھی منزل پر رہیں گے کردار ایک رہے گا۔ انداز ایک رہے گا اور یاد رکھو کہ جس کا عقیدہ موت کے بارے میں صحیح نہیں ہوتا، وہ مصائب ڈال کر بھی پریشان رہتا ہے اور جس کا عقیدہ صحیح ہوتا ہے وہ مصائب برداشت کر کے بھی مسکراتا رہتا ہے۔ موت کے بارے میں بدعقیدہ انسان میدانِ جنگ سے فرار کرتا ہے۔ اور قضا و قدر الٰہی پر ایمان رکھنے والا حیدر کرارؑ ہوتا ہے ـــ صلوات

سلاطین دنیا اور نمائندگان پروردگار کی بات آگئی ہے تو ایک ہلکا سا خاکہ تاریخ اسلام کا بھی پیش کر دیا جائے تاکہ دنیا اندازہ کر لے کہ اللہ والوں کو چھوڑنے کے بعد دنیا والوں نے جو راستہ اختیار کیا ہے اس میں کیسے کیسے لوگوں کو امت کا ذمہ دار اور دین کا ٹھیکیدار بنایا ہے اور ان کے کردار کو دیکھنے کے بعد ہی اندازہ ہو سکے گا کہ اللہ والوں کا کردار کیا ہوتا ہے اور نمائندگان پروردگار کس بلند منزل کے حامل ہوتے ہیں۔

تذکرہ بہت طولانی ہے اور ساری فہرست کے پیش کرنے کا محل نہیں ہے۔ صرف چند افراد کے حالات کی طرف تسلسل کے ساتھ اشارہ کر دینا ہے ـــ تسلسل کا آغاز مرسل اعظمؐ کی حیات کے بعد ہی سے ہو جاتا ہے لیکن میں چند افراد کو نظر انداز کیے دیتا ہوں کہ ان کے حالات تمام دنیا کو معلوم ہیں اور ہر صاحب عقل و نظر کو اندازہ ہے کہ سلطنتوں کے پاس کتنا علم کتنی بصیرت اور

کتنی دینی آگاہی تھی۔ ارباب سلطنت نے خود اعلان کر دیا تھا کہ اگر علیؑ نہ ہوتے تو ہم ہلاک ہو جاتے۔ ان سلطنتوں کا سب سے بڑا اثر یہ ہوا کہ انھوں نے اولیاء خدا کے خلاف ذہنوں کو اتنا تیز کر دیا اور مزاجوں میں اتنی جرأت پیدا کر دی کہ جب امیرالمومنینؑ کا دورِ حکومت آیا تو ام المومنین جیسی خاتون بھی میدان جنگ میں آگئیں اور معاویہ جیسا نو مسلم بھی علیؑ کا مدمقابل بن گیا۔ خوارج کی جرأتیں تو معلوم ہی ہیں اور آخری نتیجہ یزید کی شکل میں برآمد ہوا جس نے تین سال کی حکومت میں ایک سال فرزند رسولؐ کو شہید کیا۔ دوسرے سال حرم رسولؐ کو لوٹا اور تیسرے سال حرم الٰہی کو تباہ و برباد کر دیا۔ اور امت کو آگاہ کر دیا کہ جب اسلام الٰہی نمائندوں سے الگ ہو جاتا ہے تو اس کا آخری انجام یزید بن معاویہ ہوتا ہے۔

ارباب بصیرت خود اندازہ کریں کہ یزید کس آغاز کے انجام کا نام ہے اور جب انجام ایسا ہے تو آغاز کیسا رہا ہوگا۔ صلوات

یزید کے بعد امت اسلامیہ میں اتنا شعور پیدا ہو گیا تھا کہ جب اس کے بیٹے معاویہ بن یزید کو حکومت دی گئی تو اس نے صاف لفظوں میں یہ اعلان کر دیا کہ یہ خلافت روز اول سے غصبی ہے اور مجھے غصبی مال کی کوئی ضرورت نہیں ہے جن لوگوں نے خلافت کو لے کر عیش کیا ہے وہی پروردگار کی بارگاہ میں جوابدہ بھی ہوں گے۔ میں جواب دہی کا ذمہ دار کیوں بنوں ـــ یہ ہے واقعہ کربلا کا اثر کہ دنیا سمجھتی تھی کہ امام حسینؑ فنا ہو گئے۔ آلِ محمدؐ کا نام مٹ گیا۔ دین الٰہی بنی ہاشم کا کھیل تماشا بن گیا۔ لیکن امام حسینؑ نے آواز دی کہ تو بھی سر کٹا کر بھی خلافت و حکومت کو اتنا رسوا نہ کر دوں کہ بیٹا بھی باپ کی جگہ لینے کو تیار نہ ہو اور گھر کا راز گھر ہی سے کھلے ـــ میں نہیں جانتا کہ یزید کا بیٹا کتنا نیک نیت تھا اور اس نے کس خلوص سے یہ اعلان کیا تھا۔ لیکن اتنا جانتا ہوں کہ شہادت امام حسینؑ اس

قدر پُر اثر تھی کہ اس نے غیرت دار بیٹے کو باپ کی جگہ لینے سے انکار کرنے پر مجبور کر دیا۔

حضرت پیام اعظمی نے کیا خوب کہا ہے۔ ؎

صدیوں میں جو ابھری تھی وہ تصویر بدل دی　　نسلوں سے جو بگڑی تھی وہ تقدیر بدل دی
فرزند یزید اور خلافت سے ہو بیزار　　تو نے اموی خون کی تاثیر بدل دی

معاویہ بن یزید کے بعد مروان بن الحکم حاکم بنا لیکن دس مہینے سے زیادہ زندہ نہ رہ سکا اور بالآخر اپنے ہی آدمیوں کے ہاتھوں مارا گیا اور یہ بھی قدرت کا ایک انتظام تھا کہ ہماری راہ سے ہٹ کر اپنا انجام دیکھتے رہنا اور میرا تو جی چاہتا ہے کہ میں دنیائے اسلام کو چیلنج کروں اور یہ تقاضا کروں کہ کسی میں ہمت ہو تو میرے اس سوال کا جواب دے کہ تاریخ حکومت میں تو ایسے واقعات بے شمار ہیں جہاں ایک حاکم کا خون دوسرے حاکم کی گردن پر ہے اور ایک نے دوسرے کے قتل کی سازش کی ہے۔ کبھی خاندان کے چشم و چراغ نے رئیس خاندان کو قتل کرایا ہے کبھی گورنر نے بادشاہ کو قتل کرایا ہے۔ کبھی بھائی نے بھائی کو قتل کرایا ہے۔ کبھی بیٹے نے باپ کے قتل کا انتظام کیا ہے۔ کبھی کوئی اور سازش سے قتل کی گئی ہے۔ لیکن کیا تاریخ امامت میں بھی کوئی واقعہ ایسا ہے کہ کسی امام نے دوسرے امام کے قتل کا منصوبہ بنایا ہو یا ایک امام نے دوسرے امام کی شہادت میں حصہ لیا ہو جب کہ ایک ایک وقت میں متعدد امام زندہ رہے ہیں اور ہر ایک کو معلوم تھا کہ ان کے بعد امامت ہمیں ملنے والی ہے۔ دنیا کا کوئی بادشاہ ہوتا تو جلد ہی حکومت حاصل کرنے کی فکر کرتا لیکن اس تاریخ کا بے داغ ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ معصوم کردار اور ہوتا ہے اور غیر معصوم کردار اور ـــــ دنیا کے بندے اور ہوتے ہیں اور پروردگار کے نمائندے اور ـــ قتل و خون سفاک و قزاق کیا کرتے

ہیں۔ ہادی اور راہنما نہیں کرتے۔ اور شاید ملائکہ نے اسی تاریخ کو نگاہ میں رکھ کر آواز دی تھی کہ پروردگار انسانوں میں تو ایسے بھی پیدا ہوں گے جو قتل و خون کریں گے۔ اور قدرت نے واضح کر دیا تھا کہ میں اپنے منصب کا حال بہتر جانتا ہوں۔ میں یہ منصب انھیں کو دے دوں گا۔ جن کے دامن کردار پر کوئی دھبہ نہ ہوگا۔ قتل و خون سلاطین دنیا کا شعار ہے۔ ہمارے نمائندوں کا کردار نہیں ـــــ صلوات۔

مروان کے بعد جن سلاطین نے امت اسلامیہ پر حکومت کی ہے ان کا مختصر نقشہ یہ ہے۔

۶۵ھ سے ۸۶ھ تک عبد الملک بن مروان کی حکومت رہی۔ یہ شخص حکومت سے پہلے بڑا نمازی اور عبادت گذار تھا۔ لیکن جس دن یہ خبر ملی کہ خلافت آپ کے حصہ میں آگئی ہے۔ فوراً قرآن اٹھا کر بند کیا اور آواز دی "ھذا فراق بینی و بینک" آج میرے اور تیرے درمیان جدائی ہو گئی۔ اب خلافت قبضہ میں آگئی ہے۔ اب قرآن کی ضرورت نہیں ہے۔ علامہ اقبال کو اسی مقام پر مرثیہ پڑھنا پڑا ہے ؎

چوں خلافت رشتہ از قرآں گسیخت
حریت را زہر اندر کام ریخت

جب خلافت نے قرآن سے اپنا رشتہ توڑ لیا تو حریت و آزادی کے کام و دہن میں سوائے زہر کے کچھ نہ رہ گیا ـــــ میں عرض کروں گا حضرت علامہ! ابھی کتنے دن گذرے ہیں جب خلافت نے عترت سے کنارہ کشی کی تھی اتنی جلدی قرآن بھی ہاتھ سے نکل گیا۔ اب آپ نے دیکھ لیا کہ قرآن و عترت میں کتنا اتحاد ہے کہ جس سے عترت الگ ہو جاتی ہے۔ اس سے قرآن بھی الگ ہو جاتا

ہے ـــــ صلوات۔

اس بادشاہ کی انانیت و فرعونیت کا یہ عالم تھا کہ حجاز کی مسجد میں بھرے مجمع میں خطبہ دیا تھا کہ یاد رکھو ـــ "نہ میں عثمان جیسا کمزور خلیفہ ہوں نہ عمر جیسا خوشامد پسند اور نہ یزید جیسا بیوقوف۔ میرے پاس ہر بات کا علاج تلوار ہے۔ اگر تم میں سے کوئی مجھ سے تقویٰ اور پرہیزگاری کی بات کرے گا تو میں اس کی گردن اڑا دوں گا۔"

دیکھا آپ نے حکومت کا مزاج۔ منبر رسولؐ اور گفتگوئے تقویٰ پر گردن زدنی۔ یہ مزاج کہاں سے آیا۔ اور کیوں کر پروان چڑھا۔ اس کے واضح کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس روضۃ الصفا کی اس روایت ہی نے سارا مسئلہ صاف کر دیا ہے۔ اب اہل دانش کا فرض ہے کہ وہ فکر کریں کہ اسلام کہاں ہے اور حکومت کہاں ہے؟

عبدالملک کے بعد ۸۶ھ میں ولید بن عبدالملک کا دور آیا۔ یہ انتہائی جاہل آدمی تھا۔ عربی سے قطعی ناواقف۔ بیان میں ایسی غلطیاں کرتا تھا کہ سارا مجمع ہنس پڑتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود سعید بن جبیر کو اصفہان سے بلا کر محبت اہلبیتؑ کے جرم میں قتل کرا دیا اور یہ واضح کر دیا کہ حکومت کو قرآن و حدیث آئے یا نہ آئے دشمنی اہلبیتؑ ضرور آتی ہے اور حقیقت ہے کہ جسے قرآن ہی کی خبر نہیں ہے اسے اہلبیتؑ کی کیا خبر ہوگی ـــــ صلوات

عبدالملک کے بعد ۹۶ھ سے تین سال تک سلیمان بن عبدالملک کی حکومت رہی۔ اس کا ذوق طعام و شراب شہرۂ آفاق ہے۔ شکم شریف میں اتنی وسعت کہ ایک نشست میں ستر انار، چند بکری کے بچے، چھ مرغیاں اور ۲ من باد کشمش کھا گیا اور تخمہ بھی نہ ہوا۔ موت بھی کھانے ہی سے ہوئی ہے۔ ایک

مرتبہ ایک بوری ابلے انڈے اور ایک بوری انجیر کھا گیا۔ اور نتیجہ میں واصل جہنم ہو گیا۔ آستینوں کا شوربے میں ڈوب جانا۔ تہذیب کی علامت تھا اور یہی مال غنیمت میں اس کے لباس کی علامت بنا۔

تاریخ نے صرف حاکم شام کے بارے میں نقل کیا تھا کہ پیغمبر اسلامؐ نے بددعا دی تھی کہ اس کا پیٹ کبھی نہ بھرے۔ اس واقعہ سے اندازہ ہوا کہ "ایں خانہ ہمہ آفتاب است"۔ اب آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہادی دین اور حاکم دنیا میں کتنا فرق ہے۔ آستینوں کو ڈبو کے کھانا حاکم دنیا کا کام ہے اور فاقے کر کے قوم کو پانی پلانا امام وقت کا کارنامہ ہے ـــ صلوات

سنہ ۹۹ھ میں سلیمان کے بعد عمر بن عبدالعزیز کو حکومت ملی۔ یہ حکومت تو چند ہی دنوں رہی۔ لیکن تاریخ بنی امیہ کا سب سے سنہرا اور شریف دور یہی دور کہا جاتا ہے۔ جب اس بادشاہ نے بزرگوں کے کردار کی قدر سے اصلاح کی اور دو اہم کام انجام دیئے۔ ایک کام یہ کیا کہ فدک کا علاقہ بنی ہاشم کو واپس کر دیا۔ اور دوسرا کام یہ کیا کہ معاویہ کے دور سے جو مولائے کائنات پر سب و شتم کا سلسلہ جاری تھا اسے بند کرا دیا۔ بنی امیہ نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ یہ اس زہر سے واضح ہے جس نے عمر بن عبدالعزیز کی زندگی کا خاتمہ کیا تھا اور یہ واضح کر دیا تھا کہ جو قوم اپنے بادشاہ کو برداشت نہیں کر سکتی وہ آل محمدؐ کو کیا برداشت کرے گی۔ لیکن ابن عبدالعزیز کے کارناموں نے یہ واضح کر دیا کہ مظلومیت بہرحال ایک دن رنگ لاتی ہے اور ظلم کو مظلومیت کے سامنے جھکنا پڑتا ہے۔

مجھے بادشاہ کی نیت پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ ارباب تاریخ نے اس بادشاہ کو "ملک عادل" کی سند دی

ہے۔ اب کاش کوئی ان ارباب تاریخ سے پوچھتا کہ اگر فدک کا واپس کرنے والا بادشاہ عادل ہے تو لینے والا کون ہوگا اور اگر سب و شتم کو بند کرانے والا عادل ہے تو اس رسم کو جاری کرنے والا کون ہوگا ـــــ صلوات

گویا تاریخ نے ظلم سے خود اقرار دے لیا کہ عدل کسے کہتے ہیں اور ظلم کس چیز کا نام ہے۔ دنیا کہتی ہے کہ امیر المومنین نے جنگ کر کے فدک کا علاقہ واپس کیوں نہ لیا تھا۔ مجھے اس موضوع پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ کل اگر فدک کا علاقہ واپس لے لیا ہوتا تو فدک پر قبضہ ہوتا لیکن یہ الزام بھی ہوتا کہ علیؑ نے مسلمانوں پر ظلم کیا ہے اور ان کا حق غصب کر لیا ہے۔ مولائے کائنات نے واضح کر دیا کہ فاقے کرنا گوارا ہے۔ دامن کردار کا داغدار ہونا گوارا نہیں ہے۔ اللہ والوں کا سرمایہ باغ و جاگیر نہیں ہے۔ ان کا سرمایۂ حیات کردار اور کیرکٹر ہے۔ کردار سلامت ہے تو سب کچھ ہے اور کردار نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں۔

ابن عبدالعزیز کی دو سالہ حکومت کے بعد ۱۰۱ھ میں یزید بن عبدالملک بادشاہ ہوا۔ یہ ایسا عیاش اور حسن پرست انسان تھا کہ خدا کی پناہ۔ عالم یہ تھا سارے امور مملکت ایک حسین و جمیل کنیز کے حوالے کر دیئے تھے اور خود بھی اسی کے دام فریب میں گرفتار تھا۔ رفتہ رفتہ ایک دوسری کنیز نے اس کے دل و دماغ پر قبضہ کر لیا۔ اور اب ساری توجہ اس کی طرف ہوگئی۔ یہاں تک کہ ایک دن باغ میں کنیز کے ساتھ اٹھکیلیاں کر رہا تھا اور ایک ایک دانہ انگور اس کے منھ میں پھینک رہا تھا کہ اچانک ایک دانہ حلق میں پھنس گیا اور کنیز واصل ہوگئی۔ یزید کو اس کے مرنے کا اس قدر غم ہوا کہ اس نے لاش کو دفن کرنے سے انکار کر دیا۔ کئی روز تک لاش کو سامنے رکھے دیکھتا رہا۔ اور اس درمیان فعل شنیع بھی انجام دیا۔

ماشاءاللہ دین کے ذمہ دار ہوں تو ایسے ہوں۔ اور اسلام کے محافظ ہوں تو ایسے ہوں۔ اگر دین انھیں ہاتھوں میں دیدیا گیا ہوتا تو آج اسلام میں عیاشی کے علاوہ کچھ نہ ہوتا۔ مذہب اہل بیتؑ کے حکم متعہ کے مذاق اڑانے والے اور اسے عیاشی کا نام دینے والے ذرا تاریخ حکومت کا بھی جائزہ لیں اور اس کے بعد فیصلہ کریں کہ سیلاب پر باندھ باندھنے کا نام عیاشی ہے۔ یا سیلاب کو کھلی چھوٹ دیدینے کا نام عیاشی ہے۔ وہ امامت کا کارنامہ ہے اور یہ حکومت کا کارنمایاں ہے ـــ

یزید کے بعد ہشام بن عبدالملک بادشاہ ہوا۔ اس کا دور حکومت ۱۰۵ھ سے ۱۲۵ھ تک ۲۰ سال قائم رہا اور جس قدر ظلم کا امکان تھا آل محمدؐ پر ظلم کیا گیا۔ جناب زیدؒ بن علیؑ ابن الحسینؑ کی شہادت اسی کے دور کا المیہ ہے۔ جناب زیدؒ امام زین العابدینؑ کے فرزند تھے۔ ان کی والدہ گرامی کا نام حوریہ تھا جنھیں جناب مختار نے امام زین العابدینؑ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ زیدؒ نے بنی امیہ کے مظالم کے خلاف آواز اٹھائی۔ ابو حنیفہ نے ان کا ساتھ دیا۔ اور ان کی حمایت میں فتویٰ دیا لیکن ہشام نے انھیں امام بنا کر توڑ لیا اور زید کا یہ عالم ہوگیا کہ چالیس ہزار کی فوج میدان جنگ تک صرف ۱۸ نفر رہ گئی۔ جناب زید شہید ہوگئے اور ظالموں نے ان کا سر کاٹ کر ہشام کے پاس دمشق بھیج دیا۔ وہاں یہ سر صدر دروازہ پر معلق رہا۔ اس کے بعد لاش کو سولی دی گئی اور پھر سولی سے اتار کر در کوفہ پر لٹکا دیا گیا۔ اور چار برس تک مظالم کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ لاش کو نذر آتش کر دیا گیا۔

دنیا کہتی ہے کہ واقعۂ کربلا میں اتنے مظالم نہیں ہوئے۔ لشکر یزید بھی تو انسان ہی تھا۔ انسان انسان پر اتنا ظلم نہیں کر سکتا لیکن میں کہوں گا کہ کربلا کی

بات تو چھوڑیئے۔ یہ تو کربلا کے بعد کا واقعہ ہے جب سارے عالم اسلام کے احتجاج کے بعد اتنا بڑا ظلم ہو سکتا ہے تو پوری دنیائے اسلام کی بیعت کے بعد کیا نہیں ہو سکتا۔

ہشام کے بعد ۱۲۵ھ میں ولید بن یزید بن عبدالملک حاکم بنا۔ یہ صرف سوا برس بادشاہ رہا اور اس کے بعد قتل کر دیا گیا۔ لیکن سوا برس میں بھی کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ شکاری کتوں کو ہمراہ لے کر حج بیت اللہ کے لئے گیا۔ خانہ کعبہ کی چھت پر بیٹھ کر شراب پینے کا منصوبہ بنایا جو ناکام ہو گیا۔ اور حرمت کعبہ محفوظ رہ گئی۔ شراب کا یہ عالم تھا کہ حوض کے کناروں سے نمایاں کمی ظاہر ہو جائے۔

ایک مرتبہ تو یہ قیامت کر دی کہ کنیز کو شراب پلا کر ہمبستری کی اور صبح کو عمامہ پہنا کر مسجد میں بھیج دیا کہ مسلمانوں کو نماز جماعت پڑھا دے اور مسلمانوں نے نماز پڑھ لی۔ اب اس کے بعد کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایسے حاکم کو ایسے ہی عوام اور ایسے عوام کو ایسے ہی حاکم کی ضرورت ہے۔ اور جب حاکم کا یہ عالم ہے تو عوام کا کیا عالم رہا ہوگا۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ بے حسی اس منزل پر تھی کہ قرآن سے فال نکالا اور آیت اپنے خلاف نکل آئی تو قرآن مجید کو دیوار پر لٹکا کر اس قدر تیر مارے کہ پارہ پارہ ہو گیا۔ اور کہہ دیا کہ قیامت کے دن اپنے خدا سے کہہ دینا کہ مجھے ولید نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔ اور مجھے محمدؐ کے کھیل تماشے کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔

دنیا کے نظام ہدایت کا حشر دیکھ لیجئے۔ اب نہ حج کی کوئی اہمیت ہے نہ نماز کی۔ نہ قرآن کی کوئی قدر و قیمت ہے نہ کعبہ کی۔ نہ خدا کی کوئی عظمت ہے نہ رسولؐ خدا کی ــــ یہ نتیجہ کس بات کا ہے اگر کل اہلبیتؑ سے دشمنی نہ کی گئی

ہوتی تو آج یہ رنگ نہ ہوتا۔ اہلبیتؑ کا کردار یہ تھا کہ سواریاں ساتھ رہیں اور پیادہ حج کو جائیں۔ پیروں سے تیر نکال لیا جائے اور نماز کے خلوص میں فرق نہ آئے۔ سر تن سے جدا ہو جائے لیکن نوک نیزہ سے تلاوت قرآن ہو۔ حج کو عمرہ سے بدلنا پڑے لیکن حرمت کعبہ محفوظ رہ جائے۔ گلے پر خنجر رہے لیکن صدق رسول اللہ" کا کلمہ رہے۔ رگ گردن سے خون ٹپکے لیکن زمین پر نقش الا اللہ ثبت ہو ــــــ صلوات

کہاں وہ کردار اہلبیتؑ اور کہاں یہ بدکرداری حکام۔ کیا اسلام اسی بدکرداری کا نام ہے اور کیا مالک کائنات نے ایسا ہی دین نازل کیا تھا؟ اور اگر ایسا نہیں ہے تو صاف کہیے کہ اسلام آل محمدؐ کے پاس ہے باقی جو کچھ ہے وہ کھیل تماشا ہے۔ دین و مذہب نہیں ہے۔ کربلا اسی معرکہ کا نام تھا جہاں امام حسینؑ کا نعرہ تھا کہ دنیا لہو و لعب ہے اور یزید کا اعلان تھا کہ اسلام کھیل تماشا ہے۔ اب دنیا کو اختیار ہے چاہے حسینیت کے قدموں میں آجائے اور چاہے یزیدیت کے قدموں میں چلی جائے۔

ولید کے بعد اس کا فرزند یزید بن ولید حاکم ہوا اور اپنے بخل کی بنا پر تین ہی مہینے میں معزول کر دیا گیا۔ بخل کا عالم یہ تھا کہ "یزید ناقص" خطاب ہو گیا تھا۔ سارے علما کی تنخواہیں کم کر دی تھیں۔ سب کے وظیفے بند کر دیئے تھے اور جو کچھ تھا وہ اپنا عیش تھا اور بس۔ ظاہر ہے کہ اس ظلم کو کون برداشت کر سکتا تھا۔ یہ آل محمدؐ پر ظلم نہیں ہے کہ دنیا خاموش تماشائی بنی رہے۔ یہ اپنے شکم کا معاملہ ہے یہاں کون خاموش بیٹھ سکتا ہے۔ یہی حالات تو اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ مرسل اعظمؐ کے بعد اسلام عیش و عشرت کی راہوں پر چل پڑا تھا۔ اور اسے دین و مذہب سے کوئی تعلق نہیں رہ گیا تھا۔

اس دوران چند دنوں کے لئے ابراہیم بن ولید کو بھی حکومت ملی۔ لیکن حالات اس قدر خراب تھے کہ وہ خود ہی حکومت چھوڑ کر فرار ہو گیا۔ یہ بھی ایک فرق ہے بادشاہ دنیا اور نمائندہ رب العالمین میں کہ دنیا کا بادشاہ منصب چھوڑ کر فرار کر سکتا ہے لیکن الٰہی منصب دار فرار نہیں کر سکتا۔ وہ گردن کٹا سکتا ہے لیکن میدان جہاد نہیں چھوڑ سکتا۔

ابراہیم کے بعد ۱۲۷ھ میں مروان بن محمد بن مروان کی حکومت قائم ہوئی اور یہ بنی امیہ کا آخری بادشاہ قرار پایا جس کا خاتمہ سفاح عباسی نے کر دیا۔ اور اقتدار بنی امیہ سے بنی عباس کی طرف منتقل ہو گیا۔ اس بادشاہ کے حکومت کے لئے یہی کافی ہے کہ تاریخ میں اس کا لقب "مروان الحمار" ہے۔ اور حمار کے معنی گدھے کے ہوتے ہیں۔

یہ ہے اقتدار دنیا کا عالم یزید شراب خوار ہے تو وہ بھی خلیفہ ہے۔ ولید فاسق ہے تو وہ بھی خلیفہ ہے۔ یزید ناقص ہے تو وہ بھی خلیفہ ہے۔ مروان حمار ہے تو وہ بھی خلیفہ ہے۔ غرض خلافت ایسی راہوں پر چل پڑی ہے جہاں علم و کردار اور عصمت و سیرت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جو جتنا بڑا بدکار ہو گا وہ اتنا ہی بڑا خلیفۃ المسلمین ہو گا۔ اور مسلمان اتنا بے شرم ہو گا کہ تاریخ الخلفاء میں ان تمام بدکاروں کو جگہ دے گا اور علم کلام میں یہ بحث کرے گا کہ بدکاری سے خلیفہ معزول ہو سکتا ہے یا نہیں۔ یعنی اب اسلام میں یہ بحث نہیں ہے کہ بدکار خلیفہ ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اب بحث یہ ہے کہ معزول ہو سکتا ہے یا نہیں۔ یہ نتیجہ اس بات کا ہے کہ مسلمان یہ بحث نہیں کرتا کہ رسولؐ کو ہذیان گو کہنے سے انسان مسلمان رہ سکتا ہے یا نہیں۔ بلکہ یہ بحث کرتا ہے کہ واقعاً رسولؐ ہذیان بک سکتا ہے یا نہیں تو جہاں رسالت ہی کا مسئلہ صاف نہ ہو وہاں خلافت کا مسئلہ کیسے صاف ہو سکتا ہے۔ صلوات

بنی عباس نے حمایت حق آل محمدؐ کا نعرہ لگا کر اور بنی ہاشم کے بعض افراد کو ساتھ لے کر بنی امیہ کے خلاف محاذ آرائی کی اور بالآخر مروان الحمار کو تہ تیغ کر کے تخت حکومت پر قبضہ کر لیا۔ بنی امیہ کا قتل عام شروع ہو گیا۔ اور جس طرح بنی امیہ نے بنی ہاشم کا خاتمہ کیا تھا اسی طرح چن چن کر ان کا بھی خاتمہ کر دیا گیا۔ ایسے موقع پر خیال تھا کہ آلِ محمدؐ کے حقوق کی رعایت ہو گی اور ان کے نام پر حاصل ہونے والی حکومت ان کا پاس و لحاظ کرے گی۔ لیکن تاریخ گواہ ہے کہ بنی عباس کے مظالم بنی امیہ سے کچھ زیادہ ہی رہے اور اس کا راز یہ تھا کہ بنی امیہ نے کبھی بنی ہاشم کے اعزاز کا اقرار ہی نہیں کیا تھا۔ تو ان کے لئے ذلیل اور رسوا کرنا بہت آسان تھا اور بنی عباس نے تو حکومت ہی بنی ہاشم کے نام پر لی تھی۔ اب اگر بنی فاطمہؑ منظر عام پر رہ جاتے تو بنی عباس کا پوچھنے والا کون ہوتا۔ اس لئے ان لوگوں نے طے کر لیا کہ کسی طرح ان کا خاتمہ کر دیا جائے اور ان کی کوئی نمایاں فرد منظر عام پر نہ رہ جائے۔

امامت کا بھی حسن انتظام دیکھئے کہ جب بنی عباس نے قیادت کی دعوت دی تو صاف لفظوں میں انکار کر دیا اور ساتھ دینے والوں کو بھی منع کیا۔ جس میں سے بعض حضرات نے نہیں مانا اور بالآخر تہ تیغ ہو گئے۔ اور آخر میں یہ اہتمام کیا کہ امام جعفر صادقؑ نے وقت رحلت وصیت نامہ لکھا تو پانچ آدمیوں کو اپنا وصی بنایا۔ جن میں ایک منصور بھی تھا۔ منصور کو حضرت کے انتقال کی خبر ملی تو فوراً حاکم مدینہ کو لکھا کہ جعفر صادقؑ نے جس کو اپنا وصی بنایا ہو اس کا سر قلم کر کے میرے پاس بھیج دے حاکم مدینہ محمد بن سلیمان نے جواب دیا کہ انھوں نے پانچ آدمیوں کو اپنا وصی بنایا ہے ان میں سے ایک آپ ہی ہیں اور ایک میں ہوں۔ ایک عبداللہؑ ایک موسیٰ بن جعفرؑ اور ایک حمیدہ خاتون ہیں۔ منصور یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ اور کوئی جواب نہ دے سکا لیکن دنیا نے دیکھ لیا کہ اللہ والوں کا علم و فضل کیا ہوتا ہے۔ دنیا تدبیریں کرتی

رہتی ہے لیکن کوئی بہانہ نہیں تھا اور امامت لمحوں میں ساری تدبیروں کو فنا کر دیتی ہے ۔ امام جعفر صادق ؑ کے اس عمل نے واضح کر دیا کہ امامت کو سیاست دنیا سے بے خبر نہ سمجھنا۔ ہم دنیا کے سارے حالات سے باخبر ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تمہیں روکنے والا دین نہیں ہے ۔ اور ہمارے ہر اقدام پر دین کا پہرہ ہے ۔ دین کا معاملہ نہ ہوتا تو ہمارے جد سے بڑا صاحب عقل و ہوش کون تھا ۔ آج اسلام کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا ۔ غضب خدا کا کل کے چرواہے اسلام کے حاکم بن جائیں اور وارث رسول ؐ کا سوار خانہ نشین رہے ۔ یہ صرف دین کی حمایت کا مسئلہ تھا ورنہ دنیا دیکھ لیتی کہ ہم کہاں ہوتے اور یہ سلاطین دنیا کہاں ہوتے ۔

منصور کے مظالم کی داستان بہت طویل ہے ۔ ۲۲ سال کی حکومت میں قتل سادات کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا ۔ خون سادات سے گارا بنوایا ۔ سادات کے بچوں کو زندہ دیواروں میں چنوایا ۔ امام جعفر صادق ؑ کو قتل کرنے کی متعدد بار سازش کی ۔ اور بالآخر زہر دلوا دیا ۔ جن لوگوں نے حکومت کی حمایت کی تھی انھیں بھی تہ تیغ کرا دیا ۔ اور یہ واضح کر دیا کہ سلطنت خون چاہتی ہے ۔ جب تک اولادِ رسول ؐ کا قتل نہ ہوگا خلافت رسول ؐ کا حق ادا نہ ہوگا ۔

منصور کے بعد اس کا بیٹا مہدی تخت حکومت پر بیٹھا اور باپ کی جگہ آل محمد ؐ پر ظلم کرنا شروع کیے ۔ یہاں تک کہ اپنے وزیر اعظم یعقوب بن داؤد کو بلا کر حکم دیا کہ قید خانہ میں جتنے علوی سادات ہیں ان کے سردار کو فوراً تہ تیغ کر دے ۔ اور یہ کنیز انعام میں لے لے ۔ یعقوب زیدی فرقے کا آدمی تھا اور سادات سے محبت رکھتا تھا ۔ اسے سخت پریشانی ہوئی کہ بادشاہ کے حکم پر کیوں کر عمل کریں ۔ بالآخر ایک سید کو قید خانہ سے گھر لے آیا ۔ اور وہاں حکم حاکم سے باخبر کیا ۔ سید نے کہا کہ ہم اولاد رسول ؐ ہیں تو رسول ؐ اللہ کو کیا منھ دکھائے گا ۔

یعقوب لرز گیا کہ اللہ کنیز میرے پہلو میں رہے اور اولاد رسول ؐ سامنے قیدی بنی کھڑی رہے ۔ اس نے موقع پا کر انھیں رہا کر دیا کہ تم شہر سے باہر نکل جاؤ ۔ کنیز مہدی کی جاسوس تھی ۔ اس نے فوراً اطلاع کر دی اور سید کو گرفتار کر لیا گیا ۔ تھوڑی دیر کے بعد یعقوب کو طلب کیا گیا ۔ پوچھا گیا کہ تو نے میرے حکم پر عمل کر دیا؟ یعقوب نے عرض کیا سرکار عمل ہو گیا اور سید کو قتل کر دیا گیا ۔ مہدی نے اشارہ کیا اور ایک غلام نے اس سید کو پیش کر دیا ۔ یعقوب بے ہوش ہو کر گر پڑا ۔ ہوش آیا تو مہدی نے کہا کہ تم نے جھوٹ کیوں کہا؟ ۔ کہا امیر مجھے اس کے حال پر رحم آ گیا ۔ کہا اچھا جاؤ تمھیں قتل تو نہیں کروں گا لیکن زندگی بھر قید خانہ میں رہو گے ۔ ارباب عزا ! اب آپ سوچیں جب سید کو قتل نہ کرنے پر یہ سزا ملتی ہے تو خود سادات کی کیا سزا ہوگی ۔

مہدی کے بعد ہادی کا ایک سال کا دور حکومت بھی یونہی گذرا ۔ اس کے بعد سنہ ۱۷۰ھ میں ہارون رشید بادشاہ ہوا اور ۲۳ سال تک حکومت کرتا رہا ۔ اس دوران جتنے مظالم ممکن تھے ۔ آل محمد ؐ پر ڈھائے گئے اور خصوصیت کے ساتھ امام موسیٰ کاظم ؑ کو ہدف مصائب بنایا گیا ۔

سنہ ۱۷۹ھ میں حضرت سے فرزند رسول ؐ ہونے پر بحث کی گئی اور جب امام ؑ نے ثابت کر دیا کہ ہم فرزند رسول ؐ ہیں تو شرمندہ ہو کر مدینہ بھیج دیا لیکن ذہن میں کھٹک رہ گئی اور بالآخر ۲۰ شوال ۱۷۹ھ کو آپ کو مدینہ سے قیدی بنا کر بصرہ بھیج دیا گیا ۔ ۷ ذی الحجہ کو بصرہ پہونچے عیسیٰ بن جعفر حاکم بصرہ کے زندان میں رکھے گئے ۔ عید کا دن آیا ۔ حاکم شراب و کباب میں مصروف ہے اور فرزند رسول ؐ سر جھکائے کھڑے ہیں ۔

اللہ رے انقلاب زمانہ کل امام حسین ؑ کے اہل حرم شام میں پیش ہوئے تھے

اور آج امام موسیٰ بن جعفرؑ بصرہ میں اسی شان سے قیدی ہیں۔ قید خانہ میں عبادت و تلاوت کے علاوہ کوئی مشغلہ نہیں تھا۔ عیسیٰ بن جعفرؑ کردار سے متاثر ہو کر نرمی برتنے لگا تو ہارون نے وہاں سے بغداد بھیج دیا۔ فضل بن ربیع کی نگرانی میں رہے۔ فضل محب آل محمدؐ مشہور تھا لیکن اپنے حالات سے مجبور تھا۔ ایک دن ایک شخص کو بلا کر کہا کہ دیکھو زندان میں کیا نظر آتا ہے۔ اس نے کہا کہ ایک سفید چادر ہے۔ کہا بھائی یہ چادر نہیں ہے یہ امام موسیٰ بن جعفرؑ سجدہ میں ہیں۔ جسم اتنا لاغر ہو گیا ہے کہ اب چادر اور جسد مبارک میں فرق نہیں معلوم ہوتا۔ صبح سے شام تک یونہی سجدہ میں پڑے رہتے ہیں۔ ان پر کیسے سختی کی جائے۔ ہارون کو اطلاع ملی تو سندی بن شاہک کی قید میں منتقل کر دیا۔ اور آخر عمر تک وہیں رہے یہ بڑا ظالم اور جابر انسان تھا۔ امامؑ پر بے حد ظلم کیا کرتا تھا۔ آخر ایک دن ہارون کے اشارہ پر آپ کو انگور میں زہر دے دیا گیا۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے انگور کا حال معلوم ہے۔ لیکن اب میرا وقت آچکا ہے۔ یہ کہہ کر ایک دانہ کتے کے سامنے ڈال دیا۔ وہ کھا کر فنا ہو گیا۔ فرمایا کہ اس زہر کا اثر رفتہ رفتہ ہو گا اور تین دن کے بعد میں دنیا سے رخصت ہو جاؤں گا۔ مسیب بن زید کا بیان ہے کہ جیسا امام نے کہا تھا ویسا ہی ہوا اور تین دن کے بعد حالت غیر ہو گئی۔ سندی نے فوراً علماء و فضلاء کو بلا کر کہا کہ تم لوگ گواہ رہنا کہ انھیں زہر نہیں دیا گیا ہے بلکہ اپنی موت سے دنیا سے جا رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے زہر دیا جا چکا ہے۔ اور میں عنقریب دنیا سے رخصت ہو جاؤں گا۔ سندی نے کہا کہ حقیقت یہی ہے۔ میں شرمندہ ہوں۔ اب آپ اجازت دیجئے کہ میں آپ کی تجہیز و تکفین کا انتظام کروں۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے کسی کی ضرورت نہیں ہے۔ میرا غلام موجود ہے اور میں مدینہ سے کفن لے کر آیا ہوں۔ مسیب کہتے ہیں کہ تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ ایک

جوان آئے اور امامؑ سے لپٹ کر تا دیر روتے رہے۔ دونوں میں صیغۂ راز میں گفتگو ہوئی اور تھوڑی دیر کے بعد امامؑ نے انتقال فرمایا۔ جوان نے غسل و کفن دیا۔ نماز جنازہ پڑھی اور تشریف لے گئے۔ میں نے پوچھا کہ یہ کون جوان تھا تو غلام نے کہا کہ یہ امامؑ کے فرزند علی رضاؑ تھے جو باعجاز تشریف لائے تھے اس لئے کہ امام کے تمام امور امام ہی انجام دیتا ہے۔ اس نے بعد موت کا اعلان عام کیا گیا اور سندی نے جنازہ حمالوں کے حوالے کر دیا۔ جنازہ اٹھانے والے آواز دیتے جا رہے تھے کہ جسے رافضیوں کے امامؑ کا جنازہ دیکھنا ہے وہ اس جنازہ کو دیکھ لے۔ جسر بغداد تک جنازہ پہنچا۔ سلیمان کی نظر پڑ گئی۔ قصر سے دوڑ کر آیا۔ غضب خدا کا۔ فرزند رسولؐ کا جنازہ اور یہ توہین۔ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ میں غسل و کفن کا اہتمام کروں گا۔ یہ کہہ کر بیش قیمت کفن دیا اور اہتمام سے جنازہ اٹھوایا۔ میں کہوں گا اے غریب بغداد آپ کے جنازہ کی توہین ضرور ہوئی لیکن ایک سلیمان تو پیدا ہو گیا۔ جس نے بظاہر بہترین طریقہ سے کفن دیکر جنازہ کو دفن کرا دیا۔ مگر ہائے غریب نینوا۔ بہن موجود، بیٹا موجود، بیٹی موجود لیکن جنازہ جلتی ریتی پر۔ نہ کوئی کفن دینے والا نہ کوئی دفن کرنے والا ـــــ اے امام رضاؑ غریب اپنے باپ کا پرسہ لیجئے۔ مولا آپ وقت آخر سرہانے آ گئے۔ مگر وہ بیٹا کیا کرے جو باپ کے سرہانے بھی نہ آسکا اور باپ ہی اس کے سرہانے آیا۔ میرے لال میں مرنے جا رہا ہوں۔ بیٹا میرے بعد کوفہ اور شام کے بازاروں میں جانا ہو گا۔ بیٹا تیرے ہمراہ سیدانیاں بھی سر برہنہ ہوں گی۔ بیٹا تجھے صبر کرنا ہو گا ـــــ

ارباب عزا! ماہ رجب کی پچیسویں تاریخ تھی جب ہمارا اور آپ کا ساتواں امام ۹ سال کی مسلسل قید برداشت کرنے کے بعد دنیا سے رخصت

ہوگیا۔ مگر عزادارو! بڑا فرق ہے اس قید میں اور دنیا کے تمام قیدیوں میں۔ کربلا کے بعد اہل حرم بھی قید میں رہے۔ عابد بیمار بھی قید میں رہے۔ لیکن رونے والو! سب کی مدت قید تمام ہوگئی۔ بالآخر بازوؤں سے رسیاں کھل گئیں۔ طوق اتر گیا۔ بیڑیاں کٹ گئیں۔ مگر ہائے امام موسیٰ کاظمؑ کہ جسر بغداد پر جنازہ رکھا گیا اور جب تابوت سے چادر ہٹائی گئی تو ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پیروں میں بیڑیاں۔ جسم زنجیروں میں جکڑا ہوا۔ رسولؐ کا وارث جعفر صادقؑ کا فرزند۔ امت کا نگہبان۔ اسلام کا ذمہ دار اور جسم نازنین زنجیروں میں۔

وامحمداہ واعلیاہ واحسیناہ

انا للہ وانا الیہ راجعون

امام علی رضا علیہ السلام

اسم مبارک	علی
لقب	رضا۔ ضامن
کنیت	ابوالحسن
والد ماجد	امام موسیٰ کاظمؑ
والدۂ ماجدہ	نجمہ
ولادت	۱۱ر ذیقعدہ ۱۵۳ھ (جمعہ) مدینہ منورہ
شہادت	۲۳ر ذیقعدہ ۲۰۳ھ طوس
عمر مبارک	پچاس سال
زوجہ	جناب سبیکہ
اولاد	امام محمد تقیؑ
قبر مطہر	مشہد مقدس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ اشرف الانبیاء والمرسلین خاتم النبیین سیدنا ومولانا ابی القاسم محمد وآلہ الطیبین الطاہرین ولعنۃ اللہ علیٰ اعدائھم اجمعین۔ اما بعد فقد قال اللہ الحکیم فی کتابہ الکریم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى

مالک کائنات کا ارشاد ہے کہ بیشک ہدایت کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے اور دنیا و آخرت کا اختیار ہمارے ہاتھوں میں ہے۔

اس ارشاد گرامی نے صاف واضح کر دیا کہ قدرت نے ہر دور میں ہدایت کا انتظام کیا ہے اور تاریخ کے ہر موڑ پر ایک نہ ایک حجت خدا کو معین کیا ہے۔ تاریخ کا کوئی ایسا دور تصور نہیں کیا جا سکتا جب اس کی طرف سے کوئی حجت اور کوئی نمائندہ نہ رہا ہو۔ اور عالم انسانیت کا کوئی عصر سوچا نہیں جا سکتا جب اس نے ہدایت کا کوئی معقول انتظام نہ کیا ہو۔

فرق صرف یہ ہے کہ نیابت کا مزاج ہی ہے کہ ہر شخص اسی کو اپنا نمائندہ بناتا ہے جس سے خود راضی ہوتا ہے اور جس کے اعمال و افعال پر اطمینان رکھتا ہے کہ یہ ہماری مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں کرے گا۔ اور بننے کے بعد بھی انسان اسی وقت تک تسلیم کرتا ہے جب تک نمائندہ اپنا پسندیدہ رہتا ہے اور جہاں سے اس کے اعمال پسندیدگی کے خلاف ہو جاتے ہیں وہیں سے مخالفت و بغاوت شروع ہو جاتی ہے۔ اس سے کوئی مطلب نہیں ہے کہ اس کا عمل صحیح ہے یا غلط وہ صراط مستقیم پر ہے یا غلط راستہ پر۔ اصل مسئلہ تو یہ ہے کہ ہماری

پسندیدگی کے مطابق کام کرتا ہے یا نہیں ــــ؟ مالک کائنات نے بھی کچھ ایسا ہی نظام بنایا ہے اور اس نے بھی اعلان کر دیا ہے کہ جس طرح تم اپنا نمائندہ اسے بناتے ہو جو تمہارا پسندیدہ ہوتا ہے۔ چاہے ساری دنیا اس کی مخالف ہو جائے۔ اسی طرح میں اپنا نمائندہ اسے بناتا ہوں جو میرا پسندیدہ ہوتا ہے چاہے تم سب اس کے مخالف ہو جاؤ۔ مخالفت سے رائے بدلی نہیں جا سکتی اور جب بندہ بندہ کی رائے کا پابند نہیں ہوتا تو خدا بندوں کی رائے کا کس طرح پابند ہو جائے گا۔ یا دوسری لفظوں میں یوں کہا جائے کہ جب تم اپنی پسندیدگی میں میری پرواہ نہیں کرتے تو میں اپنی پسندیدگی میں تمہاری پرواہ کس طرح کروں گا۔ صلوات

یاد رکھو۔ پسندیدگی کا بھی ایک معیار ہے۔ ہر انسان بھی ہر انسان کو پسند نہیں کرتا۔ پسندیدگی کا مسئلہ اتنا ہی عام اور آسان ہوتا تو دنیا میں کوئی فساد ہی نہ ہوتا۔ اور عالم انسانیت میں کوئی جھگڑا ہی نہ اٹھتا۔ یہ تو پسندیدگی ہی کا اختلاف ہے کہ ایک حاکم بنتا ہے دوسرا ناپسند کرتا ہے۔ ایک حملہ کرتا ہے دوسرا ناپسند کرتا ہے۔ ایک گھر میں بیٹھتا ہے دوسرا ناپسند کرتا ہے ایک اقدام کرتا ہے دوسرا ناپسند کرتا ہے۔ غرض کہ ہر منزل پر ایک عمل کرنے والا ہوتا ہے اور ایک ناپسند کرنے والا ہوتا ہے۔ تو کیا تم اپنے سارے اقدامات اسی لئے چھوڑ دیتے ہو کہ شاید کوئی اسے ناپسند نہ کرے۔ اگر تم نے ایسا نظام بنایا ہوتا تو آج دنیا میں زندہ بھی نہ ہوتے۔ نہ جانے کتنی مخلوق ہے جو تمہاری زندگی کو ہی ناپسند کرتی ہے۔ اور کتنے افراد ہیں جو تمہارے وجود ہی کو پسند نہیں کرتے۔ تو کیا ایسے حالات میں تم نے خودکشی کر لی ہے۔ زہر کھا لیا ہے مر گئے ہو۔ فنا ہو گئے ہو ــــ؟ ایسا کچھ نہیں ہے تو تم در پردہ اس بات

سے قائل ہو کہ کسی کی پسند اور ناپسند اپنے فیصلے پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ یہ اور بات ہے کہ اکثر تمہیں خود بھی تجربہ ہوتا ہے کہ ناپسند کرنے والے ہی ٹھیک کہہ رہے تھے۔ اور تمھارا ہی اقدام غلط تھا۔ اور تم اپنے اقدام کی اصلاح بھی کر لیتے ہو —— لیکن اس کے باوجود آغاز کار میں یہ احتمال بھی نہیں دیتے کہ شاید میری ہی پسند غلط ہو۔ اور میں ہی خطا پر ہوں —— تو سوچو جب تمھارے فیصلے میں غلطی ہوتی ہے۔ تم راہ سے بے راہ ہو جاتے ہو۔ تمھاری خطائیں سامنے آجاتی ہیں۔ تمھیں اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا ہے تب تو تم دوسروں کی پسند کی پرواہ نہیں کرتے۔ تو مجھے کیا پرواہ ہو سکتی ہے۔ جس کے فیصلے میں کسی غلطی کا کوئی امکان نہیں ہے اور جسے معلوم ہے کہ کائنات منقلب ہو جائے اس کا فیصلہ غلط نہیں ہو سکتا۔ تم ٹھوکر کھا کر راستہ پر آسکتے ہو۔ میں اپنا فیصلہ نہیں بدل سکتا۔ تم نے تجربہ کر لیا ہے کہ ہم نے جسے پسند کر لیا پھر اسے کبھی معزول نہیں کیا۔ تم نے روز ایک کو پسندیدہ بنایا اور روز ایک کو معزول کیا ہمارے نظام میں معزول کرنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ ہم نے جسے پسندیدہ بنایا اسے بنایا۔ پھر اس میں کوئی ترمیم نہیں کی۔ اور بناتے بھی ہیں تو ایسا بناتے ہیں کہ تمہیں بھی عاجز آکے کبھی رضا ماننا پڑتا ہے۔ کبھی مرتضیٰ ماننا پڑتا ہے

—— صلوات

ہماری پسندیدگی کسی ایک عمل سے متعلق نہیں ہوتی کہ ایک بات پر خوش ہو گئے اور پھر دوسری بات پر ناراض ہو گئے۔ صبح کو خوش رہے اور شام کو ناراض ہو گئے۔ جنگ میں خوش رہے اور صلح میں ناراض ہو گئے۔ صحت میں خوش رہے اور مرض میں ناراض ہو گئے۔ اپنا فائدہ ہوا تو خوش ہوئے اور دوسرے کا مرتبہ ظاہر ہوا تو ناراض ہو گئے ہم جب کسی سے خوش ہوتے ہیں تو پوری

زندگی کے اعمال کو دیکھ کر ماضی۔ حال۔ مستقبل کا جائزہ لے کر اور پھر یوں خوش ہوتے ہیں کہ وہ اٹھے تو خوش بیٹھے تو خوش۔ میدان میں رہے تو خوش گھر میں رہے تو خوش۔ صلح کرے تو خوش۔ جنگ کرے تو خوش۔ دوستوں کے درمیان رہے تو خوش۔ دشمنوں کے درمیان رہے تو خوش۔ حد یہ ہے کہ بیدار رہے تو خوش اور سو جائے تو مرضی ہی اس کے حوالے کر دیتے ہیں۔

—— صلوات۔

ہماری خوشی کا انداز ہی الگ ہے۔ ہم خوش ہو جاتے ہیں تو ایک نیند پر ساری مرضی عطا کر دیتے ہیں۔ اور خوش نہیں ہوتے تو زندگی بھر رضا کی دعا کرنے پر بھی خوش نہیں ہوتے۔ اور زندگی کا کیا ذکر ہے۔ مرنے کے بعد بھی دعائیں ہوتی رہیں تو بھی ہم خوش نہیں ہوتے۔ ہماری نگاہ کردار پر رہتی ہے دعاؤں پر نہیں —— صلوات

ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ خود تم نے کیسی زندگی گذاری ہے اور تمھارا کردار کیا رہا ہے۔ ہمیں اس سے کوئی تعلق نہیں ہے کہ تمھارے مخلصین تمہیں کیا سمجھتے ہیں اور تمہارے بارے میں کیا عقیدہ رکھتے ہیں۔ ہم مخلصین سے مرعوب ہو جاتے تو فرعون اور نمرود کے حق میں خدائی سے دست بردار ہو جاتے شداد کی خاطر اپنی جنت کو فنا کر دیتے۔ قارون کے خزانوں کو آسمان تک بلند کر دیتے۔ لیکن ہم نے ایسا کچھ نہیں کیا اور تم پر واضح کر دیا کہ ہم تمھیں دیکھنا چاہتے ہیں تمھارے مریدوں کو نہیں۔

اور یہی تو فرق تھا اللہ والوں میں اور دنیا والوں میں کہ دنیا والے اسی پر خوش تھے دنیا ہمارے ساتھ ہے۔ عوام ہمارا کلمہ پڑھتے ہیں۔ سکہ ہمارے نام کا چل رہا ہے۔ خطبہ ہمارے نام کا پڑھا جا رہا ہے۔ تخت ہمارا ہے

تاج ہمارا ہے لشکر ہمارا ہے۔ فوج ہماری ہے۔ ملک ہمارا ہے۔ علاقہ ہمارا ہے۔ اب ایک خدا ناراض بھی ہوگیا تو کیا نقصان ہے۔ اور اللہ والے کہہ رہے تھے کہ دنیا ہماری مخالف ہوگئی ہے۔ تخت ہمارا نہیں رہا ہے۔ تاج ہمارا نہیں رہا ہے۔ ملک ہمارا نہیں رہا ہے۔ زمانہ ہمارا نہیں رہا ہے دنیا ہماری نہیں رہی ہے۔ لیکن شکر خدا کا کہ خدا ہمارا ہے۔ خدا نے بھی آواز دی میرے بندے۔ جن لوگوں نے مجھے چھوڑ کر دنیا کو لیا ہے۔ تو سہی انھیں ایسا تباہ کر دوں کہ اپنی مملکت میں بھی نشان قبر ڈھونڈے نہ ملے اور تو نے سب کچھ چھوڑ کر مجھے اپنایا ہے تو تجھے اتنا سربلند کر دوں کہ ظہر کوفہ پر ٹھہرے تو نجف اشرف ہوجائے اور صحرائے بے آب و گیاہ میں رہے تو کربلائے معلیٰ بن جائے۔

ارباب نظر! اس مقام پر یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ آج اہل دنیا اور سلاطین عالم قبروں کے بھی محتاج ہیں اور آپ پوری تاریخ پڑھ ڈالیں کسی کے نشان قبر کا بھی پتہ نہیں ہے۔ کوئی ڈھونڈے بنی امیہ کی قبریں کہاں کوئی تلاش کرے بنی عباس کے سلاطین کس کھنڈر میں سو رہے ہیں۔ اور کوئی آکے دیکھے کل کے غریب الوطن آج کس شان سے آرام کر رہے ہیں۔ اور دنیا کس طرح ان کے مزار کا طواف کر رہی ہے۔ اور میں تو یہاں تک کہنا چاہتا ہوں کہ سلاطین دنیا میں کسی کی قبر کا نشان ملتا بھی ہے اس کی وجہ سے نہیں بلکہ کسی اللہ والے ہی کی وجہ سے ملتا ہے۔ ہارون کی قبر کا پتہ روضۂ رضاؑ سے ملتا ہے ورنہ ہارون کو کون پہچانتا۔ اور اس کی قبر کو کون تلاش کرتا۔ اور عجب نہیں کہ رضائے غریب نے آواز دی ہو کہ یہ سلاطین دنیا کی ہوشیاری تھی کہ بڑی شخصیت کے پہلو میں رہو تاکہ نشان قبر محفوظ رہے لیکن قدرت نے بھی

اپنا انتقام لے لیا کہ جو بھی زیارت رضائے غریب کو جائے گا اس کا فرض ہو جائے گا کہ اگر مظلوم پر صلوات پڑھے تو ظالم پر لعنت بھی بھیجے کہ اگر ظالم و مظلوم ایک منزل پر جمع ہو جائیں تو محبت اور نفرت کا فریضہ بھی بیک وقت ادا ہو جائے۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ جب پروردگار عالم کی پسندیدگی کا معیار دنیا کے معیار سے الگ ہے کہ دنیا اسے پسند کرتی ہے۔ جو اس کی خواہش کا خیال رکھتا ہے اور وقت پر اس کے کام آتا ہے۔ اور رب العالمین اسے پسند کرتا ہے جو اس کی مرضی کا خیال رکھتا ہے اور وقت پر اس کے کام آتا ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جب بھی پروردگار کسی بندے کو پسند کر کے اپنا نمائندہ بنائے گا تو اہل دنیا اس کی مخالفت ضرور کریں گے۔ یہاں پہلے سے ایک نظام تیار ہے اور یہ طے ہو چکا ہے کہ نظام الٰہی کی پابندی نہیں کی جائے گی اور اپنے ذاتی نظام پر عمل کیا جائے گا۔ مالک کائنات نے بھی طے کر لیا کہ تم مخالفت کرتے جاؤ۔ ہم نمائندے بھیجتے جائیں گے۔ تم ستاتے جاؤ ہم ہادی بناتے جائیں گے۔ تم قتل کرتے جاؤ ہم سلسلہ کو قائم رکھیں گے۔ ایک دن تو بہر حال ہماری بارگاہ میں آنا ہے اور وہی دن وہ ہوگا جب کسی حاکم، خلیفۃ المسلمین اور سلطان و بادشاہ کی ضرورت نہ ہوگی۔ اس دن سب کو اپنے امام کے ساتھ آنا پڑے گا۔ اور ہم سلاطین سے بھی سوال کریں گے کہ تمھارا امام کون ہے اور تم کس کی امامت میں رہے ہو۔ تخت و تاج الگ ایک مسئلہ ہے اس کا حساب تو بعد میں ہوگا۔ پہلے یہ تو بتاؤ کہ تمھارا امام کون ہے؟

یہ مسئلہ اتنا نازک ہے کہ قبر ہی سے شروع ہو جاتا ہے۔ ادھر مرے ادھر خلافت گئی، حکومت گئی۔ تخت گیا۔ تاج گیا۔ خزانہ گیا۔ اقتدار گیا۔ جبر و

استبداد گیا۔ قہر و غلبہ گیا۔ اب نکیرین آکر نہیں پوچھتے کہ آپ کی حکومت کتنے رقبہ پر تھی۔ آپ کے مرید کتنے تھے۔ آپ کے خزانہ میں کتنا مال تھا۔ آپ کے کروفر کا کیا عالم تھا ـــ اب تو ایک ہی سوال ہے کہ آپ کا امام کون تھا؟ آپ نے کس کی امامت میں زندگی گذاری ہے اور کس کو اپنا امام تسلیم کیا ہے؟ سوال قبر ہی نے آخرت کا فیصلہ بھی کر دیا کہ وہاں کس کے ساتھ جانا ہے۔ اور کہاں جانا ہے؟ اگر امام صحیح ہے تو جنت ورنہ جہنم کا راستہ تو کھلا ہوا ہی ہے۔ یہی بات امام علیؑ بن موسیٰ الرضاؑ نے مامون رشید سے کہی تھی۔ جب اس نے پوچھا تھا کہ آپ اپنے جد امیرالمومنین علیؑ بن ابیطالبؑ کو قسیم جنت و نار مانتے ہیں۔ اس کی دلیل کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ یہ بات تو بالکل واضح ہے۔ آپ نے پیغمبر اسلامؐ کی حدیث تو سنی ہوگی کہ علیؑ کی محبت ایمان ہے اور علیؑ کی دشمنی کفر ہے! اس نے کہا ہاں سنی تو ہے فرمایا۔ پھر تو جنت و جہنم کی تقسیم ہو گئی۔ جو مومن ہوگا وہ جنت میں جائے گا اور جو کافر ہوگا وہ جہنم میں جائے گا۔

یہ کہہ کر وہاں سے آپ اٹھ کر چلے تو راوی نے کہا فرزند رسولؐ! آپ نے بہترین دلیل قائم کی ہے۔ آپ نے فرمایا یہ دلیل مامون جیسے لوگوں کے لئے ہے ورنہ حقیقت یہی ہے کہ میرے جد صراط پر کھڑے ہوں گے اور ہر گذرنے والے کے بارے میں فیصلہ کریں گے "ھذا الی وھذا الی" اے جہنم یہ میرا ہے اور یہ تیرا ہے۔ جس کو علیؑ اپنا کہہ دیں گے وہ جنتی ہوگا اور جس کو اپنے سے الگ کر دیں گے وہ جہنم میں چلا جائے گا۔ صلوات

مالک کائنات نے جنت و جہنم کا اختیار دیکر یہ بھی واضح کر دیا کہ دنیا کے نمائندوں کے پاس تخت و تاج اور خزانہ و بیت المال ہوتے ہیں اور میرے نمائندہ کے پاس جنت و کوثر، تسنیم، و سلسبیل، حور و غلمان

نعمات و لذات کا اختیار ہوتا ہے۔ سلطنت دنیا موت پر تمام ہو جاتی ہے اور امامت کے اختیارات موت سے شروع ہوتے ہیں۔ جہاں سب خاموش رہتے ہیں وہاں امام بولتا ہے اور جہاں سب نفسی نفسی کرتے ہیں وہاں امام امت کی شفاعت کرتا ہے۔ صلوات

ہم نے جسے پسند کر لیا اس کے کردار کو اتنا طیب و طاہر بنا دیا کہ سلاطین دنیا بھی اس کی چوکھٹ پر سر جھکانے کے لئے مجبور ہو گئے ــــــ کیا تاریخ اس حقیقت کو نظر انداز کر دے گی کہ جن مسلمانوں نے پیغمبر اسلامؐ کے بعد مولائے کائنات کو مشورہ میں شریک کرنے کے قابل بھی نہ سمجھا تھا۔ انھوں نے ہی بارہ سال کے بعد خلافت کا ایک عقدہ تصور کر لیا۔ اور ۲۵ سال کے بعد بیعت کے لئے حاضر ہو گئے۔ اور بے قرار ہو کر کہنے لگے یا علیؑ ہاتھ بڑھایئے۔ ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت کرنا چاہتے ہیں۔ مولائے کائنات نے ہاتھ کھینچ لیا۔ جب کل تم نے مجھے قابل بیعت نہیں سمجھا تو آج بیعت کی کیا ضرورت ہے۔ اور جب قوم کا اصرار بڑھا تو فرمایا۔ یہ بیعت سر راہ بازار میں نہ ہوگی۔ بیعت کرنا ہے تو مسجد پیغمبرؐ میں آؤ۔ منبر رسولؐ کے قریب آؤ۔ جب میں منبر پر بیٹھ جاؤں تب بیعت کرنا۔ مجمع مسجد میں آیا۔ مولائے کائناتؑ منبر پر تشریف لے گئے اور تمام سابق خلفاء کی منزل سے بلند جائے پیغمبرؐ پر بیٹھے اور فرمایا کہ اب بیعت کرو۔ یہاں اس لئے بیٹھا ہوں کہ مجھے پیغمبرؐ کا جانشین سمجھو۔ سلسلہ کا چوتھا نہ سمجھو سلسلے کا چوتھا ہوتا تو چوتھے زینے پر بیٹھتا۔ پیغمبر اکرمؐ کی جگہ پر بیٹھا ہوں کہ دنیا آنکھیں کھول کر دیکھ لے کہ میں سلسلے کا خلیفہ نہیں ہوں۔ بلا فصل جانشین ہوں ـــــ صلوات۔

بیعت ہوئی۔ حکومت ملی۔ امت نے سر نیاز جھکایا۔ اور ۲۵ سال

کے اندرامت کو اپنا حشر معلوم ہوگیا ۔ سر بازار بیعت لینے سے انکار کرکے بتا دیا کہ بیعت کے طلبگار اور ہوتے ہیں اور بیعت کے حقدار اور ہوتے ہیں ۔

مجھے دنیا کی بیعت کی ضرورت نہیں ہے جس کی غرض ہوگی وہ خود آکر بیعت کرے گا۔ تاریخ نے ایسا بے نیاز کردار نہیں دیکھا اور یہ انداز سوائے اللہ والوں کے کسی کا ہو بھی نہیں سکتا۔ یہ استغنا یا مولائے کائنات کے کردار میں دیکھا تھا یا دوبارہ امام علیؑ بن موسیٰ الرضاؑ کے کردار میں دیکھا ہے کہ ظلم و ستم ڈھانے والا بادشاہ بالآخر حالات سے مجبور ہو کر امام علیہ السلام کو مدینہ سے طلب کرتا ہے کہ آپ کو ولی عہد مملکت بنادے اور خود آپ سے التماس کرتا ہے۔

ولی عہدی کے سلسلے میں اکثر لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوگئی ہے کہ مامون امام علیہ السلام کا مخلص تھا اور آپ سے خاص عقیدت رکھتا تھا۔ ضرورت ہے کہ چند لفظیں اس پس منظر کے بارے میں بھی عرض کردی جائیں جن حالات نے مامون کو اس اقدام ولی عہدی پر مجبور کیا تھا۔ اور اس نے امام کے سامنے یہ پیش کش کی تھی۔

یاد رکھیے بنی عباس نے اقتدار پانے کے بعد سے بنی فاطمہؑ پر جو مظالم ڈھائے ہیں ان کی نظیر بنی امیہ کی تاریخ میں بھی نہیں ملتی۔ جو تخت حکومت پر آیا اس کا پہلا فریضہ تھا کہ سادات کو قتل کرے زندہ دیواروں میں چنوائے اور جوان کا سربراہ ہوا سے ہر طرح ذلیل کرے۔ ائمہ معصومینؑ ان حالات سے بخوبی واقف تھے ۔ انہوں نے کبھی اس اقدام کی قیادت نہیں کی جو بنی ہاشم کی طرف سے بنی عباس کے خلاف ہوا۔ سادات کرام کا یہ حال

تھا کہ جب مصائب و شدائد سے عاجز آجاتے تھے تو فوج تیار کرکے اٹھ جاتے تھے اور بالآخر قتل ہو جاتے تھے۔ اور خود ہی قتل نہ ہوتے تھے بلکہ پورے پورے خاندان کو تہہ تیغ کرا دیتے تھے ۔ امام علیہ السلام نے بارہا ان اقدامات سے روکا لیکن جوش کو ہوش کہاں ۔ ادھر حکومت کے ہوا خواہوں کا بھی یہی عالم تھا کہ کچھ تو بنی فاطمہؑ میں پھوٹ ڈالنے کے لئے سیدھے سادے سادات کو بھڑکا کر میدان میں لے آتے تھے اور تہ تیغ کرا دیتے تھے۔ اور کچھ حکومت سے اپنے حالات کا انتقام لینے کے لئے انھیں آلۂ کار بناتے تھے۔ لیکن انھیں ہوش نہیں آتا تھا اور اکثر اوقات تو ایسا ہوا ہے کہ جب معصومین علیہم السلام نے سمجھایا تو اسے حسد اور خاندانی عداوت پر محمول کر دیا۔ اور حملہ کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ ائمہ معصومینؑ نے بھی ان کے مقابلہ میں سکوت فرمایا اور حالات کا جائزہ لیتے رہے۔ ایک مرتبہ تو یہاں تک ہوا کہ ہارون کا نمائندہ عیسیٰ جلودی محمد بن جعفر صادقؑ کی تلاش میں مدینہ تک پہنچ گیا۔ اور امام رضاؑ کے گھر کا محاصرہ بھی کر لیا۔ ہارون کا حکم تھا کہ جو سید ملے اسے قتل کر دینا اور گھر لوٹ لینا۔

جلودی نے گھر میں گھس کر عورتوں کے زیورات لوٹنے کا ارادہ کیا فرزند رسولؐ نے بیحد سمجھایا لیکن اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ آخر آپ نے قسم کھائی کہ میں سارا سامان لاکر دیدوں گا تب وہ ظالم خاموش ہوا۔ اور آپ نے خواتین کے زیورات تک لاکر ظالموں کے حوالے کر دیئے یہ حالات پیش آ رہے تھے لیکن سادات کرام کو ہوش نہ آتا تھا اور انہیں حکومت سے انتقام کی دھن سوار تھی کہ اقتدار ہمارا حق ہے۔ بارہا امام علیہ السلام سے بحث بھی کی۔ جھگڑا بھی کیا۔ اور کبھی کبھی تو حکومت کے آلہ کار بن کر زہر

دینے میں بھی حصہ لیا۔ لیکن یہ امام کا ظرف تھا کہ جملہ حالات کو دیکھتے رہے۔ اور سکوت فرماتے تھے۔ بعض اوقات یہ ضرور فرمادیا کرتے تھے کہ اس اقدام کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔ اس میں پورے خاندان کی تباہی ہے۔ لیکن وہاں کون سننے والا تھا۔ ایک مرتبہ آپ نے غیظ میں آکر زید بن موسیٰؑ بن جعفرؑ سے فرمایا کہ تم نے ہوس حکومت میں لوگوں کے گھروں کو آگ لگا دی ہے۔ یہ بہت برا کام کیا ہے۔ میں قطعاً تم سے راضی نہیں ہوں۔ زید نے کہا۔ آپ نے مجھے پہچانا نہیں میں آپ کا بھائی ہوں ۔ آپ نے فرمایا کہ میرا گنہگاروں سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ جو احکام الٰہی کی مخالفت کرے وہ میرا رشتہ دار نہیں۔ یاد رکھو یہ تمہیں غلط فہمی ہوگئی ہے کہ ذریت فاطمہؑ پر آتش جہنم حرام ہے تو جو چاہو کرو ۔ ذریت فاطمہؑ سے مراد صرف امام حسنؑ اور امام حسینؑ ہیں۔ ان کے علاوہ جو جیسا کرے گا اس کی سزا بھگتنا پڑے گی۔ کسی کو معاف نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ ہمارے جد حضرت علیؑ ابن الحسین نے تو یہاں تک فرمایا ہے کہ سید نیکی کریگا تو ثواب دہرا ملے گا اور وہ برائی کرے گا تو عذاب بھی دہرا ہی ملے گا ۔ یہ تم نے کیا غضب کیا کہ مسلمانوں کے گھروں کو آگ لگا دی اور "زید النار" کے لقب سے مشہور ہوگئے۔ اس کے بعد آپ نے سفارش کرکے حکومت کے انتقام سے آزاد بھی کرا دیا۔ لیکن متوجہ کر دیا کہ اولاد فاطمہؑ کا یہ کردار نہیں ہے۔ وہ نہ حکومت کے طرفدار ہوتے ہیں اور نہ حکومت کے طلبگار۔ حکومت کی غرض ہوتی ہے تو ان کی چوکھٹ پر آجاتی ہے ورنہ وہ خود کسی کی ڈیوڑھی پر نہیں جاتے ۔

ان حالات نے سادات کو باقاعدہ طور پر حکومت تو نہیں دلوائی لیکن حکومت کا سونا جاگنا ضرور حرام کر دیا اور حالات بد سے بدتر ہوتے چلے

گئے۔ ادھر ہارون رشید گھریلو ہنگامہ سے عاجز آکر اپنی حکومت کو دو حصوں پر بانٹ دیا۔ عرب کا حصہ امین کو دیدیا اور عجم کا خطہ مامون کو۔ امین کو لوگوں نے یہ سمجھایا کہ ایک ملک میں دو بادشاہ نہیں رہ سکتے۔ اس نے چاہا کہ مامون کو یہاں بلاکر قتل کرادے اور مطلق العنان بادشاہ بن جائے۔ لیکن مامون نے جواب دیا کہ میرے ملک میں بغاوتیں بہت ہیں۔ میں ملک چھوڑ کر آنے کے لائق نہیں ہوں۔ امین سمجھ گیا کہ مامون نے ہوشیاری سے کام لیا ہے۔ چنانچہ اس نے ایک عظیم فوج مامون کے علاقہ پر حملہ کرنے کے لئے بھیج دی۔ مامون کا سردار لشکر طاہر بن الحسین مقابلہ کے لئے نکلا اور نہایت دلیری سے لڑکر کامیاب ہوا۔ امین نے دوسری فوج بھیجی طاہر نے اسے بھی پسپا کر دیا اور مقابلوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ بالآخر امین کے لشکر کو شکست ہوئی۔ اور طاہر عراق کی سرزمین پر قبضہ کرتا چلا گیا۔ ایک دن وہ بھی آیا کہ امین گرفتار ہوا اور اسے تہ تیغ کر دیا گیا۔

یہ ہے سلطنت دنیا کا انجام کہ بھائی بھائی کے قتل کا درپے ہے عزیز عزیز کے خون کا پیاسا ہے۔ فرشتوں نے کیا برا کہا تھا کہ پروردگار کیا انہیں کو خلیفہ بنائے گا جو روئے زمین پر فساد اور خونریزی کریں۔ پروردگار نے فرما دیا تھا "اِنِّیْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ" جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے۔ یعنی ایسے لوگ خلیفہ ہوں گے تو میرے نہیں ہوں گے۔ اہل دنیا کے ہوں گے۔ میرا خلیفہ صالح مصلح نیک کردار اور بلند افکار ہوگا۔

آغاز تاریخ میں ایک قابیل تھا اور یہاں تو سب ہی قابیل ہیں۔ ہابیل کا تلاش کرنا مشکل ہے۔ قابیل کے ملنے میں کوئی زحمت نہیں ہے۔ اس تاریخ ملوکیت کو ذرا تاریخ امامت سے ملا کر دیکھئے تو فرق سمجھ میں آجائیگا۔

یہاں باپ نے دو بھائیوں کو دو علاقوں کا حاکم بنایا ہے اور قتل و خون کا سلسلہ شروع ہے اور وہاں نانا نے دونوں نواسوں کو ایک ملک کا سردار اور ایک دنیا کا امام بنایا ہے اور کردار میں اتنا اتحاد ہے کہ رسولؐ کی زلفیں دونوں بھائیوں کے ہاتھوں میں ہیں اور یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک ایک طرف لے جائے اور دوسرا دوسری طرف لے جائے۔ قدرت آواز دے رہی ہے۔ پہچان لو ہمارا نمائندہ کتنا پاکیزہ کردار ہوتا ہے۔ اور تمھارا نمائندہ کتنا بدنفس اور بدکار ہوتا ہے۔

مامون نے امین کو قتل تو کرا دیا لیکن بغاوتوں کا ایک نیا طوفان ابل پڑا۔ سادات کرام کا انتقام ایک طرف۔ امین پرستوں کے حملے دوسری طرف اور پھر اپنے سرداران لشکر کی بغاوت الگ ــــ مامون بدحواس ہوگیا کہ ایسے حالات میں حکومت کیسے چلے گی۔ بالآخر عاجز آکر اپنے وزیر خاص فضل سے مشورہ کیا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ فضل نے کہا کہ بہترین ترکیب یہ ہے کہ سادات میں سے کسی کو ولی عہد بنا لیجئے۔ مخالفت کا ایک طوفان تو دب ہی جائے گا۔ اس نے مدتوں اس مسئلہ پر غور کیا۔ بنی عباس سے مشورے کئے پوری فہرست پر نظر کی۔ بنی عباس میں کوئی ولی عہدی کا اہل تو نہیں ہے۔ اور پھر جب حضرت امام رضاؑ پر نظر ٹھہری تو ان کے علم و کردار کا بنی عباس سے موازنہ کیا کہ کل جب اعتراضات ہوں گے تو ان کا کیا جواب دیا جائیگا اور یہ سب طے کرکے امام کے پاس پیغام بھیج دیا۔ امام مدینہ میں تشریف فرما تھے۔ قبر رسولؐ کی مجاوری فرما رہے تھے۔ عبادت الٰہی میں زندگی گذار رہے تھے۔ ادھر ایک عظیم قافلہ پہنچ گیا اور حضرت کو وطن چھوڑنے پر مجبور کیا۔ آپ مدینہ سے نکلے لیکن اس شان سے جیسے حسینؑ وطن چھوڑ رہے ہوں۔

گریہ و زاری کا عالم۔ کہرام برپا۔ بار بار روضۂ رسولؐ میں جاتے ہیں۔ اور باہر نکل آتے ہیں۔ جد بزرگوار گواہ رہیے گا مجبوراً جا رہا ہوں۔ میرا جانے کو جی نہیں چاہتا۔ بھلا آپ کی قبر کو چھوڑ کر کہاں جاؤں گا۔

نکلے تو در و دیوار مدینہ کو بہ حسرت دیکھتے ہوئے۔ فرمایا کہ یہ میرا آخری سفر ہے۔ اب اس سفر سے لوٹ کر آنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ آپ اندازہ کریں کہ اہل مدینہ کا کیا عالم رہا ہوگا۔ مدینہ سے رخصت ہو کر سیرت امام حسینؑ پر چل کر مکہ آئے۔ خانہ خدا کو وداع کیا۔ طواف کرکے وہاں سے رخصت ہوئے۔ امام محمد تقیؑ کی عمر ۶ برس کی تھی۔ خانہ خدا سے لپٹ گئے۔ میں تو حرم خدا سے نہ جاؤں گا۔ فرمایا فرزند مشیت الٰہی پر نظر رکھو فوراً باپ کی خدمت میں آگئے۔ بابا جان اگر مرضی پروردگار یہی ہے کہ ہم غریب الوطنی کی زندگی گذاریں اور حرم الٰہی سے دور رہیں تو میں راضی بہ رضا ہوں۔ قافلہ چلا اور راجنبی راستوں سے چلا تاکہ چاہنے والے روکنے نہ پائیں۔ مکہ سے رخصت ہو کر نیشاپور پہنچے۔ وہاں ایک شخص کے مکان میں قیام فرمایا۔ ایک بادام کا درخت لگایا جو فوراً بار آور ہوگیا اور اس سے بے شمار مریضوں نے فائدہ اٹھایا۔ ایک چشمہ خشک ہوگیا تھا اسے جاری فرمایا اور وہ "چشمۂ رضا" کے نام سے موسوم ہوگیا۔ وہاں سے چل کر شہر خراسان پہنچے۔ نماز ظہر کا ہنگام تھا۔ وضو کے لئے پانی نہ مل سکا تو ایک چشمہ جاری فرمایا جو آج تک موجود ہے۔ اور لوگ اس سے مستفیض ہو رہے ہیں۔ خراسان سے چل کر طوس پہنچے جہاں پتھر کے ظروف بنانے کا رواج تھا۔ پہاڑ کے قریب جا کر دعا فرمائی وہ نرم ہوگیا اور لوگوں نے مقام فخر میں یہ کہنا شروع کر دیا کہ داؤد کے لئے لوہا نرم

ہوا تھا اور ہمارے لئے امامؑ نے پتھر کو نرم کر دیا ہے ـــــ طوس سے سناباد تشریف لائے اور ہارون کی قبر کے پاس اپنی قبر کی جگہ معین فرمائی اور بالآخر دارالحکومت مرو میں نزول اجلال فرمایا۔ مامون نے عظیم الشان استقبال کیا۔ اور دو تین دن کے آرام کے بعد خلوت میں بلا کر کہا کہ آپ کو ولی عہد بنانا چاہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے گوشہ نشین رہنے دے مجھے حکومت کی کوئی غرض نہیں ہے۔ اس نے کہا کہ یہ عہدہ تو آپ کو لینا ہی پڑے گا۔ آپ نے قبول فرمایا اور بارگاہ الٰہی میں دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے۔ پروردگار گواہ رہنا میں مجبوراً اس عہدہ کو قبول کر رہا ہوں۔ میرے لئے تیری ولایت سے بہتر کوئی ولایت نہیں ہے۔ اب مجھے اپنے دین پر قائم رکھنا اور اپنی شریعت کی خدمت کی توفیق عطا فرمانا۔

مورخین کا بیان ہے کہ حضرت نے بار بار ولی عہدی سے انکار کیا۔ اور جب کئی روز گذر گئے تو مامون نے پوچھا آخر اس کی وجہ کیا ہے کہ آپ میری ولی عہدی قبول نہیں فرماتے۔ آپ نے فرمایا میں نے اپنے آباء طاہرینؑ سے سنا ہے کہ ولی عہدی مجھے نہ ملے گی۔ اور میں تیری زندگی ہی میں زہر دغا سے شہید کر دیا جاؤں گا۔ مامون نے کہا کس کی مجال ہے جو میرے ہوتے ہوئے آپ کو زہر دے سکے۔ آپ نے فرمایا کہ مصلحت ہوتی تو میں قاتل کا نام بھی بتا دیتا لیکن اس وقت مصلحت نہیں ہے ـــــ یہ ہے امامؑ کا علم اور یہ ہے امامؑ کی بے نیازی۔ قدرت کا انتقام کتنا شدید ہوتا ہے کہ حکومت خوشامد کر رہی ہے۔ اور امامت تخت و تاج کو ٹھوکر لگا رہی ہے۔

آخر مامون نے جھنجھلا کر کہا کہ آپ اپنے انکار سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ میں بہت زاہد و پارسا ہوں اور بادشاہ اتنا عاجز ہے کہ مجھے ولی عہد تک نہیں

بنا سکتا۔ آپ نے فرمایا کہ ایسا نہیں ہے لیکن تو بھی تو ولی عہد بنا کر یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ دنیا سے مجبوراً کنارہ کش ہیں ورنہ جیسے ہی عہدہ مل جاتا ہے فوراً دوڑ پڑتے ہیں۔ امامؑ کے اس جواب پر مامون آگ بگولہ ہو گیا اور کہنے لگا کہ اب اگر آپ نے انکار کیا تو میں آپ کو قتل کرا دوں گا۔ آپ نے فرمایا کہ اگر بات اس منزل تک پہنچ گئی ہے تو میں حاضر ہوں لیکن شرط یہ ہے کہ امور مملکت میں دخل نہیں دوں گا۔ اور حکم خدا و رسولؐ سے مشورے دیتا رہوں گا۔ یہ ہے اتحاد کردار کہ جو انداز تاریخ میں پہلے علیؑ کا تھا وہی انداز اس علیؑ کا ہے۔ کیوں نہ ہو اس خاندان میں سب محمدؐ ہیں اور سب علیؑ ہیں۔ یہاں اول و آخر میں کوئی فرق کردار نہیں ہے۔

ولی عہدی کا اعلان ہوا۔ یکم رمضان ۲۰۱ھ کو دربار عام آراستہ ہوا امامؑ کے دست اقدس پر بیعت ہوئی رضا کے لقب سے یاد کئے گئے۔ بنی عباس کا لباس سیاہ سے سبز بنایا گیا۔ لوگوں نے نذرانے پیش کئے۔ شعراء نے قصیدے پڑھے۔ امامؑ کے نام کا سکہ چلا اور قدرت نے آواز دی۔ دنیا کے بیہوشو! اب ہوش میں آ جاؤ۔ اور میرے نمائندہ کا اقتدار دیکھو۔ یہ منظر عام پر آ جائے گا تو حکومت تمہاری ہوگی۔ اور سکہ اس کے نام کا ہوگا۔

بنی عباس میں ایک کھلبلی مچ گئی۔ لوگوں نے کہنا شروع کر دیا کہ مامون نے معاذ اللہ ایک ان پڑھ آدمی کو ولی عہد بنا دیا ہے۔ مامون نے امامؑ کو دربار میں طلب کیا اور ایک خطبہ پڑھنے کی فرمائش کی۔ امامؑ نے خطبہ پڑھا۔ اہل دربار ششدر رہ گئے۔ اور پھر علمی مجلسوں کا سلسلہ قائم ہو گیا۔ آئے دن نئے نئے اعتراضات اور امامؑ کے جوابات تھے ـــــ یہی ایک مصلحت تھی۔ جس کی بنا پر امامؑ نے ولی عہدی قبول کی تھی کہ اس طرح حکومت کے سہارے اسلامی

علوم کے نشر و اشاعت کا موقع مل جائے گا ورنہ کہاں علیؑ کا لال اور کہاں تخت حکومت۔ کہاں محمدؐ کا وارث اور کہاں مامون کی ولی عہدی۔

محمد عیسیٰ یقطینی کا بیان ہے کہ امام رضاؑ سے دریافت کئے جانے والے سوالات کو اکٹھا کیا گیا تو ان کی تعداد ۱۸ ہزار تھی۔ آئے دن نئے نئے سوالات اور نئے نئے مناظرے۔ تمام مباحثات کے نقل کرنے کا محل نہیں ہے۔ صرف دو ایک واقعات کی طرف اشارہ کر دینا کافی ہے۔

مامون کے دربار میں ایک لامذہب انسان وارد ہوتا ہے اور طرح طرح کے اعتراضات کرتا ہے۔ دربار جواب سے عاجز ہے اور بالآخر امام رضاؑ کے سامنے مسئلہ پیش کیا جاتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ بھائی کیا پوچھ رہا ہے۔ اس نے کہا کہ آپ کا خدا کیسا ہے اور کہاں ہے۔ ؟

آپ نے فرمایا تو خدا کے معنی ہی نہیں سمجھتا۔ خدا مخلوق نہیں ہے۔ خالق ہے۔ کیسا اور کہاں یہ مخلوق کے صفات ہیں وہ تمام کیفیات کا خالق اور تمام مکانات کا پیدا کرنے والا ہے۔ اسے کون سا مکان اپنے احاطہ میں لے سکتا ہے۔ اور کس جگہ کی مجال ہے کہ اس پر حاوی ہو سکے۔

اس نے کہا کہ پھر صاف کہئے کہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ جو چیز حواس سے باہر ہو اس کے وجود کا اقرار نہیں کیا جا سکتا۔ آپ نے فرمایا کہ یہی تو مجھ میں اور تجھ میں فرق ہے۔ تو حواس سے باہر ہونے پر انکار کرتا ہے اور ہم اسی پر اقرار کرتے ہیں کہ حواس کے قبضہ میں نہیں آتا ورنہ بندہ ہو جاتا، خدا نہ رہ جاتا۔

اس نے کہا اچھا یہ بتایئے کہ وہ کب سے ہے۔ ؟ آپ نے فرمایا کہ کب نہیں تھا کہ میں بتاؤں کب سے ہے۔ یہ سوال تو اس کے بارے میں ہوتا ہے جو کبھی نہ رہا ہو اور جس کے نہ رہنے کے بارے میں کوئی علم نہیں ہے۔ اس کے

بارے میں یہ عقیدہ رکھو کہ ہمیشہ سے ہے۔ کب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس نے کہا خیر پہلے یہی بتایئے کہ اس کے ہونے ہی پر کیا دلیل ہے ؟ آپ نے فرمایا کہ لاکھوں دلیلیں ہیں۔ خود تیرا وجود ہی اکیلی دلیل ہے کہ جب تو اپنے جسم کے طول و عرض پر قادر نہیں ہے تو یہ علامت ہے کہ یہ سب کسی اور کے اختیار میں ہے۔ پھر پوری کائنات، چاند سورج زمین، آسمان سب پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ ان کا کوئی خالق ہے اور یہ بغیر خالق کے پیدا نہیں ہوئے۔

اس نے کہا اچھا اگر ہے تو دکھائی کیوں نہیں دیتا۔ آپ نے فرمایا کہ دکھائی دینا مخلوق کی شان ہے۔ خالق کی شان نہیں ہے۔ اس کی کوئی جگہ بھی نہیں ہے کہ اسے دیکھا جا سکے۔ اس میں کمی زیادتی کا بھی امکان نہیں ہے۔ وہ دیکھنے سننے میں آنکھ کان کا بھی محتاج نہیں ہے۔

اس نے کہا کہ عجیب بات ہے کہ دیکھتا سنتا ہے اور آنکھ کان نہیں ہیں یہ عجیب قسم کا خدا ہے ؟ آپ نے فرمایا کہ بیشک عجیب قسم ہے۔ اس کا قیاس مخلوقات پر نہیں ہو سکتا۔ آنکھ کان کا محتاج ہونا مخلوقات کا کام ہے یہ خالق کی شان نہیں ہے۔

روایت کہتی ہے کہ دہریہ نے سوالات تو بیشمار کئے لیکن اتنا انصاف پسند تھا کہ جب ہر طرح سے مطمئن ہو گیا تو حضرت کے دست حق پرست پر مسلمان ہو گیا۔

یہ تھا اللہ والوں کا کام اور اس کے بنائے ہوئے نمائندوں کا طرز عمل۔ یہاں تخت و تاج کا مسئلہ نہیں ہے یہاں دین و مذہب کے مسائل ہیں۔ تخت و تاج کو لے کے عاجز ہو جانا اہل دنیا کا کام ہے اور سب

کچھ ترک کر کے کلمہ پڑھوا لینا نمائندگان پروردگار کا کام ہے۔

مامون یہ حالات دیکھتا رہا اور ایک طرف تو خوش ہوتا رہا کہ حریفوں کی نظر میں عزت بھی بڑھ رہی ہے اور اغیار کی نگاہ میں عزت بھی بچ رہی ہے۔ کہ اگر یہ نہ ہوتے تو ہلاک ہی ہو جاتا۔ اور بعض اوقات خود بھی عجیب و غریب سوالات کرتا تھا۔ عصمت انبیاء کے بارے میں اس کے سوالات مشہور ہیں۔

ایک مرتبہ دریافت کرتا ہے کہ فرزند رسولؐ! ایک مرد کو چار عورتوں کی اجازت دی گئی ہے تو ایک عورت کو چار مردوں کی اجازت کیوں نہیں دی گئی ___؟ آپ نے فرمایا کہ اس طرح نسل مشکوک ہو جاتی اور کوئی شجرہ طے نہیں ہو سکتا۔ ہر پیدا ہونے والا یہ شبہ کرتا کہ وہ کس باپ کا بیٹا ہے اور پھر اللہ نے خلقت میں بھی عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ رکھی ہے اب اگر نظام الٹ گیا تو ایک پوری خلقت کنواری ہی رہ جائے گی۔ اور یہیں سے یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا کہ اسلام میں زنا کیوں حرام ہے؟ زنا میں نسب طے نہیں ہو سکتا اور اسلام یہ چاہتا ہے کہ آنے والے کے نسب کا صحیح علم رہے تاکہ میراث وغیرہ کے مسائل مشکوک نہ ہونے پائیں۔ جہاں نسب مشکوک ہوتا ہے وہاں میراث کے مسئلہ میں جھگڑا اٹھ جاتا ہے۔

یہ سب باتیں اپنی جگہ پر ہیں لیکن مامون ان کمالات کو برداشت بھی نہ کر سکتا تھا۔ اسے ہر آن خطرہ تھا کہ دنیا کا رخ علیؑ رضا کی طرف نہ ہو جائے چنانچہ ایک دن یہ طے کر لیا کہ حضرت کو زہر دے کر ختم کرا دیا جائے۔ اور مامون نے یہ منصوبہ بنا لیا ادھر حضرت نے ہرثمہ کو بلا کر فرمایا کہ میرا وقت قریب آچکا ہے۔ عنقریب یہ ظالم مجھے انگور میں زہر دے گا اور انگور کو زہر آلود دھاگے میں پرو دیا جائے گا۔ پھر ہاتھوں میں زہر مل کر انار نچوڑا

جائے گا اور مجھے پلایا جائے گا۔ میں دو روز کے بعد دنیا سے رخصت ہو جاؤں گا۔ دیکھو ہرثمہ تم میرے قریب نہ آنا اور جب میرا انتقال ہو جائے تو انتظار کرنا میرا فرزند آکر غسل و کفن دے گا۔ اس کے بعد تم اندر آنا۔ مامون میرا اہتمام کرنا چاہے تو لیکن کہہ دینا کہ اگر جنازہ کو ہاتھ لگایا تو عذاب الٰہی نازل ہو جائے گا۔ ہارون کے قریب میری قبر تیار ملے گی۔ اس میں مجھے دفن کر دینا۔ اور جب مامون سرگذشت پوچھے تو میرے فرزند کی آمد اور زہر کی تیاری کا پورا قصہ بیان کر دینا۔

وقت گذرا۔ مامون نے حضرت کو دربار میں طلب کیا۔ ہرثمہ نے پیغام پہنچایا۔ آپ نے فرمایا میرا وقت آگیا ہے۔ دربار میں آئے اس نے انگور پیش کیے۔ آپ نے انکار فرمایا۔ اس نے کہا کہ اس سے بہتر انگور ممکن نہیں ہیں آپ نے فرمایا کہ جنت میں اس سے بہتر ہیں۔ اس نے کہا کہ آپ میری طرف سے مشکوک ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ میرا وقت آچکا ہے۔ یہ کہہ کر دو ایک دانے تناول فرمائے۔ اور اٹھ کر چل دیئے۔ مامون نے پوچھا کیا ارادہ ہے فرمایا جہاں تو نے بھیجا ہے وہاں جا رہا ہوں۔ بیت الشرف میں آکر کروٹیں بدلتے رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد انتقال فرمایا۔ ہرثمہ کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ ایک خیمہ نصب ہے اور اس میں سے غسل و کفن دینے کی آوازیں آرہی ہیں۔ غسل و کفن تمام ہوا۔ دروازہ خود بخود کھل گیا۔ میں نے مامون کو اطلاع دی۔ اس نے تجہیز و تکفین کا ارادہ کیا۔ میں نے وصیت کا ذکر کیا۔ اس نے کہا اور کیا کہا ہے۔ میں نے کہا کہ انگور کا پورا واقعہ بیان کیا ہے۔ مامون بوکھلا گیا اور کہنے لگا کہ مجھ پر رسولؐ کی لعنت۔ علیؑ کی لعنت۔ حسنؑ و حسینؑ کی لعنت . . . . . . یہ میں نے کیا غضب کیا خیر دیکھو ہرثمہ کسی سے اس واقعہ کو بیان نہ کرنا۔ حکومت کی طرف سے اعلان عام کرا دیا

گیا کہ ولی عہد مملکت کا انتقال ہو گیا ہے تمام لوگ جنازے میں شرکت کریں۔ جنازہ تیار ہوا۔ اہتمام سے اٹھا اور ہارون کی قبر کے قریب ایک قبر تیار ملی اس میں رکھا گیا۔ قبر خود بخود بند ہو گئی۔ اور زہرؑا کا لال اپنی جدہ ماجدہ کی خدمت میں پہنچ گیا۔ اللہ رے انقلاب زمانہ یہ دامادی یہ محبت۔ یہ ولی عہدی اور سال بھر کے اندر یہ ظلم ـــــ خیر حکومت نے پردہ پوشی کے لئے سہی جنازہ تو اٹھوایا۔ اہتمام سے میت دفن تو ہو گئی۔ کم از کم وہ تو نہیں جو باپ کے ساتھ بغداد کے پل پر برتاؤ کیا گیا تھا ـــــ اور کم از کم وہ سلوک تو نہیں ہوا جو کربلا میں فرزند فاطمہؑ کے ساتھ کیا گیا تھا۔

ارباب عزا! روایت بیان کرتی ہے کہ امامؑ کی ایک بہن حضرت فاطمہ تھیں جنھیں معصومۂ قم کہا جاتا ہے۔ عرصے سے بھائی کی خبر نہ ملی۔ تو اشتیاق ملاقات میں وطن سے چلیں۔ قم کے قریب پہونچیں تو اشراف قم کو اطلاع ملی کہ امامؑ کی بہن بھائی سے ملنے آرہی ہیں ـــــ سارا شہر استقبال کے لئے باہر نکل پڑا۔ لیکن آج استقبال کا انداز نرالا ہے۔ ہاتھوں میں سیاہ پرچم۔ جسم پر سیاہ کپڑے۔ پرسے کی مکمل تیاریاں۔ سواری قم کے قریب پہنچی۔ اشراف نے بڑھ کر استقبال کیا۔ معصومہ نے گوشۂ محمل سے دیکھا۔ سیاہ پرچم نظر آئے۔ سیاہ پردے دکھائی دیئے۔ بیتاب ہو گئیں۔ ارے بھائیو! یہ استقبال کا کون سا انداز ہے۔ خدا رکھے میرا بھائی ولی عہد مملکت ہے۔ کیا ولی عہد مملکت کی بہن کا استقبال یوں ہی کیا جاتا ہے۔ یہ تم نے کیا طریقہ اختیار کیا ہے۔ مجھے ہول آرہا ہے۔ جلدی بتاؤ میرے بھائی کا کیا عالم ہے۔ لوگوں نے عرض کی بی بی! ہم آپ کو آپ کے بھائی کا پرسہ دینے کے لئے آئے ہیں۔ آپ کے بھائی نے انتقال فرمایا۔ یہ سننا تھا کہ غش کھا گئیں۔ بیمار ہو گئیں

انتقال فرما گئیں اور آگے نہ بڑھ سکیں ـــــ یہ ہے بھائی کی محبت کہ مرنے کی خبر سنی اور برداشت نہ کر سکیں۔ اور دنیا سے انتقال فرما گئیں ـــــ

ارباب عزا! کیا کہنے کی ضرورت ہے۔ کہئے تو عرض کروں کہ معصومہ قم آپ بڑی خوش نصیب ہیں۔ بھائی نے عالم غربت میں انتقال کیا۔ مگر جنازہ دھوم سے اٹھا۔ پرسہ دینے والے آئے۔ تعزیت پیش کرنے والے جمع ہوئے مگر ہائے وہ بہن جو بلندی سے دیکھ رہی ہے کہ بھائی کے گلے پر شمر کا خنجر چل رہا ہے اور کوئی نہیں ہے جس سے فریاد کرے۔ ایک بیکسی کا عالم ہے اور ایک بے بسی کی دنیا۔ آواز دے رہی ہیں۔ او پسر سعد میرا ماں جایا ذبح ہو رہا ہے۔ اور تو کھڑا دیکھ رہا ہے۔ اور جب بھائی کے اشارہ پر پلٹ کر خیمہ میں آئیں تو پرسہ کا نیا انداز ـــــ خیموں میں آگ۔ سروں سے چادریں۔ سکینہ کے منہ پر طمانچے۔ عابد بیمار کا بستر۔ ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پیروں میں بیڑیاں۔ گلے میں طوق خاردار۔ سیدانیوں کے بازوؤں میں رسیاں سر برہنہ خواتین۔ بلوائے عام۔ واجداہ واعلیاہ واحسیناہ۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون

امام محمد تقی علیہ السلام

اسم مبارک	محمد
لقب	تقی۔ جواد
کنیت	ابو جعفر
والد ماجد	امام علی الرضاؑ
والدہ ماجدہ	جناب سبیکہ
ولادت	۱۰ رجب المرجب ۱۹۵ھ (جمعہ) مدینہ منورہ
شہادت	۲۹ ذیقعدہ ۲۲۰ھ سہ شنبہ
عمر مبارک	۲۵ سال
قبر مطہر	کاظمین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ اشرف الانبیاء والمرسلین خاتم النبیین سیدنا ومولانا ابی القاسم محمد وآلہ الطیبین الطاہرین ولعنۃ اللہ علیٰ اعدائہم اجمعین اما بعد فقد قال اللہ الحکیم فی کتابہ الکریم ـــــــ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى

ارشاد جناب احدیت ہے "بیشک ہدایت کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے اور دنیا و آخرت کا اختیار ہمارے ہاتھوں میں ہے۔

اس ارشاد نے صاف واضح کر دیا کہ مالک کائنات نے ہر دور میں ہدایت کا انتظام کیا ہے۔ اور کوئی دور ایسا نہیں چھوڑا جس میں کوئی نہ کوئی ہدایت کا بند و بست نہ کیا ہو۔ کبھی صامت کے ذریعہ ہدایت کی کبھی ناطق کے ذریعہ کبھی کتاب نازل کی کبھی صحیفہ اتارا ـــــ کبھی کسی گھر کو ہدایت بنایا کبھی کسی بشر کو ـــ غرض کہ ہدایت کے جس قدر انتظامات ممکن تھے کوئی ایک انتظام بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔ اور زندگی کے ہر ایک موڑ پر ایک نہ ایک ہادی و راہنما ضرور معین کیا گیا ـــــ کتابوں اور صحیفوں کے ساتھ ہمیشہ یہ لحاظ رکھا گیا ہے کہ کوئی صحیفہ ہوا میں نہیں اڑایا گیا۔ اور کوئی کتاب فضا پر نہیں نقش کی گئی بلکہ جب کوئی صحیفہ اتارا گیا تو کسی نبی پر اور جب کوئی کتاب نازل کی گئی تو کسی رسول پر مصلحت پروردگار کو پروردگار جانتے لیکن اتنی بات ضرور واضح ہو جاتی ہے کہ اگر صحیفہ کو ہوا میں اڑا دیا جاتا اور کتاب کو فضا پر نقش کر دیا جاتا۔ الفاظ قوم تک پہنچ جاتے لیکن معانی کا ذمہ دار کون ہوتا ـــــــ

مقصود پروردگار صرف الفاظ ہی نہیں ہیں۔ اس کا منشاء فقط یہ نہیں ہے

کہ قوم الفاظ کو حفظ کرے اور ہدایت پا جائے۔ اس نے توریت کی تختیاں بھی اتاری ہیں تو کسی امتی کے ہاتھ پر نہیں بلکہ کوہ طور پر جناب موسیٰ کو بلا کر ان کے حوالے کی ہیں۔ تاکہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ ہمارا مقصود الفاظ اور نقوش نہیں ہیں۔ ہمارا مقصود معانی ہیں اور ہم یہ چاہتے ہیں کہ عالم انسانیت ان الفاظ کے معانی کو پہچانے۔ اور پھر انھیں پر عمل کرے۔ الفاظ تو فقط معانی تک پہونچنے کا ذریعہ ہیں۔ ورنہ جب معانی کے بغیر [illegible] اسلام نہیں ہو سکتا تو ساری کتاب کیوں کر ہدایت بن سکتی ہے۔ قدرت کے اس انتظام نے امت اسلامیہ کی آنکھیں کھول دی ہیں۔ اور علمار اسلام کو یہ اقرار کرنا پڑا ہے کہ مالک نے قرآن حکیم کو قلب مرسل اعظمؐ پر اسی لئے اتارا ہے کہ دنیا حضور کی زبان فیض ترجمان سے الفاظ قرآن لے اور حضور کے قلب اقدس سے معانی کا استفادہ کرے۔ وہ الفاظ الفاظ نہیں ہیں جو حضور کے ذہن مبارک سے نکلیں اور وہ معانی معانی نہیں ہیں جو حضور کے ذہن مبارک سے برآمد نہ ہوں۔ قرآن اپنی حقیقت میں حضور کی زبان کا بھی محتاج ہے اور حضور کے دماغ کا بھی۔ اب اگر اس زبان میں فرق پیدا ہو جائے تو الفاظ قرآن بے اعتبار ہو جائیں۔ اور اگر اس ذہن پر بیماری کا غلبہ ہو جائے تو معانی قرآن کا اعتبار نہ رہ جائے۔ شاید انھیں معانی سے نجات حاصل کرنے کے لئے حضور کے ذہن اقدس پر حملہ کیا گیا تھا کہ جب تک ان کا ذہن معطل نہ کیا جائے گا اس وقت تک اپنے ذہن کا اعتبار نہ پیدا ہو سکے گا۔

ادھر قدرت نے واضح کر دیا کہ اگر تم نے رسولؐ کے دماغ پر حملہ کیا تو اس کا کچھ نہ بگڑے گا۔ تم معانی قرآن سے محروم ہو جاؤ گے اور تمھارے پاس فقط الفاظ کا ذخیرہ رہ جائے گا ـــــ حسبنا کتاب اللہ میں الفاظ

ہی الفاظ ہیں معانی نہیں ہیں۔

قدرت کے انتظام نے اس مسئلہ کو بھی واضح کر دیا کہ مرسل اعظمؐ نے پروردگار عالم سے الفاظ بھی لئے ہیں اور معانی بھی۔ اس نے قلب پیغمبرؐ پر الفاظ معانی کے ساتھ نازل کئے ہیں۔ ایسا نہیں ہوا ہے کہ الفاظ نازل کر دیئے ہوں اور معانی کو محفوظ کر لیا ہو۔ یا معانی عنایت فرما دیئے ہوں اور الفاظ کو بچا لیا ہو۔ ایسا ہوتا تو قرآن اور حدیث میں فرق ہی نہ رہ جاتا ـــ قرآن اور حدیث کا ایک نمایاں فرق یہ بھی ہے کہ اشارہ خداوندی دونوں میں ہوتا ہے۔ منشار الٰہی دونوں میں کارفرما ہوتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایک میں صرف مقصد نبی کو دیا جاتا ہے اور الفاظ کا انتخاب حالات کے اعتبار سے نبی کے حوالے ہوتا ہے اور دوسرے میں الفاظ و معانی دونوں معین ہوتے ہیں۔ اس میں کسی انتخاب و اختیار کو دخل نہیں ہوتا اور واضح لفظوں میں یوں کہا جائے کہ جہاں صرف معانی خدا کی طرف منسوب ہوتے ہیں اور الفاظ نبی کی طرف منسوب ہوتے ہیں اسے حدیث کہا جاتا ہے۔ اور جہاں الفاظ اور معانی دونوں خدا کی طرف منسوب ہوتے ہیں اسے قرآن کہا جاتا ہے ـــ حدیث کو الفاظ بدل کے نقل کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ لیکن قرآن کا ایک نقطہ بھی نہیں بدلا جا سکتا۔ اور یہ فرق شاید اسی لئے رکھا گیا ہو کہ قرآن کا مخاطب روز اول سے معین ہے کہ اسے حضور سرور کائنات پر نازل ہونا ہے اور حدیث کے مخاطب حالات کے اعتبار سے بدلتے رہیں گے۔ کبھی سلمانؓ و ابوذر جیسے صاحبان علم و کردار مخاطب ہوں گے اور کبھی عرب صحرائی ـــ قدرت نے یہ اختیار پیغمبرؐ کے ہاتھ میں دیدیا ہے کہ جیسے مخاطب سامنے آئیں اسی قسم کے الفاظ استعمال کریں تاکہ وہ مدعا سمجھ سکیں اور قرآن کی مکمل تفہیم ہو سکے۔ پیغمبر اسلامؐ نے بھی حالات کے

اعتبار سے ایسا ہی کیا۔ اور دنیائے ادب کا ایک اہم مسئلہ حل ہو گیا جو اکثر لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا وجہ ہے کہ جب قرآن بھی وحی الٰہی ہے اور کلام رسولؐ بھی وحی الٰہی کا پابند ہے تو ایک اس قدر بلند کیوں ہو گیا کہ معجزہ بن گیا اور دوسرا اس قدر کم کیوں ہو گیا کہ سب کچھ ہو کے بھی معجزہ نہ بن سکا۔ کیا خدا یہ چاہتا ہے کہ عمدہ کلام کو اپنی طرف منسوب کرے اور معمولی کلام کو اپنے حبیب کی طرف منسوب کر دے۔ معاذ اللہ۔ یا کوئی مصلحت اور ہے۔ لیکن جواب بالکل واضح ہے کہ دونوں ایک ہی ذات کے کلام ہیں۔ قرآن بھی وحی الٰہی ہے۔ اور حدیث بھی اشارۃً وحی الٰہی ہے۔ لیکن فرق صرف یہ ہے کہ ایک کا مخاطب رسولؐ ہے اور ایک کا مخاطب عرب صحرائی۔ اور کھلی ہوئی بات ہے کہ جیسا مخاطب ہو گا ویسا ہی کلام ہو گا۔ مخاطب بلند مرتبہ کا ہو گا تو کلام کا معیار بلند ہو گا اور مخاطب اگر پست ہو گا تو کلام کا معیار بھی خود بخود بدل جائے گا۔ اس میں متکلم کا نقص نہیں ہے حالات کا فرق ہے۔

قرآن و حدیث کے اس فرق سے ایک مسئلہ اور بھی حل ہو گیا کہ پروردگار نے اہل بیت پیغمبرؐ کو قرآن ناطق کیوں بنایا۔ حدیث ناطق کیوں نہیں قرار دیا بات یہ ہے کہ قرآن تمام تر خدا کی طرف منسوب ہے۔ اس کا کسی بندے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور حدیث کا انتساب بہرحال بندے کی طرف ہے۔ قدرت نہیں چاہتی ہے کہ اہلبیت کا انتساب کسی بندے کی طرف چاہے وہ رسولؐ ہی کیوں نہ ہو کہ اس طرح امت کو انکار کا راستہ مل جائے گا۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ حدیث کے الفاظ بدلے جا سکتے ہیں۔ لیکن قرآن کے الفاظ میں بھی تغیر نہیں ہو سکتا۔ قرآن اس محکم کلام کا نام ہے جس کا انتساب بھی مستحکم ہے۔ الفاظ بھی مستحکم اور معانی بھی مستحکم۔ کسی طرح کے رد و بدل کا کوئی

امکان نہیں ہے۔ یہی انداز اہلبیتؑ کا ہے۔ یہاں سارا معاملہ خدا کے حوالے ہے۔ ان کا انتخاب بھی خدا کے حوالے۔ ان کا ظاہر بھی خدا کے حوالے ان کا باطن بھی خدا کے حوالے۔ یہ خود خدا کے حوالے اور جو ان سے دشمنی کرے وہ بھی خدا ہی کے حوالے۔

قرآن صامت کی ہی دشمنی کا انجام معلوم ہے۔ اب قرآن ناطق کی دشمنی کا انجام بھی معلوم کیا جا سکتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ قرآن ظاہر ہے تو اس کا دشمن اسلام سے خارج ہو جائے گا اور اہلبیتؑ معنویت قرآن ہیں تو ان کا دشمن بھی باطن اسلام یعنی ایمان سے خارج ہو جائے گا۔

مجھے علماء اسلام سے بھی یہ عرض کرنا ہے کہ یہ تو آپ حضرات نے طے ہی کر دیا ہے کہ اللہ نے قرآن حکیم کو قلب پیغمبرؐ پر اس لئے نازل کیا تھا کہ الفاظ و معانی سب محفوظ رہیں۔ اور قرآن فقط الفاظ کا مجموعہ نہ بن جائے۔ یا اہل دنیا اس کے معانی خود نہ تراشنے لگیں۔ تو کیا رسولؐ اسلام ایسا ہی غیر ذمہ دار اور غیر دیانتدار تھا کہ خدا سے چیزیں لیں دو ـــ اور امت کے حوالے کی ایک۔ ادھر سے قرآن بھی لیا۔ اور معانی قرآن بھی لئے اور ادھر جب چلنے لگے تو الفاظ امت کے حوالے کر دیئے اور معانی اپنے ساتھ لئے چلے گئے۔ یہ تو بڑی بد دیانتی کی بات ہے کہ جس کی امت کو ضرورت تھی اور جس سے نظام ہدایت وابستہ تھا اسے اپنے ہمراہ لے گئے۔ اور جس کی بظاہر اسقدر اہمیت نہ تھی اسے چھوڑتے گئے تاکہ آئے دن جھگڑا ہوتا رہے نئے نئے معانی پیدا ہوتے رہیں۔ اور امت بہکتی رہے۔ اگر منشائے رسولؐ یہی تھا کہ امت میں فساد ہو۔ قوم گمراہ ہو اور قرآن کے نئے نئے معانی ایجاد کئے جائیں تو قرآن بھی چھوڑنے کی کیا ضرورت تھی جو امت نئے نئے معانی تراش سکتی ہے وہ الفاظ بھی بنا سکتی ہے اور الفاظ کی ضرورت بھی کیا ہے

منشائے الٰہی تو معانی میں ہوتا ہے اور جب معانی کی ضرورت نہیں ہے تو منشائے الٰہی کی ضرورت نہیں ہے۔ اور جب منشائے الٰہی کی ضرورت نہیں ہے اور اپنے ہی منشا سے احکام الٰہی مقرر کرنا ہیں تو الفاظ قرآن ہی کی کیا ضرورت ہے اپنا منشا تو اپنے الفاظ میں بھی بیان کیا جا سکتا ہے۔ پیغمبر اسلامؐ آواز دیں گے خبردار! مجھ پر بددیانتی کا الزام نہ لگانا۔ خبردار میری امانت داری میں شبہ نہ کرنا۔ میں نے جو کچھ خدا سے لیا ہے سب تمھارے لئے لیا ہے۔ اور جو کچھ تمھارے لئے لیا ہے وہ سب تمھیں دیدیا ہے۔ میں نہ کلمہ لے کر جا رہا ہوں نہ کعبہ، نہ قرآن لے کر جا رہا ہوں نہ اسلام۔ نہ احکام لے کر جا رہا ہوں نہ شریعت — نہ دین لے کر جا رہا ہوں نہ مذہب — میں نے جو کچھ لیا ہے وہ سب تمھیں دیدیا ہے۔ اب یہ کیسے ممکن ہے کہ سارے مسائل تمھارے حوالے کر دیئے جائیں۔ اور ایک ہی منزل پر بددیانتی کی جائے — یاد رکھو میں نے الفاظ قرآن لئے ہیں تو وہ بھی تمھارے لئے اور معانی قرآن لئے ہیں تو وہ بھی تمھارے لئے۔ اور جب سب تمھارے لئے لیا ہے تو یہ میرا حسنِ انتظام ہے کہ ایسی زبانیں چھوڑے جاتا ہوں جن کا نطق میرا نطق ہوگا اور ایسے دل و دماغ چھوڑے جاتا ہوں جن کا علم میرا علم ہوگا۔ میں تنہا قرآن چھوڑ کر نہ جاؤں گا کہ تمھیں شکایت پیدا ہو جب جاؤں گا تو قرآن بھی چھوڑ کر جاؤں گا اور اہلبیتؑ کو بھی۔ تاکہ قرآن سے الفاظ ملتے رہیں اور اہلبیتؑ سے لہجہ۔ شاید اسی لہجہ اور معانی کا انداز سمجھانے کے لئے ایک طرف علیؑ کو لسان اللہ بنایا گیا۔ اور دوسری طرف باب مدینۃ العلم لسان اللہ بنایا گیا تاکہ لہجہ پروردگار مل جائے۔ اور باب علم بنایا گیا تاکہ معانی قرآن حاصل ہو جائیں۔ صلوات

امانت داری کی بات یہیں پر تمام نہیں ہوتی۔ رسولؐ تو اس قدر امانت دار ہے کہ جو امانت جس طرح لی ہے اسی طرح قوم کے حوالے کی ہے اگر امانت کو ہاتھوں ہاتھ لیا ہے تو ہاتھوں ہاتھ پہنچایا ہے اور اگر دل و دماغ کی راہ سے لیا ہے تو دل و دماغ کی راہ ہی سے پہنچایا ہے۔ یاد رکھیں قرآن کے الفاظ زبان کی راہ سے آئے تھے۔ تو انھیں زبان کے ذریعہ پہنچایا۔ اور قرآن کے معانی دل کی راہ سے آئے تھے اور انھیں جبریل امین نے قلب پیغمبرؐ پر اتارا تھا تو انھیں دل و دماغ کی راہ سے پہونچایا ہے۔ کیا سورۂ جمعہ کا وہ فقرہ یاد نہیں ہے کہ اللہ نے مکہ والوں میں ایک رسول بھیجا ہے تاکہ ان کے درمیان آیات کی تلاوت کرے۔ ان کے نفوس کو پاک و پاکیزہ بنائے۔ اور انھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے۔ آیت کریمہ میں تلاوت کا ذکر الگ ہے۔ اور تعلیم کا ذکر الگ ہے اور یہ اعلان ہے کہ تلاوت کا تعلق زبان سے ہے اور علم کا تعلق دل سے — پیغمبرؐ نے جس طرح الٰہی تعلیمات کو لیا ہے اسی طرح زبان و دل سے پہونچایا ہے اور یوں بھی انسان کی کل حقیقت زبان و دل سے وابستہ ہے۔ اگر زبان صادق اور دل اس کے مطابق ہے تو انسان انسان ہے ورنہ منافق ہے اور انسان نہیں ہے۔ مرسل اعظمؐ نے زبان سے تلاوت کی اور ذہن و دل و دماغ کے ذریعہ معانی کو دلوں میں اتار دیا۔ اور یہ کمال پیغمبرؐ تھا کہ معجز نما کلام کے معانی امت کے ذہن میں اتار دیئے۔ اور تلاوت و تعلیم کے فرق سے یہ بھی واضح کر دیا کہ تلاوت کی منزل پاکیزگی نفس سے پہلے ہے اور تعلیم کی منزل بعد میں ہے۔ تلاوت اس کے سامنے بھی ہو سکتی ہے جس کا نفس پاکیزہ نہیں ہے لیکن تعلیم کے لئے پاکیزگی نفس ضروری ہے۔ یہی تو وجہ تھی کہ تلاوت کفار و مشرکین کے سامنے بھی کی گئی لیکن معانی کا اثر صرف صاحبان ایمان و کردار پر ہوا۔ مقصد یہ ہے کہ حضورؐ نے جس طرح امانت لی تھی اسی طرح قوم کے حوالے

کردی اور اب مجھے کہنا پڑتا ہے کہ قرآن جبریل سے دل پر لیا تھا۔ اور اہلبیتؑ کو بنت اسد سے ہاتھوں پر لیا تھا۔ اسی لئے قرآن کو دلوں کے حوالے کر دیا اور اہلبیتؑ کو غدیر خم کے میدان میں ہاتھوں ہاتھ دیدیا۔ اب جب تک علیؑ کے ہاتھ پر بیعت نہ ہوگی قافلہ آگے نہ بڑھے گا۔ کتنا دیانت دار تھا۔ وہ پیغمبرؐ جس نے خدا سے جو کچھ لیا اور جس طرح لیا سب امت کے حوالے کر دیا۔

اور میں تو کہوں گا کہ اس شان دیانت کو کفار سمجھے مگر مسلمان نہیں سمجھے وہ ہجرت کے بعد یقین کئے رہے کہ رسولؐ امانتدار ہے امانت ضائع نہیں کریگا اسی لئے صبح کو علیؑ کے پاس آکر نبیؐ کے بارے میں پوچھا۔ امانتوں کے بارے میں نہیں پوچھا۔ انھیں یقین تھا کہ وہ اپنی جان بچا سکتے ہیں۔ لیکن ہماری امانتوں کو ضائع نہیں کر سکتے۔ اُدھر پیغمبرؐ کو بھی اتنا خیال تھا کہ تلواروں کی چھاؤں میں علیؑ کو چھوڑ کر چلے گئے اور فرمایا یا علیؑ امانتوں کو واپس کئے بغیر نہ آنا۔ ورنہ میرا ۵۳ سال کا کارنامہ برباد ہو جائے گا۔ اور جس قوم نے ۵۳ سال تک مجھے امین کہا تھا وہ بد دیانت کہنے لگے گی ـــــ اللہ اکبر ـــــ نبیؐ کو کتنا اعتماد تھا علیؑ کی شجاعت و امانت پر کہ بستر بھی حوالے کر دیا اور امانت بھی ـــــ بستر پر لٹا دیا کہ ایسا صاحب ہمت و بہادر ہے کہ کوئی اسے قتل نہیں کر سکتا۔ اور امانتیں حوالے کر دیں کہ ایسا دیانت دار ہے کہ خیانت نہیں کر سکتا

رسولؐ تشریف لے گئے اور تاریخ اسلام کے "ذمہ دار حضراتؓ" کو لیے ساتھ لے گئے اب اگر علیؑ بھی معاذ اللہ امانتوں کو واپس نہ کریں یا واپسی میں کوئی کوتاہی برتیں تو نبوت کا وقار کیا رہ جائے گا۔ اور نبیؐ کی عزت کس منزل پر ہوگی۔ کیا نازک موقع تھا کہ نبوت کا سارا وقار امانت کے ہاتھوں میں تھا۔ علیؑ امانت واپس کر دیں تو نبیؐ امین ہیں اور نہ واپس کریں تو کفار کی

نگاہ میں بد دیانت۔ اللہ رے اعتبار علیؑ کہ نبیؐ نے اپنا وقار علیؑ کے حوالے کر دیا۔ اور جانتے ہیں کہ یہ زندہ رہے گا تو میرے وقار میں فرق نہ آئے گا اب دنیا بتائے کہ نبیؐ کا امانتدار کون ہے۔ اور نبیؐ کے وقار کا محافظ کون ہے۔ اور پھر انصاف کرے کہ امانتدار کو دین کا امین بنایا جائے گا یا کسی اور کو بنایا جائے گا۔ محافظ وقار کو حافظ شریعت بنایا جائے گا یا کسی اور کو۔ میں نہیں کہتا کہ اسلام میں کس کو مرتبہ کیا تھا۔ اور کس کا مقصد کیا تھا ـــــ میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ رسولؐ اپنے "دوست" سمیت چلے گئے تھے۔ اب تو عزت و آبرو صرف علیؑ کے ہاتھ میں ہے اور علیؑ نے جان کی بازی لگا کر آبرو بچالی تاکہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ غیر صرف جان بچانا جانتا ہے عزت و آبرو اور وقار و ایمان اپنے ہی بچایا کرتے ہیں۔ وقت پر بھائی ہی کام آتا ہے۔ غیر کام نہیں آتا۔

یہ قدرت کا انتظام ہدایت تھا کہ اس نے شریعت کے ساتھ محافظین شریعت اور قرآن کے ساتھ واقعی محافظ قرآن رکھے ہیں جو الفاظ کے ساتھ معانی اور عبارات کے ساتھ مقاصد بھی محفوظ رکھتے ہیں۔ ان کا کلام یہ نہیں ہے کہ "میرا خیال یہ ہے" یا "میرا علم یہ کہتا ہے" یا "بحسب قوانین آیت کے معنی یہ نکلتے ہیں" یا فلاں صحابی کا یہ قول ہے۔" بلکہ وہ ڈنکے کی چوٹ پر اعلان کرتے ہیں کہ میرا خدا یہ ہے۔ مقصد پروردگار یہ ہے۔ منشائے الٰہی یہ ہے۔ لوح محفوظ میں یہ ہے۔ جبریل یہ لائے ہیں اور رسول اعظمؐ نے یہ بیان کیا ہے۔ ہمارے آباء و اجداد کا یہ علم ہے۔ جو لوح محفوظ سے شروع ہو کر ہم تک پہنچا ہے۔ ہمارے واسطے میں کوئی غیر معصوم نہیں ہے۔ ہم عصمت کی چہار دیواری میں پیدا ہوتے ہیں۔ اور اسی میں زندگی گذارتے ہیں۔ ہم مر بھی جاتے ہیں۔

تو ہمارے غسل و کفن میں کوئی غیر معصوم ہاتھ نہیں لگتا اور ہم آخری منزل تک عصمت ہی کے سہارے جاتے ہیں۔

تاریخ میں بے شمار واقعات ہیں جہاں محافظانِ علم و شریعت نے یہ واضح کر دیا کہ جو علم ہمارے پاس ہے وہ دنیا میں کسی کے پاس نہیں ہے اور جس وقت ہم حاملِ شریعت ہوتے ہیں اس وقت دوسروں کے گھروں میں شریعت کا تصور بھی نہیں ہوتا۔ امام محمد تقیؑ کا بچپنا ہے امام رضا علیہ السلام تشریف فرما ہیں۔ لوگ آ کے کہتے ہیں کہ آپ کے بعد امام کون ہوگا؟ آپ نے فرمایا میرا فرزند محمد تقیؑ ــــ لوگوں نے عرض کی کہ وہ تو ابھی بچے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ نمائندہ پروردگار بچہ اور جوان نہیں ہوتا۔ اس کا علم بارگاہ احدیت سے آتا ہے۔ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ عیسیٰ نے گہوارے سے کتاب و نبوت کا اعلان کیا تھا۔ تو اگر عیسیٰ گہوارے میں صاحب کتاب اور نبی ہو سکتے ہیں، تو میرا فرزند تین برس میں امام کیوں نہیں ہو سکتا۔ اور اگر تمہیں شک ہو تو امتحان کر کے دیکھو کہ علم کی کون سی منزل ہے اور کمالات کا کیا عالم ہے۔ یہ امت نہیں ہے کہ بوڑھے بھی جاہل ہی رہ جائیں۔ یہ عترت ہے جہاں بچہ بھی آغوشِ مادر سے لوحِ محفوظ کا مطالعہ کرتا ہے۔

یہی وہ مسئلہ تھا جس کا دنیا کو یقین نہ آیا لیکن جب قدرت سامنے آجاتی ہے تو انکار کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ چنانچہ تاریخ کہتی ہے کہ امام رضا علیہ السلام کی شہادت ہو چکی ہے۔ ملک کا نقشہ بدل چکا ہے۔ مامون کے سامنے عجیب و غریب حالات ہیں۔ ایک طرف عباسی افراد ناراض ہیں کہ بنی فاطمہؑ کو ولی عہدی کیوں دی گئی تھی۔ دوسری طرف بنی فاطمہؑ میں بھی قیامت برپا ہے کہ ولی عہدی دے کر بھی دھوکہ دیا۔ اور زہر دے کر شہید کرا دیا ــــ مامون عجیب

شش و پنج میں ہے۔ کرے تو کیا کرے۔ بنی عباس کے زخم پر مرہم رکھتا ہے تو بنی ہاشم ناراض ہو جاتے ہیں۔ اور بنی فاطمہؑ کو راضی کرتا ہے تو بنی عباس ہاتھ سے نکل جاتے ہیں۔ اس نے کافی غور و خوض کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ پھر دورنگی چال چلی جائے۔ جس طرح امام رضاؑ کو ولی عہد بھی بنایا گیا اور زہر بھی دلوا دیا۔ بہن کا عقد بھی کیا اور زندگی کا خاتمہ بھی کرا دیا۔ اسی طرح فرزندِ رضاؑ کے ساتھ بھی برتاؤ کیا جائے۔ اور ایسا انداز اختیار کیا جائے کہ دونوں جماعتیں خوش ہو جائیں۔ سادات کا جوشِ انتقام بھی ٹھنڈا ہو جائے اور بنی عباس کی بغاوت بھی سر نہ اٹھانے پائے۔ چنانچہ اس نے امام رضاؑ کی شہادت کے بعد پہلا قدم یہ اٹھایا کہ حکومت کا پرچم سبز سے پھر سیاہ کر دیا۔ اور بنی ہاشم کے رنگ پر بنی عباس کے رنگ کو غالب بنا دیا ــــ ادھر معاہدہ کی خلاف ورزی کر کے فرزند رضاؑ کے بجائے اپنے بھائی المؤتمن کو ولی عہد بنا دیا اور یہ عہدہ اپنے بیٹے کو بھی نہیں دیا تاکہ قوم پر دیانت داری کی دھاک بیٹھی رہے۔ بنی عباس بڑی حد تک مطمئن ہو گئے اور مامون کو یقین پیدا ہو گیا کہ اس نے بغاوتوں کا سر کچل دیا ہے۔ لیکن امین کے قتل کے بعد جو صورت حاصل پیدا ہوئی اس پر قابو پانا ذرا مشکل کام تھا اور سادات کے دل میں جو جذبۂ انتقام پیدا ہوا تھا اسے سرد کرنا بھی ایک مسئلہ تھا۔ چنانچہ اس نے طے کر لیا کہ فرزند رضاؑ کو بلا کر ان کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا جائے کہ بنی فاطمہؑ بھی مطمئن ہو جائیں اور ان کا ہنگامہ بھی ختم ہو جائے۔

چنانچہ اس نے پیغام بھیج کر امام محمد تقی علیہ السلام کو مدینہ سے بغداد طلب کر لیا۔ آپ بغداد تشریف لے آئے تو ایک دن سرِ راہ کھڑے ہوئے تھے۔ ادھر سے مامون کی سواری گذری۔ تمام لوگ راستہ چھوڑ کر ہٹ

گئے۔ آپ نہیں ہٹے۔ اس نے وجہ دریافت کی۔ آپ نے ایسا زبردست جواب دیا کہ وہ مبہوت ہوگیا اور فوراً سمجھ گیا کہ یہ خاندان رسالت کی کوئی فرد ہے آپ نے اپنا تعارف کرایا کہ میں فرزند علیؑ بن موسیٰ الرضاؑ ہوں۔ اس نے گلے سے لگا لیا۔ اور اپنے ساتھ دربار تک لے آیا۔ اب عزت واکرام کا یہ عالم ہے کہ نہ پوچھئے۔ باپ کے قتل کا الزام بھی دھونا ہے۔ بنی فاطمہؑ کو راضی بھی کرنا ہے۔ اور امام رضا علیہ السلام کی شہادت سے جو علمی خلا پیدا ہوا ہے اسے پُر بھی کرنا ہے۔ مامون جانتا ہے کہ یہ کام اولاد رسولؐ کے علاوہ کوئی نہیں کرسکتا۔ چنانچہ بصد اعزاز واحترام ہے اور بے انتہا عزت واکرام۔ ہر وقت ساتھ ہر آن خدمت۔ دربار میں آتے ہیں تو اپنے برابر بٹھاتا ہے۔ تشریف لاتے ہیں تو تعظیم کے لئے کھڑا ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ بنی عباس پر کیا گذرنا چاہیئے تھی۔ وہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک مرتبہ ساری امیدوں پر پانی پھر گیا۔ یہ بادشاہ پھر بہک گیا اس کا دماغ پھر الٹ گیا۔ نہ جانے بنی فاطمہؑ کے پاس کون سا ہنر ہے کہ جب ان کا سامنا ہو جاتا ہے تو بادشاہ بدحواس ہو جاتا ہے اور ان کی تعظیم کے لئے کھڑا ہو جاتا ہے۔ بھلا یہ سات سال کا بچہ اور یہ مامون جیسا عالم اور علم دوست بادشاہ اور یہ تعظیم واکرام۔ کوئی عقل میں آنے والی بات ہے۔ کیا دربار کے سارے علماء مر گئے ہیں۔ کیا ملک میں کوئی صاحب کمال نہیں رہ گیا ہے کہ سب سے زیادہ احترام اس بچہ کا کیا جائے۔ ہر شخص دل ہی دل میں جل بھن رہا ہے لیکن رعب شاہی مانع ہے۔ کسی میں سانس لینے کی ہمت نہیں ہے۔ یہ بنی فاطمہؑ نہیں ہیں کہ بادشاہوں کو سر راہ ٹوک دیں۔ یہ دربار کے نمک خوار ہیں۔ یہ یزید کے سامنے نہ بول سکے تو

مامون کے سامنے کیا بولیں گے۔ یہ تو علم دوست اور ہنرمند بھی ہے۔ وقت گذرتا رہا لیکن ایک مرتبہ ایسے حالات پیدا ہوگئے کہ کوئی شخص خاموش نہ رہ سکا، اور سب نے سر ہتھیلی پر رکھ کر مدعا بیان کر دیا۔ بادشاہ! اب ہم سے برداشت نہیں ہوتا۔ ہم نے بہت صبر کیا لیکن آپ کے اقدامات حد سے آگے بڑھتے جا رہے ہیں۔ ہم نے اپنی ذلت برداشت کرلی۔ ہم نے ایک بچہ کی عزت برداشت کرلی۔ ہم نے بنی فاطمہؑ کا احترام برداشت کرلیا۔ ہم نے بنی عباس کی توہین برداشت کرلی۔ لیکن سنا ہے کہ حضور اپنی لڑکی ام الفضل کا عقد اس بچہ سے کرنا چاہتے ہیں۔ ہم اس بات کو ہرگز برداشت نہ کریں گے یہ آپ کی عزت کا مسئلہ ہے۔ ہماری عزت خاک میں مل جائے لیکن آپ کی عزت کی بربادی برداشت نہ کریں گے۔ بھلا دنیا کیا کہے گی کہ بنی عباس میں کوئی لڑکا نہ ملا۔ خاندان میں کوئی ایک نہ پیدا ہوا اور بنی فاطمہؑ کے ایک بچہ کو بیٹی دیدی گئی۔ اگر آپ کا ایسا ہی خیال تھا تو لوگوں سے مشورہ کرلیا ہوتا۔ حالات کا جائزہ لے لیا ہوتا۔ ابھی ملکی حالات قدرے درست ہوئے تھے کہ آپ نے پھر ایک قیامت کر دی۔ سوچئے ذرا یہ کمسن بچہ اور حضور کی شہزادی؟ کیا ربط ہے۔ کیا مناسبت ہے۔ اچھا اگر یہی ارادہ کرلیا ہے اور اپنے ارادہ میں ترمیم کا بھی ارادہ نہیں ہے تو کم از کم کچھ دن علم کے پاس بھیج کر بچہ کو پڑھوا لیجئے۔ کچھ سکھا لیجئے۔ یہ تو نہ ہو کہ بادشاہ کا داماد جاہل ہے۔ بیٹی کو یہ شرمندگی نہ اٹھانا پڑے کہ میرے باپ نے میرا عقد ایک ان پڑھ سے کر دیا ہے ـــــ مامون یہ سب سنتا رہا اور آخر میں فیصلہ سنا دیا کہ میرا فیصلہ اٹل ہے۔ اس میں کسی ترمیم کی گنجائش نہیں ہے ـــ

[illegible] ہوگا اور ابھی بچے ہوگا۔ تم نے اسے نہیں پہچانا۔

میں پہچانتا ہوں یہ ابن الرضا ہے۔ یہ فرزند رسولؐ ہے۔ یہ دلبند فاطمہؑ ہے۔ اس کے علم کی کوئی پناہ نہیں ہے۔ تم میں کون ہے جو اسے پڑھائے گا۔ پہلے اس کے علم کا تو اندازہ کرو۔ اسکے بعد پڑھانا۔ یہ تم سب کو پڑھانے کے لئے اکیلا کافی ہے ــــــ قوم یہ تقریر سن کر دم بخود رہ گئی۔ ارے یہ امیر ہذیان بک رہا ہے۔ آخر اسے کیا ہو گیا ہے؟ یہ محبت اہلبیتؑ میں دیوانہ ہو گیا ہے۔ بچہ کو سارے دربار سے زیادہ قابل کہتا ہے۔ اور صاحبزادے کو سب کا استاد بتاتا ہے۔ خیر۔ اگر اس نے رسوائی ہی کا فیصلہ کر لیا ہے تو ہم کیا کر سکتے ہیں لیکن یہ چیلنج بھی برداشت نہیں ہے کہ یہ اکیلا سب کو پڑھا سکتا ہے تو یہی کہ ایک دن مقابلہ کرا دیا جائے اور بادشاہ کو بھی باخبر کر دیا جائے کہ اسکا فیصلہ کس قدر غلط ہے۔ یہ سوچ کر لوگوں نے عرض کی۔ امیر! آپ نے غور نہیں فرمایا ملک میں بڑے بڑے قابل لوگ پڑے ہوئے ہیں۔ محمد تقیؑ پھر ابھی بچے ہیں۔ آپ ان کے بارے میں اتنی خوش فہمی کے شکار نہ ہوں۔ حالات پر غور کر لیجئے۔ مامون نے کہا میں نے سب غور کر لیا ہے۔ جانچ لیا ہے، امتحان کر لیا ہے۔ اب آپ حضرات میں بڑا دم ہے تو اس سے باتیں کیجئے۔ خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ کون کتنے پانی میں ہے۔ قوم کو غصہ آگیا۔ عرض کی حضور! پھر ایک دن طے کر دیجئے ہم اس بچہ کا امتحان کر لیں گے۔ تاریخ طے ہو گئی۔ وقت مقرر ہو گیا۔ ملک بھر کے علماء جمع ہو گئے۔ عوام و خواص کے علاوہ نو سو علماء کرسیوں پر جلوہ افروز ہوئے۔ اور امام محمد تقیؑ کو بادشاہ کے برابر تخت پر بٹھایا گیا۔ گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا۔ مامون نے کہا تم میں کون ہے جو اس بچہ سے بات کرے گا۔ لوگوں نے کہا قاضی القضاۃ یحییٰ ابن اکثم سے بہتر کوئی نہیں ہے۔ وہی اس بچہ کا امتحان لیں گے مامون نے کہا بسم اللہ

یحییٰ نے کہا امیر اجازت ہے میں اس بچہ سے کوئی سوال کر دوں۔ مامون نے کہا یہ آپ کی تہذیب ہے؟ اجازت اس سے لینا چاہیئے کہ مجھ سے؟ مجھ سے کیا مطلب ہے۔ یحییٰ گھبرا کر ادھر متوجہ ہوا۔ صاحبزادے اجازت ہے۔ آپ نے فرمایا بیشک۔ اس نے کہا کہ اگر کوئی شخص حالت احرام میں شکار کرے تو اس کا کفارہ کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ سوال ہی مہمل ہے تو جواب کیا دیا جائے۔ کہیں اس طرح سوال سوال کیا جاتا ہے۔ سوال کے لئے پہلے صحیح صورت حال کا جائزہ لے لیا جاتا ہے تب سوال کیا جاتا ہے۔ ایک ایک مسئلہ کے ہزار رُخ ہوتے ہیں۔ خدا جانے کون سا رُخ سائل کے ذہن میں ہے کون سا رُخ جواب دینے والے کے ذہن میں ہے۔ سوال کچھ ہو جاتا ہے جواب کچھ ہو جاتا ہے۔ پہلے آپ سوال کی نوعیت واضح کیجئے اور یہ بتایئے کہ مسئلہ کی ۲۲ قسموں میں سے کون سی قسم مراد ہے۔ جب مسئلہ کی قسم طے ہو جائے گی تو میں جواب بھی دے سکوں گا۔ مسئلہ کی صحیح صورت یہ ہے کہ یہ (۱) شکار مقام حل میں ہوگا یا حدود حرم میں (۲) پھر شکاری عالم مسئلہ ہوگا یا جاہل (۳) آزاد ہوگا یا غلام (۴) بالغ ہوگا یا نابالغ (۵) اپنے عمل پر نادم ہوگا یا مصر (۶) عمداً شکار کرے گا یا سہواً (۷) پہلی مرتبہ شکار کرے گا یا مکرر (۸) شکار بھی چرند ہوگا یا پرند (۹) چھوٹا ہوگا یا بڑا (۱۰) وقت شکار بھی دن ہوگا یا رات۔ (۱۱) احرام بھی حج کا احرام ہوگا یا عمرہ کا؟ یہ بائیس شکلیں ہیں جب تک مسئلہ کی صحیح صورت سامنے نہ آجائے۔ جواب کس طرح دیا جا سکتا ہے۔ یہ سننا تھا کہ یحییٰ کے ہوش و حواس اڑ گئے۔ اس نے کبھی اتنی شکلیں سوچی بھی نہیں تھیں مامون کا اصرار بڑھا۔ یحییٰ بتاؤ کون سی صورت مراد ہے اور کس شکل کے بارے میں سوال کیا ہے۔ یحییٰ کی سانس ہی رکی ہوئی ہے کہے تو کیا کہے۔

جواب الگ نہیں بن پڑ رہا ہے۔ بھرے دربار میں ذلت الگ ہو رہی ہے۔
آخر عاجز آ کر مامون نے کہا فرزند رسولؐ! اب آپ ہی بتایئے کہ ان سوالات کا جواب کیا ہے اور ان تمام صورتوں میں کفارہ کیا دینا ہوگا۔ آپ نے فرمایا کہ یاد رکھو شکار پرندہ ہے اور بڑا ہے تو مقام حل میں ایک بکری اور حدود حرم میں دو بکریاں اور اگر شکار چرند اور وحشی ہے تو ایک دنبہ کا بچہ اور ہرن ہے تو پوری بکری۔ حرم میں ہے تو یہ دونوں چیزیں دُہری ہو جائیں گی۔ احرام بھی حج کا ہے تو قربانی منیٰ میں ہوگی۔ ورنہ مکہ معظمہ میں۔ شکار میں عالم و جاہل سب برابر ہوتے ہیں۔ اور سب کو کفارہ دینا پڑتا ہے۔ البتہ سہواً شکار کیا ہے تو معاف ہے عمداً شکار کرنے میں کفارہ ہے۔ آزاد کا کفارہ خود اس کی ذات پر ہے۔ غلام کا کفارہ اس کے آقا پر ہے۔ طفل صغیر پر کوئی کفارہ نہیں ہے۔ بالغ پر کفارہ واجب ہے۔ شکار کرنے کے بعد نادم ہو گیا ہے تو صرف کفارہ ہے اور اپنے گناہ پر اڑا ہوا ہے تو عذاب آخرت بھی ہے۔

یہ سننا تھا کہ سارا دربار چونک پڑا اور مامون فرط مسرت سے اچھل پڑا آج حکومت کی عزت رہ گئی اور فرزند رسولؐ نے اقتدار کی آبرو بچالی۔
اس کے بعد حضرتِ امامؑ یحییٰ کی طرف متوجہ ہوئے۔ اجازت ہو تو کچھ میں بھی آپ سے پوچھوں۔ ظاہر ہے کہ جو یحییٰ سوال کرنے سے عاجز تھا وہ جواب کیا دے گا مجبور ہو کر کہنے لگا۔ خیر آپ سوال کیجئے۔ ممکن ہوگا تو جواب دوں گا ورنہ آپ ہی سے پوچھ لوں گا۔ آپ نے فرمایا وہ کون سی عورت ہے جو ایک مرد پر صبح کے وقت حرام ہے۔ طلوع آفتاب کے وقت حلال ہو گئی۔ ظہر کے وقت پھر حرام ہو گئی۔ عصر کے وقت پھر حلال ہو گئی۔ مغرب کے وقت پھر حرام

ہو گئی۔ عشاء کے وقت پھر حلال ہو گئی۔ نصف شب کے وقت پھر حرام ہو گئی صبح ہوتے ہوتے پھر حلال ہو گئی۔
یحییٰ نے سنا تو اس کے ہوش اڑ گئے۔ ابھی جانور کا مسئلہ نہیں حل ہو پایا تھا کہ انسان کا مسئلہ پیش آ گیا۔ شکار کا مسئلہ کیا پوچھا کہ خود ہی شکار ہو گیا۔ اب کوئی بس نہیں ہے۔ بالآخر عاجز آ کر کہنے لگا۔ فرزند رسولؐ! آپ ہی بیان کریں آپ نے فرمایا یہ ایک دوسرے شخص کی کنیز ہے۔ جو انسان پر حرام ہے۔ طلوع آفتاب کے وقت اسے خرید لیا تو حلال ہو گئی۔ ظہر کے وقت آزاد کر دیا پھر حرام ہو گئی عصر کے وقت عقد کر لیا پھر حلال ہو گئی۔ مغرب کے وقت ظہار کا صیغہ پڑھ دیا (اور اس کو اپنی ماں جیسا کہہ دیا) پھر حرام ہو گئی۔ عشاء کے کفارہ دیدیا پھر حلال ہو گئی۔ نصف شب کے وقت طلاق دیدی پھر حرام ہو گئی۔ صبح ہوتے ہوتے رجوع کر لی پھر حلال ہو گئی۔ ایک ہی عورت ہے جو حالات کے اعتبار سے اتنی بار حلال ہوئی اور پھر حرام ہو گئی۔ (مناقب)
گویا معصوم نے واضح کر دیا کہ شے پر نظر نہ رکھو حالات پر نظر رکھو۔ حالات ہی حلال بناتے ہیں اور حالات ہی حرام بناتے ہیں اور یہ حقائق وہی جانتے ہیں جو شریعت کے مزاج سے باخبر ہیں اور احکام کی حقیقت تک رسائی رکھتے ہیں۔
اور میں سمجھتا ہوں کہ معصوم نے در پردہ اس مسئلہ کو بھی حل کر دیا جو اکثر لوگ کہا کرتے ہیں کہ جب وفات رسولؐ کے بعد علیؑ نے خلافت کا دعویٰ کیا اور اس کے لئے احتجاج کیا تو جب تین دور کے بعد خلافت مل رہی تھی تو انکار کیوں کیا کیا اب اسے اپنا حق نہیں سمجھتے تھے۔ یا پہلے ہی دعویٰ صحیح نہیں کیا تھا؟ فرزند رسولؐ نے واضح کر دیا کہ شے حالات کے اعتبار سے بدل جایا کرتی ہے۔ کل خلافت براہ راست رسولؐ کی خلافت تھی اس لئے قبول کرنے کے لائق تھی اور

اپنے شایانِ شان تھی اور آج خلافت، خلافتِ رسولؐ نہیں ہے۔ بلکہ خلافت خلیفۂ رسولؐ ہے۔ اس لئے جب تک یہ نسبت درمیان سے ہٹ نہ جائے قابل قبول نہیں ہے۔ اسی لئے جب تک منبرِ رسولؐ پر محلِ رسولؐ پر نہ بیٹھ گئے قوم سے بیعت نہیں لی تاکہ دنیا سمجھے کہ میں نے رسولؐ کی جگہ لی ہے کسی خلیفۂ رسولؐ کی جگہ نہیں لی ہے۔ صلوات

اسی طرح یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا کہ جب صدیقہ طاہرہؑ نے فدک کا دعویٰ کیا اور مولائے کائناتؑ نے ان کی حمایت میں بیان دیا۔ ان کی گواہی پیش کی گئی اور آپ حکومتِ وقت کو حقِ زہراؑ کا غاصب سمجھتے رہے تو جب آپ کے ہاتھ میں حکومت آئی تو آپ نے فدک کیوں نہیں لے لیا اور اسے اپنی حالت پر کیوں رہنے دیا کہ ابن عبدالعزیز کے زمانے میں سادات تک واپس کیا جائے۔ یہ جواب بہت تفصیلی ہے اس کے ذیل میں یہ بھی دیکھنا پڑے گا کہ مولائے کائنات نے اپنے دور میں فدک کے ساتھ کیا برتاؤ کیا ہے۔ اور پھر یہ بھی دیکھنا پڑے گا کہ وہ تھا کہاں جسے واپس لیا جائے دورِ ثالث میں کس طرح تقسیم ہو چکا تھا اور واپسی کا امکان کس حد تک تھا اور یہ بھی دیکھنا پڑے گا کہ جب مظلومہؑ اپنے مقدمہ کا فیصلہ کرا کے دنیا سے جا چکی ہے تو جاگیر کو واپس لینے کا مطلب مظلومہؑ کے ثواب اور ظالم کے عذاب کی کمی ہے۔ اور علیؑ اسے گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ زہراؑ کے ثواب میں کوئی کمی ہو۔ یا داستانِ مظلومیت کسی دور میں بھی مخفی اور مجروح ہو جائے لیکن فی الحال ان تمام باتوں کا محل نہیں ہے۔ اس وقت حالات کے بدلنے میں اتنا عرض کرنا ہے کہ کل اور آج میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ کل یہ باغِ فاطمہ زہراؑ کا تھا اور حکومت غاصب کہی جاتی تھی۔ اور آج حکومتِ وقت

اسے امت کا مال بنا چکی ہے۔ اور ایک ایک کے ذہن میں یہ بات بٹھا چکی ہے کہ بنتِ رسولؐ کا دعویٰ غلط تھا۔ اس جاگیر کو پیغمبر امت کے حوالے کر گئے ہیں۔ اور یہ فرما گئے ہیں کہ ہمارا سارا ترکہ امت کا مال ہوتا ہے۔ ہمارے گھر میں میراث نہیں ہوتی تو مولائے کائناتؑ یہ محسوس کر رہے تھے کہ اب اگر فدک پر قبضہ کیا گیا تو کل صرف وارثۂ زہراؑ احتجاج کر رہے تھے۔ اور آج تو پوری امت احتجاج کرے گی کہ علیؑ نے ہمارے مال پر قبضہ کر لیا ہے اور امت کی جاگیر کو غصب کر لیا ہے اور جو الزام کل حکومتِ وقت کے سر تھا وہی آج امامت کے سر آجائے گا۔ مولائے کائناتؑ نے فرمایا کہ جاگیر چھوڑنا گوارا ہے مگر الزام لینا گوارا نہیں ہے۔

الزام کی نوعیت آپ بہتر سمجھتے ہیں کہ پوری مملکتِ اسلامیہ میں یہ ہنگامہ ہو جاتا کہ علیؑ نے حکومت پاتے ہی امت کے اموال پر قبضہ کر لیا اور جب تک دوسروں کی حکومت رہی خاموش رہے۔ یہ اپنا حق سمجھتے تھے تو اسی وقت لینا چاہیے تھا۔ آج اقتدار پانے کے بعد کیسا حق زندہ ہو گیا غرض کہ مملکت میں ایک ہنگامہ ہو جاتا۔ اور ظالموں کو ایک نیا بہانہ مل جاتا مولائے کائنات نے اس مصیبت کو بھی برداشت کر لیا۔ اور ظالموں کو کوئی موقع حاصل نہیں کرنے دیا۔ ان مصائب کا اثر مولائے کائناتؑ کے دل پر کیا ہوا یہ علیؑ ہی کا دل جانتا ہے۔ البتہ نسلِ علیؑ میں یہ احساس زندہ رہا اور ایک ایک فرد کے ذہن میں یہ بات سلامت رہی چنانچہ امام محمد تقی علیہ السلام کی کمسنی ہے۔ بیٹھے ہوئے رو رہے ہیں اور مسلسل آنسو جاری ہیں۔ کسی نے کہا فرزندِ رسولؐ آپ کیوں رو رہے ہیں اور اس قدر کیوں گریہ فرما رہے ہیں۔ فرمایا۔ میں سوچتا ہوں کہ ظالموں نے میری جدہ ماجدہ

سے ساتھ کیا برتاؤ کیا اور کس طرح انھیں اذیتیں پہنچائیں۔ خدا کی قسم مجھے موقع مل گیا تو ایک ایک ظالم کو قبر سے نکال کر اس کی لاش کو نذر آتش کرا دوں گا اور خاکستر کو ہوا میں اڑا دوں گا۔" اللہ اللہ یہ مصائب۔ اور دل بنت رسولؐ کیا امت اسی کو کہتے ہیں اور کلمہ پڑھنے کا یہی مطلب ہوتا ہے۔ مگر ارباب عزا! سیاست کی دنیا ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ یہاں رشتوں کا کوئی لحاظ نہیں ہوتا۔ وہ تو رسولؐ کی بیٹی تھی اور یہاں تو ام الفضل حکومت ہی کی بیٹی تھی۔ اور امام محمد تقیؑ حکومت ہی کے داماد تھے۔ لیکن روایت کہتی ہے کہ جب بیٹی نے باپ سے شوہر کی شکایت کی تو تلوار لے کر امام کی خواب گاہ میں پہنچ گیا۔ اور اپنی دانست میں تلوار سے جسم اقدس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ وہ تو مالک کائنات کا کرم تھا کہ امام کو بچا لیا ورنہ حکومت نے تو بیٹی کے بیوہ ہونے کی بھی کوئی پرواہ نہیں کی تھی اور بیٹی بھی ایسی ظالم کہ جب سے امامؑ کے عقد میں آئی سوائے شکایت کے کوئی کام نہیں تھا۔ روزانہ باپ سے [illegible] بھائی سے شکایت۔ عزیزوں سے شکایت۔ یہاں تک کہ مامون نے عاجز آ کر امام کو مدینہ بھیج دیا۔ ام الفضل کو وہاں میدان اور وسیع مل گیا اور جب دیکھا کہ حضرت نے عقد ثانی بھی فرما لیا ہے اور اس کی طرف حسب دلخواہ توجہ نہ فرماتے تو باپ کو شکایتی خطوط لکھنا شروع کر دیئے۔ جب باپ نے کوئی توجہ نہیں کی اور تھوڑے عرصہ کے بعد اس کا انتقال ہو گیا تو بھائی کے پاس خطوط جانے لگے۔ آخر عاجز آ کر بھائی نے امامؑ کو مدینہ سے بغداد طلب کیا اور اب یہ طے کیا کہ امام کو ان شکایتوں کے بدلے سزا دی جائے گی۔ امامت کا قصور کیا ہے حکومت جانے۔ البتہ تاریخ کا اعتراف ہے کہ امامؑ کی شہادت کے بعد ام الفضل نے خود یہ اعلان کیا کہ میں نے ان کے اوپر بڑا ظلم کیا ہے اور انہوں

نے کبھی میرے ساتھ کوئی برائی نہیں کی۔ وقت گذرتا رہا اور بہانے تلاش ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک دن معتصم نے ام الفضل کو راضی کر لیا اور حضرت کو انگور میں زہر دلوا دیا۔ اور ایک روایت کی بنا پر اپنے غلام کے ذریعہ شربت بھیجا اور حضرت نے اسے پی کر فرمایا "رِضًا بِقَضَائِهٖ وَتَسْلِيمًا لِأَمْرِهٖ" اور زہر کا اثر سارے جسم میں دوڑ گیا۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ معتصم نے اپنے وزیر کے ذریعہ حضرت کی دعوت کی اور زہر آلود کھانا دیا جیسے ہی حضرت نے دو لقمے نوش فرمائے زہر کا اثر شروع ہو گیا۔ آپ اٹھ کھڑے ہوئے۔ وزیر نے کہا اور نوش فرمایئے۔ آپ نے فرمایا کہ تیری مراد کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ اور یہ کہہ کر بیت الشرف میں تشریف لائے۔ بستر پر کروٹیں بدلتے رہے اور بالآخر ۲۹ ذی قعدہ سنہ ۲۲۰ھ کو دنیا سے رحلت فرمائی۔ آپ کا ایک شریک کار تھا اسے مدینہ میں اپنے امور کا مہتمم بنا کر تشریف لائے تھے۔ وہ کہتا ہے کہ میں امام علی نقیؑ کی خدمت میں حاضر تھا کہ ایک مرتبہ آپ نے ایک تختی کو سامنے رکھ کر کچھ دیکھنا شروع کیا اور تھوڑی دیر کے بعد اندر تشریف لے گئے اور بیت الشرف میں کہرام برپا ہو گیا۔ میں نے عرض کی فرزند رسولؐ خیر تو ہے فرمایا میرے بابا نے انتقال فرمایا۔ اس کے بعد باعجاز کاظمین تشریف لے گئے اور اپنے پدر بزرگوار کی تجہیز و تکفین فرما کر اسی مقام پر دفن فرمایا جہاں آج قبر مطہر موجود ہے۔

ارباب عزا! مسافرت کا عالم۔ گھر دور۔ اہل وطن دور۔ بیٹا دور اعزا دور۔ زہر کا اثر۔ پیاس کی شدت۔ کون تھا جو پانی حاضر کرتا کون تھا جو دوا لا کر دیتا۔ لیکن بہر حال کوئی نہ کوئی پیدا ہو گیا۔ جس نے وقت آخر سہارا دے دیا۔ امام علی نقیؑ بھی باعجاز آ گئے۔ غربت میں جنازہ اٹھ گیا۔

بیٹے کے ہاتھوں سے باپ کا لاشہ دفن ہوگیا۔ مگر ہائے حسینؑ غریب وطن سے دور مگر اہل وطن قریب۔ گھر دور مگر اعزا سب خیمہ میں۔ بہن موجود بیٹی موجود وارث موجود۔ مگر اللہ رے بیکسی۔ تین دن تک جنازہ ریگ گرم کربلا پر پڑا رہا اور کوئی دفن و کفن کرنے والا نہیں تھا۔

میں کہوں گا اے امامؑ علی نقی آپ کے لئے یہ صدمہ بہت سخت ہے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ آپ کے باپ کو زہر دیا گیا۔ لیکن شہادت کے بعد آپ کو گرفتار نہیں کیا گیا۔ مگر ہائے امام زین العابدینؑ۔ شہادت کے بعد ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پیروں میں بیڑیاں۔ گلے میں طوق خاردار۔ کوفہ و شام کا سفر۔ ماں بہنوں کے کھلے سر منادی کی آواز تماشائیو! تماشا دیکھو یہ اولاد رسولؐ قید ہو کر جا رہی ہے۔ ہائے وہ کوفہ ہائے وہ شام وہ باپ کا سر وہ نوک نیزہ وہ بیٹے کی غربت وہ طوق و سلاسل کس سے کہیں اور کون سنے۔ ایک مرتبہ جب ایک مرد اجنبی مل گیا تو فرمایا بھائی ہم اولاد رسولؐ ہیں جنہیں یوں قیدی بنایا گیا ہے۔ ہم ذلیل کئے جا رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا کوئی والی و وارث ہی نہیں ہے۔ کاش آج رسولؐ اللہ ہوتے اور یہ منظر دیکھتے کہ یزید کا دربار۔ شامیوں کا مجمع۔ سیدانیوں کے کھلے سر۔ یزید کے ہاتھ میں چھڑی۔ امام حسینؑ کا سر اقدس۔ یا رسول اللہ آیئے۔ اپنی اولاد کا عالم تو دیکھئے۔ اپنی زینبؑ کو دیکھئے۔ اپنی ام کلثومؑ کو دیکھئے۔

شامیان بستند باز و زینبؑ و کلثومؑ را
اے فلک ان ابتدا ایں انتہائے اہلبیتؑ

انا للہ وانا الیہ راجعون
وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنقَلَبٍ يَنقَلِبُونَ

امام علی نقی علیہ السلام

اسم مبارک	علیؑ
لقب	نقی، ہادی
کنیت	ابوالحسن ثالث
والد ماجد	امام محمد تقیؑ
والدہ ماجدہ	جناب سمانہ
ولادت	۵ رجب ۲۱۴ھ جمعہ مدینہ منورہ
شہادت	۳ رجب ۲۵۴ھ شنبہ سامرہ
عمر مبارک	۴۰ سال
قبر مطہر	سامرہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین خاتم النبیین سیدنا ومولانا ابی القاسم محمدؐ وآلہ الطیبین الطاہرین ولعنۃ اللہ علی اعدائہم اجمعین اما بعد فقد قال اللہ الحکیم فی کتابہ الکریم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اِنَّ عَلَیْنَا لَلْھُدٰی وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَۃَ وَالْاُوْلٰی

مالک کائنات کا ارشاد ہے کہ "بیشک ہدایت کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے اور دنیا و آخرت کا اختیار ہمارے ہاتھوں میں ہے۔

اس ارشاد نے صاف واضح کر دیا کہ رب العالمین نے ہر دور بشریت میں ہدایت کا مکمل انتظام کیا ہے۔ کتابیں بھیجی ہیں۔ صحیفے نازل کئے ہیں۔ انبیاء مقرر کئے ہیں۔ اولیاء کا سلسلہ قائم کیا ہے۔ صاحبان کمالات و کرامات کو معین کیا ہے اور کوئی دور ایسا نہیں چھوڑا کہ زمانہ حجت خدا سے خالی رہ جائے اور بندوں کی حجت رب العالمین پر تمام ہو جائے۔ یہ اور بات ہے کہ بندوں نے اس کے انتظام سے فائدہ نہیں اٹھایا اور ہر دور میں اپنا ایک الگ نظام بنائے رہے۔ کبھی فرعونیت کی شکل میں سر اٹھایا کبھی نمرودیت کی صورت میں خدائی کا دعویٰ کیا کبھی شداد و قارون بن کے دولت و اقتدار کا مظاہرہ کیا۔ لیکن یہ گوارا نہ کیا کہ نمائندگان پروردگار کے سامنے سر تسلیم جھکا دیں اور یہ اعتراف کر لیں کہ قدرت کا انتظام بندوں کے انتظام سے بہتر ہے۔ بات صرف یہ ہے کہ ہر شخص کے ذہن میں یہ نکتہ تھا کہ اگر الٰہی انتظام کو قبول کر لیا تو ہمارا ٹھکانا کہاں ہوگا۔ وہاں صاحبان علم و کردار کی ضرورت ہے۔ وہاں عصمت و عفت کی ضرورت ہے۔ وہاں کمالات و کرامات لازم ہیں اور یہاں جہالت و عیاری، بدکاری و شراب خواری۔ عیاشی

و بدکرداری کے سوا کچھ نہیں ہے۔ الٰہی نظام میں ہمارا کیا مرتبہ ہوگا۔ یہ نظام رائج ہو گیا تو اپنے حصے میں تازیانوں اور کوڑوں کے سوا کچھ نہ آئے گا۔ شراب پئیں گے تو حد ــــ زنا کریں گے تو حد ــــ چوری کریں گے تو حد ــــ قتل نفس کریں گے تو قصاص ــــ بدعملی اور بدکرداری کا مظاہرہ کریں گے تو سزا غرض کہ زندگی کے ہر موڑ پر سوائے پریشانی کے کچھ نہ ہوگا۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ اپنا نظام خود بنائیں اور اتنا مستحکم بنائیں کہ اللہ والوں کو جینے کا موقع ہی نہ ملے نہ ان کے ہاتھ میں اقتدار ہوگا نہ یہ سزا دینے پر قادر ہوں گے۔ نہ ان کے قبضہ میں ملک دنیا ہوگا نہ یہ ہمارے تخت و تاج پر قبضہ کر سکیں گے۔ ملک خدا کا ہوگا اور حکومت ہماری ہوگی۔ کائنات خدا کی ہوگی اور اقتدار ہمارا ہوگا۔ یہ نسخہ روز اوّل سے ابلیس نے تجویز کیا تھا۔ اور اسی پر ایک کائنات چلتی رہی اور آج تک چل رہا ہے۔ اس نے روز اوّل سمجھایا تھا کہ دیکھو اگر آزادی کی زندگی گذارنا ہے۔ اپنے اختیارات و حقوق کو محفوظ رکھنا ہے۔ دنیا میں سکون و چین سے رہنا ہے تو بہترین راستہ یہی ہے کہ خدا کو مانو اور خدا والوں کو نہ مانو۔ خدا تمھاری حکومت کے مقابلے میں حکومت نہ کرے گا۔ لیکن نمائندگان خدا سے ٹکراؤ ہو جائے گا۔ اور وہ جینے نہ دیں گے۔ بہتر یہی ہے کہ ان کی عظمت کے سامنے سر نہ جھکاؤ اور ان کی بلندی سے انکار کرتے رہو۔ مجھے خدا سے کوئی اختلاف نہیں ہے۔ میں نے اس کو لاکھوں سجدے کئے ہیں اور اب بھی کر سکتا ہوں لیکن میں آدمؑ کے ہاتھوں اپنے ہاتھ نہیں کٹا سکتا۔ میں اپنے اختیارات کو برباد نہیں کر سکتا۔ میں نے ایک سجدہ کا انکار کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے راحت پالی۔ اب مجھ سے کوئی مطالبہ ہوگا نہ سوال و جواب۔ تم مسلمان ہو کہ صبح و شام واجب و حرام کے جھگڑے میں پڑے ہو اور تمھیں کلمہ سے فرصت نہیں ملتی۔ میں شیطان ہوں کہ پوری راحت سے زندگی گذار رہا ہوں۔

اور جسے چاہتا ہوں بہکا دیتا ہوں۔ یہ سب طفیل ہے اس ایک جرأت رندانہ کا جس کا مظاہرہ میں نے روز اول کیا تھا اور آج تک اس کے مزے لے رہا ہوں۔ میں نے آدمؑ کو سجدہ کر لیا ہوتا تو آج تک ملائکہ کی طرح سجدہ ہی کرتا رہتا اور بندگی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آتا۔ دیکھو بندگی چھوڑنے کا فائدہ کیا ہوا کہ فرعون جیسا رب اعلیٰ۔ نمرود جیسا خدا۔ شداد جیسا مالک جنت۔ قارون جیسا سرمایہ دار ابوسفیان جیسا عیار، یزید جیسا ظالم۔ حجاج جیسا سفاک۔ متوکل جیسا بدکردار سب میرے ہی غلام ہیں۔ انبیاء کی غلامی چھوڑ کر اتنے بڑے سلاطین کی شاہی ملی اور سب کو اپنے اشاروں پر نچا رہا ہوں۔ کسی کو سجدہ سے روکا۔ کسی کو بندگی سے روکا۔ کسی کو نماز سے روکا۔ کسی کو عبادت سے روکا۔ کسی سے شراب پلوا دی۔ کسی کو زنا پر آمادہ کر دیا۔ کسی کو قاتل بنا دیا۔ کسی کو لٹیرا بنا دیا۔ کسی کو سود میں پھنسا دیا کسی کو عیاشی میں [illegible] دیا۔ کسی سے ماں بہن کی عزت لٹوا دی۔ کسی سے بھائی اور باپ کا قتل کرا دیا۔ غرض کہ جو چاہا وہ کیا۔ کوئی مجھے روکنے والا نہیں ہے اور جس کے روکنے کا خطرہ تھا اس نے بھی مہلت دے دی ہے۔ اب یہ ہے میرا اقتدار اور یہ ہے میرا اختیار ـــــ میں نے نمائندگان پروردگار کو چھوڑ کر بڑے عیش کیے ہیں۔ تمھیں بھی عیش کی زندگی گزارنا ہے تو کسی نمائندۂ پروردگار کے سامنے سر نہ جھکانا ـــــ اور دیکھو اگر ماننا ہو تو کتابوں کو ماننا۔ افراد کو نہ ماننا۔ کتابیں بدل سکتی ہیں۔ ان میں تحریف ہو سکتی ہے۔ ان کی غلط تاویل ہو سکتی ہے لیکن افراد پر تصرف ممکن نہیں ہے۔ ان سے ہر آن خطرہ ہی خطرہ ہے۔ دیکھو میں نے یہودیوں سے کہہ دیا کہ کتاب کو لے لو اور موسیٰ کو چھوڑ دو۔ میں نے عیسائیوں سے کہہ دیا کہ انجیل کو لے لو اور عیسیٰ کو سولی پر چڑھا دو۔ رند کے رند رہو گے ہاتھ سے جنت بھی نہ جانے پائے گی۔ دیکھو یہودی اور عیسائی کتنے مزے

میں رہے۔ جیسی چاہی کتاب بنائی۔ جیسی چاہی ترمیم و تحریف کی اور آج ساری دنیا میں اہل کتاب بنے ہوئے ہیں۔ ایک تم مسلمان ہو کہ تمھاری عقل میں کچھ نہیں آتا۔ کتاب کے ساتھ نبی کا کلمہ پڑھ رہے ہو اور انھیں بھی لیے ہوئے ہو اچھا دیکھو اگر مصلحتاً یہ غلطی کر لی ہے تو کوئی حرج نہیں ہے لیکن اس کا خیال رکھنا کہ جیسے ہی نبی درمیان سے اٹھنے لگیں فوراً ہوشیار ہو جانا اور کتاب لے کر افراد سے انکار کر دینا ورنہ قیامت تک پریشانی میں گرفتار رہو گے۔

ارباب کرم! یہ پرانا نسخہ ہے جو ہر دور میں آزمایا گیا ہے اور شیطان نے اپنے شاگردوں کو اس کے استعمال پر آمادہ کیا ہے اور عمل بھی کرایا ہے لیکن یہ قدرت کا انتظام ہے کہ اس نے کہا ابلیس! تو سب کچھ کر سکتا ہے۔ لیکن تو یہی کہ تو خود ہی اقرار کرے کہ میرے مخلص بندوں کو گمراہ نہیں کر سکتا۔ اور میرا انتظام بھی یہی ہے کہ ہر دور میں مخلصین رہیں تاکہ میری حجت تمام رہے اس کے بعد تو سب کا فیصلہ قیامت پر رکھا گیا ہے اسی دن تیرا بھی فیصلہ ہوگا اور تیرے نمائندوں کا بھی فیصلہ ہوگا۔

عزیزان محترم! ـــــ شیطان نے اس حد تک گمراہ کیا کہ الٰہی نظام کے بلند کردار بندوں کے سامنے ایسے ایسے افراد کو لایا گیا جن کے بارے میں یہ تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ ان کی کوئی حیثیت ہے۔ ذرا غور تو کیجیے۔ کہاں جناب ابراہیمؑ اور کہاں نمرود۔ کہاں جناب موسیٰ اور کہاں فرعون۔ کہاں جناب عیسیٰ اور کہاں یہودی۔ کہاں حضور سرور کائناتؐ اور کہاں ابوسفیان۔ کہاں مولائے کائنات اور کہاں حاکم شام۔ کہاں سرکار سید الشہداءؑ اور کہاں یزید۔ کہاں ائمہ معصومینؑ اور کہاں ہشام و عبدالملک و متوکل و منصور جیسے بدمست شرابی ـــــ اور اس پر ہوس یہ ہے کہ کہیں بھی اللہ

والوں کی طرح بلند کردار مانا جائے چنانچہ تاریخ کا واقعہ ہے کہ متوکل عباسی نے اپنے دور کے عظیم ترین ادیب ابن سکیت سے پوچھا کہ بتاؤ تمہاری نظر میں علیؑ کے فرزند حسنؑ و حسینؑ کا مرتبہ زیادہ بلند ہے یا میرے فرزند منتصر و معتز کا؟ ابن سکیت نے گھبرا کر کہا۔ امیر یہ کیا کہہ رہا ہے کہاں فرزند رسولؐ حسنؑ و حسینؑ اور کہاں تیرے فرزند ـــ کیا مقابلہ ہے ان دونوں کا۔ اور کیا ربط ہے ان دونوں میں۔ متوکل کو غیظ آگیا اور حضرات حسنینؑ کی شان میں گستاخی شروع کر دی۔ لیکن تاریخ نے واضح کر دیا کہ صاحبان کمال کے کمال کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ گالیاں دینا آسان ہے کمال کا انکار ناممکن ہے۔ اور میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ بھی قدرت کا انتظام تھا کہ متوکل اپنے سامنے سوال کرے اور ابن سکیت اسی کے سامنے جواب دے دیں تاکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یہ فیصلہ ہو جائے کہ اہلبیتؑ کا مقابلہ ممکن نہیں ہے اور امت کا مرتبہ بہر حال اہلبیتؑ سے پست تر ہوتا ہے اور مقابلہ ممکن بھی کیونکر ہو سکتا ہے۔ ایک طرف وہ امت ہے جو سرکار دو عالمؐ کے قدموں کو سر پر رکھنے کو شرف سمجھتی ہے۔ اور ایک طرف وہ شہزادے ہیں جن کی منزل دوش رسولؐ اور پشت رسالت پر ہو اور جن کی بلندی کا یہ عالم ہے کہ اگر کوئی کہہ دیتا ہے کہ کیا کہنا کیا عمدہ سواری ہے تو سرکارؐ ٹوک کر فرماتے ہیں۔ خبردار یہ نہ کہو۔ یہ کہو کہ کیا اچھے سوار ہیں۔ سواری پر نگاہ رکھنا ناقص ذہنیت ہے اور سوار پر نگاہ رکھنا کمال انسانیت ہے۔ صلوات

یہی ایک موقع نہیں متوکل کی پوری زندگی اسی فکر میں گذری ہے کہ دنیا مجھے اللہ والوں کے برابر سمجھ لے۔ اور اللہ کے نمائندوں کو یوں تباہ و برباد کر دیا جائے کہ دنیا عاجز آکر ہماری طرف متوجہ ہو جائے۔ لیکن میں کہوں

گا متوکل یہ فکر بیکار ہے۔ یہ تجربہ پہلے ہو چکا ہے اور ناکام ہو چکا ہے۔ اب دوبارہ تجربہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کل ابرہہ نے بھی یہی سوچا تھا کہ خانۂ کعبہ کو منہدم کر دیا جائے تو قوم مجبور ہو کر میرے گرجا کو سجدہ کرے گی۔ لیکن تاریخ نے واضح کر دیا کہ گرجا گر سکتا ہے عظمت کعبہ مجروح نہیں ہو سکتی۔ تو نے یہ سوچا تھا کہ قبر حسینؑ کا نشان مٹ جائے گا تو تیرے باپ دادا کے مقبروں کی عظمت بڑھ جائے گی۔ امام علی نقیؑ نظر بند رہیں گے تو قوم تجھے اپنا رہنما مان لے گی لیکن تاریخ گواہ ہے کہ نہ تیرے باپ دادا کی قبروں کا کوئی نشان ہے اور نہ تجھے مذہبی قیادت کا شرف مل سکا ہے۔ چند روزہ حکومت ضرور رہی لیکن جس شان سے آئی تھی اسی شان سے چلی گئی۔ اور بیٹے ہی نے باپ کو تہ تیغ کرا دیا۔ آل محمدؐ کا دامن بے داغ بھی رہا اور تجھے تیرے کردار کی سزا بھی مل گئی۔ قدرت کا یہ بھی ایک انتظام ہے کہ جب کوئی اللہ والوں سے ٹکراتا ہے تو آپس ہی میں تباہی کے سامان مہیا ہو جاتے ہیں۔ اور اللہ والوں کو کوئی اقدام کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ پوری تاریخ اسلام پڑھ ڈالیں۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ خلفاء کو خلفاء ہی نے قتل کرایا ہے۔ سلاطین کو سلاطین ہی نے مارا ہے۔ شہنشاہوں کو شہنشاہوں ہی نے قتل کرایا ہے۔ لیکن کسی امامؑ کے دامن پر کسی امامؑ یا خلیفہ کے خون کا دھبہ نہیں ہے۔ یہ علامت ہے کہ اقتدار خون بہانے کے لئے آتا ہے اور امامت خون بچانے کے لئے آتی ہے۔

دنیا نے جتنا ذلیل کرنا چاہا۔ قدرت نے اتنی ہی عزت دی۔ تاریخ کے بے شمار واقعات ہیں جن سے یہ حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے لیکن یہاں صرف چند مثالوں کی طرف اشارہ کر دینا کافی ہے۔ متوکل کا دور ہے۔ امام علی نقیؑ مدینہ میں قبر رسولؐ کے پاس علوم دین کی نشر و اشاعت فرما رہے ہیں۔ نہ حکومت

سے مطلب نہ اقتدار سے غرض۔ اپنا دین اپنا مذہب۔ اپنا فرض اپنا منصب اور بس۔ لیکن حکومت کے ہواخواہوں کو سکون نہ ملا اور متوکل کے پاس شکایت کی کہ حضرت علی نقیؑ مدینہ میں حملہ کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ فوج اکٹھا ہو گئی ہے سامان فراہم ہو گیا ہے۔ عنقریب حملہ ہونے والا ہے۔ متوکل شراب کے نشہ میں دیوانہ، سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ کوئی راستہ سمجھ میں نہ آیا تو ایک ہی راہ سامنے آئی کہ اپنے پیش رو بادشاہوں کی طرح امام کو اپنے پاس بلا کر نظر بند کر دیا جائے اور یہ خطرہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔ چنانچہ ہرثمہ کی قیادت میں تین سو سپاہیوں کا لشکر اس خط کے ساتھ روانہ کیا کہ آپ کی زیارت کا بے حد اشتیاق ہے۔ میں حاضر ہونے سے معذور رہوں۔ آپ زحمت فرما کر تشریف لے آئیں۔ آپ کے احترام کے لیے فوج روانہ کر رہا ہوں۔ آپ کے حقوق کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے گا۔ مجھے یہی شرمندگی کھائے جا رہی ہے کہ میں آپ کے حقوق کو ادا نہ کر سکا اور آپ کے آداب کا باقاعدہ لحاظ نہ رکھ سکا۔ خیر۔ اب گذارش ہے کہ فوراً تشریف لے آئیں۔ جب تک آپ تشریف نہ لائیں گے میرے ذہن کو سکون نہ ملے گا۔

ایسا خلوص آمیز خط کہ انسان دور سے دیکھ کر دھوکہ کھا جائے۔ لیکن کیا کہنا نگاہِ امامت کا۔ پہچان گئے کیا مقصد ہے۔ ایک ہفتہ کی مہلت لی۔ سامان سفر تیار کیا۔ گرمی کا زمانہ تھا لیکن سارے سردی کے کپڑے لحاف، توشک وغیرہ ساتھ لیا اور سات دن کے بعد روانہ ہوئے۔ اس شان کے ساتھ روانہ ہوئے کہ در و دیوار مدینہ کو حسرت سے دیکھ رہے تھے۔ قبر رسولؐ سے پٹ پٹ کر رو رہے تھے۔ اور اہل وطن کو یوں الوداع کہہ رہے تھے جیسے اب پلٹ کر آنا نہیں ہے۔ ادھر فوج کے آتے وقت درمیان راہ یہ واقعہ پیش آیا تھا کہ متوکل کی فوج

میں ایک محب اہلبیتؑ بھی تھا۔ دشمنان اہلبیتؑ اسے بات بات پر چڑھایا کرتے تھے اور وہ اپنے امکان بھر جواب دیا کرتا تھا۔ اتفاق سے یہ قافلہ ایک صحرا میں ٹھہرا اور طے ہوا کہ شب بسر کرنے کے بعد قافلہ آگے بڑھے گا۔ محب اہلبیت کو پھر لوگوں نے چھیڑا کہ تمہارے امام حضرت علیؑ نے فرمایا ہے کہ قیامت کے دن ہر زمین سے ستر ستر مردے اٹھائے جائیں گے۔ بھلا اس صحرائے لق و دق میں کون دفن ہوگا جو اٹھایا جائے گا۔ تمہارے امام بھی کیسی بے سر پیر کی باتیں کرتے ہیں۔ محب اہلبیتؑ نے حسب امکان جواب دیدیا تھا لیکن آج امامؑ کا انتظام دیکھ کر ظالموں کو پھر موقع مل گیا اور کہنے لگے۔ یہ علیؑ نقی بھی تو تمہارے امام ہیں جن کو سردی اور گرمی کا بھی فرق معلوم نہیں ہے۔ یہ قیامت کی گرمی صحرا کا سفر اور سردی کا سامان لے کر نکلے ہیں۔ جسے سرد و گرم زمانہ کا اندازہ نہیں ہے وہ امامت کا دعویٰ کرتا ہے۔ افسوس محب اہلبیتؑ یہ گفتگو سن کر شرمندہ ہو گیا۔ کہنے لگا میں جواب تو نہیں دے سکتا ہوں لیکن اتنا جانتا ہوں کہ جب میرے امامؑ نے سردی کا سامان لیا ہے تو انشاء بے محل نہ ہوگا۔ اب مصلحت کیا ہے یہ مجھے نہیں معلوم ہے میرے ایمان کا تقاضہ ہے کہ میں امامؑ کے ہر عمل کو صحیح سمجھوں۔ اب یہ تو وقت فیصلہ کرے گا کہ امامؑ کا کلام صحیح ہوتا ہے یا غلط۔ قافلہ روانہ ہوا اور جب دوبارہ اسی صحرا میں پہونچا تو ایک تیز آندھی کے آثار دکھائی دیے۔ آندھی کے ساتھ بارش کے آثار تھے تھوڑی دیر نہ گذری تھی کہ قیامت کی آندھی اور اس کے ساتھ غضب کی بارش۔ بارش میں زبردست اولے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سارا موسم تبدیل ہو گیا اور لوگ سردی سے اکڑنے لگے۔ سامان کسی کے پاس نہیں تھا۔ فرزند رسولؐ نے اپنا فاضل سامان ہرثمہ کے پاس بھیج دیا اور ہرثمہ نے دل ہی دل میں یہ کہا کہ میں مدینہ میں کہہ رہا تھا کہ انہیں

کیا ہوگیا ہے یہ کیسا سامان کر رہے ہیں۔ لیکن اب اندازہ ہوا کہ خاندان رسالت کی بات ہی اور ہوتی ہے۔ سردی بڑھی اور اتنی بڑھی کہ پچاسوں آدمی ڈھیر ہوگئے۔ صبح ہوئی تو لاشوں کا ایک انبار تھا۔ ہرثمہ نے گھبرا کر کہا فرزند رسولؐ اب کیا کیا جائے آپ نے فرمایا کہ سب کو یہیں دفن کر دو اور آگے بڑھو۔ لاشیں دفن ہوئیں اور جب لاشیں دفن ہوگئیں تو آپ نے فرمایا ہرثمہ دیکھو میرے جد نے کس قدر سچ کہا تھا کہ ایک ایک زمین سے ستر ستر مردے اٹھائے جائیں گے۔ لوگ میرے دوست مذاق اڑا رہے تھے۔ اب معلوم ہوگیا کہ مردے کس طرح اٹھیں گے اور سردی کا سامان کیوں ساتھ لیا گیا ہے۔ کہاں ہے وہ شخص جو میرے دوست کا مذاق اڑا رہا تھا اور میرے جد کی تکذیب کر رہا تھا؟ تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ وہ بھی لقمۂ اجل بن چکا ہے۔

یہ ہے امامت کا اقتدار کہ جو زبان سے کہہ دیا وہ ہو کر رہا۔ اور کیوں نہ ہو۔ یہ ترجمان مشیت ہیں جو بغیر مشیت الٰہی کے کلام بھی نہیں کرتے۔ اور چاہتے ہی وہ ہیں جو خدا چاہتا ہے۔ حکومت کی باگ ڈور سنبھال لینا آسان ہے۔ موت و حیات پر قبضہ پا لینا مشکل ہے۔ یہ صرف اسی گھرانے کا شرف ہے جہاں ملک الموت بھی بلا اجازت قدم نہیں رکھتے۔

لیکن افسوس یہ ہے کہ اس کے بعد بھی متوکل کو عقل نہ آئی اور اس نے حضرت کے سامرہ پہونچنے کے بعد حکم دیدیا کہ آپ کو فقراء و مساکین کے مسکن پر ڈال دیا جائے اور وہیں پڑا رہنے دیا جائے۔ تین دن حضرت کو اسی مقام پر مقیم رکھا گیا اور متوکل نے ملاقات کا موقع نہیں دیا تاکہ حضرت کی توہین ہو جائے اور حضرت کا یہ عالم ہے کہ شکر خدا کر رہے ہیں کہ جب تک منحوس بادشاہ کی شکل نہ دیکھیں اسی وقت تک بہتر ہے۔ رفتہ رفتہ شہر میں یہ خبر پھیل گئی کہ فرزند رسولؐ

کو مدینہ سے بلا کر فقراء و مساکین کے ساتھ ڈال دیا گیا ہے۔ ایک چاہنے والا صالح بن سعید بیتاب ہو کر خدمت میں حاضر ہوا۔ فرزند رسولؐ! یہ ظلم؟ متوکل کا یہ برتاؤ؟ اب تو آپ پہچان گئے کہ یہ سلاطین کس قدر منافق ہیں اور کس طرح دھوکہ دیتے ہیں۔ کہاں آپ اور کہاں یہ جگہ؟ فرزند رسولؐ خاموش سنتے رہے اور آخر میں مسکرا دیئے۔ سعید آخر اس طرح گھبراتے کیوں ہو؟ مجھے یہاں کوئی تکلیف نہیں ہے۔ میں سکون سے زندگی گذار رہا ہوں۔ فقراء کے پاس رہنے سے وہ گھبرائے جو شاہوں کے محلوں میں رہا ہو۔ ہم نے تو ہمیشہ فقیروں کے ساتھ زندگی گذاری ہے۔

لیکن فرزند رسولؐ! یہ بڑی تکلیف دہ جگہ ہے۔ فرمایا سعید ذرا اپنے داہنے بائیں دیکھو کیا نظر آرہا ہے۔ اب جو سعید نے دیکھا تو طرح طرح کے باغات بہترین سبزہ، عمدہ بہاریں۔

عرض کی فرزند رسولؐ یہ کیا ہے؟ فرمایا سعید ہمارے اختیار میں سب کچھ ہے۔ لیکن ہم دنیا میں عیش کرنا نہیں چاہتے۔ ہم نے اپنا عیش آخرت کے لئے اٹھا رکھا ہے۔ یہاں اہل دنیا کو آرام کر لینے دو۔ ہم اسی طرح زندگی گذاریں گے۔ ہمیں اپنی فکر نہیں ہوتی صرف اپنے چاہنے والوں کی فکر ہوتی ہے۔

سعید خاموش ہوگئے۔ تین دن کے بعد حضرت کو اس سرائے سے زراقی کے گھر منتقل کر دیا گیا کہ وہاں نظر بند رہیں گے۔ اور وہ اذیت بھی پہنچائے گا لیکن حضرت نے اپنے حسن کردار سے اسے بھی رام کر لیا اور اس حد تک رام کر لیا کہ جب ایک چاہنے والا ملاقات کے لئے آیا اور زراقی نے پوچھا کیسے آنا ہوا؟ تو اس نے کہا کہ آپ کی ملاقات کے لئے چلا آیا تھا۔ زراقی نے کہا نہیں تم اپنے امامؑ کی زیارت کے لئے آئے ہو۔ اس نے بہانہ کرنا چاہا۔

زراقی نے کہا اب مجھ سے نہ چھپاؤ۔ مجھے انہوں نے اپنا گرویدہ بنا لیا ہے۔ صبح و شام کی عبادت اور ہر آن کا سجدۂ شکر مجھے اپنا بندہ بے دام بنا چکا ہے۔

اللہ عجب شان بندگی ہے کہ ہر وقت عبادت و تلاوت اور سامنے قبر کہ کسی آن خوف خدا ذہن سے نہ جانے پائے۔ بھلا اس کردار کے لوگ کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ یہ میرا مقدر ہے کہ وہ میرے پاس ہیں۔ چاہنے والا مطمئن ہو گیا اور زراقی کے اس برتاؤ سے خوش ہوا۔ اور قدرت نے آواز دی دنیا والو! فرعون کے قصر میں موسیٰ کی پرورش دیکھی ہے تو متوکل کی حراست میں امام علی نقیؑ کا سکون و اطمینان بھی دیکھ لو۔

وقت گذرتا رہا۔ آخر متوکل نے عاجز آ کر آپ کو سعید کی حراست میں دیدیا یہ ظالم بڑا دشمن اہلبیتؑ تھا۔ ایک چاہنے والا حضرت کی ملاقات کو گیا تو کہنے لگا اپنے خدا سے ملنے آئے ہو۔ مل لو۔ کل تک انھیں قتل کر ڈالا جائے گا۔ زائر پریشان ہو گیا۔ خدمت امامؑ میں عرض کرتا ہے کہ مولا آپ کے قتل کا ارادہ ہو رہا ہے۔ فرمایا بھائی پریشان نہ ہو ابھی میرا وقت نہیں آیا ہے۔ مجھے کوئی قتل نہیں کر سکتا۔ عرض کی مولا۔ وہاں قبر بھی تیار ہو گئی ہے۔ فرمایا ہاں۔ مگر مجھے قتل نہیں کیا جا سکتا۔ زائر مطمئن ہو گیا اور امامؑ اسی طرح بارہ سال حراستوں کی زندگی گذارتے رہے۔ یہاں تک کہ فتح بن خاقان کو متوکل کی وزارت نصیب ہوئی اور انہوں نے موقع پا کر یہ تحریک چلائی کہ شہر سے باہر جتنی غیر آباد زمینیں ہیں انھیں عوام کے ہاتھ فروخت کر دیا جائے تاکہ ان کی آبادکاری کا کام انجام پا سکے اور حکومت پر کوئی بار بھی نہ پڑے۔ اور متوکل نے اس تحریک کو قبول کر لیا۔ فتح نے موقع پا کر ایک قطعہ زمین امام علی نقیؑ کے نام فروخت کر دی اور بیعنامہ نوٹ لگا دیا کہ اس زمین کی قیمت وصول ہو چکی ہے۔ انھیں معلوم تھا کہ متوکل

حضرت کے نام قرض زمین دینے پر راضی نہ ہوگا۔ اسے معلوم ہے کہ میں محب اہلبیتؑ ہوں۔ اس نے تو مجبوراً وزارت کا عہدہ دے رکھا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جب متوکل نے فہرست طلب کی اور اس میں حضرت کا نام دیکھا تو آگ بگولہ ہو گیا یہ انھیں زمین کیوں دی گئی ہے۔ کیا میں اپنے ملک میں انھیں بسا کر اپنے لئے خطرہ مول لوں گا۔ لیکن جب یہ نوٹ دیکھا کہ قیمت وصول ہو چکی ہے تو خاموش ہو گیا۔ اور حالات کا انتظار کرتا رہا۔ حضرت نے مختصر سا مکان بنا لیا اور اپنے مکان میں منتقل ہو گئے لیکن متوکل کو قرار کہاں؟ — ایک ایسا انسان جسے غریب الوطن بنا دیا گیا ہے اور جس کی خاطر یہ ہے کہ اسے فقیروں کے درمیان رکھا گیا ہے۔ جس کی عزت یہ ہے کہ اسے مسلسل حراستوں اور نظربندیوں میں رکھا گیا ہے۔ جس کے دل کا یہ عالم ہے کہ صبح و شام قبر حسینؑ کی بے حرمتی کی آوازیں کانوں میں آرہی ہیں۔ اور کلیجہ پانی ہوا جا رہا ہے۔ اس سے کسی انقلاب کی کیا توقع ہو سکتی ہے۔ انقلاب تو اس وقت نہ کیا جب بنی عباس قیادت کے طالب تھے۔ انقلاب اس وقت نہ کیا جب علوی سادات عباسیوں سے انتقام لینے پر تلے ہوئے تھے تو اب انتقام اور انقلاب کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔ لیکن چور کا دل ہی کتنا ہوتا ہے۔ حکومت کو ہر آن یہی خطرہ ہے کہ کہیں انقلاب نہ ہو جائے۔ کہیں تخت قدموں کے نیچے سے نکل نہ جائے۔ کہیں، حالات بدل نہ جائیں کہیں زمانہ کروٹ نہ لے لے اور اسی ایک توہم پر امامؑ کو مسلسل اذیتیں دی جا رہی ہیں۔ مختلف بہانوں سے "برکۃ السباع" میں بھیجا گیا جہاں ایسے درندے پالے گئے تھے کہ ایک لمحہ انسان کو برداشت نہیں کر سکتے تھے اور جب کسی کو سزا دینا ہوتی تھی وہیں بھیج دیا جاتا تھا اور وہ لمحوں میں جانوروں کا لقمہ اجل بن جاتا تھا۔ لیکن قدرت کا انتظام کہ جانوروں نے قدموں پر سر رکھ دیئے اور گویا تعظیماً سجدہ کر کے بتا دیا کہ انسانو! تم اسکی

قدر نہیں جانتے ہو ہم جانور اس کی عظمت کو پہچانتے ہیں۔ کاش تم ہماری ہی برادری سے ہوتے تو کم از کم اس کی عظمت تو پہچانتے لیکن کیا کرو۔ قرآن حکیم نے سچ کہا ہے کہ کچھ انسان جانوروں جیسے ہیں بلکہ ان سے بھی بدتر ہیں اور ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔ تم جانوروں سے بدتر ہو اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ تمہارے بزرگ ایک جانور کے پیچھے پوری لڑائی لڑ چکے ہیں۔

تم سے کسی خیر کی کیا توقع ہو سکتی ہے۔ تم نے مراتب کو نہیں پہچانا۔ ہم نے پہچان لیا۔ اور احترام بھی کیا ـــــ لیکن افسوس کہ حکومت کو اب بھی ہوش نہ آیا۔ اور نئی ترکیب یہ اختیار کی گئی کہ جب بھی امامؑ دربار میں آئیں کوئی پردہ نہ اٹھائے اور انہیں ذلیل کیا جائے۔ قدرت کا انتظام دیکھئے کہ جیسے ہی آپ تشریف لے آئے ایک تیز ہوا چلی اور پردہ خود بخود اٹھ گیا۔ سامنے آئے تو خود بادشاہ تعظیم کے لئے کھڑا ہو گیا۔ غلاموں کو حکم دیا گیا تھا کہ جیسے ہی امامؑ آئیں انھیں قتل کرا دیا جائے۔ اور غلام تعظیم کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور جھک کر سلام کیا۔ بادشاہ سخت متحیر ہوا اور جب حضرت تشریف لے گئے تو غلاموں سے پوچھا یہ تم نے کیا کیا۔ عرض کی جو آپ نے کیا وہی ہم نے کیا۔ یہ جیسے ہی دربار میں آئے ایسا محسوس ہوا کہ ان کے ہمراہ کوئی شمشیر کف آ رہا ہے اور آواز دے رہا ہے خبردار قدم آگے نہ بڑھانا ورنہ کوئی ایک بھی زندہ نہ بچے گا۔ کیوں نہ ہو صاحب ذوالفقار کا فرزند ہے۔ اس کا لوہا آسمان والوں نے مانا ہے۔ زمین والوں کا کیا ذکر ہے۔

دربار میں توہین امامؑ کی ایک نئی شکل یہ نکالی گئی کہ دور شراب کو عام کر دیا گیا اور حضرت کو شراب پر مدعو کیا گیا۔ آپ نے فرمایا کہ ہم اہلبیتؑ شراب سے ذوق نہیں رکھتے۔ اس نے کہا اچھا رقص سے شوق فرمائیے۔ آپ نے فرمایا

ہم محرمات اور منکرات سے الگ رہتے ہیں۔ اس نے کہا شعر ہی سنائیے۔ فرمایا کہ میں شعر نہیں کہتا۔ اس نے کہا وہ تو آپ کو سنانا ہی پڑیں گے۔ مجبوراً آپ نے مولائے کائناتؑ کے چند شعر سنائے۔ جن کا مضمون یہ تھا: "وہ لوگ کہاں ہیں جن کے دروازوں پر ریشمی پردے پڑے رہتے تھے۔ جن کے سروں پر تاج رہا کرتے تھے ان کے چہروں کی رونق کہاں گئی۔ ان کی آرائش و زیبائش کیا ہو گئی۔ قضا و قدر نے انھیں تخت سے کھینچ کر زمین کے اندر پہونچا دیا۔ عیش و آرام رنج و غم میں بدل گیا۔ کیڑے ان کے جسم کو کھا رہے ہیں۔ بدترین منزل میں ان کا قیام ہے اور کسی کو ملنے تک کی اجازت نہیں ہے ـــــ یہ سننا تھا کہ متوکل بے ہوش ہو گیا۔ چیخ مار مار کر رونے لگا اور تمام جام و ساغر کو توڑ کر پھینک دیا۔ حضرت کو باعزت طریقہ سے رخصت کر دیا (منتہی الآمال) ـــــ اور قدرت نے آواز دی۔ دیکھا ہمارا انتظام۔ ہم جسے عزت دینا چاہتے ہیں اسے کوئی ذلیل نہیں کر سکتا۔ تو سہی کہ ہم تمہارے ہی دربار میں انقلاب نہ برپا کر دیں اور تمہارے ہی ہاتھوں تمھیں ذلیل نہ کر دیں۔

متوکل اس پر بھی ہوش میں نہ آیا اور جاسوسوں کے بیان پر اعتماد کر کے حضرت کے مکان کی تلاشی کا حکم دیدیا۔ جاسوس راتوں رات گھر میں داخل ہوئے چھت کی طرف سے آئے۔ حضرت مصلے پر تھے۔ فوراً اٹھ کر چراغ لے کر پہونچ گئے۔ آؤ۔ آؤ میرا گھر دیکھ لو۔ میں چراغ دکھائے دیتا ہوں کہ کہیں گر نہ پڑو۔

کائنات میں اس کردار کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ آنے والے شرمندہ ہوئے حضرت نے ایک ایک گوشہ کی تلاشی دی اور سوائے سامان عبادت کے کچھ برآمد نہ ہوا۔ لوگوں نے متوکل کو خبر کی۔ اس نے دربار میں طلب کیا اور بظاہر احترام کیا لیکن بنی عباس کی روش معلوم ہے۔ وہ کبھی آلِ محمدؐ کا وقار برداشت ہی نہیں

کرسکتے۔ ان کے مظالم بنی امیہ سے بدتر ہیں۔ بنی امیہ نے زندگی میں مظالم ڈھائے تھے۔ بنی عباس نے قبروں پر مظالم ڈھائے ہیں۔ نشان قبر تک مٹانے کی کوشش کی ہے۔ خدا برا کرے اس تعصب کا کہ انسان صاحبان کمال کو زندہ بھی نہ رہنے دے اور مرنے کے بعد بھی قبروں پر ظلم ڈھائے۔ مگر واہ رے قدرت پروردگار جب کسی ظلم کا ارادہ کیا گیا قدرت نے ظلم ہی کو اظہار فضیلت کا ذریعہ بنا دیا۔ آپ سوچیں کہ اگر متوکل نے قبر حسینؑ پر ہل چلوانے کی کوشش نہ کی ہوتی۔ نہر کا پانی کٹ کرانے کی سعی نہ کی ہوتی تو کسے معلوم ہوتا کہ شہادت کے بعد حسینؑ کی جلالت کیا ہے اور کون سمجھتا کہ شہید راہ خدا کی زندگی کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ دنیا تو یہی سمجھتی کہ حسینؑ معاذ اللہ اس شخصیت کا نام ہے جس کو کربلا میں یزید سے شکست ہو گئی۔ اور جو انتہائی غربت و بیکسی کے ساتھ شہید ہو گئے۔ لیکن متوکل کے مظالم نے واضح کر دیا کہ حسینؑ کربلا میں کیا بے بس ہوتے۔ سیکڑوں سال گذرنے کے بعد بھی بے بس نہیں ہیں۔ حکومت کا سارا زور صرف ہو رہا ہے لیکن امامت اپنے روحانی اقتدار سے حکومت کا زور روکے ہوئے ہے۔ اب تو اندازہ ہوا کہ روحانیت کا اقتدار کیا ہوتا ہے اور روحانیت مادیت کا زور کس طرح دبا دیا کرتی ہے۔ یاد رکھو حسینؑ مشیت الٰہی سے مجبور نہ ہوتے تو کربلا کا تختہ بھی پلٹ گیا ہوتا۔ لیکن وہ مشیت کی بات تھی آج مشیت یہی ہے کہ حسینؑ اپنا زور دکھلا دیں۔ اور دنیا کو بتا دیں کہ شہید راہ خدا مرنے کے بعد بھی اس قدر زندہ ہوتا ہے تو زندگی میں کیسی زندگی ہوگی اس کا اندازہ کون کر سکے گا۔

سلاطین وقت نے اپنا سارا زور ختم کر دیا لیکن نہ امامت کو مرعوب کر سکے نہ امامت کے وقار میں کوئی کمی پیدا کر سکے۔ آخری حوصلہ باقی رہ گیا تھا۔ ایک دن اسے بھی آزما لیا۔ جب دیکھا کہ کسی طرح امامؑ قابو میں نہیں آ رہے ہیں

تو یہ خیال پیدا ہوا کہ شائد انھیں ہمارے اقتدار کا اندازہ نہیں ہے۔ اگر اقتدار کا اندازہ ہو جائے تو خود بخود سر جھکا دیں گے۔ چنانچہ حکم عام دیدیا گیا کہ ساری فوج ایک میدان میں اکٹھا ہو اور ایک اونچا سا ٹیلہ بنایا جائے جہاں سرکار "جہاں پناہ" جاکر اپنی فوج کا جائزہ لیں گے۔ ٹیلہ تیار ہوا۔ فوج اکٹھا ہوئی۔ ۹۰ ہزار افراد صحرا میں مسلح بکھرے ہوئے۔ اور بادشاہ امام علی نقیؑ کو لیکر بلندی پر جاتا ہے۔ فرزند رسولؐ! چلئے آج آپ کو شہر کا منظر دکھایا جائے۔ امامؑ نے کسی بات کا انکار نہیں کیا اور ہر انکار کو خلاف مصلحت سمجھتے رہے۔ اسلئے بھی کہ انکار سے اذیت کا نیا بہانہ مل جائے گا۔ اور اس لئے بھی کہ یہی مواقع اپنے فضائل و کمالات کے اظہار کے ہوتے ہیں ـــــ بلندی پر تشریف لے گئے۔ بادشاہ نے فوج پر ایک نگاہ کی اور کہنے لگا کہ آپ میرا اقتدار دیکھ رہے ہیں۔ میری فوج کا کیا عالم ہے۔ اور میرا لشکر کہاں تک پھیلا ہوا ہے ـــ ان حالات کو دیکھنے کے بعد آپ اپنے انجام کے بارے میں نہیں سوچتے اور برابر حکومت سے مقابلہ پر آمادہ رہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ میں تیرا اقتدار دیکھ چکا اب ذرا آسمان کی طرف نظر اٹھا۔ اب جو اس نے نظر اٹھائی تو کیا دیکھا کہ زمین سے آسمان تک فوج ہی فوج نظر آ رہی ہے اور ہر طرف لشکر ہی لشکر دکھائی دے رہا ہے آپ نے فرمایا وہ تیرا اقتدار تھا۔ یہ میرا اقتدار ہے۔ یہ سننا تھا کہ بادشاہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب ہوش آیا تو حضرت نے فرمایا کہ اس قدر پریشان کیوں ہے۔ میں تو تیری فوج دیکھ کر پریشان نہیں ہوا۔ تو میری فوج دیکھ کر اس قدر پریشان کیوں ہو گیا۔ اس نے کہا فرزند رسولؐ! آپ کی فوج خدا کی پناہ اس کی کوئی انتہا بھی ہے۔ آپ نے فرمایا کوئی انتہا نہیں ہے۔ لیکن یاد رکھو ہم اہلبیتؑ ان طاقتوں کو حکومت کے مقابلہ میں

صرف نہیں کرتے اور ہر مصیبت کو برداشت کرلیتے ہیں۔ ہم نے دنیا کو ترک کر دیا ہے اور آخرت کو اختیار کرلیا ہے۔ ہم اسے اپنی توہین سمجھتے ہیں کہ دنیا کے دو روزہ سلاطین سے مقابلہ کریں۔ نہ ہمارے خدا نے فرعون و نمرود سے مقابلہ کیا ہے اور نہ ہم سلاطین وقت سے مقابلہ کرتے ہیں۔ (منتہی الآمال)

یہ ہے اقتدار امامت اور یہ ہے کردار امامت۔ کسی اور کو یہ اقتدار مل گیا ہوتا تو ساری دنیا کو فنا کر چکا ہوتا اور روئے زمین پر کوئی ایک دشمن زندہ نہ رہتا۔ یہ آل محمدؐ کا کردار تھا کہ اتنا عظیم اقتدار رکھنے کے بعد بھی اسے کبھی اپنی ذات کے لئے استعمال نہیں کیا۔ اور ہمیشہ خدا کی طاقت کو خدا کے لئے استعمال کرتے رہے۔ انھوں نے سنگ ریزوں کو نطق دیا تو تسبیح پروردگار کے لئے۔ جانوروں کو گویائی دی تو شہادت رسالت کے لئے۔ چاند کے ٹکڑے کئے تو عظمت پروردگار کے لئے اور مغرب سے سورج بھی پلٹایا تو سجدۂ الٰہی کے لئے۔

اپنی ذات کے لئے کبھی کسی طاقت کو استعمال نہیں کیا۔ اپنی ذات کے لئے طاقت کو استعمال کرتے تو سلاطین کے ہاتھوں گرفتار نہ رہتے۔ اپنے گھر میں نظر بند نہ رہتے۔ حراستوں کی زندگی نہ گذارتے۔ قبروں کا نشان نہ مٹایا جاتا۔ بچوں کو بھوکا پیاسا نہ رکھا جاتا۔ گلے میں رسی نہ پڑتی۔ پہلو پر دروازہ نہ گرتا۔ محسن کی شہادت نہ ہوتی۔ یہ سب اسی لئے تھا کہ انہوں نے اپنی طاقت کو اپنی ذات کے لئے استعمال نہیں کیا اور ہمیشہ مرضی الٰہی پر راضی برضا رہے۔ قیامتیں گذر گئیں اُف تک نہیں کی۔ پہاڑ ٹوٹ پڑے بددعا بھی نہیں کی۔ مصائب کا سلسلہ قائم رہا آہ نہیں کی۔ گلا کٹ گیا بخشش امت کے علاوہ کوئی دعا نہیں کی۔ کہاں دنیا میں ملیں گے۔ ایسے صاحبان کردار۔ اور کہاں نظر آئیں گے ایسے بندگان پروردگار۔ امام علی نقیؑ کا تذکرہ تھا تو انھیں کے تذکرہ پر بیان کو تمام کر دینا چاہتا ہوں۔ وہ دور محن وہ

سلسلۂ مصائب۔ وہ ہجوم مصائب۔ وہ طوفانِ شدائد کہ جدِّ مظلوم کی زیارت پر پابندی عائد ہے۔ زائرین کو قتل کیا جا رہا ہے۔ ہاتھ کاٹے جا رہے ہیں۔ بچے ذبح کئے جا رہے ہیں۔ اور شائقینِ زیارت قبرِ مظلوم کی زیارت کو جا رہے ہیں وہ دن بھی آیا جب متوکل کا قتل واقع ہوا اور اس کے بعد منتصر نے زیارت سے پابندی ہٹائی۔ مظلومیت رنگ لائی۔ قبر مظلوم آباد ہوئی۔ زائرین جانے لگے امامؑ کے دل کو قدرے سکون ملا۔ لیکن وہ فرزند کیا کرے۔ جو شیت کے ہاتھوں اس قدر مجبور رہے کہ اف تک نہیں کر سکتا۔ کیسے کیسے مظالم۔ آپ تصور کر سکتے ہیں۔ حکم عام ہے کہ جو زیارت کے لئے جائے۔ اس سے ایک مخصوص رقم وصول کی جائے۔ ضعیف عورتیں فاقے کرتی ہیں۔ رقم جمع کرتی ہیں اور آکر کہتی ہیں یہ حکومت کا ٹیکس حاضر ہے۔ میں اپنے مولا کی زیارت کے لئے جا رہی ہوں۔ سپاہیوں نے سوال کیا یہ رقم کہاں سے آئی؟ ضعیفہ نے کہا میں نے فاقے کرکے جمع کی ہے۔ مجھے فاقے گوارا ہیں لیکن قبر حسینؑ کی زیارت نہ کروں یہ گوارا نہیں ہے۔ کیوں ارباب عزا! جانے والی کو قبر حسینؑ کا اتنا اشتیاق ہے۔ کاش کوئی اس بہن سے پوچھتا جو بھائی کی لاش کو صحرا میں چھوڑ کر جا رہی تھی اور اتنی مہلت نہیں تھی کہ بھائی کی قبر بنا سکتی۔ تڑپ کر فریاد کر رہی تھی نانا! آپ کی نماز جنازہ ملائکہ نے پڑھی ہے اور یہ آپ ہی کا حسینؑ ہے جس کا لاشہ جلتی ریتی پر پڑا ہوا ہے اور کوئی دفن کرنے والا نہیں ہے۔ نانا یہ آپ ہی کی زینب ہے جس کے بازو رسیاں بندھی ہوئی ہیں اور جس کو کوفہ و شام لے جایا جا رہا ہے۔ اور پھر لاش برادر سے خطاب کرکے کہہ رہی تھیں۔ بھیا گواہ رہئے گا کہ بہن مجبور ہو کر جا رہی ہے ورنہ اپنا اختیار ہوتا تو ہرگز آپ کو صحرا میں چھوڑ کر نہ جاتی۔

ارباب عزا! مصائب کا یہ سلسلہ تمام ہوا لیکن کس طرح تمام ہوا کہ

معتز باللہ نے امام علی نقی علیہ السلام کو موقع پاکر زہر دلوادیا۔ اور زہراؑ کا یہ لال ۳ رجب ۲۵۴ھ کو اپنی جدہ ماجدہ کی خدمت میں پہنچ گیا۔ اور عجب نہیں کہ جاکر عرض کیا ہو۔ جدہ ماجدہ کل آپ نے اپنے لال کو زہر دغا سے تڑپتے دیکھا تھا آج پھر اپنے ایک فرزند کو زہر دغا کا شہید دیکھ لیجئے۔ جدۂ ماجدہ آپ کی پوری ذریت زہر دغا سے شہید کر دی گئی اور آپ کا خاندان یونہی تباہ کر دیا گیا۔ آپ کے بچوں کو زندہ دیواروں میں چنا گیا۔ آپ کے فرزندوں کے خون سے گارا بنوایا گیا۔ آپ کے حسینؑ کی قبر پہ ہل چلوانے کی کوشش کی گئی۔ آپ کے لال کی قبر پہ نہر کاٹ کر لائی گئی لیکن پانی شرما کر دور ٹھہر گیا۔ جس کے بچوں کو تین دن تک پانی نہ ملا ہو اس کی قبر تک میں کس طرح جاؤں گا۔

عزادارو! امامؑ کا انتقال ہوا۔ امام حسن عسکریؑ موجود تھے۔ باپ کی تجہیز و تکفین کا فرض انجام دیا۔ غسل دیا، کفن پہنایا۔ اپنے کاندھوں پر جنازہ اٹھایا اور اہتمام سے باپ کو دفن کر دیا ـــــ مگر ہائے حسینؑ مظلوم کون تھا جو یہ سارے انتظامات کرتا۔ ایک بیٹا تھا جس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں، پیروں میں بیڑیاں، گلے میں طوق خاردار۔

رونے والو! روایت میں ملتا ہے کہ باپ کا انتقال ہوا تو امام حسن عسکریؑ نے فرط گریہ سے گریبان چاک کر ڈالا۔ کسی نے کہا فرزند رسولؐ! آپ کو تو صبر کرنا چاہیے۔ فرمایا۔ یہ غم اس لائق ہے کہ اس میں گریبان کو چاک کر ڈالا جائے۔ ہاں ارباب عزا۔ جس کا بیٹا زندہ ہوتا ہے۔ جس کی اولاد زندہ ہوتی ہے۔ اس کا غم یونہی منایا جاتا ہے۔ مگر ہائے حسینؑ غریب ـــــ کسی کی آنکھ میں آنسو آجائے تو اشقیا نوک نیزہ سے اذیت دیں۔

اور کوئی رونے کا ارادہ کرے تو تازیانے مارے جائیں۔ گریبان کون چاک کرے۔ ایک سکینہ ہے تو اس کا کرتا پہلے سے پھٹا ہوا ہے۔ ایک بچی ہے تو اس کے دامن میں آگ لگی ہوئی ہے اور اس کا دل فریاد کر رہا ہے ارے میرے بابا۔ اب تو چچا بھی نہیں ہیں۔ میرے دامن کی آگ کون بجھائے گا کون جانے سکینہ پر کیا گذری ـــــ اور کون جانے کہ بچی کی فریاد کو سن کر باپ پر کیا گذر گئی ـــــ دل کہتا ہے کہ لاش تڑپی ہوگی۔ آواز آئی ہوگی۔ سکینہ اب صبر کرو بیٹی۔ بیٹی اب چچا کو یاد نہ کرو۔ چچا فرات کے کنارے سو گیا۔ اب چچا واپس نہ آئیں گے میری لال۔

انا للہ وانا الیہ راجعون ـــــ

★

امام حسن عسکری علیہ السلام

اسم مبارک	حسنؑ
لقب	عسکری، زکی
کنیت	ابو محمد
والد ماجد	امام علی نقیؑ
والدہ ماجدہ	جناب سوسن
ولادت	۱۰ ربیع الثانی ۲۳۲ھ جمعہ مدینہ منورہ
شہادت	۸ ربیع الاول ۲۶۰ھ
عمر مبارک	۲۸ سال
قبر مطہر	سامرہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی اشرف الانبیاء الاولین والآخرین خاتم النبیین سیدنا ومولانا ابی القاسم محمد وآلہ الطیبین الطاہرین ولعنۃ اللہ علی اعدائھم اجمعین اما بعد فقد قال اللہ الحکیم فی کتابہ الکریم ۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

إِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدَىٰ وَإِنَّ لَنَا لَلْآخِرَةَ وَالْأُولَىٰ

ارشاد جناب احدیت ہوتا ہے "بیشک ہدایت کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے اور دنیا و آخرت کا اختیار ہمارے ہاتھوں میں ہے۔"

مالک کائنات نے اس ارشاد میں صاف واضح کر دیا ہے کہ ہم نے ہر دور میں ہدایت کا انتظام کیا ہے۔ اور ہر موڑ پر ہادی اور رہنما مقرر کئے ہیں یہ انسانوں کی بدبختی ہے کہ انھوں نے ہمارے ہادیوں اور رہنماؤں سے فائدہ نہیں اٹھایا اور اپنی مرضی کے مطابق رہنما تلاش کرتے رہے۔ ان کی جہالت کا تو یہ عالم ہے کہ انھوں نے ہمارے انبیاء و مرسلین کو چھوڑ کر پتھروں کو اپنا رہنما بنایا اور ان کا عقیدہ یہ تھا کہ یہ اصنام 'یہ بت' ہی ہم کو خدا تک پہنچا سکتے ہیں ــــ اور اس سے قریب کر سکتے ہیں۔ صاحب اختیار و اقتدار انبیاء کے بارے میں یہ عقیدہ نہ پیدا ہو سکا اور بے شعور بتوں کے بارے میں یہ عقیدہ پیدا ہو گیا ظاہر ہے کہ انسان جب اس جہالت اور نادانی پر اتر آئے تو انتظام ہدایت بھی کیا کر سکتا ہے اور اسے کون راہ ہدایت پر لا سکتا ہے۔ ہمارا فرض رہنمائی کا انتظام کرنا تھا ہم نے کر دیا۔ فائدہ اٹھانا نہ اٹھانا انسان کا کام تھا اس میں ہمارا کوئی دخل نہیں ہے۔ ہم اس کا حساب روز محشر کریں گے کہ کس نے ہماری ہدایت سے فائدہ اٹھایا اور کس نے ہمارے نظام کو نظر انداز کر دیا۔

انسان عقل و شعور سے کام لیتا تو اتنا سوچتا کہ خالق عقل و شعور کے پاس علم و کمال ہم سے زیادہ ہے۔ وہ جسے اپنا نمائندہ قرار دے گا اس کے فضائل و کمالات ساری دنیا سے زیادہ ہوں گے۔ اس کے ذریعہ جو نظام عالم ظہور میں آئے گا وہ کائنات کے سارے نظاموں سے بہتر اور برتر ہوگا وہ انسان کے باطن سے باخبر ہے۔ وہ اس کی نیتوں کو بھی جانتا ہے۔ وہ اس کے مستقبل سے بھی آگاہ ہے۔ وہ نمائندہ بنائے گا تو اسی وقت بنائے گا جب ماضی و حال و مستقبل سب کو نگاہ میں رکھ لے گا۔ ظاہر و باطن سارے کردار کو آزمائے گا۔ تبلیغ و ترویج کی ساری صلاحیتوں کا جائزہ لے گا اور کھلی ہوئی بات ہے کہ جو اتنے اہتمام کے ساتھ راہنما بنایا جائے گا اس کی شان ہی کچھ اور ہوگی۔ اس کا عالم وہ نہ ہوگا کہ صبح کو بنایا اور شام کو معزول کر دیا اور شام کو بنایا صبح کو معزول کر دیا۔

ارباب کرم! آپ راہِ مستقیم سے ہٹے ہوئے اسلام کا جائزہ لیں تو اس میں اور کفر میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ اسلام بھی کفر کا کوئی حصہ ہے۔ کل صبح کو بت بنتے تھے اور شام کو فنا کر دیئے جاتے تھے۔ اور آج صبح کو خلیفہ بنتے ہیں اور شام کو معزول کر دیئے جاتے ہیں۔ کل انبیاء و مرسلین کو چھوڑ کر صامت بتوں کی پرستش ہو رہی تھی اور آج قرآن ناطق کو چھوڑ کر حسبنا کتاب اللہ کا نعرہ لگایا جا رہا ہے — صلوات

لیکن قدرت نے واضح کر دیا کہ تم جب کبھی اپنے نمائندوں کو ہمارے نمائندوں سے موازنہ و مقابلہ کرو گے۔ تمھیں محسوس ہو جائے گا کہ تم نے الگ نظام بنا کر سخت غلطی کی ہے اور تمھارے مقدر میں ٹھوکروں کے سوا کچھ نہیں آیا ہے۔ تم میں شعور ہوتا تو تم اتنا سوچتے کہ جسے تم بناتے ہو وہ ہر منزل پر ٹھوکر کھا کر تمھیں پکارتا ہے کہ بھائیو! مجھ سے خطا ہو جائے تو بتا دینا میں

راستہ سے ہٹ جاؤں تو مجھے راہ پر لگا دینا۔ میں ٹیڑھا ہو جاؤں گا تو مجھے سیدھا کر دینا۔ میں بہک جاؤں تو مجھے صراط مستقیم بتا دینا۔ اور مختصر یہ کہ میں ٹھوکر کھا جاؤں تو تم مجھے سنبھال لینا۔" اور جسے ہم بناتے ہیں وہ ٹھوکر کھا کر دوسروں کو آواز نہیں دیتا ہے۔ بلکہ دنیا میں کوئی بھی ٹھوکر کھانے والا ٹھوکر کھا کر اسے آواز دیتا ہے۔ تو وہ سنبھال لیتا ہے۔ بس یاد رکھو کہ ٹھوکریں کھانا تمھارا کام ہے اور سنبھال لینا ہمارا کام ہے۔ اور کیوں نہ ہوتا تم نے در در کی ٹھوکریں کھائیں اور حیدرؑ کو چھوڑ دیا۔ اور ہم نے ہر در پہ حیدرؑ کو مقرر کر کے شہر علم کا در بنا دیا۔ اور کعبہ کے قریب آیا تو دیوار کعبہ میں بھی در بنا دیا تاکہ دنیا پہچان لے کہ حیدرؑ کون ہے —

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ پروردگار عالم نے جس دور میں جسے نمائندہ بنایا۔ ساری کائنات میں اس کا جواب نہیں ملا اور فضائل و کمالات اس شان سے منظر عام پہ آئے کہ دشمنوں کو بھی اقرار کرنا پڑا — وہ مصائب میں رہے۔ قید خانوں میں رہے۔ حراستوں میں رہے لیکن ان کے کردار کی شعاعیں دنیائے انسانیت کے دلوں تک پہنچتی رہیں۔ کیا دنیا اس حقیقت کو نظر انداز کر دے گی کہ سلاطین دنیا نے ائمہ معصومین کی زندگیوں پر بے پناہ پہرے بٹھائے اور حراست و زندان میں رکھ کر اذیت و مصیبت کی بے حساب تاکید کی لیکن جس نے ایک مرتبہ کردار و عمل کا جائزہ لے لیا وہ گرویدہ ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ کتنے کافروں کو مسلمان بنا دیا۔ کتنے منافقوں کو صاحب ایمان بنا دیا۔ کتنے دلوں میں عقیدت کے چراغ جلا دیئے۔ کتنے ذہنوں کو محبت کی روشنی دیدی۔ کتنے حیوانوں کو انسان بنا دیا اور بسا اوقات تو ایسا انقلاب برپا کر دیا کہ دیکھنے والے دیکھتے ہی رہ گئے۔ دربار میں قتل کے ارادہ سے

بلایا گیا ہے اور جب دربار میں داخل ہوتا ہے تو حاکم سرو قد کھڑا ہو کر تعظیم کرتا ہے۔ غلاموں کو گردن زدنی کی تاکید کر دی گئی ہے لیکن جب تشریف لاتے ہیں تو غلام جھک کر تسلیم کرتے ہیں۔ تاریخ میں ایک واقعہ نہیں ہے بیشمار واقعات ہیں۔ اس وقت دو ایک واقعات کی طرف اشارہ کر دینا کافی ہے تاکہ دنیا کا ظلم بھی سامنے آجائے اور ظلم کی شام میں ہدایت کے چراغ کی روشنی بھی نظر آجائے۔

عبداللہ بن خاقان ایک محبِ اہلبیتؑ اور عقیدت مند انسان تھا۔ اس کے فرزند احمد بن عبداللہ کو حکومت وقت نے صیغہ اوقاف کا افسر بنا دیا تھا۔ عہدہ کا ملنا تھا کہ دنیا منقلب ہو گئی۔ اور دشمنی اہلبیتؑ ہی سرمایۂ زندگی بن کر رہ گئی۔ ایک مرتبہ احمد بن عبداللہ کے سامنے علوی سادات کا ذکر آ گیا تو اس نے کہا کہ روئے زمین پر سادات میں امام حسن عسکریؑ سے بہتر و افضل کوئی نہیں ہے۔ ان کا علم ان کا زہد ان کا تقویٰ ان کی عظمت قابل صد رشک ہے علماء سے لے کر عوام تک اور فقراء سے لے کر حکام تک سب ان کی تعظیم کرتے ہیں۔ اور ان کے کمالات کی قدر کرنا اپنا فریضہ سمجھتے ہیں۔ لوگوں نے کہا کہ آپ ایسا فرما رہے ہیں؟ آپ کو تو ان کے خلاف کہنا چاہئے۔ اس نے کہا بیشک لیکن میرا تجربہ یہ ہے کہ ایک دن میں دیوان خانہ میں اپنے باپ کے پاس کھڑا تھا کہ خادموں نے آکر خبر دی کہ امام حسن عسکریؑ تشریف لا رہے ہیں۔ یہ سننا تھا کہ میرے بابا انکی تعظیم کے لئے دوڑ پڑے اور نہایت ہی احترام سے لا کر اپنے پاس بٹھایا۔ میں نے اس سے پہلے کسی کی اس طرح تعظیم کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ مجھے سخت حیرت ہوئی کہ بابا کو کیا ہو گیا ہے اور اس طرح کیوں تعظیم کر رہے ہیں۔ لیکن کھڑا منظر دیکھتا رہا۔ وہ حضرت تشریف فرما رہے اور میرے بابا گفتگو میں مسلسل یہ کہتے

رہے کہ میرے ماں باپ آپ پر قربان۔ مجھے سخت حیرت ہوئی کہ اس جوان میں کون سی خاص بات ہے کہ بابا جان اس انداز سے گفتگو کر رہے ہیں۔ یہ تو کوئی گفتگو کا انداز نہیں ہے۔ اسی اثنا میں کسی نے خبر دی کہ خلیفہ وقت تشریف لا رہے ہیں لوگ تعظیم کے لئے دوڑ پڑے لیکن بابا پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ مجھے اور تعجب ہوا کہ آج یہ کیا ہو گیا ہے کہ بادشاہ سلامت کی سواری آ رہی ہے اور ان پر کوئی اثر نہیں ہو رہا ہے۔ نہ استقبال نہ احترام۔ نہ چوبدار نہ خدام۔ کوئی توجہ نہیں ہے یہاں تک کہ سواری کا ایک حصہ مکان کے احاطہ میں داخل ہو گیا تو بابا نے امامؑ سے فرمایا کہ اب مناسب یہ ہے کہ آپ تشریف لے جائیں۔ خلیفۂ وقت کی سواری آ رہی ہے۔ وہ حضرت نہایت خاموشی سے روانہ ہو گئے۔ بابا نے ان کی پیشانی کا بوسہ دیا اور انھیں رخصت کر کے بادشاہ کے استقبال کی طرف متوجہ ہو گئے۔ مجھے یہ بات سخت ناگوار گذری۔ میں نے خادموں سے پوچھا کہ یہ جوان کون تھے جنھیں بابا نے اس قدر مرتبہ دیدیا ہے۔ خادموں نے کہا یہ امام حسن عسکریؑ ہیں جنھیں "ابن الرضاؑ" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ اپنے وقت کے بڑے صاحب کمالات و کرامات ہیں۔ میں نے طے کر لیا کہ آج اپنے بابا سے بحث کروں گا کہ آخر یہ کیا طریقہ ہے کہ خلیفۂ وقت آئے تو کوئی فکر نہیں ہے اور ایک جوان آجائے تو یوں ان کی تعظیم کی جائے۔ یہ کیا انداز ہے۔ یہاں تک کہ رات آئی اور بابا جان کا غذات دیکھنے بیٹھے تو میں نے قریب آکر عرض کی۔ یہ کون بزرگ تھے جنکی تعظیم کے لئے آپ بے قرار تھے۔ اور ان سے اس لہجہ میں گفتگو کر رہے تھے۔ عبداللہ نے کہا کہ یہ شیعوں کے امامؑ ہیں اور یاد رکھو کہ خلافت بنی عباس سے نکل جاتی تو روئے زمین پر ان سے زیادہ کوئی حق دار نہیں تھا۔ یہ بڑے صاحب کرامات و کمالات ہیں ان کے والد امام علی نقیؑ بھی بے پناہ کمالات کے مالک

تھے یہ لوگ یکتائے عصر اور یگانۂ روزگار ہیں ان کی کوئی مثال و نظیر نہیں ہے۔

احمد کہتا ہے کہ یہ منظر دیکھ کر میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ نہ جانے میرے باپ کو کیا ہو گیا ہے اور ان کے ہوش و حواس کیسے ہیں کہ وہ اس طرح کی گفتگو کر رہے ہیں۔ اور میں نے یہ طے کر لیا کہ اب میں خود ان بزرگ کے حالات کا جائزہ لوں گا۔ اور دیکھوں گا کہ باپ کے بیان میں کہاں تک صداقت ہے۔ اگرچہ میرا باپ لغو گو اور غلط بیان نہیں ہے۔ لیکن اس مسئلہ میں نہ جانے کیوں اس قدر مبالغہ سے کام لے رہا ہے۔ یہاں تک کہ ایک عرصہ تک میں حالات کا جائزہ لیتا رہا اور حضرت کے عیوب تلاش کرتا رہا۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ جیسے جیسے ان کے حالات کو قریب سے دیکھتا رہا ان کی عظمت نگاہوں میں اور بڑھتی رہی۔ اور اب یہ محسوس ہوتا ہے کہ میرے باپ نے جو کچھ کیا تھا بالکل صحیح کیا تھا۔ اور یہ بزرگ اسی عظمت و احترام کے مستحق ہیں۔

ارباب نظر! دیکھا آپ نے بات کس عداوت سے چلی اور کس جگہ پر آکر ٹھہری۔ قدرت یہی چاہتی تھی کہ لوگ ہمارے نمائندوں کو آزمائیں۔ ان کے کردار کا جائزہ لیں۔ ان کی زندگی کو قریب سے دیکھیں۔ کم سے کم ان کے کمالات تو منظر عام پر آجائیں اور دنیا کو محسوس تو ہو جائے کہ اس نے ہمارے نظام کو چھوڑ کر کتنا بڑا نقصان اٹھایا ہے اور اپنے نظام کی بدولت کتنی ٹھوکریں کھائی ہیں۔ لیکن سلاطین وقت بھی اس نکتہ سے خوب باخبر تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر یہ منظر عام پر رہے تو ہمارا پرسان حال کوئی نہ ہوگا۔ اور ساری دنیا انہیں کی طرف مڑ جائے گی۔ اسی لئے ہر آن یہی فکر رہی کہ ان کو منظر عام سے الگ رکھا جائے۔ اور پھر امام حسن عسکریؑ کے ساتھ تو ایک نیا ظلم بھی ہوا۔ ہر امام کو عوام سے دور رکھا جاتا تھا۔ حضرت کو گھر سے بھی الگ رکھا گیا۔ اس لئے کہ حکومت وقت کو معلوم تھا کہ پیغمبرؐ کا آخری وارث انہیں کے صلب سے پیدا ہونے والا ہے اور نظام

دنیا کا انقلاب اسی کے ہاتھوں میں ہونے والا ہے۔ ظلم کا خاتمہ وہی کرے گا۔ اسلام کا حقیقی پرچم وہی لہرائے گا۔ "لا الٰہ الا اللہ محمدؐ رسول اللہ" کے ساتھ علیؑ ولی اللہ" کا کلمہ وہی پڑھوائے گا۔ بساط اقتدار اسیؑ کے ہاتھوں الٹی جائے گی۔ تخت اسی کے سیلاب میں تختے بنیں گے۔ تاج اسی کے اشاروں پر ٹھوکروں کی گیند بنیں گے۔ اس لئے ہر ایک کو فکر تھی کہ حضرت اپنے گھر میں بھی نہ رہنے پائیں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ حجت خدا وجود میں آجائے۔ اور تخت و تاج کی عمر مختصر ہو جائے۔ مصائب کا یہ سلسلہ تھا کہ نہ عوام میں رہیں نہ گھر میں رہیں۔ حراست اور مکمل حراست۔ زندان اور مکمل زندان۔ یہاں تک کہ جب بادشاہ کو اطمینان نہیں ہوا تو اپنے ہی قصر کے ایک حصے میں محبوس کر دیا تاکہ گھر والوں سے ملاقات نہ ہونے پائے۔ اور آخری حجت خدا وجود میں نہ آنے پائے۔

اللہ رے انقلاب زمانہ۔ بنی عباس کا وارث تخت حکومت پر رہے اور پیغمبر اسلامؐ کا لال ایک ایسی کوٹھری میں جس میں روشنی کا گذر بھی نہ ہو۔ لیکن یہ کردار کی روشنی تھی جو وہاں بھی چھپائی نہ جا سکی اور بالآخر امامؑ کو اس حراست سے نکالا گیا۔ اور اس حجت خدا کا وجود سامنے آگیا جس کے تصور سے کائنات ظلم لرز رہی تھی۔ قدرت نے آواز دی اگر فرعون نے اپنے دور کے موسیٰؑ کو روک لیا ہوتا تو تم بھی اس دور کے موسیٰ کو روک لیتے۔ لیکن یاد رکھو فرعون عمر دیکھتا رہ جاتا ہے اور موسیٰ قصر فرعون میں آکر اعلان حق کر دیتے ہیں۔

ایسے حالات میں امامؑ نے جو زندگی گذاری اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا آپ کے دور میں تین سلاطین بنی عباس گذرے ہیں اور ہر ایک نے اپنے امکان بھر آپ کو ستانے کی کوشش کی ہے۔ ابتدائی دور میں متوکل کا زمانہ تھا اس کے بارے میں کچھ کہنا ہی نہیں ہے۔ اگر یزید زندہ ہو کر اس دنیا میں آسکتا تو متوکل ہی

کی شکل میں آتا۔ دوسری شکل ممکن نہ تھی۔ متوکل ۱۴ سال حکومت کرکے ۲۴۷ھ میں
واصل جہنم ہوا تو اس کی جگہ پر منتصر نے حکومت سنبھالی۔ ایک سال کے بعد اس کا بھی
خاتمہ ہوگیا تو مستعین باللہ نے حکومت ہاتھ میں لی۔ اور ۲۵۲ھ تک چار برس مسلسل
حکومت کرتا رہا۔ مستعین کے بعد ۲۵۲ھ میں معتز باللہ کو حکومت ملی لیکن تین برس
سے زیادہ نہ رہ سکی۔ معتز باللہ کے بعد مہتدی کا دور آیا۔ لیکن ایک ہی سال میں اس کے
قتل پر تمام ہوگیا۔ مہدی کے بعد معتمد باللہ تخت حکومت پر آیا اور بدنصیب ۲۳ سال تک
مسلمانوں کی گردنوں پر مسلط رہا۔ ان سلاطین نے امام حسن عسکریؑ کے ساتھ کیا برتاؤ کیا
اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بنی عباس کا مزاج معلوم ہوچکا ہے۔ متوکل کی
سازشیں اور اسکی شرارتیں شہرۂ آفاق بن چکی ہیں۔ اب باقی افراد کے لئے یہی کافی ہے
کہ یہ سب متوکل کے جائز وارث تھے، جب تک اپنے معاملات حکومت میں مبتلا رہے۔ امامؑ
کی زندگی پرسکون رہی اور جیسے ہی سیاسی معاملات سے نجات ملی پہلا کام یہ کیا کہ امامؑ کو
اذیت دی جائے۔ اور ان کی زندگی کا خاتمہ کردیا جائے۔ وہ حجت خدا وجود میں نہ
آنے پائے جو ہر فرعون وقت کا تختہ الٹنے والا ہے۔

تفصیلات کا محل نہیں ہے۔ اجمالی طور پر ہر بادشاہ کے مزاج کا تعارف
کرادیا جائے تاکہ دنیا کو یہ اندازہ ہو جائے کہ ارباب سیاست نے نظام ہدایت کو اپنے
ہاتھوں میں لینے کے بعد کیسے کیسے افراد کو تخت حکومت پر بٹھایا ہے۔ اور تخت حکومت
پر بیٹھنے والوں نے اللہ والوں کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔

متوکل کے قتل کے وقت امام حسن عسکریؑ کی عمر شریف تقریباً ۱۵-۱۶
سال کی تھی۔ آپ جوانی کی سرحدوں میں قدم رکھ چکے تھے۔ لیکن ایسے مصائب کی
زندگی میں کیا جوانی اور کیا ضعیفی۔ کل ۲۸ برس کی عمر ملی لیکن اس میں بھی ضعیفی کے
آثار نمودار ہوگئے تھے۔ اور شدت مصائب نے حالات بالکل تبدیل کردیئے تھے

متوکل کے بعد منتصر تخت حکومت پر آیا لیکن اسے صرف چند ماہ حکومت کرنے کا موقع ملا —
— اور اس دور میں وہ اپنے ہی حالات نہ سنبھال سکا۔ امام کی طرف کیا توجہ کرتا۔
امام کی زندگی قدرے پرسکون رہی۔ لیکن عالم غربت وحراست میں سکون کا کیا ذکر
ہے۔ صرف جس دن کوئی تازہ مصیبت نہ آئے اسی دن کو سکون واطمینان کا دن سمجھ
لیجئے۔ ۶ برس کی عمر سے وطن چھٹ چکا ہے۔ باپ کے ساتھ مدینہ سے سامرہ آچکے ہیں
بلکہ لائے جاچکے ہیں۔ اور یہاں ہر روز ایک تازہ افتاد اور ہر دن ایک تازہ مصیبت
امامؑ نے یہ زندگی کس طرح گذاری ہے۔ اس کا تذکرہ بعد میں ہوگا۔ پہلے اس روح
کا اندازہ کرلیجئے جس کے تحت یہ کردار منظر عام پر آرہا ہے۔ اور جس سے عصمت
کا خمیر اٹھایا گیا تھا۔ کمسنی کا زمانہ ہے، سامرہ کی گلیاں ہیں، بچے کھیل کود میں
مصروف ہیں اور امام حسن عسکریؑ کھڑے رو رہے ہیں۔ بہلول دانا کا گذر ہوا
فرزند رسولؐ کو روتے دیکھا۔ دل بے قرار ہوگیا۔ عرض کرتے ہیں۔ شہزادے کیا
آپ کے پاس کھلونے نہیں ہیں تو میں ابھی لائے دیتا ہوں۔ رونے کی کیا ضرورت
ہے شہزادے نے فرمایا۔ بہلول ہم اہلبیتؑ کھیلنے کے لئے نہیں پیدا ہوئے،
ہم عبادت واطاعت کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ یہ کہہ کر قرآن مجید کی آیت سنادی
کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے تم کو عبث پیدا کیا ہے اور تم پلٹ کر ہماری بارگاہ میں
آؤ گے۔ بہلول متحیر ہوکر رہ گئے۔ عرض کرتے ہیں فرزند رسولؐ مجھے کچھ نصیحت
فرمائیے۔ آپ نے چند نصیحت آمیز اشعار سنائے اور سُنا کر اس قدر روئے کہ
بیہوش ہوگئے۔ بہلول نے گھبرا کر کلیجے سے لگا لیا۔ ہوش آیا تو عرض کی شہزادے
آپ اس قدر کیوں رو رہے ہیں۔ آپ پر تو کوئی ذمہ داری بھی نہیں ہے۔ آپ
تو بچے ہیں۔ فرماتے ہیں بہلول میں نے دیکھا ہے کہ مادر گرامی جب آگ روشن کرتی
ہیں تو پہلے چھوٹی لکڑیوں کو جلاتی ہیں اس کے بعد بڑی لکڑیوں کی باری آتی ہے۔

میں سوچتا ہوں بہلول کہ اگر آتشِ جہنم کو روشن کرنے میں چھوٹی ہی لکڑیاں کام آگئیں تو کیا ہوگا۔ یہ کہہ کر حضرت خاموش ہوگئے اور بہلول فرطِ مسرت سے جھومنے لگے۔ اللہ یہ ہے امامت کا بچپنا۔ چند برس کی عمر اور اس پر یہ عرفانِ الٰہی۔ یہ خوفِ پروردگار۔ دنیا میں کسے یہ انداز نصیب ہوتا ہے۔ دنیا کے بوڑھوں میں بھی یہ عرفان نہیں ہے جو آلِ محمدؐ کے بچوں میں پایا جاتا ہے۔ کیوں نہ ہو۔ درسگاہ رب العالمین کے تعلیم یافتہ آغوشِ رسالت وامامت کے پروردہ۔ ان کے پاس کمال نہ ہوگا تو کس کے پاس ہوگا۔ یہ صاحبانِ عرفان نہ ہوں گے تو کون ہوگا۔ قیامت کی بات ہے کہ آغوشِ عصمت کے پروردہ افراد سے وہ لوگ مقابلہ کریں کہ جن کی نسلیں آغوشِ کفر و نفاق میں پرورش پاتی رہیں۔

اربابِ کرم! اس مقام پر ایک فقرہ کا عرض کر دینا ضروری ہے کہ بہلول جیسا صاحبِ معرفت جس کی ذہانت و قابلیت کی بنا پر ہارون رشید نے اپنا وزیرِ اعظم بنانا چاہتا ہو اور انھوں نے بربنائے استغنا و بے نیازی اسے ٹھکرا دیا ہو وہ بھی یہ عالم دیکھ کر متحیر رہ جاتا ہے اور سوچتا ہے کہ خانوادہ عصمت کا کیا انداز ہوتا ہے۔ دنیا کے جاہل و ناداں کیا سمجھیں گے کہ امامت کا وقار کیا ہے۔ اور اس کے کردار کا انداز کیا ہوتا ہے۔ امام حسن عسکریؑ نے بھی واضح کر دیا کہ جب ہم معصوم ہو کر ایسا خوفِ خدا رکھتے ہیں اور اس طرح لرزتے ہیں تو تمھیں کیا کرنا چاہئے اور تمھارا انداز کیا ہونا چاہئے۔ یہ تمھیں خود سوچنا چاہئے اور یہ نہ کہنا کہ معصوم کو اس قدر خوف کی کیا ضرورت ہے۔ اور وہ اس قدر کیوں گریہ کرتے ہیں۔ اس لئے کہ جسے جس قدر عظمت کا احساس ہوتا ہے وہ اسی قدر خوفزدہ بھی رہتا ہے۔ اور جو عظمت کا اندازہ ہی نہیں رکھتا وہ کیا خوف پیدا کرے گا۔ بچہ سانپ کو نہیں جانتا تو اس سے کھیلتا ہے۔ بزرگ انسان جانتا ہے

تو اس کے قریب بھی نہیں جاتا۔ خوف ہمیشہ معرفت سے پیدا ہوتا ہے۔ اب جسے معرفت ہی نہیں ہے اسے خوف کہاں سے حاصل ہوگا یا یوں کہا جائے کہ جن لوگوں کو سانپ کا عرفان حاصل ہے وہ سانپ کے ڈر سے روتے ہیں اور جن لوگوں کو خدا کی معرفت حاصل ہے وہ خوفِ الٰہی سے گریہ کرتے ہیں۔

بہلول کا ذکر آگیا ہے تو چند کلمے اور سن لیجئے۔ یہ بڑے پایہ کے بزرگ تھے اور بہترین علم و دانش کے مالک تھے۔ ان کی حاضر جوابی اور ان کے کمال کا یہ عالم تھا کہ لوگ انھیں دیوانہ کہنے لگے تھے۔ اور یہ بھی اس بات پر خوش تھے کہ اس طرح دیوانگی میں جہاں چاہتے ہیں وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ اور جو چاہتے ہیں کہہ دیتے ہیں۔ حکومت کا عتاب نازل نہیں ہوتا۔ اور حق کا اعلان بھی کر دیتے ہیں۔ تاریخ میں ان کے بے شمار واقعات پائے جاتے ہیں۔ لیکن ان کے تذکرہ کا محل نہیں ہے۔ صرف ایک واقعہ کی طرف اشارہ کر دینا کافی ہے کہ ایک مرتبہ لوگوں نے دیکھا کہ ایک ٹوٹی پھوٹی قبر میں پیر لٹکائے اطمینان سے بیٹھے ہیں۔ ایک شخص نے کہا کہ یہ دیوانہ کیا کر رہا ہے۔ اس سے دریافت کرنا چاہئے کہ یہ شہر کیوں نہیں جاتا اور یہاں قبرستان میں کیوں پڑا ہے بڑھ کر دریافت کیا۔ بہلول یہاں کیوں پڑے ہو۔ شہر کی طرف کیوں نہیں جاتے۔ بہلول نے مسکرا کر فرمایا کہ سارے شہر والے تو اسی طرف آ رہے ہیں۔ میں ادھر جا کر کیا کروں گا۔ پھر دنیا والے تو ساتھ بیٹھنے کے لائق بھی نہیں ہیں۔ ہزار برائیاں ہزار عیب، ہزار جھوٹ، ہزار غیبت اور یہیں جن کے درمیان بیٹھا ہوں کیسے اچھے لوگ ہیں۔ خاموش پڑے ہیں نہ کوئی لڑائی نہ جھگڑا۔ نہ کسی کی غیبت نہ کسی کی برائی نہ کسی کا مال چھینتے ہیں نہ کسی پر ظلم کرتے ہیں نہ اپنے ہمسایہ کو ستاتے ہیں۔ اور نہ آنے والے کو بھگاتے ہیں۔ ہر آنے والے کے لئے دل کشادہ رکھتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ دشمن بھی آجاتا ہے تو نہایت خوشی سے پہلو میں جگہ دے دیتے ہیں۔ نہ مال

نہ دولت کی فکر نہ جاہ و جلال کی ہوس نہ تخت و تاج کے لئے مر رہے ہیں۔ نہ اقتدار حکومت کے لئے بےچین ہیں۔ کتنے اچھے ہیں یہ لوگ اور کتنے خاموش ہیں یہ افراد۔ جن کے درمیان میں بیٹھا ہوا ہوں۔ بھلا شہر میں کہیں ایسے لوگ ملتے ہیں۔

بہلول نے بے ثباتی دنیا کا بھی نقشہ کھینچ دیا۔ انسان کو اس کے آخری انجام سے بھی باخبر کر دیا۔ قبرستان کی فضیلت بھی بیان کر دی وہاں جانے کا فلسفہ بھی بتا دیا۔ اور ساتھ ساتھ ارباب حکومت و اقتدار پر کڑی تنقید بھی کر دی۔ ذرا دنیا والوں کا کردار تو دیکھو اور پھر اس کے انجام پر بھی نگاہ ڈالو تو معلوم ہوگا کہ اہل دنیا کس قدر خدا کو بھول چکے ہیں۔ اور کس طرح ان کے ذہن پر دنیا غالب آچکی ہے۔ اور کیوں نہ ہو جس کے نمائندے ہیں اسے یاد کئے ہوئے ہیں خدا کے نمائندے ہوتے تو خدا کو یاد رکھتے۔ دنیا کے نمائندے ہیں تو دنیا کو یاد کئے ہوئے ہیں۔

بہلول نے متعدد ائمہؑ کی محفل سے فیض اٹھایا ہے اور مختلف معصومینؑ کی بارگاہ میں رہے ہیں۔ ظرف میں صلاحیت اور نفس میں قابلیت ہو تو ان بارگاہوں سے ایسا ہی کمال ملتا ہے۔ یہاں کے پروردہ ایسے ہی صاحبان فضل و شرف ہوتے ہیں اور ظرف میں صلاحیت نہ ہو تو بارگاہ رسالت سے بھی کچھ نہیں ملتا۔ اور مجھے تو یہ کہنا پڑتا ہے کہ جب اس بارگاہ کے خادموں کا یہ عالم ہے تو جن کی بارگاہ سے یہ شرف لیا ہے ان ہستیوں کا کیا عالم ہوگا۔ اتنا فرق تو ماننا پڑے گا کہ بارگاہ میں حاضری دینے والے بہلول دانا ہوں گے تو بارگاہ کے مالک علم کے ہزار باب میں ہر باب سے ہزار باب نکالنے والے ہوں گے اور رسولؐ آواز دیں گے "اَنَامَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُھَا" عصمت پکار اٹھے گی۔ "اَوَّلُنَا مُحَمَّدٌ وَاٰخِرُنَا مُحَمَّدٌ وَکُلُّنَا مُحَمَّدٌ"۔۔۔۔ صلوات

امام حسن عسکریؑ بچپنے ہی سے اپ کے ساتھ مدینہ سے طلب کرلئے گئے اور سامرہ میں آپ کی زندگی صرف مصائب و آلام کا شکار رہی۔ امام علی نقیؑ کی زندگی تک ان کے ساتھ نظر بندی اور حراست کی زندگی گذارتے رہے اور ان کے بعد قید تنہائی میں زندگی بسر کی۔ حکومت کی نئی روش یہ ہے کہ حضرت اپنے بچوں سے بھی ملاقات نہ کرنے پائیں۔ تاکہ خدا کی آخری حجت منظر عام پر نہ آنے پائے۔ ہر آنے والا بادشاہ ایک نئی ترکیب سوچتا ہے۔ اور جبر بدلنے والی حکومت امامؑ کو قتل کر دینے کی نئی تدبیر نکالتی ہے۔ یہاں تک کہ مستعین باللہ نے ایک گھوڑا خریدا اور وہ اتفاق سے سرکش نکل گیا۔ ایسا سرکش کہ کسی کی سواری کو قبول ہی نہ کرتا تھا۔ جس نے چڑھنے کا ارادہ کیا اسی کو پامال کر دیا۔ اور جو قریب گیا اسی کو روند ڈالا۔ حکومت عاجز ہے۔ شہسوار پریشان ہیں۔ آخر کیا کیا جائے اتنا عمدہ گھوڑا اور اتنا سرکش۔ بالآخر ایک نئی ترکیب نکالی گئی کہ امام حسن عسکریؑ کو طلب کیا جائے۔ اور ان سے سواری کے لئے کہا جائے۔ اگر وہ سوار ہو گئے تو گھوڑا رام ہو جائے گا اور اگر نہ ہو سکے تو اپنا مدعا حاصل ہو جائے گا۔ اور بلا کسی زحمت و بدنامی کے ختم ہو جائیں گے۔ آدمی پہونچ گیا آپ تیار ہو گئے۔ اور تیار ہو کر مستعین کے دربار میں تشریف لے آئے۔ مستعین نے کہا کہ آپ کو ایک عجیب کام کے لئے زحمت دی ہے۔ آپ نے کہا فرمایئے؟ کہا میں نے ایک گھوڑا خریدا ہے چاہتا ہوں کہ آپ ہی سے افتتاح ہو جائے۔ مکاری کی بھی حد ہوتی ہے اور قدرت بھی کیا رنگ دکھلاتی ہے تو سمجھا تیرے ہی دربار میں فضیلت کا اعلان ہو جائے۔ آپ نے فرمایا بیشک میں حاضر ہوں۔ اس نے لگام آپ کے حوالے کی آپ لگام لے کر آگے بڑھے اور لوگ موت کی خوشیاں منانے لگے۔ جیسے ہی آپ قریب پہونچے نہایت سکون سے لگام لگا دی۔ اس نے کہا فرزند رسولؐ زین بھی آپ ہی کس دیں۔

آپ نے وہ بھی کر دیا۔ کہا ذرا سوار بھی ہو جائیں۔ آپ نے سواری کا ارادہ کیا تو گھوڑے نے سر جھکا دیا۔ آپ سوار ہو گئے اور تا دیر دوڑاتے رہے۔ اس کے بعد اتر کر فرمایا۔ بادشاہ کو کیا حکم ہے یا میں جاؤں۔ بادشاہ نے کہا میں چاہتا ہوں کہ یہ گھوڑا آپ ہی کو دیدوں۔ آپ نے فرمایا میں اس کے لئے بھی حاضر ہوں یہ فرما کر گھوڑے کو لیا اور نہایت ہی اطمینان سے بیت الشرف کی طرف چلے آئے۔

یہ تھا امت کا اقتدار اور وہ تھی حکومت کی روش۔ امامت نے بھی آواز دی کہ تو بھی تیرے گھوڑے پر میں ہی سواری کروں اور تجھے اپنے گھوڑے پر چڑھنا نصیب نہ ہو۔ میں کہوں گا معتصم کا گھوڑا بھی شداد کی جنت بن گیا کہ سب کو اس کی بہار نصیب ہوئی تو دو مالک کو ہی نصیب نہ ہو سکی۔ امامت نے اپنے اقتدار سے یہ بھی واضح کر دیا کہ جو ایک گھوڑے کی لگام نہیں سنبھال سکتا وہ پوری حکومت کی باگ ڈور کیا سنبھالے گا اور ارباب نظر ہم تو کئی برسوں سے سنتے آئے ہیں۔ کل خیبر کے بارے میں بھی یہی کہا جا رہا تھا کہ وہ تو لڑنے کے لئے تیار تھے لیکن گھوڑا ہی نہیں ٹھہرا اور میدان سے بھاگ آیا تو وہ کیا کرتے۔ تو میں کہوں کا کچھ نہیں کہتے صرف گھوڑے کی فراست کی داد دیتے کہ مالک کے عزائم کو کس طرح پہچانتا ہے۔ اور سوار کے اشاروں پر کس طرح چلتا ہے۔

معتصم کے ارادے ناکامیاب ہوئے۔ اس کے بعد معتز باللہ کی حکومت آئی۔ اس نے آپ کو علی بن یادمش کی حراست میں دیدیا۔ وہ دشمن اہلبیتؑ ضرور تھا۔ لیکن حضرت کے کردار کو دیکھ کر رام ہو گیا اور اپنے اعمال کی معافی طلب کر کے آپ کو آرام گاہ تک پہونچا دیا اور صاف اعلان کر دیا کہ مجھے حکومت کے عتاب کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ میں ایسے بندۂ خدا کو اذیت نہیں دے سکتا

چند دنوں کے بعد معتز واصل جہنم ہو گیا۔ اس کی جگہ مہتدی باللہ کو حکومت ملی۔ یہ بظاہر بڑا پاک باز اور متقی تھا۔ لیکن دشمنیٔ اہلبیتؑ میں اپنے آباء و اجداد سے کم نہ تھا۔ صرف ایک سال کے قریب حکومت کی لیکن اس میں بھی ہر طرح امام کو اذیت دیتا رہا۔ اور ایک لمحہ آپ کو چین سے بیٹھنے نہ دیا۔ کھانا پانی تک بند کر دیا۔ اور اکثر آپ تیمم سے نماز پڑھ لیتے تھے۔ یہاں تک کہ مظلومیت رنگ لے آئی۔ اور پہرہ دار حضرت سے مانوس ہو گئے۔ اب جو داروغہ زندان صالح بن حنیف حالات کا جائزہ لینے آیا تو کیا دیکھا کہ سارے غلام آپ کے سامنے صف بستہ کھڑے ہیں۔ اور آپ کے حکم کے منتظر ہیں۔ صالح کے آنے پر کسی میں کوئی انقلاب نہیں آیا اور صالح مبہوت ہو گیا۔ جب میرے سامنے ان غلاموں کا یہ عالم ہے تو میرے بعد کیا ہو گا۔ اور لوگ کس طرح ان کی اطاعت کرتے ہوں گے۔ سزا دینا ممکن نہیں ہے ورنہ کہیں اپنا ہی خاتمہ نہ ہو جائے۔ مناسب یہی ہے کہ انھیں آزاد کر دیا جائے۔ اور قید سے رہا کر دیا جائے ورنہ اگر یوں ہی ان کا کردار لوگوں کے سامنے آتا رہا تو سارا سماج محب اہلبیتؑ ہو جائے گا ——— ارباب کرم! آپ کو یاد ہوگا کہ مرسل اعظمؐ نے صلح حدیبیہ کے موقع پر فرمایا تھا کہ کفار کا کوئی آدمی آجائے گا تو ہم واپس کر دیں گے اور ہمارا کوئی آدمی گرفتار ہو جائے گا تو ہم واپس نہ لیں گے۔ مسلمانوں کو اس بات پر بے حد جلال آیا تھا۔ اور بعض لوگوں نے تو رسالت ہی کو مشکوک بنا دیا تھا لیکن امام حسن عسکریؑ کے کردار نے واضح کر دیا کہ غیر کے دیار میں قیدی بن کر رہنا بھی اسلام کے حق میں مفید ہوتا ہے۔ اس طرح اپنا کردار پیش کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اور دشمن کے دل موڑ دئے جاتے ہیں۔ کیوں نہ ہو دادا کی مصلحت کو پوتے سے بہتر کون سمجھ سکتا ہے۔ اور رسالت کے کردار کو امامت سے بہتر کون ادا کر سکتا ہے۔ حکومت اس مصلحت کو نہ کل سمجھی تھی اور نہ آج سمجھی ہے۔ اسے

تو جوش انتقام میں قیدی بنانا آتا ہے۔ وہ کیا جانے کہ اللہ والے قید ہو کر بھی کس طرح دین حق کی تبلیغ کرتے ہیں۔ جناب یوسفؑ نے قید خانہ میں توحید کا سبق سکھایا تھا۔ امام موسیٰ کاظمؑ نے قید خانہ میں نمائندۂ حکومت سے سجدہ کرایا تھا۔ ثانی زہراؑ نے قید رہ کر شام کے دیار کو فتح کیا تھا۔ امام حسن عسکریؑ نے قید کی زندگی گذار کر دشمنوں کی زندگیاں بدل دی ہیں۔ اور عباسیت کی تاریکیوں میں ایمان کے چراغ روشن کر دیئے ہیں۔ جس نے کردار کو دیکھ لیا وہی گرویدہ ہو گیا اور جس پر بندگی کی چھوٹ پڑ گئی اسی کا دل نور ایمان سے منور ہو گیا۔

معتز باللہ کے قتل کے بعد معتمد تخت حکومت پر بیٹھا۔ اس کے زمانے میں ملک میں انقلابات برابر سر ابھار رہے تھے۔ اور یہ انتظام مملکت سے عاجز تھا لیکن امام حسن عسکریؑ کی اذیت کی طرف برابر متوجہ تھا۔ اور یہاں تک کہ اپنے غلام نحریر کو سخت تاکید کر دی کہ حضرت کو بے حد ستایا جائے اور اس نے اس قدر ستایا کہ اس کی زوجہ تک اس کی مخالف ہو گئی۔ آخر نبی زادے کو کس قدر ستائے گا۔ اور روز قیامت رسول اللہ کو کیا منھ دکھائے گا۔ نحریر کو ادنیٰ رحم نہ آیا اور اپنی اذیتوں کو اور زیادہ کر دیا۔ لیکن حضرت کے صبر و سکون میں کوئی فرق نہ آیا۔ بالآخر ایک دن آپ کو درندوں کے سامنے ڈال دیا گیا۔ اور یہ طے کر لیا گیا کہ آج ان کی زندگی کا خاتمہ کر دیا جائے گا۔ لیکن درندوں نے آپ کو دیکھتے ہی سر قدموں پر رکھ دیا اور حضرت ان کے سروں پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ حکومت دم بخود رہ گئی اور درندوں نے آواز دی تم انسان ہو کر انھیں نہیں پہچانتے ہو اور ہم جانور ہو کر انھیں پہچانتے ہیں۔ ہماری معرفت کا عالم یہ ہے کہ کل ان کے باپ کو یہاں بھیجا گیا تھا۔ تب بھی ہم نے اطاعت کی تھی اور آج انھیں بھیجا جا رہا ہے۔ تب بھی ہم ان کی اطاعت کر رہے ہیں۔ حیف ہم نسلوں کو پہچانتے ہیں۔ اور تم شخصیت کو بھی نہیں پہچانتے۔ ایسے انسانوں سے ہم جانور

ہی بہتر ہیں۔

آخر عاجز آکر معتمد نے خود اپنی حراست میں رکھ لیا اور مکمل دو برس ایک کوٹھری میں محبوس رکھا۔ جہاں روشنی تک کا گذر نہیں تھا۔ اور امام صرف عبادت پروردگار میں وقت گذارتے تھے۔ ضعف و ناتوانی کا یہ عالم تھا کہ ۲۴ برس کی عمر میں ضعیفی کے آثار نمودار ہو گئے تھے۔ لیکن خدا گواہ ہے کہ کردار میں کوئی فرق نہیں آیا اور امامت آواز دیتی رہی کہ قید ستم سے جسم میں ضعف آسکتا ہے۔ کردار میں ضعف نہیں آسکتا۔ تم نے جسم کی طاقت کو اپنا سرمایہ بنایا ہے۔ ہم نے کردار کی طاقت کو اپنا طرۂ امتیاز قرار دیا ہے۔

۲۵۵ھ میں معتمد نے آپ کو رہا کیا اور آپ اپنے بیت الشرف میں تشریف لائے۔ ۲۵۵ھ میں امام عصرؑ کی ولادت ہوئی اور قدرت نے واضح کر دیا کہ فرعونیت نے اپنی ساری تدبیریں تمام کر لیں لیکن جب موسیٰ کی ولادت کا وقت قریب آگیا تو ہم نے تمام پہرے ہٹا دیئے۔ اور دنیا کو بتا دیا کہ جسے ہم زندگی دینا چاہتے ہیں اسے کوئی نہیں مٹا سکتا۔ تو جب روز اول ہی واضح ہو گیا کہ حجت خدا کی زندگی پر حالات کا اثر نہیں ہوتا ہے۔ تو آج دنیا اس زندگی پر کیوں تعجب کر رہی ہے۔ جو ان حالات میں دنیا میں آسکتا ہے وہ ان حالات میں زندہ بھی رہ سکتا ہے۔

معتمد کے لئے یہ حالات ناقابل برداشت تھے کہ ہم انھیں مٹا دینا چاہتے ہیں اور یہ روز بروز مرجع خلائق بنتے جا رہے ہیں۔ لوگوں کی توجہ ان کی طرف بڑھتی جا رہی ہے۔ چنانچہ ایک دن اس نے طے کر لیا کہ اب آبائی حربہ کے علاوہ ان حالات سے نجات پانے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ ایک زہر آلود طعام تیار کرایا اور اپنے خادم کے ذریعہ امام علیہ السلام تک پہونچا دیا۔ خادم نے عرض کی کہ یہ طعام سرکار نے خاص طور سے آپ کے لئے تیار کرایا ہے اور آپ ہی کے لئے بھیجا ہے۔ آپ نے

فرمایا۔ بہتر ہے۔ جب میرے ہی لئے تیار کرایا گیا ہے۔ تو میں ہی کھاؤں گا۔ چنانچہ آپ نے اسے تناول فرمایا۔ تناول فرمانا تھا کہ جسم اقدس پر زہر کا اثر شروع ہو گیا۔ اور حالت بگڑنے لگی۔ حکومت کو حالات کی اطلاع ہوئی تو فوراً قدیمی مکر سے کام لیتے ہوئے تیمارداری کا انتظام کیا۔ سرکاری طبیب معین کئے تاکہ حضرت اس زہر سے جانبر نہ ہونے پائیں اور نمک خوار طبیب برابر یہ اعلان کرتے رہیں کہ انھیں زہر نہیں دیا گیا ہے بلکہ اچانک طبیعت خراب ہو گئی ہے اور علاج برابر جاری ہے۔ امکان ہے کہ صحت یاب ہو جائیں گے۔

عقید کا بیان ہے کہ میں حضرت کی خدمت میں حاضر تھا۔ آپ نے مجھ سے فرمایا کہ مجھے زہر دیا گیا ہے اور میرا وقت قریب آگیا ہے، جب میں آب مصطگی طلب کروں تو سمجھنا کہ میری موت قریب ہے اتنے میں حضرت کی حالت دگرگوں ہوئی۔ آپ نے فوراً پانی طلب فرمایا۔ میں نے آب مصطگی حاضر کیا۔ آپ نے فرمایا کہ ابھی اس کا وقت نہیں آیا ہے۔ خالص پانی لاؤ۔ میں نے پانی حاضر کیا۔ آپ نے وضو فرمایا۔ مصلے پر آئے۔ نماز ادا کی۔ بارگاہ احدیت میں مناجات کی اس کے بعد بستر پر تشریف لائے اور فرمایا کہ اب وہ پانی لاؤ۔ میں نے پانی حاضر کیا۔ آپ نے پینے کا ارادہ کیا۔ لیکن دست مبارک میں ایسا رعشہ پیدا ہوا کہ نہ پی سکے اور پیالہ کنیز کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد آپ خاموش ہو گئے اور معلوم ہوا کہ دنیا سے رحلت فرما گئے۔ حسینؑ کا یہ فرزند بھی دنیا سے تشنہ ہی گیا اور امام زمانہ کے دل پر ایک داغ یہ بھی رہ گیا۔ عجب نہیں کہ کربلا کا رخ کر کے آواز دی ہو کہ جد مظلوم آپ کو بھی وقت آخر پانی نہیں مل سکا تھا۔ اور میرا بابا بھی دنیا سے تشنہ لب ہی رخصت ہوا۔

اور اب عزا! ماہ ربیع الاول کی آٹھویں تاریخ تھی۔ جب امام حسن عسکریؑ

اس دنیا سے رخصت ہو رہے تھے۔ اور ہمارا اور آپ کا آخری امامؑ یتیم ہو رہا تھا۔ یہ تاریخ عزا کی تاریخ میں بے حد اہمیت کی حامل ہے۔ سال بھر جن معصومین کا غم منایا جاتا ہے وہ خود بھی دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ اور ان کے وارث بھی دنیا سے جا چکے ہیں۔ لیکن ہمارا یہ گیارہواں امام وہ ہے جس کا وارث خدا رکھے ابھی زندہ ہے۔ ضرورت ہے کہ ہم اور آپ مل کر اپنے اس امامؑ زمانہ کی خدمت میں باپ کا پرسہ دیں اور عرض کریں کہ فرزند رسولؐ اب تک آپ کربلا کے مصائب کو یاد کر کے روتے تھے۔ اور حسینؑ مظلوم کی خدمت میں عرض کرتے تھے ——— جد بزرگوار! اگر زمانہ نے مجھے پیچھے ڈال دیا ہے اور مقدر نے موقع نہیں دیا کہ میں کربلا میں آپ کی نصرت کرتا۔ تو جد مظلوم اب میں صبح و شام آپ کا ماتم کروں گا۔ اور آنسو تمام ہو جائیں گے تو آنکھوں سے خون بہاؤں گا۔ لیکن آپ کے مصائب پر گریہ بند نہ کروں گا ——— مولا! آج آپ پر ایک تازہ غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ یتیمی کا صدمہ اور یہ حالات۔ مولا آپ کے مصائب کربلا سے ملتے جلتے ہیں۔ وہاں بھی بیٹا موجود تھا لیکن باپ کے سرہانے نہ آسکا۔ اور یہاں بھی آپ ظاہر بظاہر باپ سے مل بھی نہ سکے۔ لیکن مولا! آپ باعجاز ہی باپ کے سرہانے رہے تو ——— اور جب باپ کا انتقال ہو گیا تو آپ نے غسل و کفن دے کر جنازہ تیار تو کر دیا اور جب ظاہری طور پر آپ کے چچا نماز کے لئے کھڑے ہوئے تو آپ نے آکر دامن کھینچ لیا۔ چچا ہٹئے یہ معصوم کی نماز جنازہ ہے اسے غیر معصوم ادا نہیں کر سکتا۔ میں بیٹا موجود ہوں۔ میرے ہوتے ہوئے آپ کو کیا حق پہنچتا ہے کہ آپ نماز پڑھیں یہ کہہ کر آپ آگے بڑھے اور باپ کی نماز جنازہ ادا کر دی۔ لیکن مولا! کوئی عابد بیمار کے دل سے پوچھے۔ باپ کا لاشہ جلتی ریتی پر پڑا ہوا ہے۔ اور بیٹا قید ہو کر جا رہا ہے۔ ثانی زہراؑ فریاد کر رہی ہیں۔ جد بزرگوار! آپ کی

نماز ملائکہ نے پڑھی ہے اور یہ آپ کا حسینؑ جلتی ریتی پر پڑا ہوا ہے اور آپ کی ذریت قیدی بن کر جا رہی ہے۔ نانا ذرا اپنی زینبؑ کا حال تو دیکھئے کس شان سے رسن بستہ ہو کر مقتل سے کوفہ و شام کے بازاروں کی طرف جا رہی ہے۔

ارباب عزا! امام حسن عسکریؑ کا جنازہ اٹھا اور تاریخ کہتی ہے کہ اتنی شان سے اٹھا کہ اس شان سے اب تک اولاد رسولؐ میں کسی کا جنازہ نہ اٹھا تھا۔ ساری مملکت پورا شہر۔ اعیان حکومت۔ بادشاہ وقت۔ عوام۔ خواص۔ وزراء سفراء۔ علماء۔ فقہا غرض ہر طرف اجتماع ہی اجتماع۔ ظاہری نماز جنازہ میں بھی ہزاروں کا مجمع۔ اہتمام۔ انتظام۔ جنازہ اٹھا اور باپ کے پہلو میں دفن ہوا۔ عزادارو! یہ آخری حسنؑ کا جنازہ ہے جسے عالم غربت کے باوجود باپ کا پہلو نصیب ہو گیا۔ مگر اسے فاطمہؑ کا لال نہ باپ کا پہلو ملا نہ نانا کا قرب۔ روضۂ رسولؐ کی طرف جنازہ چلا بھی تو تیروں کی بارش۔ تابوت میں ۷۰ تیر۔ یہ سیدہؑ کے لال کا جنازہ ہے۔ عزادارو! آپ سوچ سکیں تو سوچیں۔ قبر رسولؐ پر کتنی مرتبہ زلزلہ آیا ہوگا۔ جب سیدہ کا جنازہ اٹھا تو قبر رسولؐ میں زلزلہ آیا۔ جب مسجد کوفہ سے جبریل کی آواز گونجی تو قبر رسولؐ کو زلزلہ ہوا۔ جب حسنؑ کے جنازہ پر تیر برسے تو قبر رسولؐ کو زلزلہ ہوا۔ جب ام سلمہ عصر عاشور کو خواب دیکھ کر پرسہ کے لئے آئیں تو قبر رسولؐ کو زلزلہ ہوا۔ اور سب سے عظیم تر زلزلہ تو اس دن آیا ہوگا جب نواسی قید شام سے چھٹ کر وطن آئی ہوگی۔ اور نانا کی قبر پر حاضری دی ہوگی۔

عزاداران حسینؑ! آج کی تاریخ قوم میں دوہرے غم کی تاریخ ہے۔ امام حسن عسکریؑ کا ماتم ایک طرف اور ایام عزا کا آخری دن ایک طرف۔ عجب نہیں کہ یہ دن ایام عزا کا آخری دن بھی اسی اعتبار سے ہو کہ معصومین کی تاریخ میں یہ آخری شہادت ہے۔ ۸ ربیع الاول کو بارگاہ احدیت میں پیش ہوئی ہے۔ اس کے بعد بارہواں وارثِ رسولؐ ابھی زندہ

ہے۔ بہرحال اس تاریخ کو اس غم کے لحاظ سے بھی ایک اہمیت حاصل ہے۔ اور آج اس قیامت خیز منظر کی بھی یاد منائی جاتی ہے۔ جب شام سے قافلہ چھٹ کر مدینہ آ رہا تھا اور جناب ام کلثوم آواز دے رہی تھیں نانا کے مدینے ہمارے آنے کو قبول نہ کرنا۔ ہم لٹ کر آئے ہیں۔ نانا کے مدینے سے ہم گئے تھے تو ہمارے سروں پر وارثوں کے سائے تھے۔ گودیوں میں بچے تھے اور واپس آئے ہیں تو سروں پر گرد غربت ہے اور گودیاں خالی ہو چکی ہیں۔

قافلہ بیرون مدینہ ٹھہرا۔ محمد حنفیہ ملاقات کی غرض سے چلے۔ سیاہ پرچم دیکھ بیہوش ہو کر گر پڑے۔ ارے یہ سیاہ پرچم کیسے۔ میرا بھیا کہاں ہے۔ غلاموں نے سنبھالا۔ آقا چلئے قافلہ آیا ہے۔ حسینؑ نہیں آئے۔ سید سجادؑ قافلہ لے کر آئے ہیں۔ محمد حنفیہ آگے بڑھے۔ سید سجادؑ نے بڑھ کر استقبال کیا۔ چچا نے بھتیجے کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ سید سجادؑ نے کہا چچا ذرا ہاتھ ہٹا لیجئے۔ محمد حنفیہ نے فرمایا بیٹا میرا بھیا کیا مارا گیا تم نے مجھے بالکل بھلا دیا۔ اور اب مجھ سے گلے بھی نہیں ملنا چاہتے۔ عرض کی چچا خدا گواہ ہے۔ ایسا نہیں ہے ذرا سنبھل کر میری گردن کی حالت تو دیکھئے۔ مجھے طوق خاردار پہنا کر کوفہ و شام کی طرف لے جایا گیا تھا۔ محمد حنفیہ نے جھک کر غور سے دیکھا تو بیہوش ہو گئے۔ ارے میرے لال تجھ پر یہ مصائب۔ گذر گئے بیٹا تو نے ایسی اذیتیں برداشت کیں میرے لال۔ عجب نہیں سید سجادؑ نے فرمایا ہو چچا ذرا اپنی بہنوں کا حال تو دیکھئے۔ میں ان بہنوں کو لے کر درباروں میں گیا۔ بازاروں سے گذرا۔ چچا ہزاروں تماشائیوں میں ہم چند قیدی۔ اور آگے آگے منادی کی آواز۔ تماشائیو! تماشا دیکھو۔ یہ اولاد رسولؐ قیدی بن کر جا رہی ہے۔

وقت گذرا۔ قافلہ مدینہ میں داخل ہوا۔ کس شان سے داخل ہوا۔ خدا بہتر جانتا ہے۔ کون بتائے گا کہ بیبیوں کے دل پر کیا گذری۔ کون بتائے گا کہ لیلیٰ کو اکبرؑ

کیسے یاد آئے۔ شہزادی زینبؑ نے عونؑ و محمدؑ کو کس طرح یاد کیا۔ اُمِ فروہ کو قاسمؑ کے بعد وطن کیسا لگا اور اس ماں کو کیسے چین آیا جس کا ایک بچہ خاکِ کربلا پر سو رہا ہے اور ایک بچی شام کے زندان میں آرام کر رہی ہے۔

تھوڑی دیر گذری تھی کہ ایک مرتبہ ثانیٔ زہراؑ نے عابدِ بیمار سے کہا۔ بیٹا میں نانا کی قبر پر جا رہی ہوں۔ میں نانا کو اپنی روداد غم سناؤں گی۔ پردہ کا اہتمام ہوا۔ عورتوں کا ہجوم۔ پرسہ دینے والوں کا مجمع۔ مدینہ والوں کا اژدھام۔ نبیؐ کی بیٹی چلی۔ قبرِ اطہر کے قریب آئی۔۔ آواز دی نانا! آپ کے حسینؑ کا پرسہ دینے آئی ہوں۔ نانا آپ کے حسینؑ کی سنانی لے کر آئی ہوں۔۔۔ نانا میں لٹ کر آ گئی۔ بھیا کو کربلا میں چھوڑ کر آئی ہوں۔ نانا کوئی ساتھ نہیں آیا۔ ایک بیمار بھتیجے کو بچا کر لائی ہوں نانا۔۔ سب کربلا کی خاک پر سو گئے۔ اور واے نانا ایک بچی تو شام کے زندان میں ہم سے جدا ہو گئی۔ ہم نے اسے وہیں دفن کر دیا۔ اور اندھیرے قید خانے میں چھوڑ کر چلے آئے۔ نانا ہم پر کیا گذر گئی کیسے بتائیں۔۔۔ اگر مجمع عام نہ ہوتا تو شانوں سے ردا ہٹا کر دکھاتی کہ کس طرح رسیوں سے بازوؤں کو جکڑا گیا تھا اور کس طرح کربلا سے کوفہ اور کوفے سے شام تک تازیانوں پر تازیانے کھائے ہیں۔

عزادارو! میرا دل کہتا ہے کہ قبرِ پیغمبرؐ کو زلزلہ آیا ہوگا اور آواز آئی ہوگی۔ بس زینبؑ بس! بس میری لال بس۔ اب نانا کو زیادہ مصائب نہ سناؤ۔ نانا کا دل تڑپ رہا ہے۔ بیٹی میں اُس وقت بھی موجود تھا جب میرے لال کے گلے پر خنجر چل رہا تھا۔ میری بیٹی میں اُس وقت بھی تھا جب تیری پشت پر تازیانے

لگ رہے تھے۔ شاباش میری بیٹی تو نے میری محبت کا حق ادا کر دیا۔ تو نے زہراؑ کے شیر کا اثر دکھلا دیا۔ زینبؑ تیرے نانا پر تیرا احسان ہے کہ تو نے تازیانے کھائے مگر میرے دین کو بچا لیا۔ شاباش میری بیٹی شاباش اب اس کا اجر قیامت کے دن ملے گا جب عادل کی عدالت ہوگی۔ تیرے نانا کی فریاد ہوگی۔ زہراؑ کے بال بکھرے ہوں گے۔ اور عرشِ الٰہی کو زلزلہ ہوگا۔ تیری ماں عرض کرے گی۔ پروردگار میرا گھر اجڑ گیا۔ میرے مالک میری نسل تباہ ہو گئی۔ میرا حسینؑ مارا گیا۔ معبود میری زینبؑ کے بازوؤں میں رسیاں باندھی گئیں۔

وامحمداہ واعلیاہ وحسیناہ۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

کیسے یاد آئے۔ شہزادی زینبؑ نے عونؑ و محمدؑ کو کس طرح یاد کیا۔ اُمِ فروہ کو قاسمؑ کے بعد وطن کیسا لگا اور اُس ماں کو کیسے چین آیا جس کا ایک بچہ خاکِ کربلا پر سو رہا ہے اور ایک بچی شام کے زندان میں آرام کر رہی ہے۔

تھوڑی دیر گذری تھی کہ ایک مرتبہ ثانیٔ زہراؑ نے عابدِ بیمار سے کہا۔ بیٹا میں نانا کی قبر پر جا رہی ہوں۔ میں نانا کو اپنی رودادِ غم سناؤں گی۔ پردہ کا اہتمام ہوا۔ عورتوں کا ہجوم۔ پرسہ دینے والوں کا مجمع۔ مدینہ والوں کا اژدہام۔ نبیؐ کی بیٹیؑ چلی۔ قبرِ اطہر کے قریب آئی ـــ آواز دی نانا! آپ کے حسینؑ کا پرسہ دینے آئی ہوں۔ نانا آپ کے حسینؑ کی سناونی لے کر آئی ہوں ـــ نانا میں لٹ کر آگئی۔ بھیا کو کربلا میں چھوڑ کر آئی ہوں۔ نانا کوئی ساتھ نہیں آیا۔ ایک بیمار بھتیجے کو بچا کر لائی ہوں نانا ـــ سب کربلا کی خاک پر سو گئے۔ اور اے نانا ایک بچی تو شام کے زندان میں ہم سے جُدا ہو گئی۔ ہم نے اسے وہیں دفن کر دیا۔ اور اندھیرے قید خانے میں چھوڑ کر چلے آئے۔ نانا ہم پر کیا گذر گئی کیسے بتائیں ـــ اگر مجمعِ عام نہ ہوتا تو شانوں سے ردا ہٹا کر دکھاتی کہ کس طرح رسیوں سے بازوؤں کو جکڑا گیا تھا اور کس طرح کربلا سے کوفہ اور کوفے سے شام تک تازیانوں پر تازیانے کھائے ہیں۔

عزادارو! میرا دل کہتا ہے کہ قبرِ پیغمبرؐ کو زلزلہ آیا ہوگا اور آواز آئی ہو گی۔ بس زینبؑ بس! بس میری لال بس۔ اب نانا کو زیادہ مصائب نہ سناؤ۔ نانا کا دل تڑپ رہا ہے۔ بیٹی میں اُس وقت بھی موجود تھا جب میرے لال کے گلے پر خنجر چل رہا تھا۔ میری بیٹی میں اُس وقت بھی تھا جب تیری پشت پر تازیانے

لگ رہے تھے۔ شاباش میری بیٹی تُو نے میری محبت کا حق ادا کر دیا۔ تُو نے زہراؑ کے شیر کا اثر دکھلا دیا۔ زینبؑ تیرے نانا پر تیرا احسان ہے کہ تُو نے تازیانے کھائے مگر میرے دین کو بچا لیا۔ شاباش میری بیٹی شاباش اب اس کا اجر قیامت کے دن ملے گا جب عادل کی عدالت ہو گی۔ تیرے نانا کی فریاد ہو گی۔ زہراؑ کے بال بکھرے ہوں گے۔ اور عرشِ الٰہی کو زلزلہ ہو گا۔ تیری ماں عرض کرے گی۔ پروردگار میرا گھر اجڑ گیا۔ میرے مالک میری نسل تباہ ہو گئی۔ میرا حسینؑ مارا گیا۔ معبود میری زینبؑ کے بازوؤں میں رسیاں باندھی گئیں۔

واحمدا واعلیاہ وحسیناہ۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔